الفاظ

جلد ۸ | جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۳ء | شمارہ ۱، ۲

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی اطہر پرویز

اسد یار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

سرورق پر: مجنوں گورکھپوری

زرِ سالانہ ــــ ۱۶ روپے

قیمت ــــ ۳ روپے

پرنٹر پبلشر ــــ اسد یار خاں

مطبوعہ ــــ جواہر آفسیٹ پریس نئی دہلی

کتابت ــــ ز۔ رشید، الٰہ آباد

مقامِ اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

گوشۂ مجنوں

نئے افسانے

اور انشائیہ بھی

غزلیں

یادیں اور یادیں

اور

اداریہ

حکومتوں کے قول اور عمل میں اتنا بُعد ہوگیا ہے کہ اب لوگ اس کی ہر بات کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس معاملے میں مرکز اور ریاست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ الکشن کے مینی فسٹو اٹھا کر دیکھ لیجئے، عمل آپ کے سامنے ہے۔ یہ فرق اپنے آپ واضح ہوجائے گا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے رائے دہندگان کی بڑی اکثریت ان پڑھ بھی ہے اور معصوم بھی ــ لیکن جس طرح اصولوں میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں، شاید حکومتوں کے معاملے میں بھی یہ بات سچ ہے۔ مثلاً بہار کی حکومت کو لیجئے۔ وہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت بہار جو کہتی ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ اس لئے ہم ان کے اعلانات پر اب اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں بہار کے وزیر اعلیٰ شری جگن ناتھ (مصرا) نے اعلان کیا کہ وہ "مظہر الحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی" قایم کرنے والے ہیں۔ یہاں ہم یو۔پی۔ والے عرصے اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس کا ذکر برسوں سے زور و شور سے ہو رہا ہے۔ ویسے آج کل یہ شور بھی کچھ مدھم سا ہوگیا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ دو سال بعد اس کا چرچا پھر اسی شان کے ساتھ ہوگا۔ مسز اندرا گاندھی یقیناً اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے مختلف علاقوں میں تقریریں کریں گی۔

ریاستی حکومتیں بعض معاملات میں خاصی خود مختار ہیں۔ اور یہ خود مختاری تو تھی ہی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ایک جنبش قلم سے اسے اسکولوں اور کالجوں سے نکال دیا گیا اور ایسا نکالا کہ اس روز سے اردو والے اس کو واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برسراقتدار پارٹی محض یہ نعرہ دے کر کہ اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہئے سرخ رو ہونا چاہتی ہے۔ لیکن اللہ رے بے بسی۔

کیا حکومت اترپردیش جناب جگن ناتھ مصرا صاحب کی طرح ایک بار ہمت سے کام لے گی۔ بہر حال ہم بہار کے وزیر اعلیٰ کو ان کے اقدامات کے لئے مبارکباد دیتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ یو۔پی۔ کے وزیر اعلیٰ اپنے اندر ان کی سی جرأت اور ہمت پیدا کریں گے۔

ــــ مجلسِ ادارت

قتیل شفائی

غالب کالونی، سمن آباد، لاہور

غزل

ٹوٹنے اور بکھرنے کا چلن مانگ لیا
ہم نے حالات سے شیشے کا بدن مانگ لیا

اپنے کار میں جو اک پھول تھا اس کے بدلے
ہم سے اک شخص نے خوابوں کا چمن مانگ لیا

جب سنا آئیں گے کچھ لوگ نصیحت کرنے
ایک دوجے سے وہیں ہم نے دہن مانگ لیا

وہ مسلمان تھی اللہ سے شرماتی رہی
اور بھگوان سے گوری نے سجن مانگ لیا

زور تھا شیخ و برہمن کا ہر اک بستی میں
ہم نے رہنے کے لئے شہر سخن مانگ لیا

ہم بھی موجود تھے تقدیر کے دروازے پہ
لوگ دولت پہ گرے، ہم نے وطن مانگ لیا

جس کی تحریر میں ہونا تھا ہمیں دفن قتیل
اس نے واپس وہیں کاغذ کا کفن مانگ لیا

مجنوں گورکھپوری

جدیدیت — یعنی؟

اگر ہم برصغیر پاک و ہند کی گذشتہ ایک صدی کی ذہنی اور معاشرتی زندگی کا سرسری مطالعہ کریں تو ہم کو بہت واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے اور نصف آخر سے بیسویں صدی میں آج تک ہماری فکر اور ہمارے نصاب عمل میں کئی اعتبارات سے بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اجمالی طور پر چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک ہماری زندگی میں حادثات و تغیرات اور نئے مسائل اور نئے میلانات کا سوال ہے، وہ پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں لیکن پہلے ان تغیرات اور بدلتے ہوئے میلات اور اقدار کا ہم کو جو کچھ احساس تھا وہ غیر شعوری تھا اور اس کا اثر ہمارے فکر و اظہار اور ہمارے تخئیل اور عمل پر غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر پڑتا رہا۔ آج ہم کو زندگی کی جلد جلد بدلتی ہوئی صورتوں کا شعوری طور پہ احساس ہے اور شدت کے ساتھ احساس ہے۔ یہ نئے ذہن اور پرانے ذہن کے درمیان بڑا سنگین فرق ہے۔ آج ساری دنیا کی زندگی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو حادثات اور انقلابات تاریخ کے گذشتہ ادوار میں ایک صدی یا نصف میں رونما ہوتے تھے ان سے بہت زیادہ حادثات اور انقلابات اب ہر دس سال یا پانچ سال کے بعد ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ہم کو اپنی فکر و عمل کا زاویہ بدلنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو ہنگامے ہوتے تھے۔ ان کا جغرافیائی رقبہ محدود ہوتا تھا اور اس رقبہ سے باہر کرۂ زمین کے دوسرے حصے ان کے اثرات سے مامون رہتے تھے۔ اور اب جیسا کہ ہمارا تجربہ ہم کو بتا رہا ہے اگر دنیا کے کسی چھوٹے سے چھوٹے خطے میں کوئی طوفان اٹھتا ہے تو اس کا اثر عالمگیر ہوتا ہے۔ اس کے ارتعاشات زمین کے ہر گوشے میں انسان کی ذہنی اور عملی زندگی تک پہنچتے ہیں اور اس پر اپنا دباؤ ڈالتے ہیں۔ ان تمام اسباب و حالات کا جو اثر ہمارے ذہن پر ہوتا ہے وہ شعوری طور پر ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم کو ہر لمحہ یہ اثر ہمارے شعور میں کارفرما محسوس ہوتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور کے ذہن کی سب سے اہم خصوصیت زندگی کے بحران کا یہی

شدید احساس ہے جو تردّد (ANXIETY) کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ہم اپنے دور کو تردّد کا دور کہہ سکتے ہیں اور اس دور کا آغاز یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوتا ہے۔ عصر جدید کے ایک نقاد READ نے ہمارے زمانے کی ایک بہت بڑی پہچان یہ بتائی ہے کہ "ہم زندگی کے مسائل کا شدید احساس رکھتے ہیں۔" احساس کی یہ شدت ہیجان کی حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ یہ زمانہ سقراطی حد تک خود آگاہ ہے۔ اتنا خود آگاہ کہ اس کا لازمی نتیجہ ذہنی انتشار اور بے یقینی ہے۔ ہم جو کچھ سوچتے یا کرتے ہیں تو سوچتے یا کرتے وقت ہمارے اندر یہ فکر بھی کام کرتی رہتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ ایسی حالت میں ہم جو عملی قدم اٹھاتے ہیں اس میں ہمارا فکری میلان خلل انداز ہوتا رہتا ہے اور چونکہ سوچنے اور کرتے رہنے کا عمل بیک وقت جاری رہتا ہے۔ اس لئے عمل کے نقائص کا احساس ہماری فکر کو بھی منتشر کئے رہتا ہے۔

حالات و حوادث زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اردو ادب اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (جس کو غدر کا غلط نام دیا جاتا رہا ہے) کے بعد سے اردو زبان و ادب میں بہت سے میلانات اور تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اب سے ایک چوتھائی صدی پہلے تک ان میلانات اور تحریکوں کا مقصد بہت صاف اور واضح تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک نصاب تھا۔ اور وہ ہمہ سمتی ہوتے ہوئے مجموعی طور پر کسی ایک سمت کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ اور اس کو اس کے مقصد کے اعتبار سے کوئی ایک عنوان دیا جا سکتا تھا۔ مثلاً سر سید کی تحریک جو علی گڑھ کے نام سے مشہور ہے یا عقلیت اور افادیت کے میلانات یا رومانی اور جمالیاتی میلان جس کے تحت ہم ساری تصور پرستی اور ماورائیت کو لا سکتے ہیں۔ یا دوسری جنگ عظیم تک ترقی پسند تحریک کا زور جس سے ہمارے اندر نئی آگاہیاں پیدا ہوئیں اور ہم کو اپنی مادی زندگی کی اصل قدر اور منزلت کا شعور ملا۔

ارضی، جسمانی اور مادی زندگی کے برحق اور مقدس ہونے کا شعور ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دین ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو غلطی پہلے تصوریت کے مبلغ کر چکے تھے وہی غلطی ترقی پسندوں نے کی یعنی زندگی کی ثنویت اور جدلیت کو بھول کر وہ بھی زندگی کے ایک ہی رُخ پر ضرورت سے زیادہ زور دینے لگے اور ہم زندگی کے دوسرے رخ سے کچھ بیگانے سے ہو گئے۔

آزادی ملنے کے بعد سے اب تک اردو ادب میں دراصل کوئی دوسری تحریک یا کوئی ایک دوسرا میلان وجود میں نہیں آیا۔ ادب کا مارکسی نظریہ جو کچھ ہم کو دے سکتا تھا دے گیا اور جو کچھ وہ

دے گیا وہ نئی نسل کے شعور میں جذب ہو چکا ہے۔ آج ترقی پسند تحریک برائے نام باقی تو ہے لیکن اس میں وہ دم نہیں ہے جو پہلے تھا اور اس کا سبب یہ ہے کہ اب وہ ہمارے فکر و عمل میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی ۔ ہر تحریک کچھ ناگزیر عوامل اور محرکات کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ۔ اور اس کا ایک مخصوص مقدر ہوتا ہے ۔ ایک میعاد کے بعد جب اس مقدر کی تکمیل ہو چکی ہے تو وہ تحریک یا تو ختم ہو جاتی ہے یا بیکار ہو جاتی ہے ۔ اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا آج بھی کوئی ایک میلان یا تحریک ہے جو ہمارے نظام فکر اور ہماری تخلیقات پر غالب ہو جس طرح گذشتہ تحریکیں اور میلانات غالب رہ چکے ہیں ۔ اگر غور سے مطالعہ کر کے ایمانداری کے ساتھ جواب دیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ اس وقت ادب میں کوئی نئی تحریک نہیں چل رہی ہے اور آج کی ادبی تخلیقات کسی ایک میلان کی نمائندگی نہیں کرتیں ۔ آج جتنے لکھنے والے ہیں اتنے ہی میلانات ہیں ۔ تحریک کا کوئی سوال نہیں ۔

کچھ عرصے سے ہندوستان اور پاکستان میں ایک اصطلاح کا زور بڑھا ہوا ہے جس کو خواہ مخواہ کوئی ایک میلان سمجھا جا رہا ہے جدیدیت کی اصطلاح ہے جو اردو ادب میں اور بہت سی اصطلاحات کی طرح انگریزی سے ماخوذ ہے ۔ برصغیر کے دونوں ممالک میں جدیدیت پر آئے دن مذاکرے اور مباحثے ہوتے رہتے ہیں اور مختصر غیر رسمی صحبتوں میں بھی اس کا بڑا چرچا ہے ۔ سب سے پہلے تو جدیدیت کی اصطلاح ہی کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ اصطلاح کس قاعدے سے بنی ہے اور انگریزی میں جو دو الفاظ رائج ہیں ان میں سے اس کو کس کا مترادف سمجھا جائے ۔ جدیدیت سے MODERNITY مراد ہے یا MODERNISM ۔ جو لوگ کہ جدیدیت کا نعرہ لگا رہے ہیں ، خود ان کے ذہن صاف نہیں ہیں اور وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جدیدیت MODERNITY ہے یا MODERNISM ۔ ہم عام طور سے "یت" کا لاحقہ "ISM" کے لئے لاتے ہیں ۔ جیسے اشراقیت مشائیت ، روحانیت ، ماورائیت ، عینیت ، مادیت وغیرہ ۔ اشراقیت اشراقی سے ماخوذ ہے ۔ مشائیت مشائی سے ، ماورائیت ، ماورائی سے ، مادیت مادی سے ، روحانیت روحانی سے ، عینیت عینی سے ۔ لہذا اگر کوئی لفظ عربی ، فارسی یا اردو میں جدیدی ہوتا تو اس سے جدیدیت کا لفظ مشتق ہو سکتا تھا MODERNISM کے لئے اگر کوئی اصطلاح قاعدے سے بن سکتی ہے تو وہ جدتی سے جدتیت ہوگی ۔ جدتی ہمارے لئے نامانوس ضرور ہے لیکن جس طرح بدعت سے بدعتی ۔ خلقت سے خلقی ۔ حیرت سے حیرتی شامت سے شامتی بنایا گیا ہے ۔ اسی طرح جدت سے جدتی بنایا جا سکتا ہے اور جدتی سے جدتیت کی اصطلاح بن سکتی ہے اور یہ اصطلاح MODERNISM کی قائم مقام ہوگی

MODERNISM عام طور پر جدیدیت کی طرح ایک عقیدہ یا ادعائی نظریہ کا مترادف ہے اور اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عام طور سے "کل جدید" "لذید" یعنی جدت کے خبط کو MODERNISM کہتے ہیں MODERNISM، MODERNITY کے برخلاف صحت مند زندگی کی علامت اور اس کی بقا اور ارتقا کی ضمانت ہوتی ہے اور MODERNITY کے لئے اردو میں ہمارے خیال میں جدت کا لفظ کافی ہے MODERNITY یا جدت زندگی کی صحیح رفتار یعنی اس کے صحیح سمت میں آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے۔ زندگی کے لئے MODERNITY نہ صرف پسند یا ناپسند کی بات ہے بلکہ ناگزیر ہے MODERNITY یا جدت اٹھا ہوا قدم ہے اور جو شخص یا جو گروہ اس پیش قدمی کی مخالفت کرتا ہے وہ یا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک مقام پر قدم جمائے کھڑے رہیں یا الٹے پاؤں چھوڑی ہوئی منزلوں کی طرف واپس چلے جائیں۔ یہ دونوں میلانات زندگی کی تخلیقی اور ارتقائی فطرت کے خلاف ہیں۔

اب اصل موضوع کی طرف پھر آئیے۔ اگر ہم بہت سے غلط الفاظ کی طرح جدیدیت کے لفظ کو درست مان لیں۔ اس لئے کہ یہ رائج ہو چکا ہے تو سوال یہ ہے کہ "جدیدیت" ادب میں کس فکری رجحان یا عمل میلان کا نام ہے۔ راقم کو ہندوستان و پاکستان میں گذشتہ تین چار سال کے اندر اکثر ایسے مذاکروں، ادبی جلسوں، یا غیر رسمی صحبتوں میں حصہ لینا پڑا ہے جن میں جدیدیت پر تقریری یا تحریری بحثیں ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں جتنی تقریریں سننے میں آئیں اور جتنے مقالے مختلف موقعوں پر پڑھے گئے اور جتنے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے وہ اپنی تمام طویل بحث کے باوجود کچھ الجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے یا پھر بے نتیجہ تھے۔ ہم ان تمام مذاکرات اور مقالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جدیدیت کسی ایک میلان یا کسی ایک سمت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ کبھی کوئی لاشعور پر زور دیتا ہے اور اس کو جدیدیت کہتا ہے۔ کبھی کوئی فرانس کے مشہور ناول نگار سارتر کی تقلید کرتا ہے اور بغیر اچھی طرح سمجھے ہوئے وجودیت کے نظریے کی حمایت کرتا ہے اور کبھی کوئی شعور کی رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کی تبلیغ کرتا ہے اور ان میں سے ہر شخص کو اصرار ہے کہ اس کا پیش کیا ہوا زندگی اور ادب کا نظریہ جدیدیت ہے۔ ہمارے سامنے بعض ایسے ملفوظات اور مضامین بھی ہیں جن میں کسی نہ کسی حد تک مندرجہ بالا تمام میلانات باہم مخلوط معلوم ہوتے ہیں اور ان سے ذہن بھول بھلیاں ہو کر رہ جاتا ہے۔ راقم کو بعض ایسے نوجوان ادیبوں سے بھی تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے جو کھلے یا ڈھکے الفاظ

میں یہ کہتے ہیں کہ سرے سے کسی قدر کے قابل ہی نہیں۔ ابھی دس پندرہ سال کی بات ہے کہ "فراریت" یا پلائن گریزی کو سب سے بڑی نامردی سمجھتے تھے اور روایتی یا کلاسیکی ادب کے بیشتر حصے کو "فراری" بتاتے تھے۔ لیکن اس اقدار کے سرے سے نہ قایل ہونے کو کیا کہا جائے ایک ہم عصر شاعر کا ایک خاصا خوبصورت شعر ہے جس کا دوسرا مصرعہ ہے ؎

" نہ زندگی کی تمنا نہ زندگی سے گریز "

مگر آخر یہ کون سی منزل ہے اور آگے کس منزل کا پتہ دیتی ہے؟ قدیم سے قدیم زمانے سے آج تک کوئی نظامِ فکر ایسا نہیں جو ہم کو کچھ دے نہ گیا ہو اور جس کے صحت بخش عناصر انسان کی زندگی کے مزاج میں جذب نہ ہو گئے ہوں۔ لاشعوریت ہو یا وجودیت زندگی اور ادب کا سماجی نظریہ ہو یا شعور کی رو کا نظریہ، ان سب میں کچھ نہ کچھ ایسے عناصر ملیں گے جو زندگی کی حقیقت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں اور جو اس قابل ہیں کہ ان کو کچھ کر قبول کیا جائے اور سلیقے کے ساتھ ان کو زندگی اور ادب کے نصاب کا جزو بنایا جائے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر نظریہ کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ کس ماحول کے کن موثرات نے اس نظریہ کو جنم دیا ہے اور اس کے کون سے عناصر اپنے وقت کے ساتھ مخصوص ہیں اور کون سے عناصر ایسے ہیں جو پائیدار قدریں رکھتے ہیں کون سے عناصر ذاتی مزاج اور نجی زندگی کے سانحے کی پیداوار ہیں اور کون سے عناصر عام انسانیت کے لئے نئی یافت کا حکم رکھتے ہیں۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ مذکورہ بالا نظریات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر نظریہ ایسا ہے جس پر طویل اور مفصل بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے ان تمام نظریات میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر نظریہ کسی نہ کسی لحاظ سے انفرادیت یا شخصی مزاج پر زور دیتا ہے اور ہیئت اجتماعی اور اس کے مفروضات اور مسلمات سے انحراف کر کے مفکر یا ادیب کی اپنی شخصیت اور اس کے اپنے مزاج کے اظہار کے لئے گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ ایک ردعمل ہے۔ زندگی اور ادب کے مارکسی سماجی نظریے نے اب سے بیس سال پہلے سماجی شعور اور اقتصادی عوامل پر اتنا زور دیا تھا کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے کچھ کھو کر رہ گیا تھا۔ یہ صرف ہمارے برصغیر میں نہیں ہوا بلکہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی یہی ہوتا رہا۔ یہ نظریہ اس اعتبار سے بہت قابل قدر تھا کہ اس نے ہم کو ہماری بڑھی ہوئی انفرادیت کے گورکھ دھندے سے نکالا اور ہمارے اندر اجتماعی زندگی کا ایک واضح اور پائیدار شعور پیدا کیا۔ لیکن گذشتہ جنگ عظیم کے بعد کچھ ایسا محسوس ہونے

بلکہ صرف سماجی شعور پر اگر زور دیا جاتا رہا تو انسان من حیث الفرد محض مشین کا ایک پرزہ ہو کر رہ جائیگا اور اس کی فردیت ایک دم فنا ہو جائے گی اور اگر فردیت فنا ہو گئی تو تخلیق و اختراع کی قوت بھی مفقود ہو کر رہ جائے گی۔ اس احساس نے ہمارے اندر میکانکی مارکسیت اور بڑھتی ہوئی اجتماعیت کے خلاف ایک جذبہ پیدا کر دیا جو دیکھتے دیکھتے اتنا شدید ہو گیا کہ آج ہم زندگی اور ادب دونوں کو اپنی ذات اور اپنے شخصی شعور اور اپنی ذاتی زندگی کے داعیات اور مطالبات کی روشنی میں دیکھنے لگے. جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ملکی ادب میں کوئی ایسا میلان کارفرما نظر نہیں آتا جو ہمہ گیر ہو اور زندگی کی ہمہ سمتی اصلیت پر محیط ہو، اس وقت دنیا جس شکست و ریخت اور انتشار سے گزر رہی ہے، اس نے ہمارے فکر و عمل میں بھی ایک بحرانی کیفیت پیدا کر رکھی ہے اور ہم کچھ بوکھلائے ہوئے سے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں پہلے بھی ایسے دور آتے رہے ہیں لیکن پہلے لوگ شعوری طور پر اپنے دور کے بحران کا ایسا تیز احساس نہیں رکھتے تھے۔ وہ بحران کا جزو بن کر رہ جاتے تھے مگر آج ہم کو اپنے زمانے کے انتشار کا بہت تیز شعور بھی ہے جو ہم پر چھایا ہوا ہے۔ یہاں تک تو ہم کو اپنے دور کے ادیبوں کے ساتھ ہمدردی رہتی ہے لیکن اگر ادب نام ہے اپنے دور کی زندگی کے تخلیقی عکس کا تو یہی بات ہم کو نئی نسل کے ادیبوں میں نہیں ملتی یا خال خال ملتی ہے۔ آج کا ادب اپنے دور کے انتشار کو بھی صاف اور واضح طور پر پیش نہیں کر پا رہا ہے۔ ہمارے خیالات گڈمڈ ہیں اور ہمارے تمام فکری اور عملی حرکات و سکنات کچھ مجذوبانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت نئی نسل جن نظریات کا سہارا لے رہی ہے وہ اور بہت سے نظریات کی طرح مغرب سے مستعار ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ ایسا نہیں جو حقیقت شناسی، صفائی ذہن اور حسن اظہار کے ساتھ ہمارے ادب میں بھرپور جلوہ گر ہو۔ یعنی ہم صرف خلاء میں نظریات سے بحث کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اردو ادب کی کسی صنف میں کوئی نظریہ کامیابی کے ساتھ داخل ہو سکا ہے یا نہیں، لاشعور کے نظریے سے تو کسی نہ کسی حد تک ہمارا ادب مانوس ہو چکا ہے۔ شعور کی رو کی بھی کچھ ناقص مثالیں اردو ناولوں اور افسانوں میں ملتی ہیں، لیکن وجودیت تو ابھی تک محض وظیفہ لب ہے اور اردو ادب کی کسی صنف میں کوئی ایسا اکتساب نظر نہیں آتا جس کو ہم وجودیت کا نمائندہ کہیں۔

ان تمام نظریات میں کچھ نہ کچھ ایسے عناصر ملیں گے جو نئے ذہن کی تربیت میں صحت بخش ثابت ہو سکتے ہیں مگر ہم کو محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں کسی نظریہ کی کورانہ تقلید ہمارے شعور میں کوئی بگاڑ نہ پیدا کر دے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب کوئی نظریہ پہلی بار ہمارے سامنے آئے تو ہم تنقید اور تفحص سے کام لیں، اور یہ دیکھیں کہ وہ کس دور کی پیداوار ہے اور کن اسباب و عوامل کا نتیجہ ہے

اور اس میں کتنے عناصر ایسے ہیں جن کو آج بھی قبول کر لینا ہمارے لئے خیر و برکت کا سبب ہوگا جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم کو اردو ادب کی نئی نسل سے شکایت ہے یا ہم محض اعتراض کرنا چاہتے ہیں یا ہم اس نسل سے مایوس ہیں۔ نئی نسل اپنے حال میں مبتلا ہے۔ یہ حال بہت پیچیدہ ہے۔ جس زمانے اور جیسے ماحول سے اس وقت ہمارا معاشرہ گزر رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ انتشار و اختلال ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسے ادوار کی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ زندگی میں چاروں طرف سے طوفانی موجیں اٹھ رہی ہیں اور زندگی ایک بھنور ہو کر رہ گئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے یہ بھنور اتنا پیچ در پیچ نہیں ہوتا تھا اور اس کی جڑیں اتنی دور تک گہرائیوں میں نہیں ہوتی تھیں۔

ایسے ادوار نے بھی ادب پیدا کیا ہے اور یادگار ادب پیدا کیا ہے۔ وہ فن کوئی فن نہیں، وہ ادب کوئی ادب نہیں جو اپنے دور کے پورے عکس کا حامل نہ ہو۔ لیکن اگر ادب کو زندہ رہنا ہے تو اس میں مستقبل کی سمت کچھ اشارے بھی ہونا چاہئیں۔ اگر زندگی میں اضطراب و انتشار ہے تو ادب بھی اضطراب در آغوش اور انتشار بہ کنار ہوگا۔ ہم کو ادیبوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ اس حالت کو پیش کرتے وقت اظہار میں اضطراب یا انتشار نہ پیدا ہونے دیں اور توازن اور ٹھہراؤ اور وضاحت اور صفائی کے ساتھ صورت حال کو اس کے اصلی روپ میں پیش کریں تاکہ ابلاغ کا پورا پورا حق ادا ہو سکے۔

اس سلسلے میں ہم کو اس نسل سے بھی کچھ کہنا ہے جس نے اب سے بیس پچیس سال پہلے تربیت پائی ہے اور جس کا شعور دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک بالغ اور پختہ ہو چکا تھا اور جو اپنی تمام صلاحیتوں کو برعظیم کی تقسیم سے پہلے بروئے کار لا چکا تھا اس نسل میں وہ لوگ شامل ہیں جن کی عمریں اس وقت پچاس سے پچھتر سال تک ہیں۔ اس نسل میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو ہر حال میں قیادت اور سربراہی کے آرزومند ہوتے ہیں۔ یہ ہر نئے میلان اور ہر نئے نعرے کا اس لئے ساتھ دیتے ہیں کہ کہیں نوجوان ان کو قدامت پرست نہ سمجھیں اور وہ کہیں نئے کارواں کی گرد میں دب کر نہ رہ جائیں ان "سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنے والوں" کو کسی میلان یا کسی تحریک یا کسی نظریے سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ یہ پچھلے ذہن رکھنے والے زندگی کے کسی مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس وقت ہمارے سامنے ایسے کئی ارباب ہیں جو ادب کی دنیا میں غیر معروف نہیں ہیں اور جو اس وقت "جدیدیت" کا نعرہ لگانے والوں کے ساتھ ہیں۔ اور کبھی وجودیت کی حمایت کرتے ہیں۔ کبھی شعور کی رَو کی کبھی لاشعور کے علمبردار ہیں۔ کبھی سائنسی نظریہ ادب کے۔ حالانکہ انھوں نے ان میں سے نہ تو کسی ایک کا غائر مطالعہ کیا ہے اور نہ وہ اس پر غور و فکر کی استعداد رکھتے ہیں۔ ہم کو

دن یاد ہے جب کہ یہ لوگ کلاسیکی ادب یعنی متقدمین کے شعری اور نثری کارناموں پر سر دھنتے تھے،
جب ۱۹۳۶ء کے بعد زندگی کی مادی اصلیت پر زور دیا جانے لگا اور ادب کا سماجی اقتصادی نظریہ
ترقی پسند مصنفوں کی انجمن نے پیش کیا تو یہ لوگ اس ڈر سے کہ کہیں یہ سائے میں نہ پڑ جائیں ترقی پسندوں
کے ساتھ ہو گئے اور ان کی ہر افراط و تفریط کی تعریف کرنے لگے اور اسلاف کے تمام اکتسابات کو بے
قدر اور ناقابل لحاظ سمجھنے لگے۔ اور آج جب کہ ادب کا مارکسی نظریہ اپنا کام کر چکا ہے اور ترقی پسند تحریک
بے جان ہو کر رہ گئی ہے تو یہی نابالغ بڈھے "جدیدیت" کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کو
اپنے نام اور اپنی شہرت کی بقا کے لئے کوئی نہ کوئی نیا سہارا چاہئے۔ نوجوان نسل کو ہماری طرف سے
تنبیہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے چوکنے رہیں وہ کسی وقت بھی ان کا ساتھ چھوڑ کر ان کی مخالفت کر
سکتے ہیں۔ لیکن اسی پرانی نسل میں کچھ دوسرے قسم کے لوگ بھی ہیں جو نئی نسل کے جملہ حرکات و
سکنات اور ان کے نظریات اور تخلیقات سے اپنے کو بہت اجنبی پاتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ مخلص ہیں اور
ان کی فکری مجبوریوں کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ نئی نسل سے کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ
اس کے بدلے ہوئے انداز کو سمجھنے سے قدرتی طور پر قاصر ہیں۔ ان کو ہم یہ اطمینان دلانا چاہتے ہیں
کہ نئی نسل کا مستقبل اتنا اندیشہ ناک نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھ رہے ہیں۔ نئی نسل زندگی کے نئے
راستوں کو ٹٹول رہی ہے اور اس کے لئے نئے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے پرانی ڈگر سے
ہٹ کر طرح طرح کے خطرات سے دوچار ہونے کے لئے تیار ہے۔ اس کو سیدھی سی مثال سے
بڑی آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے اور یہ باپ اور بالغ اولاد کی مثال ہے۔ بالغ اولاد سے یہ
توقع اپنی جگہ برحق ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر نئی منزل پر اپنے بزرگوں کی یاد اور ان کا احترام قائم
رکھے گی اور خود بالغ اولاد کے حق میں یہ ضروری ہے اس لئے کہ اسلاف کی کمائی اس کے لئے زادِ راہ
کا حکم رکھتی ہے۔ نئی نسل زندگی کی نئی منزلوں پر جو کچھ بھی حاصل کرتی جائے۔ اسلاف جو کچھ حاصل کر
چکے ہیں اس سے کبھی بھی بے نیاز یا بے تعلق نہیں ہوا جا سکتا۔ زندگی اور زندگی کے جملہ اکتسابات
ایک تاریخی تسلسل رکھتے ہیں۔ ایک بہت بڑے باعمل مفکر کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ "ہم کو اپنے
اسلاف کی تقلید تو نہیں کرنا ہے لیکن ان کے اکتسابات کی مثالوں کو سامنے رکھ کر ان سے بہت کچھ سیکھنا
ہے۔ اور زندگی کے نئے مراحل کو طے کرنے میں ان سے کام لینا ہے۔" ٹینی سن (TENNYSON) کا یہ
قول کہنہ بھی ہمارے لئے شمع راہ بن سکتا ہے:

LET KNOWLEDGE GROW FROM MORE TO MORE

BUT MORE OF REVERENCE IN US DWELL

نئی تخلیقات اور نئے اختراعات کے لئے ماضی کے کارناموں کا تاریخی احترام ضروری ہے۔
بہر حال روئے سخن دراصل پرانی نسل کے لوگوں کی طرف ہے۔ اولاد کا کیا فرض ہے یہ بتا دیا گیا
لیکن فرض یک طرفہ نہیں ہے آباؤ اجداد کا بھی کچھ فرض ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ ہر قدم پر اپنے
نوجوان حریف یا مقابل نہ سمجھیں، اور وہ نوجوانوں کے نئے اقدام سے وہ غیر مطمئن یا اندیشہ ناک
جس قدر بھی ہوں ان کی بہترین دعائیں اور نیک خواہشیں نوجوانوں کے ساتھ بہر حال ہونا چاہئیں۔
نوجوان نئی منزلوں کی تلاش میں نئے راستوں پر ٹھوکریں بھی کھائیں گے ۔۔۔ لڑکھڑائیں گے بھی،
گریں گے بھی، لیکن ان کے اندر صالح توانائیاں ہیں تو وہ گرتے پڑتے بالآخر سنبھل جائیں گے
اور سنبھل کر کوئی نہ کوئی صحیح اور راستہ نکال لیں گے۔

اس نکتہ کو ہم ایک تمثیل سے سمجھانا چاہتے ہیں۔ یہ تمثیل C. D. LEWIS کی کتاب
A HOPE FOR POETRY سے لی گئی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی اور
ہماری صدی کی پانچویں دہائی تک اس کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ تمثیل یہ ہے:

کسی گھر کا نوجوان بیٹا اپنے والدین کی سخت گیری اور اپنے موروثی کھیتوں
میں پرانے تھکا دینے والے ڈھرے پر مسلسل کام کرتے کرتے عاجز ہو جاتا
ہے اس کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ نہ صرف خود اس کو اور اس کے ماں
باپ کو کچھ عرصہ تک آرام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ کھیتوں کو بھی کچھ مہلت
دینا چاہئے تاکہ وہ دم لے کر اپنے اندر روئیدگی اور بالیدگی کی نئی توانائیاں
پیدا کر سکیں۔ اس خیال سے وہ کچھ پونجی لے کر اور رخت سفر باندھ کر دور
دراز سفر پر چل پڑتا ہے والدین اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتے
ہیں اور پھر اس کا غم لے کر بیٹھ رہتے ہیں۔ کچھ پڑوسی ماں باپ کے ساتھ واقعی
انس رکھتے ہیں اور ان کے غم میں شریک رہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ایسوں
کی ہے کہ جو ہمدردی کے پردے میں طعن وتشنیع اور طنز وتضحیک کا اظہار
کرتے ہیں۔ والدین کے کانوں میں طرح طرح کی افواہیں پڑتی رہتی ہیں جو زیادہ
تر مایوس کرنے والی ہوتی ہیں۔ کبھی سننے میں آتا ہے کہ بیٹا سمندر پار چلا گیا
ہے۔ کبھی خبر آتی ہے کہ وہ بیابانی غول کے ہاتھوں میں پڑ گیا ہے جو اس کو

تباہ کر رہے ہیں۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلاں ملک میں اوباش دوستوں اور آوارہ عورتوں کی محبت میں اپنی ساری پونجی گنوا چکا ہے اور ٹکڑوں اور چیتھڑوں کو محتاج ہے۔ کبھی سنائی دیتا کہ وہ ایک ایسے ملک میں پہنچ گیا ہے جہاں وہ اپنی زبان بھی بھول گیا ہے اور اپنے ماں باپ کے ننگ و ناموس کو خاک میں ملا رہا ہے۔ کبھی اطلاع ملتی کہ وہ ایک سنسان ریگستان میں سرگرداں مارا مارا پھر تا رہا اور بالآخر پاگل ہو گیا۔ اور کبھی خبر پہنچتی ہے کہ وہ کب کا مر چکا ہے۔ وطن میں اس کے خلاف طرح طرح پہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ ایک اس کا باپ ہے جو عفو در گزر کا جذبہ لئے ہوئے خاموش مسکرا تا رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کو یقین ہے کہ یہ سب افواہیں غلط ہے۔ اس کا بیٹا ناکارہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یکایک اس کا نوجوان بیٹا وطن واپس آجاتا ہے۔ فلاکت زدہ اور بے حال نہیں بلکہ ہر لحاظ سے تندرست، مالدار اور پہلے سے کہیں زیادہ عقلمند اور تجربہ کار۔ وہ بتاتا ہے کہ وطن سے بہت دور فلاں ملک میں ہزاروں ایکڑ زمین اس کے زیر کاشت رہی، اس کے بینک میں ایک معتدبہ رقم جمع ہے اس نے شادی بھی کر لی ہے اور اس کے خوبصورت اور تندرست بچے بھی ہیں۔ والدین کہتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ یقین تھا کہ ان کا بیٹا کارِ نمایاں کر کے آئے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ والدین کے لاشعور میں اپنے بیٹے کے سامنے کچھ کمتری کا بھی احساس ہے۔

تو شاید نوجوان نسل اپنی تمام سرگردانیوں اور پریشانیوں، اپنی تمام ٹھوکروں اور بدراہیوں کے بعد کچھ نہ کچھ نئی یافت لے کر آئیں گی جو اسلاف کے اکتسابات پر اضافہ ہوگی، اس کا ہم کو یقین ہے۔

"میں اوائل عمر سے یہ یقین رکھتا تھا کہ زندگی نام ہے تاریخ کا، اور تاریخ کی رفتار کی تدریجی اور ارتقائی ہے۔ اس میں کلاسیکی، رومانی، انقلابی سبھی منزلیں آتی ہیں اور تمام منزلوں سے گزرے بغیر ترقی کا کوئی صحیح تصور قایم نہیں ہو سکتا۔" □

سید سبطِ حسن

مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں

جدید اردو ادب میں مجنوںؔ صاحب کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ میری دو چار سطروں سے نہ بڑھے گا نہ کم ہوگا۔ البتہ مجنوںؔ صاحب کی عظمت کا اعتراف بڑا خوش گوار فریضہ ہے، جو مجھ پر مدت سے فرض تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ ان کی قاموسی شخصیت اور دلکش تحریروں پر کچھ لکھوں، لیکن ہر بار مجنوں صاحب کے دوست اور اپنے استاد پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کی یہ نصیحت مانع ہوئی کہ کسی صاحبِ قلم پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کی تمام تصنیفات کو سلسلے وار ضرور پڑھ لینا چاہیئے تاکہ تم مصنف کے ذہنی ارتقا سے واقف ہو سکو اور اس کے فکر و فن کا جو نقش تمہارے ذہن میں ابھرے وہ حقائق پر مبنی ہو۔ افسوس ہے کہ اس نصیحت پر عمل کرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ یوں تو مجنوں صاحب کی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، تنقیدی مضامین وغیرہ میں آٹھویں جماعت سے پڑھ رہا ہوں، مگر زندگی کی مصروفیتوں یا یوں کہیئے کہ میری پریشاں خیالیوں نے کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ ان کی کتابیں باقاعدہ ترتیب سے پڑھتا۔ اور اب تو اتنے دن بیت گئے ہیں کہ ذہن میں چند تاثرات محفوظ رہ گئے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ مجنوںؔ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں ان کا ایک پرانا نیاز مند شاملِ حال باجے کی طرح شریک ہے۔

ادیب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تحریریں پڑھ کر ادب ہی سے چڑ ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو ہم میں زندگی کی مضطرب حقیقتوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے جمالیاتی ذوق کو نکھارتے ہیں اور ہم میں ادیب بننے کا شوق تیز کرتے ہیں۔ مجنوںؔ صاحب ایسے ہی ادیب گر ادیب ہیں۔ نہ جانے کتنے صاحب نظر ہوں گے جن کے جمالیاتی ذوق کو مجنوں صاحب نے جلا بخشی ہے۔ نئی نسل کا حال تو مجھے نہیں معلوم البتہ ہماری نسل کا شاید ہی کوئی ادیب ہو جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے مجنوںؔ صاحب سے کچھ نہیں سیکھا۔

ہماری طالب علمی کے زمانے میں مجنوںؔ صاحب کی کہانیاں نگار اور ایوانؔ میں شائع ہوتی تھیں

ان کہانیوں کو ہم لوگ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ان میں حقیقت اور رومان کا ایسا دلکش امتزاج ہوتا تھا کہ اشتی جوانیاں جذبات کے طوفان میں بہنے لگتی تھیں۔ ان کہانیوں کے کردار اور ماحول عموماً دیہاتی ہوتے۔ اور جن لوگوں نے بستی گورکھپور یا پوربی یوپی کے دیہات دیکھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مجنوں صاحب نے وہاں کے درمیانہ طبقے کے رہن سہن اور مسایل زیست کی بڑی سچی تصویر کھینچی تھی۔ مجھ کو کہ پوربی بھی ہوں، دیہاتی بھی۔ مجنوں صاحب کی ہر کہانی اپنے دیس، اپنے گاؤں بلکہ اپنے گھر کی کہانی نظر آئی۔ اس وقت تک عشق کا ذاتی تجربہ تو نہیں ہوا تھا لیکن ان کہانیوں کو پڑھ کر دل میں ٹیس ضرور اٹھتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش ہم کو بھی عشق ہو جائے۔ اور ہم بھی غم کی ان لذتوں سے آشنا ہوں جو مجنوں صاحب کی کہانیوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ بہت بعد میں پتہ چلا کہ ان کے بعض افسانے ٹامس ہارڈی کے ناولوں سے ماخوذ تھے۔ مگر ہارڈی کے ناول پڑھنے کے بعد بھی مجنوں صاحب کا فنی مرتبہ کم نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ ہمیں نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے کہیں زیادہ دل آویز نظر آیا۔

کالج ہی کے زمانے میں ہم نے ایک مضمون مجنوں صاحب کو ایوان کے لئے بھیجا۔ موضوع ادبی تھا، یا فلسفیانہ، اب یاد نہیں۔ البتہ اپنے خیال میں ہم نے اس مضمون میں انشا پردازی کا عرشِ اعظم چھو لیا تھا، اور ہمیں یقین تھا کہ مجنوں صاحب اس مضمون کو اپنے رسالے میں بہت نمایاں جگہ دیں گے مگر دو تین ہفتے کے بعد مضمون واپس آگیا۔ مجنوں صاحب نے اخلاقاً تالیف قلب کے لئے ایک دو فقرے تعریف کے لکھ دیئے تھے۔ ہم نے اس سند ہی کو غنیمت جانا مگر ایوان میں مضمون بھیجنے کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی۔

ہر شخص اپنے صورت ناآشنا ہیرو کا کوئی نہ کوئی ذہنی خاکہ ضرور بناتا ہے۔ چنانچہ مجنوں صاحب کی تحریریں پڑھ کر ہم نے بھی ان کا ایک ذہنی خاکہ بنایا تھا۔ لیکن اس خاکے کو ان کے فوٹو نے غارت کر دیا۔ یہ فوٹو ان کے افسانوں کے ایک مجموعے غالباً خواب و خیال میں شایع ہوا تھا۔ اس میں مجنوں صاحب کی فوٹو کے نیچے میر صاحب کا مصرعہ درج تھا کہ

مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہو گا

مجنوں صاحب کی ذات و صفات کی تشخیص شاید اس سے زیادہ موزوں الفاظ میں کہیں نہ ملے۔ مجنوں صاحب اس تصویر میں کرسی پر نہ بیٹھے ہوتے، اور اگر انھوں نے یہ تصویر شیروانی اور چوڑی مہری کا پاجامہ پہن کر کھنچوانے کے بجائے کسی ویرانے میں لنگوٹی باندھ کر کھنچوائی ہوتی تو ہر شخص یہی سمجھتا کہ یہ تصویر لیلائے نجد کے عاشقِ نامراد میاں مجنوں ہی کی ہے۔ رہی عاشقی سو مجنوں صاحب

گزشتہ آدھی صدی سے لیلائے ادب سے اپنی محبت کو جس وفاداری سے نباہ رہے ہیں اس سے دنیا واقف ہے۔ مجنوں صاحب یقین مانئے جوانی میں بھی اتنے ہی موٹے تازے اور ملیم شحیم تھے جتنے آج ہیں انھوں نے اپنی نازک بدنی پر دولت و ثروت کی چربی کبھی چڑھنے نہیں دی۔

مگر صاحب جب میں مجنوں صاحب سے پہلی بار ۱۹۳۵ء میں ملا تو اندازہ ہوا کہ اس دھان پان شخص میں کس بلا کی توانائی پوشیدہ ہے۔ مجنوں صاحب نے صبح نو بجے بولنا شروع کیا اور شام کے چھ بجے تک لگاتار بولتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ نو آموز کو ایک ہی نشست میں فلسفہ اور جمالیات سب کچھ گھول کر پلادیں گے کس قیامت کی قوتِ گویائی تھی کہ علم و فضیلت کا چڑھتا دریا نطق و لب کی روانی کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ واپس آتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے جو مجھ کو ملانے لے گئے تھے، مجنوں صاحب کی عالمانہ گفتگو کا ذکر کیا تو وہ بولے خیر گزری کہ مجنوں صاحب سقراط کے زمانے میں نہیں ہوئے ورنہ ان حضرت کو بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ میں نے پوچھا کیوں؟۔ مگر وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہنے لگے۔ مجنوں صاحب کی باتیں سُن کر تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سقراط پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام فقط بہانہ تھا۔ ایتھنز والے دراصل سقراط کی دن رات کی کج بحثیوں سے عاجز آگئے تھے تمہیں بتاؤ آخر کوئی کہاں تک ہر وقت حُسن کیا ہے، عشق کیا ہے، نیکی کیا ہے؟ خیر و شر کس کو کہتے ہیں۔ عدل اور انصاف کی تعریف کیا ہے، یہ لکچر سنتا رہے۔ لیکن ہمارے دوست شاید سقراط کی زندگی سے آگاہ نہ تھے اور نہ انھوں نے مجنوں صاحب کی باتیں غور سے سنی تھیں۔ کیوں کہ نہ سقراط زاہد خشک تھا اور نہ مجنوں صاحب ہیں۔ اب تو خیر اسد اللہ خاں کو کچھ زمانے نے اور کچھ قویٰ کے اضمحلال نے اس قابل ہی نہیں رکھا۔ لیکن بے تکلف دوستوں کی مجلس ہوتی اور کیف و مستی کا ماحول تو مجنوں صاحب کی گل فشانی گفتار سے ساری محفل جھکنے لگتی تھی۔

مجنوں صاحب کے دور سے پہلے تنقید نگاری کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے بزرگ نقاد مثلاً آزاد، حالی اور شبلی مغربی علوم و ادبیات سے قریب قریب ناواقف تھے۔ مجنوں صاحب اردو، فارسی اور عربی ادب پر تو عبور رکھتے ہی ہیں، وہ مغربی علوم و ادب پر بھی پوری طرح حاوی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کالج میں وہ انگریزی ادب ہی پڑھایا کرتے تھے۔ مجنوں صاحب اور ان کے ہم عصر نقادوں نے تنقید نگاری کے میدان میں جو اضافے کئے جو نئی راہیں نکالیں اُن پر تو کوئی سکہ بند نقاد ہی تبصرہ کر سکتا ہے۔ ہم تو فقط اتنا جانتے ہیں کہ مجنوں صاحب ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں۔ بلکہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز سے پہلے بھی وہ زندگی اور

ادب کی ترقی پسند اقدار ہی کی ترجمانی کرتے تھے۔ ترقی پسند ادب کے اصول و نظریات کا تعین کرنے والوں میں مجنوں صاحب کا نام سر فہرست ہے۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ مجنوں صاحب نے اپنے ترقی پسندانہ مسلک سے کبھی انحراف نہیں کیا اور نہ اپنے فلسفۂ زیست کو کبھی مصلحتوں کے قالب میں ڈھالا۔ وہ پہلے بھی ترقی پسند تھے اور آج بھی ترقی پسند ہیں، کہ ترقی پسندی ان کی سرشت بھی ہے اور ان کا ضمیر بھی۔ ہر چند کہ پچھلے پچاس برسوں میں دنیا میں بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں، خود ترقی پسند ادب کی تحریک بہت سے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ مجنوں صاحب کے بعض ہمسفروں اور ہم صفیروں نے پٹری بھی بدل لی ہے یا تھک کر بیٹھ رہے ہیں مگر یہ پیر جواں فکر آج بھی اپنے قلم کی پاک دامانی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ وہ قلم جس نے ہماری کئی نسلوں کو ادب کا پاکیزہ شعور عطا کیا، وہ قلم جو حسن صداقت کی علامت بھی ہے اور مردانِ حق پرست کے لئے مشعل زاہ بھی۔ یہ قلم سدا سلامت رہے اور مجنوں صاحب کی نازک انگلیاں اس کے بوجھ سے کبھی نہ تھکیں۔

مجنوں صاحب جنگ آزادی کے پرانے سپاہی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ حب بشر کے گیت گائے ہیں اور جمہوریت، سماجی انصاف اور امن کی قوتوں کا ساتھ دیا ہے وہ ادب کی خدمت کو ایک سماجی فریضہ اور ادیب کو سماج کا الوٹ انگ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ادیب سماج سے وابستہ رہ کر، اس کی خواہشوں اور خوشیوں میں شریک ہو کر، اس کے دکھ درد کی آواز بن کر ہی جان دار اور با مقصد ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ □

فراق گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری

بات ہے غالباً ۱۹۱۹ء کی ، برسات کا زمانہ تھا۔ گورکھپور میں کچھ لوگوں نے گورکھپور بینک کی عالیشان عمارت میں صبح کے وقت کسی چھٹی کے دن ایک مشاعرہ کیا۔ میری کائناتِ شاعری اس وقت تک شاید ڈیڑھ دوسو ابتدائی اشعار تک محدود تھی۔ مشاعرے میں میں نے بھی غزل پڑھی اور منجملہ دیگر اصحاب کے ایک عددر بہ دبلے پتلے نوجوان نے بھی غزل پڑھی جس کی عمر بہ مشکل سولہ برس کی ہوگی۔ نہایت پرتکلف شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ، ترکی ٹوپی ۔ یہ تھی اس نوجوان کی پوشاک ۔ کھلتا ہوا گورا رنگ، چہرے پر چیچک کے کچھ داغ ،کشادہ پیشانی اور آنکھوں میں کسی قدر چمک ۔ جسم کی انتہائی لاغری کے ساتھ پورے جسم اور مختلف اعضار میں ایک طرح کا برقی چنچل پن ۔ اس سب پر طرّہ یہ کہ ہر امر میں انتہائی خوداعتمادی ہونٹ کسی قدر موٹے ، لیکن ہرگز ناموزوں نہیں ۔ ان پر پان کا لاکھا ۔ کچھ کچھ نکلتی ہوئی مونچھیں ، سر کے بال بہت ہلکے اور کچھ کچھ بڑھے ہوئے ۔ ہلکے سے میری مراد ہلکے رنگ سے ہے یعنی بالوں کے رنگ میں تین حصّہ دبی ہوئی سیاہی اور ایک حصّہ اس میں ملی ہوئی سرخی بیٹھنے میں کسی قدر لمبی اور بہت ہی پتلی گردن ، مستقل طور پر داہنے طرف کو جھکی ہوئی ۔ ایک سپاٹ انداز میں اس نوجوان نے پوری غزل سنائی ۔ غزل کا یہ حال کہ شاید ہی کوئی ایسا مصرع رہا ہو جس میں چار اضافتوں سے کم کی ترکیبیں ہوں ـــــ غلطی یا کچا پن یا کم مشقی کسی شعر میں بھی نہیں ۔ ہر شعر سے ذہانت نمایاں اور شاعرانہ کاریگری بھی پوری چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر تھی ۔ البتہ سوزوگداز تاثیر اس غزل کی صفتیں نہ تھیں ۔ بہرحال اس دبلی پتلی کم سن شخصیت کو جو ہر لحاظ سے محسن معلوم ہوتی تھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ اور یہ چرچا مشاعرے میں ہونے لگا کہ یہ نوجوان شاعر شہر گورکھپور کی جانی بوجھی ہوئی ہستی فاروقی صاحب کا فرزند اکبر ہے ۔ اور غالباً ہائی اسکول میں پڑھتا ہے ۔

دن گزرتے گئے ۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں آئی سی ایس اور پی سی ایس دونوں سے

مستعفی ہوکر میں ڈیڑھ برس کی قید فرنگ بھی کاٹ آیا۔ جیل سے نکل کر جب گورکھپور آیا تو فاروقی صاحب نے میرے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک بڑی شاندار دعوت دی۔ اس بار اس چھوٹی سی محبت میں یہ نوجوان شاعر ہم لوگوں کو پھر ملا۔ اور دعوت کے بعد شعروشاعری کا چرچا شروع ہوگیا۔ جب استادوں اور ان کی اصلاحوں کا ذکر ہورہا تھا تو بیچ میں یہ نوجوان بول اٹھا کہ "میں اصلاح کے سخت خلاف ہوں۔" ہم سب نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں؟" تو اس نے معاًجواب دیا کہ "اصلاح سے شعر دوغلا ہوجاتا ہے۔" بات آئی گئی ہوگئی۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد میں شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں گیا ہوا تھا۔ اور اس عزیز کے مکان کے سامنے پھاٹک پہ میں کھڑا تھا کہ یہ نوجوان بھی سامنے ہی نظر آیا۔ کیوں کہ فاروق صاحب کا گھر بھی یہاں سے بہت قریب تھا۔ میں مزاج کا بہت زود آشنا واقع ہوا ہوں۔ اس لئے فوراً میں نے مجنوں گورکھپوری کو (یہ نوجوان مجنوں گورکھپوری تھا) اپنے مکان پر روز تیسرے پہر آنے کی مستقل دعوت دے دی۔ میرے گھر اس سے پہلے کبھی چائے نہیں بنی تھی۔ مجنوں بچپن سے ہی چائے کے شوقین تھے۔ اور اب ہمارے گھر والوں کے لئے بھی چائے ایک جزو بن گئی۔ فاروق صاحب کے ایما سے مجنوں انٹرنس پاس کرکے اپنے والد کی ایک بہت بڑی دکان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس امر کا اظہار مجنوں کی پختہ دماغی کا روشن ثبوت ہے کہ میں نے ان ملاقاتوں میں پل بھر کو یہ محسوس نہیں کیا کہ شاعری اور ادب، سائنس اور فلسفہ اور فنون لطیفہ کے نازک سے نازک نکات کو سمجھنے میں اور ان امور پر خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو کرنے میں یہ نوجوان مجھ سے کسی طرح سے کم ہے۔ پھر ایک دوسرے کو میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، ریاضؔ اور کچھ فارسی شعراء کا کلام جو مجھے کم یاد تھا لیکن مجنوں کو بہت یاد تھا ہم دیر دیر تک سناتے تھے آسیؔ غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے۔ جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کانپور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہوگیا۔ اور مجنوں بی۔ اے پاس کرچکے تھے گورکھپور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہوکر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں ہم دونوں اب تک اس حسن اتفاق پہ حیرت کرتے ہیں۔

پھر یورپ کی فلاسفی اور انگریزی ادب اور مذہب کی ماہیت اور کبھی کبھی سیاسی امور

پر بھی باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ شاید میں اور مجنوں ۱۹۲۳ء کے ان چند مہینوں کو اپنی زندگی کا بہترین زمانہ سمجھتے ہیں۔ آپکو یہ بات دلا دلاکر پھر حیرت میں ڈال دوں کہ مجھ سے آٹھ برس چھوٹے ہوتے ہوئے اور رسمی تعلیم میں اتنا فرق ہوتے ہوئے یہ محض انٹرنس پاس نوجوان علمی میدان میں جو میرے دوش بدوش چلتا رہا تو اس کی وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ عربی کی اچھی خاصی تعلیم اور فارسی کی بہت بلند اور مکمل تعلیم یہ نوجوان لڑکپن ہی میں حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اسکول میں خواہ اس کا درجہ دسواں ہی کیوں نہ ہو، اس کا دماغ ایک بہت پڑھا لکھا دماغ بن چکا تھا۔ فردوسی، عرفی، بیدل اور دیگر فارسی شعرا کے کلام کے حساس مطالعہ نے مجنوں کے دل و دماغ پر جلا کر دی تھی۔

۱۹۲۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گورکھپور سے مستقل طور پر مجھے آل انڈیا کانگریس کے انڈر سکریٹری کے منصب پر بلا لیا۔ کچھ دنوں مجنوں بھی اپنے گھر والوں کی رضامندی سے میرے پاس الہ آباد چلے آئے اور یہاں کے کرسچین کالج میں نام لکھا کر میرے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ہم دونوں نے قریب قریب اسے معمول بنا لیا کہ شام کو سینما ضرور دیکھیں کیوں کہ کانگریس آفس کے اوپر جس مکان میں ہم دونوں رہتے تھے موتی محل سینما اس سے بہت قریب تھا۔ کبھی کبھی دوسرے سینما گھروں میں بھی ہم لوگ جاتے تھے۔

مجنوں نے کرسچین کالج میں سائنس کے مضامین لئے تھے۔ ان کے والد فاروق صاحب کو ریاضی اور سائنس کی دوسری شاخوں پر غیر معمولی عبور تھا۔ اور مجنوں بھی ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ سائنس کے بہت اچھے طالب علم تھے۔ الہ آباد میں میرے ساتھ قیام کے دوران میں ایک بار ایسا ہوا کہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں سے آسکر وائلڈ کا ڈرامہ SALOME اٹھا لایا۔ اور ٹالسٹائے کے ڈرامے بھی اٹھا لایا میرے پڑھ چکنے کے بعد سرسری طور سے دونوں کتابیں مجنوں بھی دیکھ گئے اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ، لیکن نہایت نپے تلے انداز میں SALOME کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ اور ٹالسٹائی کے ڈرامہ ـــــ کا اردو ترجمہ ابو لطرز (پہلا کلوار) کے نام سے کر ڈالا۔ مجنوں کے پاس انھیں چھپوانے کے لئے روپے نہ تھے۔ میرے پاس کچھ فالتو روپے تھے۔ جس سے یہ دونوں کتابیں بہت جلد چھپ گئیں۔ جب مجنوں کے پاس روپے ہوئے تو بغیر کسی یاد دہانی کے انھوں نے میرے روپے واپس کر دیئے۔ مجنوں میں جہاں بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں ہیں۔ وہاں ایک غیر معمولی صلاحیت یہ بھی ہے کہ انگریزی الفاظ اور انگریزی فقروں کا نہایت برجستہ اور صحیح ترجمہ وہ کر سکتے ہیں۔ مجنوں کی عمر ابھی مشکل سے انیس برس کی

ہوگی۔ اور میں اس امر کا تصور نہیں کر سکتا کہ انیس برس کا لڑکا انگریزی شاعری انگریزی نثر، سائنس اور فلسفہ اور جمالیات اور دیگر علوم کی انگریزی اصطلاحوں کا اتنا تیز بہدف ترجمہ کر دے کہ آنکھیں کھل جائیں۔

قیام الہ آباد کے اس دوران میں، میں اور مجنوں نئی کتابوں، فلسفے کے نئے مدرسوں، مذہب کے گہرے نکات اور اس دور کے اردو ادب پر جی کھول کر باتیں کیا کرتے تھے۔ انیس بیس برس کی عمر ہی میں وہ درجن بھر عشق کر چکے تھے۔ اچھی سے اچھی شراب پی چکے تھے۔ ایک ایک رات میں صرف یک شبا نا محبت کی تکمیل میں محبوب کو نذر و نیاز، شراب اور شاندار دعوت کے سلسلے میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے اڑا چکے تھے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ایک نہیں آدھے تھیٹر کا لونڈا کتنا نڈر اور کس جیوٹ کا ہے۔ بدمعاشوں سے ان کو سابقے پڑ چکے تھے، اور بدمعاش شخص ان کے تیور سے سہم کر رہ گئے تھے۔

اب یہ بھی بتا دوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف اس لئے نہیں کھنچتے تھے کہ بنیادی طور پر ہم دونوں کا مزاج یکساں تھا، ہماری باہمی ہم آہنگی اور قربت اس وجہ سے تھی کہ مجنوں کی شخصیت میں غالب عنصر حساس عقلیت کا تھا۔ اور میرے اندر غالب عنصر ذہن کی روحانیت اور وہ وجدانیت تھی جو بعد کو میری شاعری میں نمایاں ہوئی۔ میں ان کی جچی تلی باتوں پر فریفتہ تھا اور وہ میری باتوں کی اشاریت اور رمزیت کے شیدائی تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ اصل بات یوں ہے کہ مجنوں کے مزاج کا فاعلی عنصر عقلیت ہے، لیکن ان کے مزاج کا ایک انفعالی عنصر بھی ہے جو وجدانیات و جمالیات کا شدید احساس کرتا ہے۔ مجنوں کے مزاج کا یہ عنصر یا اس کی یہ رگ بہت حساس ہے۔ اسی سے وہ خود تو کیف یا سوز و ساز میں ڈوبے ہوئے اشعار نہیں کہتے۔ لیکن ایسے اشعار کو سن کر ان پر حال و قال کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میری شاعری میں غالباً وجدانی عنصر غالب ہے۔

الہ آباد میں مجنوں کا قیام زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا۔ وہ سخت بیمار پڑ گئے اور مستقل طور پر کرسچین کالج کو چھوڑ کر پھر گورکھپور واپس چلے آئے۔ تین برس تک میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اپنے منصب پر اس کے بعد کام کرتا رہا۔ اس دوران میں مجنوں نے گورکھپور میں "ایوان اشاعت" قائم کر لیا۔ اور رسالہ "ایوان" کا اجرا کیا۔ ان کے ادبی کارناموں کی تخلیق اب باقاعدہ شروع ہوگئی۔ افسانے ناول بصیرت افروز تنقیدی مضامین، فلسفیانہ اور علمی تصنیفات، طویل اور ادبی بحثیں، کبھی کبھی نہایت

بچی تلی شاعری، نظموں اور غزلوں کی شکل میں ان تمام میدانوں کو انھوں نے اپنی فکر اور تخلیقی قوت کی جولا نگاہ بنالیا۔ یہ تین چار برس کا زمانہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے اپجاؤ زمانہ رہا ہے، جو بعد کو بھی کئی برس تک رہ رہ کر ان سے بہت قابل قدر چیزیں لکھواتا رہا اور جو اس وقت تک قایم رہا۔ جب تک وہ "ایوان" نکالتے رہے SALOME اور ابوالمز کے بعد برنارڈ شا کے مشہور ناٹک "بیک ٹومیتھ سلا" —— سے ماخوذ "آغاز ہستی" افسانوں کے دو مجموعے "سمن پوش" اور "خواب و خیال" کئی برس پہلے کی تصنیف "زیدی کا حشر" نیا ناول "سوگوارِ شباب" بلند فلسفیانہ مقالہ "شوپنہار" "تاریخ جمالیات" "مریم مجدلین" بائرن کے منظوم ڈرامہ "کین" کا ترجمہ "قابیل" کے نام سے اور ان کے علاوہ سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی نہایت تربیت یافتہ تحریریں، بہت سے ادبی اور تنقیدی تبصرے، دس بارہ برس کے اندر یہ تمام پرمغز، ٹھوس یادگار تصنیفیں مجنوں نے اردو دنیا کو دی ہیں۔

میں مجنوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ "تمھارے افسانوں میں بسا اوقات زمانہ کے خلاف ایک جھلاہٹ کا عنصر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ پریم چند کے افسانوں کا سوز و گداز اپنے افسانوی ادب میں پیدا کرو۔ اور ہندوستانی زندگی کی ناقابل فراموش سچی مصوری سے اپنے افسانوں کو سدا بہار بنا دو" میری تجویز کا بیج ایک زرخیز زمین میں دفن ہوا اور "سوگوار شباب" نامی ناول کی شکل میں کچھ دنوں بعد بار آور ہوا۔ مجھے جاننے والوں میں بہتوں کو یہ نہیں معلوم کہ اب سے تیس برس پہلے چھ سات افسانے میں نے بھی لکھے تھے، لیکن یہ میدان مجھ سے بہت جلد چھوٹ گیا۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ ایک بار کئی دنوں کے لئے مجنوں اور پریم چند دونوں میرے مہمان رہے۔ ایک دن صبح کو جب ہم تینوں سو کر اٹھے تو میں نے کہا کہ بھائی ایک پلاٹ میرے ذہن میں آیا ہے۔ خود اپنی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اور ٹینی سن کے منظوم افسانہ "اینوک آرڈن" —— اور طامس ہارڈی کے ناول TESS سے متاثر ہو کر۔ آپ دونوں میں جو بھی چاہے اسے یہ پلاٹ نذر ہے۔ میں نے پلاٹ بیان کر دیا جو دونوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ پریم چند نے "آبھوشن" کے نام سے ہندی کا جامہ اسے پہنا دیا اور مجنوں نے یہ افسانہ "گنا" کے نام سے شایع کیا۔

مجنوں سے میری گفتگو جیسا کہ اب تک عرض کرتا آیا ہوں فلسفہ اور جمالیات کے موضوع پر نہایت انہماک سے اکثر ہوتی رہتی تھی۔ انھیں لمحوں کی تحریک سے غالباً مجنوں نے کچھ دنوں بعد "شوپنہار" اور "تاریخ جمالیات" دو کتابیں شائع کیں۔ مجنوں کے افسانوں سے جو ذرا سی مجھ میں ناآسودگی تھی، اس کی بنا پر ان سے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ خلاقانہ اور دیانت دارانہ تنقیدی مضامین بھی ہم لوگوں کو

ھنا چاہئیں ۔ میں تو ان دنوں خط و کتابت کے علاوہ نثر قریب قریب لکھتا ہی نہیں تھا، لیکن مجنوں نے دو تین مجموعے تنقیدی مضامین کے شایع کئے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ مجنوں نہایت محبت سے کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مجھے افسانوں کو چھوڑ کر تنقید کی طرف آنے کی ترغیب فراق نے دلائی۔ اس امر میں غالباً مجنوں کی نشو و نما میں میرا حصہ کچھ اسی طرح کا رہا ہے جیسے ورڈز ورتھ کی شاعری کی نشو و نما میں اس کے دوست کولرج کا حصہ رہا ہے ۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اور مجنوں علمی اور ادبی امور میں ہمیشہ یکساں ردِّ عمل ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً میر کے بارے میں تو ہم دونوں کا ردِّ عمل ایسا رہا ہے کہ ہمارے خیالات بالکل ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ لیکن میں سودا کی غزلوں کا بھی قایل رہا ہوں، مجنوں بالکل قایل نہیں رہے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اکثر مجھے چھیڑتے رہے ہیں کہ میاں تم سودا کو کیوں گھسیٹ لایا کرتے ہو۔ میں آتش کے کلام کے بہترین حصے پر مٹا ہوا ہوں۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ آتش کے بڑے اشعار میں اکثر دوسرا مصرع پہلے مصرعے سے کچھ کم حیثیت کا ہوتا ہے۔ مجھے لکھنؤ اسکول کی شاعری عام طور پر کم پسند ہے۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ دبستانِ دلی کی شاعری یکسر جذباتی ہے ۔ اور گوشت کے ایک ایسے لوتھڑے کے مانند ہے جس میں ہڈی نہ ہو۔ مجنوں کی عقلیت اس خارجیت کو مناسب خراج پیش کرتی ہے جو لکھنؤ شاعری میں ہمیں ملتی ہے ۔ حسرت کی شاعری کے ہم دونوں دلدادہ ہیں، لیکن اب میں مجنوں کی نسبت کسی قدر کم دلدادہ ہوں اصغر کی شاعری کو میں جس بلند لہجے میں سراہتا تھا، وہ مجنوں کے دل کو نہیں لگتی تھی ۔ اگرچہ اصغر کی شاعری کی خوبیوں کا انھیں بھی اعتراف ہے ۔ جوش کی شاعری میں جو زور و توانائی ہے اور جو رنگا رنگی ہے، میں اکثر اسے اچھا لتا رہتا ہوں ۔ لیکن مجنوں ذرا کم ہی قایل ہوتے رہے ہیں ۔ انگریزی شاعری پر رائے زنی میں مجنوں شیلے کے ہم پرواز ہیں۔ اور میں ورڈز ورتھ کا ہم رفتار ہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ رموزِ ادب کو چیر جانے والی ذہنیت رکھتے ہوئے بھی مجنوں ورڈز ورتھ کے قایل نہیں ہوئے شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ میں ہندو گھر میں پیدا ہوا اور مجنوں مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ۔ وہ مجرّد اور صنعتی تخیل سے متاثر ہوتے ہیں جس کی بہترین مثال شیلے ہے ۔ میں خاکی دنیا کی پاکی کا قایل ہوں اور سفر سے زیادہ وطن یعنی آفاق کی وطنیت کے تصور کی طرف کھنچتا ہوں۔ اسی سے وہ کیٹس کے مداح تو ضرور ہیں، لیکن معتقد اتنے نہیں ہیں اور میرا ردِّ عمل اعتقاد کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ مجنوں نے ایک نہایت بصیرت افروز اور متوازن کتابچہ اقبال پر لکھا تھا جو کئی برس پہلے شایع ہو چکا ہے۔ میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں ۔

میں اور مجنوں دونوں بہت دنوں تک لینن کی شخصیت اور اس کے کارناموں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں پاتے تھے۔ جب اس کی وجہ ہم لوگ بیان کرتے ہیں تو ہم دونوں مزے لے کر خوب ہنستے ہیں۔ ہم دونوں کو بہت دنوں تک لینن کی تصویر ناپسند تھی۔ خاص طور پر اس کی داڑھی کی تراش خراش۔ جب آدمی کا چہرہ پسند نہ آئے تو اس کا فلسفہ یا اس کے عمل کیوں کر پسند آئیں بعد کو یعنی ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہونے کے بعد ہی ہم دونوں کو اپنی اس دلچسپ حماقت کا احساس ہوا اور ہم دونوں لینن اور اشتراکیت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ پانے لگے۔

ہاں تو اب میں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا معلم ہو گیا تھا۔ اور اب تک اسی منصب پر ہوں۔ مجنوں انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کر کے سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور کے ایک باوقار پروفیسر رہ چکے تھے اور اس طرح اب ہم دونوں بہت حد تک ہم مذاق ہونے کے ساتھ ساتھ ہم پیشہ بھی ہو چکے تھے اور یہ رشتہ اب تک قایم ہے۔ میرے طریقۂ تعلیم اور مجنوں کے طرزِ درس میں کافی فرق ہے۔ میرا ذہن غالباً درس و تدریس میں خلاقانہ اور طبع زادانہ ہے۔ میں کسی ادبی سبق کو پڑھانے یا ادبی مسئلہ کو سلجھانے میں تجربات زندگی کی اصطلاح میں بے لاگ مسلسل تقریر کرتا چلا جاتا ہوں اور مناسب محسوسات کا اظہار اپنے لفظوں میں کرتا ہوں۔ مجنوں شاید اتنی تیزی سے اور بیک وقت اتنی باتیں سوچنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ عقلی منطقی اور لغوی مفہوم کو بہت باقاعدگی سے نپے تلے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں، لیکن ان کے لیکچر اور ان کے لکھائے ہوئے نوٹ ہوتے ہیں بہت کارگر اور عموماً تیر بہدف۔ بہت کوشش و انہماک کے ساتھ اور بہت مرکوز توجہ کے ساتھ وہ درجے کو ایسی باتیں بتاتے ہیں جن میں کوئی لفظ بدلا نہیں جا سکتا اور کوئی لفظ بڑھایا گھٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ حسابی کتابی تدریس بہت معلمانہ اور پر از معلومات ہوتی ہے۔ اس اندازِ تعلیم و تادیب میں اگرچہ کیف آوری کم ہوتی ہے۔ لیکن روکھا پھیکا پن بالکل نہیں ہوتا۔ مجنوں درجے میں کہنے کی باتیں پہلے سے سوچ کر مرتب کر لیتے ہیں۔ میری باتوں میں آمد زیادہ ہوتی ہے اور وہ گویا اپنے آپ کو خود مرتب کرتی جاتی ہیں۔ پورے کالج پر بلکہ کالج کے پورے اسٹاف پر بھی مجنوں کا ایک رعب رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے مجنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے تھے۔ میں نے مجنوں سے پوچھا کہ علی گڑھ سے چلے کیوں آئے اس کے جواب میں مجنوں نے بڑی مزے دار بات کہی۔ کہنے لگے کہ بھائی جہاں مسلمان ہی مسلمان رہتے ہوں، وہاں کسی کو پڑھنے لکھنے سے کیا غرض۔ اگر مجنوں

کا یہ کہنا غلط ہے تو یہ لطیفہ سنانے کا جواز میں یہی کہہ کر دے سکتا ہوں کہ "نقل کفر کفر نہ باشد۔"

مجنوں سے متعلق کچھ اور لطیفے پیش کرتا ہوں جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا یگانہ کی شاعری کے مداح میں اور مجنوں دونوں رہے ہیں۔ بلکہ مجنوں نے تو اپنی تحریروں میں کئی موقعوں پر جی کھول کر ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ مرزا یگانہ کو مجنوں نے گورکھپور کے مشاعرے میں بلایا اور ان کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مرزا یگانہ اپنا بہترین و بلند ترین دین اردو کو دے چکے تھے۔ اور اب بجائے یگانہ شاعری کے یگانہ آرٹ کے علمبردار ہو گئے تھے۔ جب مجنوں سے پوچھا گیا کہ یگانہ صاحب کے نئے کلام پر آپ کی کیا رائے ہے؟ تو مجنوں نے کہا کہ اب ان کی شاعری بھول کر رہ گئی ہے۔ پڑھنے والے اس فقرے کا مطلب جو چاہیں لگائیں۔

ایک بار ایک صاحب نے جو میرے اور مجنوں دونوں کے معتقد و مداح تھے میری اور مجنوں کی دعوت اپنے یہاں کی۔ مجنوں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن میرے اصرار سے راضی ہو گئے جب دعوت کھاکے ہم لوگ پلٹے تو مجنوں نے مجھ سے اچانک طور پر یہ کہا کہ "یہ باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔" میں نے پوچھا۔ کیا ہوا؟ کہنے لگے "تھرماس بالکل آج ہی خریدا گیا تھا، ہم لوگوں کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے۔" وہ کافی غصہ ہو کر رہے تھے۔ لیکن ہنسی کے مارے میرا برا حال ہو گیا۔

گورکھپور کے ایک نوعمر شاعر جنھیں خاص حلقوں میں کافی شہرت مل چکی تھی، اپنی نظموں کی فرضی محبوبہ کا جب جب ذکر کرتے تھے تو اس فرضی محبوبہ کے لئے صرف ایک لفظ استعمال کرتے تھے۔ وہ لفظ تھا محترمہ۔ مجنوں اس لفظ کی تکرار کے کچھ حد تک تو حامل ہو سکے۔ مگر بعد کو ان سے نہ رہا گیا کہنے لگے کہ اردو میں صرف "والدہ محترمہ" مستعمل ہے۔

یوں تو مجنوں نے شاعری شروع کر کے بہت جلد اسے ترک کر دیا لیکن ان کی نظر بہت تیز ہے۔ اردو کے ایک چوٹی کے شاعر نے انھیں اپنا یہ مطلع سنایا۔

اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے

مجنوں نے فوراً کہا کہ نرگسِ مستانہ یا نرگسِ دیوانہ نہیں ہوتی۔ شاعر مذکور کو اپنا مطلع بدلنا پڑا۔

حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کچھ موٹے تازے اور کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ ایک بار میں

نے مجنوں سے کہا کہ یار اصغر کے کئی اشعار میں بہت سوز و گداز ہے۔ مجنوں نے منہ بنا کر کہا کہ "سوز" ہو یا نہ ہو "گداز" ضرور ہے۔

مجنوں کے کچھ تنقیدی فقروں کی نوک پلک دیکھئے۔ مثلاً "غالب بڑا پاجی شاعر ہے۔" جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اس کی تقلید کی، وہ خراب ہو کر رہ گیا۔ "غزل ایک بہت کٹر صنفِ سخن ہے۔" کٹر کا لفظ دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ "حالی ماتھے پر بل ڈالے بغیر سلامت روی سے اپنی نثر لکھتے چلے جاتے ہیں۔" کس خوبی سے حالی کے مزاجِ نثر نگاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک بار میں شبلی کے مقابلے میں محمد حسین آزاد کی نثر نگاری کی حمایت کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بحث جاری رہنے کے بعد مجنوں نے کہا "آزاد نے لکھا ہی کیا ہے؟" کس خود اعتمادی سے مجنوں نے اپنی بات کہی۔

جاڑوں کے دن تھے۔ اسلامیہ کالج گورکھپور میں مجنوں کے اہتمام سے ایک مشاعرہ ہوا کئی شعراء مجنوں کے مہمان تھے۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ ذوقی جو اپنی ایکٹنگ اور نقالی کے لئے بہت مشہور و مقبول ہیں، وہ بھی تھے۔ بارہ بجے رات کے قریب مجنوں صاحب کے ساتھ اُن کے گھر ہم لوگ واپس آئے۔ اور سب لوگ ابھی بہت دیر جاگنے کے موڈ میں تھے۔ مجنوں صاحب کی لائبریری میں انگیٹھی جلوائی گئی۔ اندر سے چائے منگوائی گئی۔ اور ذوقی نے کئی زبانوں میں اپنی نقالی شروع کر دی۔ جس میں ایک زبان پشتو بھی تھی۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ پاس ہی مجنوں صاحب کا ہندو ملازم ستر برس کا چوکیدار لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ قہقہوں کا شور سن کے وہ چونک اٹھا اور کہنے لگا کہ "تم لوگ شور کرو۔ صبح جب مجنوں صاحب اٹھیں گے تو جو بادھوائی تم لوگوں نے مچا رکھی ہے اس کا مزا وہ تم لوگوں کو چکھا دیں گے۔" لطف یہ تھا کہ مجنوں صاحب سب سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ جس کی اس غریب کو خبر نہ تھی۔

میرے اور مجنوں کے درمیان کئی بار جھڑپیں بھی ہو گئیں ہیں۔ ایک بار جب مجنوں گورکھپور تھے اور میں الہ آباد، تو ڈاک پر بھی ہم لوگ ایک دوسرے سے خوب لڑے منہ سے لڑتے تو منہ تھک جاتا۔ لیکن دونوں کے قلم جلد نہ تھکے۔ اور خوب چلی کٹی ہم لوگ ایک دوسرے کو لکھتے رہے دونوں کا غصہ جتنا بڑھتا جاتا تھا، اتنی ہی باہمی محبت بھی عود کرتی چلی آتی تھی۔ اور دونوں اپنے غصہ بھرے خطوں میں لکھتے تھے کہ خیر دوستی اور تعلقات تو ختم نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ باتیں بہت بری ہیں۔ کئی خطوں کے بعد یہ لڑائی بند ہوئی۔ لیکن تحریری صلح کے ساتھ نہیں۔ بلکہ ہم دونوں خطوط کے ذریعے لڑ جھگڑ کر چپ ہو رہے۔ اس بات کے کئی مہینوں بعد مجنوں ایک دن اچانک

میرے گھر الہ آباد وارد ہو گئے۔ میں غسل خانہ میں تھا۔ اور ان کے آنے کا شان وگمان بھی مجھے نہ تھا۔ میرے ملازم کو چائے بنانے کا حکم دے رہے تھے۔ اور غسل خانہ میں ان کی آواز آ رہی تھی۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں دیوانے پھر مل بیٹھے۔ تھوڑی دیر تک خوب گزرتی رہی۔ پھر مجنوں نے سلسلہ استفسار شروع کر دیا یوں کہ "جناب آپ نے مجھے میرے متعلق اپنے خطوط میں یہ یہ باتیں کیوں لکھیں؟" میں نے جواب دیا کہ غصّے میں اگر جھوٹ الزامات نہ لگائے جائیں تو غصّہ کیسے قایم رہے اور غصّے کا لطف کیسے آئے؟ اب باقاعدہ صلح ہو گئی۔

مجنوں کی شخصیت کئی لحاظ سے مجھ سے بہت مختلف ہے۔ انھیں سیر و سیاحت کا بڑا شوق ہے اور میرے لئے سفر سقر ہے۔ ہوٹلوں میں انھیں جنّت کی بہار نظر آتی ہے اور مجھے وحشت ہوتی ہے۔ وہ گھر پر شراب پینے کے قایل نہیں۔ ہوٹل میں کھانا پینا گویا ان کی عمر بڑھا دیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اب تک ان کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کنبے کے اور لوگوں سے الگ ہو کر رہنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ اس لئے ہوٹل ان کے لئے ایک خوشگوار فرار کا موقع بن جاتا ہے۔ چائے کا انھیں بڑا شوق ہے اور انھیں کی وجہ سے چائے پینا میری عادت ہو گئی۔ وہ پان کے بھی رسیا ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا۔ جب میرے یہاں الہ آباد کبھی کبھی ان کا آنا ہوتا ہے تو وہ اپنا سب وقت مجھے نہیں دیتے۔ دو تین دن کے قیام میں بھی ان کے تانگے کا بل بیسوں روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ الہ آباد کی خاص ہستیوں سے وہ مل چکے ہیں۔ اور میرے یہاں آکر سب سے باقاعدہ جا کر ملاقات کرتے ہیں۔ میں اپنا تکیہ نہیں چھوڑتا۔ کیوں کہ میں ایک بے دست و پا آدمی ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں مجنوں بڑے سے بڑے آدمی کو اپنا والہ و شیدا بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ پروفیسر نعیم الرحمٰن مرحوم۔ پنڈت امرناتھ جھا۔ ان سب پر ان کی شخصیت کا جادو چل چکا ہے۔

جب جب میں گورکھپور جاتا ہوں تو مجنوں ہی کا مہمان ہوتا ہوں۔ گاڑی بہت صبح گورکھپور پہنچتی ہے۔ اپنے ملازموں اور بال بچوں کو وہ ہدایت کر دیتے ہیں کہ جب میں آؤں تو میری آسائش کا تمام انتظام وہ لوگ کر دیں۔ خود وہ دو گھنٹہ دن چڑھے اٹھتے ہیں۔ اور میں تمام ضروریات سے فارغ ہو کر بیوقوف بنا بیٹھا رہتا ہوں، تب کہیں آپ اندر سے تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اس میں مجنوں کا ذرا بھی قصور نہیں۔ میں تو اپنی بے خوابی شام ہی سے غرق جام کر دیتا ہوں۔ مجنوں کی صحت اس کی انھیں اجازت نہیں دیتی۔ جوانی میں تو وہ بوتلیں پی کر ہضم کر جاتے تھے، لیکن اب شراب ان سے نہیں پچتی۔ بے خوابی کے شکار وہ بھی ہیں اس لئے کہیں رات گئے ان کی آنکھ لگتی ہے۔

ہم دونوں کے درمیان کبھی کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمۂ قرآن کا ذکر بھی اٹھا ہے۔ اور ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا نے قرآن کو اپنے ترجمے میں نذرِ لغت، نذرِ عقلیت اور نذرِ قواعد کر دیا ہے۔ اور روحِ قرآن تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اسلام، اسلامیات سے بڑی چیز ہے۔ ایک بار میں نے مجنوں سے ایک ایسی بات کہی کہ اگر وہ بات میں کسی اور سے کہتا تو اس کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جاتی۔ لیکن مجنوں نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ بات یہ تھی کہ اردو کے بہت بڑے محسن ہوتے ہوئے بھی سرسید اردو کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ آگے نہ پڑھیے۔ رک کر سوچئے کہ میرا اور مجنوں کا مفہوم کیا تھا۔ اب آپ سوچ چکے ہوں گے اور بات سمجھ میں نہ آئی ہوگی۔ ہم لوگوں کا مفہوم یہ تھا کہ اردو ادب کے کچھ حصوں میں ایک عالمگیر کیفیت، رمزیت، تحلیل قلب، سوز و گداز جمالیاتی احساس اور وجدانی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ سرسید نے ان تمام قدروں کو نذرِ تدبر کر دیا۔ انھوں نے اردو کو نذرِ لغت کر دیا اور علی گڑھ کی فضا میں ایک صحافتی اور محض علمی و تاریخی ادب کے لئے قدرشناسی کا احساس کسی قدر بچ رہا۔ اردو ادب کا وہ حصہ جو حال و قال سے لبریز ہے، اسے سرسید کی سرپرستی نہیں ملی۔ صرف معاملت جس حصے میں ہے، اسی حصے کو سرپرستی ملی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سرسید کے زمانے میں عام طور پر اردو ادب مائل بہ انحطاط تھا۔ لیکن ان کے زمانے میں غالب اور غالب کا ادب دونوں موجود تھے۔ جنھیں سرسید نے نظرانداز کر دیا۔ کوئی چاہے تو سرسید کی بڑی شخصیت کا صحیح اندازہ لگا کر اس امر کا فیصلہ کرے کہ میر اور ان کے ہم نوا شعرا غالب، مومن، مصحفی اور آتش کے کلام کو سرسید اپنے دل میں جگہ دینے کا مذاق رکھتے تھے یا نہیں۔ آج ترقی پسند ادب کی تحریک نے اس گتھی کو بہت کچھ سلجھا لیا ہے کہ ادب میں وجدانی کیفیت اور حال و قال یا جمالیاتی صفات کے ساتھ ساتھ پیامِ عمل اور قومی بیداری کی تحریکیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔

مجنوں کے والد فاروق صاحب سائنس داں ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا تخلص دیوانہ رکھا تھا۔ مجنوں نے کیا عجب، اسی رعایت سے اپنے تخلص کا انتخاب کیا ہو۔ ایک بار مجنوں کے سب سے چھوٹے بھائی نے جس کی عمر مشکل سے اس وقت سولہ برس کی رہی ہوگی، ایک صحبت میں اپنی غزل سنائی۔ شاید ابھی اس لڑکے نے اپنا کوئی تخلص نہیں رکھا تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ تم اپنا تخلص خبطی کر لو۔ خیر شاعری تو دیوانہ صاحب، مجنوں صاحب اور خبطی صاحب نے جاری نہیں رکھی۔ لیکن اس واقعہ نے ہمیں ایک لطیفہ ضرور دیا۔

میں یہ لکھ چکا ہوں کہ مجنوں کو تنقید کی طرف مائل کرنے میں میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ مجھے

نثر نگاری کی طرف مائل کرنے میں مجنوں کی شخصیت بہت حد تک کارگر رہی ہے۔ میری نثر مجنوں کی نثر سے کافی مختلف قسم کی ہے۔ میں نے مجنوں کی نثر کو سوئیفٹ کی نثر سے مشابہ بتایا ہے۔ لیکن شاید یہ محض ایک نیم صداقت ہے۔ مجنوں کی نثر ڈاکٹر جانسن کی اس نثر سے مشابہ ہے جس میں عقل نامہ فطانت یا wisdom کے مقامات تک پہنچ گئی ہے۔ اور جس کی بہترین مثال شیکسپیر کے ڈراموں کی شرح میں جانسن نے پیش کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جانسن کی کتاب "حیات شعراء" میں جس طرح جانسن کہیں کہیں بہک گیا ہے۔ مجنوں اپنی تنقیدوں میں ایک جگہ بھی نہیں بہکے۔ عقل تنقید کو مجنوں نے ایک تاثری صفت عطا کی ہے۔ اور ان کے تنقیدی ادب کو ان کے تمام کارناموں میں قدر اوّل کی چیز تسلیم کیا جائے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس طرف میں نے مجنوں کو راغب کر دیا۔

کئی لحاظ سے میں مجنوں کو اپنے آپ سے ایک بہتر انسان سمجھتا ہوں۔ وہ غلط باتوں پر جھلاّہٹ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن غالب کی طرح یا میری طرح غیر مہذب الفاظ میں انھوں نے کبھی اظہارِ عتاب نہیں کیا۔ شاید یہ بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ بسا اوقات غالب شرمناک گالیاں بکنے کے بھی مرتکب ہو جاتے تھے۔ جس سے ان کی عظمت ہماری نظروں میں کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ مجنوں کی شخصیت میں ایک انار کی ہے جس کی میرے یہاں بہت کمی ہے۔ ایک امر میں مجنوں سے میرا کچھ اختلاف بھی ہے۔ بہت سے ہندوؤں کی تنگ نظری یا تعصب یا مسلم آزاری کا ذکر کرتے ہوئے مجنوں بسا اوقات ہندو قوم سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ مایوسی غالباً ان کی ایک مستقل کیفیت بن چکی ہے۔ میں بھی ہندوؤں کی بہت سی بدتمیزیوں، حماقتوں اور ذلالتوں کا شدید احساس رکھتا ہوں۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندو قوم نئے سرے سے مہذب اور متمدن ہوگی۔ اور اپنی کئی لعنتوں سے آزاد ہو جائے گی مجنوں بھی ہندوؤں سے مایوس ہوتے ہوئے غالباً بالکل مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ کاش ہندو قوم نئی تہذیب کو جلد اپنا سکے۔ آمین

ہم دونوں کی دوستی کو اب قریب قریب تیس برس ہونے کو آئے۔ شروع ہی سے مجنوں کو میں احمد صدیق نہ کہہ کر ہمیشہ مجنوں کہہ کے مخاطب کرتا ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ رگھوپت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ملاقات کے پہلے دن مجھے بحیثیت فراق کے کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ مجنوں کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ یا کم از کم ان کا عجیب و غریب لیکن نہایت مخلص گورکھپور میں تو مشہور ہو ہی چکا تھا۔ □

مجنوں گورکھپوری — مختصر حالاتِ زندگی

خاندانی نام	احمد صدیق
تخلص	مجنوں
والد کا نام	مولوی محمد فاروق دیوآنہ
دستاویزی سن پیدائش	۱۰ر جنوری ۱۹۰۴ء
اصلی تاریخ پیدائش	۱۰ر مئی ۱۹۰۴ء
ابتدائی تعلیم	سینٹ اینڈریوز اسکول، گورکھپور
میٹرک	۱۹۲۱ء گورکھپور
ایف۔اے۔	۱۹۲۷ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
بی۔اے۔	۱۹۲۹ء سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپور
ایم۔اے۔ (انگریزی)	۱۹۳۴ء آگرہ یونیورسٹی
ایم۔اے۔ (اردو)	۱۹۳۵ء کلکتہ یونیورسٹی

درس و تدریس

۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء	لکچرر، شعبۂ انگریزی، سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپور
جولائی تا دسمبر ۱۹۳۵ء	لکچرر، شعبۂ انگریزی، سربراہ شعبۂ تعلقاتِ عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
جولائی ۱۹۳۶ء تا مئی ۱۹۳۷ء	لکچرر (انگریزی و منطق)، میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج، گورکھپور
جولائی ۱۹۳۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء	پروفیسر انگریزی، صدر شعبۂ اردو، سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپور

ستمبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء	صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
نومبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء	اسسٹنٹ ڈائرکٹر، علی گڑھ، تاریخ ادب اردو اور ریڈر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر مجنوں گورکھپوری مئی ۱۹۶۸ء میں پاکستان تشریف لے گئے۔ ۱۹۷۰ء تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

*

شادی	۱۴؍ اکتوبر ۱۹۲۶ء
اولاد	تین بیٹے: ظفر عالم، قمر عالم، بدر عالم راحل
	بیٹی: تہمینہ
	داماد: اقبال احمد (پلانٹ انجینیر، ایٹمک انرجی کمیشن، کراچی)

□

مجنوں گورکھپوری کی تصانیف

تنقید و فلسفہ

شوپنہار
ادب اور زندگی
نقوش و افکار
دوش و فردا
غزل سرا
تاریخِ جمالیات
اقبال
نکاتِ مجنوں
پردیسی کے خطوط ۱؎
غالب: شخص اور شاعر
افسانہ
تنقیدی حاشیے
شعر و غزل
پردیسی کے خطوط ۲؎

افسانہ

خواب و خیال
مجنوں کے افسانے
صیدِ زبوں
زیدی کا حشر
سمن پوش
سوگوارِ شباب
سرنوشت
نقشِ ناہید
گردش
سراب

ترجمہ

سلومی (آسکر وائلڈ)
آغازِ ہستی (برنارڈ شا)
ابوالخمر (طالستائی)
قابیل (بائرن)
مریم مجدلانی (مارس ماہترلنک)
سنگھاسن بتیسی (ہندی کی لوک کہانیاں)
کنگ لیئر (شیکسپیئر)
شمسون مبارز (ملٹن)

تالیف

زہرِ عشق (نواب مرزا شوق)
حسن فطرت (عبرت گورکھ پوری)

عبدالعزیز خالد
لاہور

غزل

ہو کے صیقل سوزِ دل، چہرے سے لو دینے لگا
نالۂ خاموش کی لے بن گئی موجِ صدا

اس سے کچھ تبدیلیٔ موسم کا ملتا ہے سراغ
غمزۂ غماز ہے رنگِ نگاہ آشنا

ہے یہ موقع مغتنم اے ساقیانِ بزمِ جم!
میکشوں کے ہاتھ میں دے دو کلیدِ میکدہ

ربِ آدم زاد کا آئین، لاتبدیل ہے
دارِ فانی میں فقط حسنِ عمل کو ہے بقا

اپنے آیندہ کا ہر شخص آپ ذمہ دار ہے
آپ اپنا وہ مسیحا، آپ اپنا ناخدا

ہے ہوس کے لب پہ ہر دم نعرۂ ہل من مزید؟
ہے یہی نعرہ ہی سرچشمہ نشاطِ کار کا

منصب و زر دل کے فکروں کو بڑھاتے ہیں فقط
صرف خاکِ گور ہی جوع البقر کی ہے دوا

کیا یونہی تنہا رہے گا رزقِ خاک اس کا لہو
آدمی کیا ایک جنسِ رائگاں پیدا ہوا؟

ہو نہ غافل زندہ رُود احوالِ بعد الموت سے
کاروانِ زندگی کی ہے یہی بانگِ درا

اپنے نفس و اہلِ خانہ کو نہ بیجا تنگ کر
جس قدر طاقت ہے تجھ میں بوجھ اتنا ہی اٹھا

صاحبِ تخلیق کانٹے کی طرح کھٹکے اُسے
ہے یہ دنیا ابتدا سے دشمنِ اہلِ نوا

ساحری موسیٰ کے آگے کیا کرے گا سامری
خلطِ بحث اس کا مقصد تھا سو اس نے پا لیا

بیچیں روحوں کو جو جسموں کو بچانے کے لئے
ان کے لب پر بھی زوالِ علم و عرفاں کا گلہ!

لقمے جن کے رشوتی ہیں قول ہیں جن کے دروغ
خود کو گردانیں ازانِ امتِ خیر الوریٰ!

موجِ گل کا کام لیتے ہیں سمومِ دشت سے
شکوہ جورِ دیر کا کرتے نہیں اہلِ وفا

موت سے پہلے کشاکش سے ملے کس کو نجات؟
قید و بندِ شوق سے ہو آدمی کیسے رہا؟

بڑھ کے بنے لہو و تجارت سے جو میرے پاس ہے
دے مگر اس کو وہی توفیق دے جس کو خدا

بیٹھنے دیتا نہیں نچلا فراغت سے کبھی
مضطرب رکھتا ہے حاسد دل مرا مجھ کو سدا

نیم خوابی نیم بیداری میں شب میری کٹے
وقفے وقفے سے نہ جانے کون دیتا ہے ندا؟

کیوں نہ رکھوں وقت کے میں لمحے لمحے کا حساب
وقت میرا حال خالد، وقت مستقبل مرا

ہرچرن چاولہ
MOLLEFARET-50A,
OSLO-7 (NORWAY)

بیچ کی بات

"تمھیں 'بے شرم' کے معنی آتے ہیں؟ ارے تم تو سر ہلا رہے ہو۔ آئیں بھی کیسے۔ اس لفظ کو مرے تو کئی سال ہو گئے ہیں۔"

"الفاظ مرتے بھی ہیں؟"

"ہاں۔ الفاظ جنم لیتے ہیں۔ چلتے ہیں، پھرتے ہیں۔ ہنستے ہیں، روتے ہیں۔ پروان چڑھتے ہیں۔ بوڑھے ہوتے ہیں اور اپنی عمر گزار کر مر جاتے ہیں۔ کچھ وقت سے پہلے بھی مر جاتے ہیں۔ اِس لفظ کو مرے تو کئی سال ہو گئے ہیں۔ پھر تمھیں اس کے معنی کیسے آسکتے ہیں جسے تم نے ایک عرصے سے سنا تک نہیں۔"

"میں گھر پر لغت میں دیکھ لوں گا۔"

"مگر یہ لفظ تمھاری لغت میں نہیں ملے گا کیوں کہ تمھاری لغت نئی ہو گی اور میں کہہ چکا ہوں کہ اس لفظ کو مرے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اچھا ٹھہرو۔ میرے پاس ایک بہت پرانی ڈکشنری ہے۔ شاید اس میں اس کے معنی مل جائیں گے ـــــ ہاں یہ رہے۔ بے شرم یعنی بے غیرت۔ بے حیا، جس کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہو۔"

"یہ الفاظ بھی میں نے نہیں سنے اور یہ آنکھوں کا پانی مرتا کیسے ہے؟"

"دیکھو بھئی۔ یہ معنی خود ہی بڑا عجیب لفظ ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک لفظ کے ملتے جلتے لفظوں کو اس لفظ کے معنی کہا جاتا ہے۔ اب ایک لفظ جو مر گیا ہو۔ اس کے زندگی میں کتنے ہی نام کیوں نہ رہے ہوں، وہ بھی تو ساتھ ہی مر جائیں گے۔ اب میں مرے ہوئے کو کیسے زندہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔ فی زمانہ جب آنکھوں میں پانی رہ ہی نہیں گیا تو کوئی کیسے اسے قتل کرے اور کسی کو دکھائے ـــ اب تو اس لفظ کے معنی تمھیں سمجھانے کا میرے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ تمھیں کسی برے انسان کی کہانی سناؤں۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ۔ تم مجھے کیسا انسان سمجھتے ہو؟"

"بہت نیک۔ آپ تو دیوتا سمان ہیں۔ شہر کے نیک ترین انسان۔ جن کے ہر کوئی گن گاتا ہے۔"

"دیکھو۔ اگر بات سمجھنی ہے تو اچھے طالب علم بنو۔ ذہن کی سلیٹ بالکل دھو دھاکر اور صاف کر کے میرے پاس آؤ۔ یوں سمجھ لو کہ میں ایک کورا کاغذ ہوں اور اس کے بعد میں جو کچھ اس پر لکھتا جاؤں۔ پڑھتے جاؤ تمھیں سب کچھ آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو دل سے یہ خیال نکال دو کہ میں نیک انسان ہوں یا دیوتا ہوں۔ اب تم خاموشی سے میری کہانی سنتے جاؤ گے تو تمھیں بے شرم، بے غیرت وغیرہ الفاظ کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔"

تو سنو۔ ہوا یہ کہ پتا جی کی موت کے بعد میں نے ٹیڑھی انگلیوں سے اپنا کاروبار بہت زیادہ بڑھا لیا اور ایسے ایسے ہیر پھیر کئے جو میرے باپ دادا یا اس کے اوپر کی پیڑھی میں کسی نے نہیں کئے تھے۔ نتیجتاً سرکار دربار میں بھی میرا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ چھوٹے موٹے سرکاری معاملات میں بھی نہ صرف میری رائے لی جانے لگی بلکہ اسے افضل بھی مانا جانے لگا۔ تم جانو عزیزنہ۔ غریبوں کے ووٹوں کا کیا ہے۔ چوری چھپے ان کی گلی محلے کے بجلی کے سارے بلب یکے بعد دیگرے تڑوادو اور پھر ان کے سامنے نئے لگوادو۔ لڑکیوں کے سکول کی چار دیواری بنوادو محلے کی ساری ٹونٹیوں میں چند روز پانی باقاعدگی سے آنے دو۔ کسی قریبی مندر مسجد کی مرمت تو اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ ایسا ذرا سا کچھ کر دو تو سب ووٹ تمھارے۔ بعد میں پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ کون پوچھتا ہے۔ کوئی پوچھے بھی تو کان مت دھرو —— ان دنوں جو بھی میونسپل کارپوریشن کا امیدوار کھڑا ہوتا تمھارے اِس چچاجان کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے بعد میں بھی سب مجھے سب سلیوٹ مارتے تھے۔ پیسہ بھی تو سلیوٹ وصول کر ہی لیتا ہے۔ تو بھئی تب اپنے پو بارہ تھے اور پانچوں گھی میں تھیں مگر ان ہی دنوں ایک نئی بات ہو گئی۔ وہ یہ کہ لڑکیوں کے سکول میں ایک نئی ہیڈ مسٹریس آگئی۔ عزیزنہ کیا چیز تھی وہ۔ علم و عقل میں تو ہزاروں سے آگے اور حسن میں بھی یکتا۔ آتے ہی اس نے سکول کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ میں جوانی کی سرحدیں عبور کر چکا تھا مگر یہ ظالم عشق انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اس منہ زور گھوڑے نے مجھے وہ وہ چکر دیئے کہ میرا سر گھوم کر رہ گیا اور تم جانو۔ گھوما ہوا سر تو الٹی باتیں ہی سوچے گا۔ جب کسی طرح میری دال نہیں گلی تو میں نے حسب عادت گھی نکالنے کو انگلیاں ٹیڑھی کرنی شروع کر دیں اور اس پر ایسے ایسے الزام لگانے

شروع کئے کہ اس کی جگہ کوئی دوسری ہوتی تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ اور مڑ کر بھی نہ دیکھتی مگر وہ نہ صرف شیرنی کی طرح ڈٹی رہی بلکہ میرے ہی گھاٹ مجھے مارنے پر تل گئی۔ میں نے چاہا کہ اس کا اپنے علاقے کے سکول سے تبادلہ کرادوں مگر اس کے آنے کے بعد سکول کی رپورٹیں پہلے سے کئی گنا زیادہ اچھی ہوگئی تھیں اور بچوں کے والدین بھی اپنے بچوں کی کامیابیوں پر اس سے بہت خوش تھے۔ اس لئے میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا مگر پھر بھی میں نے اپنی کمینگیوں پر کوششیں جاری رکھیں۔

میرے گھاٹ پر اس نے مجھے یوں مارا کہ اس نے میرے ہی بیٹے سے عشق کرنا شروع کر دیا اور وہ دیوانہ اس کے حسن کی چکا چوند سے ایسا اندھا ہوا کہ اسے یہ بھی نظر نہ آیا کہ وہ اس سے عمر میں ایک سال بڑی ہے۔ میں بھی نمبری گھاگ ہوں مگر میں کیا کرتا۔ مجھے تو اس معاشقے کا تب علم ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور وہ میری بہو بنی میرے آشیرواد کے لئے میرے پاؤں چھو رہی تھی۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی برداشت ہو جاتی مگر جانے سالی کے عشق میں کیا آگ تھی کہ چھورا دن بدن جلتا گیا اور دو ہی سال کے اندر اندر بھگوان کے دربار جا پہنچا۔ یہ مجھ پر دوسری بڑی چوٹ تھی جس کو برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور غصے میں تم جانو، انسان الٹی سوچ ہی سوچتا ہے۔ میں نے سوچا۔ بکری اپنے تھان پر باندھ لوں تو آہستہ آہستہ ذبح کرتا رہوں گا۔ سالی آواز تک نہیں نکال سکے گی۔ لوگ مجھے دھرماتما کہتے ہیں تو بھی کہہ رہا تھا۔ میں رام بھگت بھی ہوں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں پرنتو وہ سب دکھاوے کی چیزیں ہیں بھئی۔ رامائن تو سب ہی پڑھتے ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤ کہاں کا ہے؟

—— 'دھولا' کا۔ پھر تو تو اپنے ہی گاؤں کا چھورا ہے۔ میں تمہارے ساتھ یوں ہی اردو ہندی میں بات کر رہا ہوں۔ اب تمہارے سنگ اپنی بولی ماں بات کروں گا۔ تو میں کہہ رہیا تھا کہ رامائن تو سب ہی پڑھے ہیں پر وا پہ عمل کون کر سکے ہے۔ کوئی ہیں۔ جب لکشمن کے دھورے (سامنے) رام چندر جی نے سیتا جی کے زیورات رکھے تس پہ وے بولا۔ دیر در میں تو کیول میا کے چرنوں کا زیور پہچانوں ہوں۔ سو یہ رہیا۔ بھئی اب ہر کوئی لکشمن تھوڑے بن سکے ہے۔ تمہارے مارے سے کے چھپا ہے۔ اپنے اسی دیش میں کچھ مانش ایسے دلی ہوئے ہیں جو گیارہ بارہ سال کے لونڈے سے اٹھارہ بیس برس کی لونڈیا بیاہ لادیں ہیں۔ جب

ٹیک چھورا جوان ہووے ہے چھورے کا باپ گاڑی کھینچتا رہوے ہے۔ آر بھائی دلہنیا وا کی موت پا پیچھے بیاہتے تو ہزاروں کو دیکھا۔

آ بھئی حیدر۔ ادھر بیٹھ۔ تو بھی سن میری بپتا کی کہانی۔ جب اپنی آتما ای صاف نہیں ہے تو پھر کسی سے کیا چھپانا۔ پر تو تو ہمارے گام کی بولی نہ سمجھ سکے ہے۔ بھئی معاف کرنا چھورے۔ تمہارا کے نام ہے۔ اب پھر مجھے اردو ہندی میں بات کرنی پڑے گی۔ میری بے شرمی کی بات تو تھوڑی تیرے پلے پڑ گئی ہو گی گر بات آگے بھی جاتی ہے۔ میری آتما بہت ملیچھ ہے۔ لوگ ٹھیک ہی مجھے ملیچھ داس کہتے ہیں۔ نام تو تم جانتے ہی ہو کہ میرا مہیش داس ہے۔ میں چٹا ان پڑھ، انگوٹھا ٹیک۔ میری بدقسمتی کہ میں نے کہیں سے دستخط کرنے سیکھ لئے۔ اپنی اور سے میں نے اپنے دستخط سدھارنے کی بہت کوشش کی مگر یہ سسرا میرے نام مہیش داس میں لکھتے وقت 'ایچ' جو ہے وہ 'ایل' بن جاتا ہے۔ پیسے سے سب کام کرائے جا سکتے ہیں مگر یہ دستخط بھین چو ایسی چیزیں ہیں جو آپ ہی کرنے پڑتے ہیں۔ اِی میرے غلط دستخط کرنے کی وجہ سے لوگ مجھے ملیچھ داس کہتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ میرا یہ نام سب میری پیٹھ پیچھے ہی پکارتے ہیں۔ سامنے تو مہیش داس جی، مہیش داس جی اور لالہ صاحب، لالہ صاحب کہتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔ بھئی سچ پوچھو تو وہ ٹھیک ہی مجھے ملیچھ داس کہتے ہیں۔ میرے کرم ہی ایسے نیچ ہیں کہ کسی ملیچھ کے کیا ہوں گے۔

ایک رات کی بات ہے کہ میں نے بکری کو پکڑ کر چھری پھیرنی چاہی تو اس نے ہرنی جیسی مظلوم نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "باپو تم..." میں نے چھری چلکاتے ہوئے کہا۔ "خبردار۔ جو مجھے آئندہ باپو کہا۔ بس ایک بات پلے باندھ لے۔ تو ناری ہے اور میں نر۔ اور تیرے میرے بیچ ایک ہی رشتہ ہو سکے ہے۔ عورت اور مرد کا۔ جے تجھے اس گھر میں رہنا ہے تے منھ بند اور دھوتی ڈھیلی رکھنی پڑے گی۔ میں بہت کمین مانش ہوں بھائی حیدر۔ تمہارا کا بتاؤں ماری تو بدھی ماں اِہ بات ای نہ آوے ہے کے دھرتی ماں مارا بوجھ کیسے ڈھووے ہے ـــــ میری زیادتیوں سے تنگ آ کر اس نے میرا گھر جو اب اس کا اپنا گھر ہونا چاہئے تھا، چھوڑ دیا اور باہر کمرہ لے کر رہنے لگی۔ وہ چاہتی تو دوسری شادی کر کے نیا گھر بسا سکتی تھی مگر اس نے میرے چھورے سے سچا پریم کیا تھا اور وہ اس کی بیوہ بن کر اپنے سسرال ساری عمر عزت سے گزارنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے نام کی مالا جپتی تھی مگر میں نے اسے باہر بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ میں نے اس پر غنڈے چھوڑ سے جھوٹے الزام لگائے اور شہر میں بدنام کرنا شروع کر دیا۔ وہ اکیلی عورت ذات۔ نہ کوئی آگے

نہ پیچھے۔ کب تک برداشت کرتی۔ بے چین دبے قرار وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔ وہ کچھ عرصہ ہسپتال میں زیر علاج رہی۔ واپس آکر سکول میں ڈیوٹی سنبھالی تو میں نے دوسرے ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیئے۔ اور ایک دن اس کی سکول کی چپراسن کو دے دلا کر اس کے دفتر کی الماری میں شراب کی دو بوتلیں رکھوا دیں۔ بس پھر کیا تھا۔ میرے الزام کے ساتھ میری بات کے ترازو میں دو بوتلیں بھی چڑھ کر بیٹھ گئیں اور میرا الزام اتنا بھاری ہو گیا کہ اس کا بوجھ نہ اس کمزور عورت سے سنبھالا جا سکا اور نہ ہی اس کے ہمدرد افسروں یا بچوں کے والدین سے۔ پہلے تو اس کا بھیجہ ذرا سا اپنی جگہ سے ہلا تھا مگر اس الزام سے تو اس کا دماغ بالکل ہی الٹ گیا اور وہ سڑکوں پہ وقت بے وقت پھٹے پرانے اور کبھی کبھی نامکمل کپڑوں سے پھرنے لگی۔ قصبے کے کچھ لوگوں سے مل کر میں نے اسے شہر کے بڑے ہسپتال میں داخل کروا دیا کیوں کہ میری بہت بدنامی ہونے لگی تھی۔ وہ اس ہسپتال میں سال بھر رہی پھر صوبے کی راجدھانی کے بڑے ہسپتال میں بھجوا دی گئی۔ دو تین سال بعد لوگ اسے بھول بھلا گئے اور ادھر بھگوان نے میرے گھر کے سارے چھپر پھاڑ ڈالے اور دھن یوں برسا کہ حویلی میں دولت کے انبار لگ گئے۔ مجھے بھی اب چھپروں کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ میں نے حویلی کی ساری چھتیں ہی پکی کروا ڈالیں اور گھر کا روپ ہی بدل کے رکھ دیا اور دروازے پر ایک چوکیدار بھی رکھ لیا جو چوکیداری کم کرتا تھا۔ مال اِدھر اُدھر سپلائی زیادہ کرتا تھا۔ جس میں میرے لئے خوبصورت ہرنیوں کا گوشت مہیا کرنا بھی اس کا فرض اولیں تھا۔ کیوں بھائی حیدر۔ میں اردو ٹھیک بول رہا ہوں نا؟"

"اجی۔ کمال ہے لالہ صاحب۔ آپ نے تو..."

"آداب عرض ہے ـــــ کہہ دو بھی کہہ دو۔ آپ نے تو اردو کی ٹانگ توڑ کے رکھ دی ہے تیرا چاچا الطاف بھی یہی کہا کرتا تھا مگر اس نے میرے بہت کام کئے۔ یوں سمجھ لے کہ مجھے اس درجے پہ پہنچانے میں سب سے بڑا اسی کا ہاتھ ہے۔ پر میں احسان فروش نہیں۔ میں نے بھی اسے مٹی سے اٹھا کر محل میں پہنچا دیا تھا۔ پہلے وہ اس علاقے کا چھوٹا سا غنڈہ تھا پر ہماری سنگت میں آنے کے بعد وہ محلوں میں پہنچ گیا اور اپنے گرگوں کو ٹیلی فونوں پہ آرڈر دینے لگا۔ میں نے اسے بیک وقت لیڈر بھی بنا دیا اور بدمعاش بھی رہنے دیا۔ ادھر آؤ تو یہ کھوٹا پہن لو، ادھر جاؤ تو وہ چڑھا لو۔ یار یہ جنتا بہت سیدھی ہے۔ ہم پر اعتبار کرتی ہے اور جب تک اعتبار کا دم قائم ہے۔ ہم ہاتھ رنگتے رہیں گے۔ تمہارے چاچا کے کرخت اور ظالم چہرے پر بھولا بھالا کھوٹا اس کا روپ ایسا طلائم کر دیتا تھا کہ اس کے تمام ہم مذہب اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے پہ تیار ہو جاتے تھے۔ میں اس کا

سب کچھ اس کی جھولی میں رہنے دیتا تھا بس گرو دکشنا کے ناطے اس کے ہم مذہبوں کے ووٹ صرف اپنے لئے رکھ لیتا تھا۔ پھر دوٹوں نے جب نوٹوں میں بدلنا شروع کیا تو میرے وارے نیارے ہو گئے اور مجھے اپنا قصبہ چھوٹا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کہا۔ الطاف۔ چل آگے چلیں۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ کیوں بھئی۔ حیدر میں اردو ٹھیک بول رہا ہوں نا؟ــــ تو ہم پھر راجدھانی آ گئے۔

تیرا چاچا۔ میری لائن پر چلتا رہتا تو اسے کھر و بیچ تک نہ آتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا الطاف۔ تو اب اپنی اوقات پہچان۔ اب تو معمولی آدمی نہیں۔ تجھے میدانوں میں کودنے کی کیا ضرورت ہے تو وہ فلمی ہیروؤں جیسا ہیرا ہے جس پر ہم جیسے لوگوں کا کروڑوں روپیہ لگا ہوا ہے۔ جب تمہارے ڈپلی کیٹ تمہاری جگہ جان مارنے کو ہر دم تیار ہیں تو تو کیوں خواہ مخواہ رِسک لیتا ہے مگر حیدر اس کے ہاتھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو بے بس ہو جاتا تھا۔ کہتا تھا۔ کھانڈے پہ زنگ لگنے دوں تو پھر لوہے کا کھیل ہی کیوں کھیلوں۔ حیدر بات تو اس کی ٹھیک تھی مگر آدمی کو بیچ کر چلنے میں کیا نقصان ہے۔ بندوق چلاؤ مگر کسی دوسرے کے کندھے کا مورچہ بنالو تو کیا حرج ہے۔ تو بیچ کی بات جانتا ہے حیدر کے ایسے ہی ہوں ہاں کئے جاتا ہے۔ اب تو نے اپنے چاچے کا چارج سنبھالا ہے تو اس راہ سے بچنا ہوگا جس راہ پر موت مورچہ لگائے بیٹھی ہو۔ کبھی اپنی قدر پہچانو۔ مرنے کو لوگوں کی کیا کمی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا ان کے مرنے سے۔ الٹا دیش کا بھلا ہوتا ہے مگر ہم تم مر جائیں تو ساری کشتیاں رک جائیں۔ فائدہ؟ ہم دیش کا بھلا سوچتے ہیں۔ تنکہ پھر ہمارا بھی بھلا ہو جاتا ہے تو کسی کا کیا بگڑتا ہے۔

میں بیچ کی بات جو تمھیں بتانے جا رہا تھا۔ وہ یوں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ اردو ہندی میں کہتے ہیں کہ اس طرح ہے کہ تیرے چاچا نے ذرا ہاتھ رنگنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ چیلا میں گورو۔ میں نے اسے ایسی راہ بتائی کہ اس کے بھی پو بارہ رہیں اور میرا دشمن سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی رہے سلامت کی سلامت۔

میں شہر آکر بسا تو وہ لونڈیا پہلے ہی شہر میں موجود تھی۔ اس پگلی نے تو مجھے نہیں پہچانا مگر میں نے اپنی بہو کو پہچان لیا۔ وہ پاگل خانے سے تو آزاد ہو چکی تھی مگر اس کے دماغ کے کئی کل پرزے ابھی تک ڈھیلے تھے اور اسے تن بدن کا ہوش تک نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ آج اسے ہوش نہیں ہے۔ کل آئے گا تو میری بہت بدنامی ہوگی۔ وہ پگلی کی پگلی رہے مگر کل کو کوئی

دوسرا اسے پہچان لے تو میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ وہ فٹ پاتھ پر ایک بڈھے کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اٹھائیس انتیس ۲۹ سال کی جوان جہان ہمت گوڑی اور وہ ستر سے اوپر کا ضعیف بڈھا مسلمان۔ ہاتھ کانپتے ہوئے۔ آنکھوں کے دیئے بجھے ہوئے اور چہرہ جھریوں کا جال۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی اور بھیک مانگنے کا کٹورہ اور دوسرے میں لڑکی کا کندھا۔ دونوں سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے۔ ان کے رشتے کو باپ بیٹی کا رشتہ کہا جا سکتا تھا۔ خلوص اور پیار کے رشتے کا نام دیا جا سکتا تھا اور ان کے مذہب کو مذہب انسانیت کہہ سکتے تھے۔ میں نے اس ہیرے کو سڑکوں پر پھینکا تھا۔ اس بڈھے نے اٹھا لیا۔ جو پیار اور خلوص اسے مجھ سے ملنا چاہئے تھا وہ اسے اس غریب مگر خلوص کی دولت سے مالا مال بڈھے سے ملنے لگا۔ انسانی بھیڑیئے اسے نوچتے کھسوٹتے تو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی۔ وہ اسے تسلیاں دیتا اور وہ اپنے تمام دکھ بھول بھال کر پھر زندگی جینے کی جنگ لڑنے لگی تھی۔ سیدھا سا ان کا رشتہ مگر حیدر، تیرے چاچا الطاف اور میں نے اسے ہندو مسلم سوال بنا ڈالا۔ تیرے چاچا کو کچھ مسلمان کی، جن سے اس کی دشمنیاں تھیں، دکانیں لوٹنی تھیں اور مجھے لونڈیا کا فیصلہ کرنا تھا۔ شہر میں فساد ہوا مجھے کہنا چاہیے کہ شہر میں فساد کرایا گیا۔ تیرے چاچا نے خوب ہاتھ رنگے اور گھر بھی مال سے تر بتر ہو گیا۔ تیرے چاچا سے میں نے چھوکریا اٹھوالانے کو کہا۔ ارے بھئی۔ کون سی بڑی بات ہے تیرے حکم بردار سینکڑوں۔ پر پتہ نہیں کہ تیرے چاچا کے دل میں کیا پھانس تھی کہ آپ ہی کود گھسیٹر میں کود پڑا۔ وہ جو کہتے ہیں نا۔ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ بڈھے کی لاٹھی اللہ کی لاٹھی بن گئی اور اس کی ایک بے آواز مگر کڑاکے دار ضرب نے تیرے چاچے کا بھیجہ چیر کر رکھ دیا۔ میں نے اپنی طرف سے اپنی ساری دولت ڈاکٹروں کے قدموں میں دھر دی مگر آئی کو کون روک سکے ہے۔ تیرا چاچا اللہ کو پیارا ہوا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے مگر تیرے لئے دروازے کھول گیا ورنہ اس کے ہوتے اس ساری سلطنت پر تیری حکومت کبھی نہیں ہو سکتی اور تیرے میرے سے کیا چھپا ہے تو بھی مغل شہزادے کی طرح اسی دن کی راہ دیکھ رہا تھا۔ دیکھ ہم تیرے دشمن نہیں ہیں۔ تیرا ستارہ مہاراج چندر گپت کی طرح چڑھے گا اگر تو اپنے گورو چانکیہ یعنی ہماری راہ چلتا رہے گا۔ بھلا ہو تیرے چاچے کا۔ تیرے لئے تو میدان خالی کر ہی گیا۔ مگر مرتے مرتے میرا بھی ساتھ ہی مسئلہ حل کر گیا۔ چھوری کے سر اور چہرے پر لاٹھی کی ایسی ضربیں لگا گیا کہ اب زندگی بھر نہ کوئی اسے پہچان سکے گا اور نہ ہی اس کی کوئی پرانی یاد واپس آ سکے گی۔

میرے کام کے چھوڑے۔ تیرا کے نام ہے۔ تو اپنا نام، پتہ تے کام اس کاغذ پہ لکھ دے اور جا کر لمبی تان کے سو جا۔ سمجھ کر تیرا کام ہوگیا۔ پر یاد رکھ۔ میں جذباتی ہو جاتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ دل چیر کر کسی کے سامنے رکھ دوں مگر یہ سب وقتی بات ہوتی ہے۔ جذبات سے دنیا کے کام نہ چل سکیں ہیں۔ اپنے کام کا جان کے، میں نے تیرے سامنے اپنا دل کھولا ہے۔ یہ کمبخت ضمیر جو ہے نا۔ مجھے کبھی کبھی بہت دکھ دیتا ہے۔ پر یہ بھی دھیان میں رکھ کہ میرے شراراتی گھوڑے ضمیر کی باگیں میرے شیطان دماغ کے ہاتھوں میں ہیں۔ یاد رکھ۔ میرے سنگ بنا کے رکھے گا تو بہت سکھ پائے گا۔ میں تجھے ایسے سیٹ کردوں گا کہ تیری دسوں کی دسوں گھی میں رہیں گی۔ باقی اپنے خلاف جانے والے کے لئے مجھے ہمیشہ سے میچھو بھی بننا آتا ہے۔ جا پتر۔ موج کر۔ بس سمجھ لے کہ پندرہ دن بعد ایک نئی شاندار جاب تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ ☐

شبنم مناروی

ریاض، سعودی عربیہ

غزلیں

وہ بول کر کبھی ہم سے کبھی بولتے نہ تھے
لفظوں کے بند چاک کبھی کھولتے نہ تھے

سورج بتا کہ چاند سے وہ لوگ کیا ہوئے
راہِ وفا میں جن کے قدم ڈولتے نہ تھے

باتیں وُہی ہیں حاصلِ سرمایۂ حیات
ہم بولنے سے پہلے جنھیں تولتے نہ تھے

پہلے بھی لوگ یوں تو بڑے فتنہ ساز تھے
بے وجہ شیر و آب بِس گھولتے نہ تھے

اشکوں کو جانتے تھے محبت کا ترجماں
مٹی میں موتیوں کو کبھی رولتے نہ تھے

خواب مت دیکھو کہ پھر جینا سزا ہو جائے گا
رات ہو جائے گی، ہنگامہ بپا ہو جائے گا

بستیوں میں دھول اڑتی ہے تو گھبراتا ہوں میں
کیا خبر تھی آدمی خود سے خفا ہو جائے گا

نام پائے گی جفاؤں کا ہر اک شیریں ادا
اور ہر انمول سپنا بدنما ہو جائے گا

جس سے تھا اجداد کا قلب و نظر کا سلسلہ
اس زمیں سے بھی ہمارا واسطہ ہو جائے گا

منزلوں کے سامنے ہم ہار کر رہ جائیں گے
پاؤں اٹھیں گے مگر رستہ جدا ہو جائے گا

وادیاں مغموم ہیں شبنم کہ پردیسی ہیں ہم
یوں نہ سوچا تھا کہ ان سے فاصلہ ہو جائے گا

فیض احمد فیض

کچھ یادیں

(ناظم حکمت، الیا اہرن برگ اور سارتر کی)

ماسکو شہر ایک طرح سے دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں کا بین الاقوامی مسافر خانہ ہے۔ کوئی ایک دن کے لئے آیا کوئی ایک ماہ کے لئے اور کوئی مرحوم ترک شاعر ناظم حکمت کی طرح آیا تو یہیں کا ہو رہا۔ چنانچہ جتنے باکمال لوگوں سے یہاں یا سوویٹ یونین کے دوسرے شہروں میں ملاقات رہی ہے۔ ان کے محض نام گنوانے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں اول تو مختلف سوویٹ جمہوریتوں کے اہل ہنر کی پوری فوج ہے۔ پھر یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ادیبوں کا کارواں ہے۔ مثلاً اٹلی کے البرٹو مورے ویا، فرانس کے سارتر، انگلستان کے پروفیسر ایمسن، اینگسن ولسن، ولیم گولڈنگ، افریقہ کے لیوپولڈ سینگھور جواب سینے گال کے صدر ہیں۔ لاطینی امریکہ کے نرودا، عراق کے الجواہری، لبنان کے مشعل سلیمان اور سہیل ادریس، فلسطین کے محمود درویش اور معین بسیسو، مصر کے عبدالرحمان خمیسی، ڈاکٹر مندور یوسف السباعی، جاپان کے یوشی ہوتا، اور ہندوستان کے سب پرانے دوست غرض کس کس کا نام لوں۔ سوویٹ میزبانوں میں کچھ تو دنیا سے رخصت بھی ہو چکے جن میں بعض سے نیازمندی تھی جیسے عظیم ناولسٹ اور صحافی الیا اہرن برگ یا بزرگ شاعر دردوفسکی تھے۔ بعض سے دوستانہ تھا جیسے نقاد اور ناول نگار کوجی توف تھے اور بعض سے یارانہ جیسے یوری ردین سوف تھے۔ ان سولہ سترہ برس میں کس کس سے کتنی بار ملاقات ہوئی اور کیا کیا باتیں ہوئیں اگر یاد کرنے بیٹھوں تو غالباً بقیہ عمر اسی میں گزر جائے گی۔ اور اپنی یادداشت تو اتنی ناقص ہے کہ کل کی سنی ہوئی بات بھی یاد نہیں رہتی اور صحافت سے کنارہ کشی کے بعد نوٹس لکھنے کی عادت نہیں رہی۔ صرف دو تین صحبتوں میں گفتگو کا ایک آدھ نکتہ جو ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔ فی الحال ان ہی میں اکتفا کرتا ہوں۔

ناظم حکمت

ناظم حکمت کا نام ہم بہت پہلے سے جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ دور میں ترکی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انگریزی میں ان کی نظموں کے تراجم کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی لاہور میں ہاتھ آگیا تھا جسے بہت سے لوگوں نے بہت شوق سے پڑھا۔ یہ مجموعہ بیشتر حبسیات پر مشتمل ہے اور ناظم کے طویل ایّام اسیری کی یادگار ہے۔ چنانچہ میں اپنے جیل خانے کے دنوں میں ناظم کے جیل خانے کے ایام کا یہ مصرعہ اکثر یاد کرتا تھا۔

آلام کچھ بھی ہو
اپنا نگینوں بھرا دل درخشاں رکھو،

ناظم حکمت نے زندگی کا بہت سا حصہ ترکی کے جیل خانوں میں گزارا اور پھر فرار ہو کر سوویٹ یونین میں پناہ لی اور وہیں بس گئے۔ اگرچہ ان کا دل یہاں ہر طرح کی آسائش بہم ہونے کے باوجود دیارِ وطن میں تڑپتا رہا اور جلاوطنی میں لکھے ہوئے ان کا بیشتر حزنیہ اشعار کا موضوع یہی ہے۔

۱۹۵۸ء میں تاشقند کی افروایشیائی ادبی کانفرنس کے پروگرام میں ہم نے ایک مشاعرہ بھی رکھوا دیا تھا جو یہاں کے لوگوں کے لئے ذرا نئی چیز تھی۔ سوویت یونین میں ہماری طرح کلام شاعر بزبان شاعر کا دستور ہے لیکن عام طور سے ایسی تقریبات میں صرف ایک معروف شاعر کا کلام سنا جاتا ہے۔ یا کسی خاص تقریب کی مناسبت سے متعلقہ موضوع پر نظم اور نثر دونوں پیش کئے جاتے ہیں۔ مشاعروں کا اکھاڑا نہیں رچایا جاتا ہے، اسی تاشقند مشاعرے میں ناظم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اس کے بعد اس سے دوستی اور محبت کا رشتہ ۱۹۶۳ء میں ان کی ناگہانی وفات تک قائم رہا۔

ناظم حکمت دیکھنے میں بہت وجیہہ آدمی تھے۔ ستواں قد، چھریرا بدن، گہرے سنہرے گھنگھریالے بال، بھوری آنکھیں، بہت تیکھے نقش اور سرخ و سفید رنگ۔ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال بڑے ہوں گے لیکن بالکل نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ خاندان کے رئیس، ایک پاشا کے پوتے، نوجوانی میں اناطولیہ میں جنگ حریت میں شرکت کی اور اس کے بعد عوام کے لئے عملی اور تحریری جدوجہد میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ تاشقند کانفرنس کے بعد جب ہم ماسکو پہنچے تو ناظم نے ہم دو چار دوستوں کو اپنے ڈاچا یعنی مضافاتی آرام گاہ میں مدعو کیا۔ یہ تین بڑے بڑے کمروں کی ایک بہت ہوادار چوبی عمارت تھی۔

ایک دو گھنٹے کھانے پینے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے میں گزرے۔ پھر ناظم نے کہا "چلو بھئی

اب دوسرے کمرے میں چل کر گپ کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ گپ کرنے کے آداب سے ہماری طرح پرانے سودین لوگ تو آشنا تھے جو کھانا بھی لیٹ کر ہی کھایا کرتے تھے۔ لیکن ان یورپین لوگوں کو یہ فن بالکل نہیں آتا۔ ہر وقت کرسیوں میں جتنے بیٹھے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے، یہاں ہر دیوار کے ساتھ ساتھ تخت نما لمبے لمبے کوچ رکھے تھے۔ دیواروں پر دورِ حاضر کے نامور مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اور ناظم کے مختلف ڈراموں کے پوسٹر تھے جو ماسکو کے علاوہ اور بہت سے شہروں میں اسٹیج ہو چکے تھے۔ ناظم نے کہا اب لیٹ کر آرام سے گپ کرتے ہیں۔ شعر کے اسلوب، ہیئت اور لغت کی بات چلی جس کا سلسلہ اس کے بعد کئی صحبتوں میں میرے اور ناظم کے درمیان جاری رہا۔ ناظم کا کہنا تھا کہ قطعی آزاد شاعری یا آزاد نظم کا وجود تو ممکن ہی نہیں جیسا کہ نظم کے لفظ ہی سے ظاہر ہے۔ الفاظ کو کسی ترتیب سے جوڑنا بجائے خود ایک پابندی ہے اور شعر میں کچھ تلازمے اس پر مستزاد بھی ہیں تاکہ شعر نثر کی سطح سے اوپر اٹھ سکے اور چونکہ شعر نے موسیقی ہی کے بطن سے جنم لیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اسے کسی مخصوص اور واضح ردم لَے یا آہنگ کا پابند ہونا چاہئے۔ جو شعر کے موضوع اور کیفیت کے مطابق ہو۔ لیکن اس میں عام طور سے دھوکا ہوتا ہے کہ اس کے یا آہنگ کی جو صورتیں بزرگ پہلے سے وضع کر گئے ہیں ان سے تجاوز کرنا مناسب نہیں، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور لَے یا آہنگ کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اصل میں ہر زبان کی روزمرہ بول چال کا اپنا ایک مخفی اور قدرے بکھرا ہوا آہنگ ہوتا ہے جس پر پوری توجہ دی جائے تو اس سے کئی طرح کے مترنم صوتی خاکے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ عوامی گیت تو خیر بہت واضح چیز ہے لیکن اگر تم کسی بوڑھے شہری یا دیہاتی داستان گو سے کوئی پرانا قصہ سنو تو اس کی نثر میں بھی تمہیں اس زبان کا آہنگ ملے گا۔ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ اپنی زبان میں اس کے فطری آہنگ و ترنم کے امکانات دریافت کر کے اپنے شعر کی لَے ان کے قریب لائی جائے۔ لیکن ہم عام طور سے ایسا نہیں کرتے مثلاً تم اپنی اردو زبان یا میری ترکی زبان کی مثال لے لو۔ ان زبانوں کا اپنا لہجہ اپنا صوتی آہنگ تو کچھ اور ہے لیکن شعر میں پیروی سب عربی عروض کی کرتے ہیں۔ وہ کیوں بھئی؟ یہ پرانے اوزان اور بحریں تو عربوں نے اپنی زبان، اپنی بول چال، اپنے گیتوں اور نغموں سے برآمد کی تھیں اور یہ بھی تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ ان کی لَے کا اصل ماخذ اونٹ کی چال کا ردم ہے تو ہم اس عربی لکیر کے فقیر کیوں بنے بیٹھے ہیں؟ ویسے اپنی اپنی ضرورت اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق قدیم شعرا نے عربی بحروں میں ترمیم و اضافے اور تصرفات تو کئے جو سب نے قبول بھی کر لئے لیکن عروض کے بنیادی ڈھانچے سے منحرف ہونے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ چنانچہ

جب سے میں نے شعر لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہی مسئلہ سامنے آیا اور جب سے میں نے کوشش شروع کی کہ شعر میں عروض کے متبادل کوئی آہنگ پیدا کرنے کی صورت کی جائے۔ پھر آہستہ آہستہ میں عروض کا سہارا لینا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے جدید ترک شاعر ایسے ہی لکھنے لگے ہیں۔

اس موضوع پر ہماری کئی بار گفتگو ہوئی اور بعض نظمیں جو میں نے ماسکو میں لکھی تھیں وہ غالباً ان ہی صحبتوں سے متاثر ہیں۔

ناظم کہتے تھے "میری باتوں سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں شعر و ادب کی پرانی روایت سے خلاف ہوں یا اس سے بالکل قطع تعلق کے حق میں ہوں، بلکہ اگر غور کرو تو بات اس کے برعکس ہے۔ یہ اس طرح کہ ہماری روایت کا اصل ماخذ تو پرانا عوامی ادب ہے، عوامی گیت ہیں، داستانیں ہیں رزمیے ہیں۔ کلاسیکی طرزِ اظہار اور عروض کی پابندی کا دور تو بعد میں آیا، اور اس تبدیلی کی وجہ محض شاعرانہ یا ادبی اپج کی تحریک نہیں تھی بلکہ بنیادی وجہ تو معاشرے کے نظام اور بود و باش کے طور طریقوں کی کایا پلٹ تھی۔ یعنی پرانے خود مختار اور خود کفیل قبائلی نظام کی جگہ بادشاہی، نوابی یا جاگیرداری نظام نے لے لی تھی۔ اس نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ نظام نے ایک نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تہذیب پیدا کی اور شعر و ادب کو اسی سانچے میں ڈھال لیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمارے مشرقی ممالک میں صدیوں تک یہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور اسی کے نتیجے میں ہم نے قدامت پسندی اپنا شعار ٹھہرا لیا۔ شعر و ادب میں بھی سیاست اور معیشت میں بھی۔ لیکن یہ دور گزر چکا۔ انسانی دنیا صنعتی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ زندگی کی لے بدل گئی، بود و باش کے طریقے بدل گئے، انسانی رشتوں کی صورتیں مختلف ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں انفرادی اور اجتماعی انسانی تجربات کی نوعیت اور ماہیت اور متن اگلے زمانے سے بالکل مختلف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے مناسب اور موثر اظہار کے لئے نئی صورتیں اور نئے سانچے بھی درکار ہوں گے۔ نظریاتی طور سے تو یہ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن عملی طور سے بات جہاں پر اٹک جاتی ہے وہ ذہنی یا نظریاتی مسئلہ نہیں فنی یا جمالیاتی مسئلہ ہے۔ یعنی محض حقیقت کا اظہار ہی کافی نہیں۔ اس اظہار میں حسن کاری بھی لازم ہے۔ شروع شروع میں اس مسئلے کی پیچیدگی کا مجھے بھی پوری طرح احساس نہیں تھا چنانچہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ابتدائی شاعری جو بیشتر سیاسی اور جلسے جلوس کی شاعری ہے بالکل یک رخی یا "ون ڈائی مینشنل" شاعری ہے جو وقتی یا ہنگامی طور پر مفید بھی ہوتی ہے اور موثر بھی لیکن جس کی لغت یا ہیئت میں کسی انسانی تجربے کی گہرائیوں اور نزاکتوں کا عکس نہیں ملتا۔

"روایت، ہیئت، اور موضوع کے الگ الگ خانے نہیں بنائے جا سکتے۔ مثلاً موضوع کے

تقاضے کے مطابق میں نے پابند شاعری بھی کی ہے بلکہ اگر پرانے زمانے کی کوئی داستان منظوم کی ہے تو اس زمانے کی صحیح فضا پیدا کرنے کے لئے قدیم اور متروک زبان بھی استعمال کی ہے اور اس علاقے کی عوامی دھنوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ فارم یا ہیئت کے بارے میں پہلے بھی میں نے کسی سے کہا تھا کہ اس کی صورت تو کسی حسینہ کی ساقِ سیمیں جراب کی سی ہے جو ساقِ سیمیں کے حسن میں تو اضافہ کرے لیکن خود زیادہ نمایاں نظر نہ آئے۔"

اس پر میں نے حسرت موہانی کا شعر سنایا اور بہت داد پائی ؎

رنگِ قبا سے مل گئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

الیا اہرن برگ

۱۹۶۳ء غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ ہے۔ لینن گراڈ شہر۔ علامہ اقبال کو "سوادِ رومۃ الکبریٰ" میں دلی یاد آتی تھی لیکن اس شہر کا تو کوئی بدل ہماری طرف موجود نہیں۔ ماسکو کے برعکس یہ بالکل یورپین طرز کا شہر ہے۔ سڑکیں، چوراہے، عمارتیں، گرجے، شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریائے نیوا کے پل بیشتر مغربی وضع کے ہیں لیکن پشکن کی زبان میں، کانسی گھوڑے کے شہسوار، پیٹر اعظم کا بسایا ہوا یہ شہر روس کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور انقلابی تاریخ کے آثار سے مالا مال ہے۔ پیٹر اعظم کے گھڑسوار مجسمے سے لبِ دریا شہر کی جانب چلو تو ہر عمارت کوئی نہ کوئی پرانی یا نئی تاریخی یاد جگائے گی۔ اس مکان میں پشکن غزل سرا ہوا کرتا تھا، اس مہیب قلعہ میں سیاسی قیدی روشنی اور آزادی کو ترستے تھے۔ وہ آرورا جہاز ہے جس کے عرشے سے اکتوبر انقلاب کی توپ داغی گئی تھی۔ یہ سمولنی انسٹی ٹیوٹ ہے یہاں لینن نے اپنی انقلابی حکومت تشکیل کی تھی اور یہ زار کا محل ہے جو اب ہرمی ٹیج عجائب گھر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ جس کے سب نوادرات، تصاویر، مجسمے، جواہرات، ظروف، ملبوسات وغیرہ وغیرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے چند گھنٹے تو کیا چند دن بھی کافی نہیں۔

اگلے دن یہاں یورپین ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور کچھ ایفرو ایشیائی ادیب بھی مبصر کی حیثیت میں مدعو کئے گئے ہیں۔ چنانچہ میں اور ایلس بھی آج ہی لندن سے یہاں پہنچے دن بھر شہر میں پیدل گھومنے کے بعد سب لوگ ہوٹل میں سستا رہے ہیں لیکن اپنا دل نہیں مانتا کہ اس شہر میں ایک لمحہ بھی کسی بند کمرے میں ضائع کیا جائے۔ ہوٹل سے چند قدم پر ایک مختصر سا پارک ہے"

اس کے وسط میں پشکن کا دراز مجسمہ۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے لینن گراڈ کی فاسئی شام کو لبادے کی طرح اوڑھ رکھا ہے اور دو تین ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کے گھنگھریالے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ اس وقت سر نگوں کس سوچ میں غرق ہے۔ لیکن شاید اس کی درد مند آنکھیں شفقت اور ترحم سے ان نوخیز جوڑوں کو تک رہی ہیں، جو اس کے چاروں طرف آہنی بنچوں پر چھدرے چھدرے پتوں کی اوٹ میں اپنے وفور شوق کو چھپانے کی عبث کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے دن ہم کانفرنس کے لئے لینن گراڈ ادیبوں کی انجمن کے صدر دفتر میں جمع ہوئے جو گئے وقتوں میں کسی بڑے امیر کا محل تھا۔ مندوبین میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ فیدن، الیا اہرن برگ، شولوخوف، سارتر، ایمیس، جان لیمان، اور کئی دوسرے۔ تین دن کے مختصر قیام میں ان سب سے تو ملاقات ممکن نہ تھی، بنے اور میں نے اپنی دوست مریم سلگانیک کے ذریعے اہرن برگ اور سارتر صاحب سے ملاقات کی فرمائش بھیجی اور ایک ہی سہ پہر میں ان دونوں بزرگوں سے یکے بعد دیگرے ملاقات کا وقت طے ہوا۔

پہلے اہرن برگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی کافی ضعیف نظر آتے تھے، کمر جھک گئی تھی، آنکھیں بھی دھندلا رہی تھیں، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، میانے قد کے دُبلے پتلے آدمی تھے جن کو دیکھ کر کسی تھکے ہوئے شکاری پرندے کی یاد آتی تھی۔ اہرن برگ صاحب کی بہت سی باتیں تو ہم کانفرنس کے دوران ہی میں سن چکے تھے جب انھوں نے سویٹ یونین کے بارے میں مغربی ادیبوں کے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ کوئی کوئی فقرہ مجھے یاد ہے۔ "آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے جدید ادب کا بہت سا حصہ آپ کے کہنے کے مطابق سپاٹ اور بے کیف ہوتا ہے۔ جسے تخلیقی اعتبار سے معیاری ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں لکھنے والوں کے اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے آپ کی انجمن کی انتظامیہ کے ایماء پر ان کے نظریات کی تبلیغ کے لئے لکھی جاتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا کہنا ایک حد تک تو صحیح ہے لیکن دو تین باتوں پر ذرا غور فرمائیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تھا اور سوویٹ معاشرہ تشکیل دیا تھا تو ہم نے آپ سے اور ساری دنیا سے یہ اقرار ضرور کیا تھا کہ ہم ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے جا رہے ہیں۔ ہم سرمایہ داری، جاگیرداری، مطلق العنانی، استحصال وغیرہ۔ سب خباثت ختم کر دیں گے جو طبقاتی نظام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب وعدے تو ہم نے کئے تھے اور ہم انھیں پورا بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کب عہد کیا تھا کہ ہم گھٹیا ادب پیدا نہیں کریں گے اور یہ بھی

کب کہا تھا کہ ہماری ادیبوں کی تنظیم میں کچھ بودم قسم کے لوگ بھی بقراط بن کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔
خیر اِس بات کو چھوڑیئے اب یہ بتائیے کہ آپ جسے گھٹیا یا غیر معیاری ادب کہتے ہیں وہ کس زبان میں
کس ملک میں اور کس دور میں اچھے اور بڑھیا ادب کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پیدا نہیں ہوا۔
آپ ذرا اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھئے آپ کے ہاں جو روز سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لچر یا
بچکانہ کتابیں چھپتی ہیں، ان کے مقابلے میں سنجیدہ اور معیاری ادب کے کتنے نمونے سال بھر میں
سامنے آتے ہیں؟ چلئے ہمارا ادب بے کیف ہے، سپاٹ ہے، بے مزہ ہے لیکن آپ کے تجارتی
اداروں کی طرح اس میں زہر اور کیچڑ کی ملاوٹ تو نہیں ہوتی۔ ہمارے ادیب یہاں کے محنت کشوں
کی زندگی یا یہاں کے قومی تعمیری منصوبے کے بارے میں اکثر لکھتے ہیں اور بعض اوقات کامیابی سے
نہیں لکھ پاتے۔ لیکن آپ کے پیشہ ور ادیبوں کی طرح جرائم اور فحاشی، یا امراکی گھریلو زندگی کے
ناز نخرے تو اپنا موضوع نہیں ٹھہراتے۔

"آپ کہتے ہیں کہ ہم نے انقلاب کے بعد ٹالسٹائے، دوستوئیفسکی، چیخوف یا گورکی جیسا بھی
بڑا ادب کیوں پیدا نہیں کیا کیوں کہ گورکی بھی انقلاب سے پہلے ہی کی پیداوار ہے۔ یہ بھی آپ کا
کہنا ٹھیک ہے، ہم نے ٹالسٹائے جیسا بڑا ادیب اس بیس تیس سال میں نہیں پیدا کیا، لیکن ہم نے
وہ ذات پیدا کی ہے جو آپ ایک ہزار سال میں نہیں کر سکتے۔ ہم نے بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔
"گریٹ ریڈر" جو آپ کے معاشرے میں نہ اب ہے اور نہ اس کی موجودہ صورت میں کبھی کبھی ہوگا
شیکسپیرؔ تو آپ کا ادیب ہے ہمارا تو نہیں ہے لیکن آپ نے گزشتہ تین سو برس میں اس کے جتنے
ایڈیشن جتنی تعداد میں چھاپے ہیں غالباً ان سے زیادہ گزشتہ بیس برس میں ہم چھاپ چکے ہیں اور
پھر آپ کے ہاں اسکول یا یونیورسٹی سے باہر شیکسپیرؔ کون پڑھتا ہے؟ یہاں ہر کوئی اس سے آشنا
ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جینئس جیسے ہومر ہے، یا شیکسپیرؔ یا ٹالسٹائے، کہیں بھی اور کسی دور
میں بھی پیدا ہو وہ تو ہمیشہ ایک اتفاق یا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اس لئے اس کی پیدائش کا سہرا کسی
معاشرے یا کسی دور کے سر باندھنا معقول بات نہیں اور اگر وہ کسی جگہ پیدائش سے انکاری ہے
تو کسی پر الزام بھی نہیں دھر سکتے۔"

سہ پہر کے وقت بنے اور میں اہرن برگ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے، بہت
خندہ پیشانی سے ملے، اٹھ کر مصافحہ کیا، اور فرانسیسی زبان میں خیریت پوچھی۔ کانفرنس کے
بارے میں کچھ باتیں ہوئیں پھر پوچھا کافی پیو گے؟ پھر ساتھ ہی معذرت شروع کر دی۔ "ویسے

پوچھو تو کسی مہمان کو اس ہوٹل کی کافی پیش کرتے ہوئے مجھے ندامت ہوتی ہے، یہ بھی کوئی پینے کے لائق چیز ہے۔ لیکن اس ہوٹل پہ کیا منحصر ہے کوئی سا ہوٹل یا کوئی سا گھر ہو روس میں ایسی ہی کافی ملے گی۔ دراصل ہم روسیوں کو دو کاموں کا سلیقہ بالکل نہیں آتا اور نہ میرے خیال میں کبھی آئے گا۔ ایک تو یہ اچھی کافی بنا نہیں سکتے اور دوسرے ہوٹلوں کے لئے اچھی تصویر بنانا نہیں جانتے۔ یہ دیکھو یہ سامنے کیا لشکا رکھا ہے:" کمرے کی دیوار پر کچھ ویسی ہی مبتدیانہ قسم کی تصویر آویزاں تھی جو ہوٹلوں میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے، کسی جنگل پہاڑ یا وادی کا منظر، لیکن ہوٹل کے کمرے میں اس طرح کی تصویریں لگانے میں ایک منطق بھی ہے:" اہرن برگ کہنے لگے؟ دیکھئے نا ہوٹل میں تو آپ زیادہ سے زیادہ چار دن مہمان ٹھہرتے ہیں پھر آپ کو گھر لوٹنا ہوتا ہے اس لئے بالکل معقول بات ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں دلفریبی کا کوئی ایسا سامان نہ دکھایا جائے جس کی یاد بعد میں آپ کو ستاتی رہے کیوں کہ نہ جانے آپ کبھی اس ہوٹل میں دوبارہ آئیں نہ آئیں اور آئیں بھی تو کیا شرط ہے کہ وہی کمرہ آپ کو دوبارہ ملے اس لئے ہوٹل کے کمرے میں جو بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے وہ فرنیچر ہو یا برتن ہوں یا دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر، سب کچھ غیر ذاتی، اِم پرسنل، میکانیکی اور بیگانہ قسم کا ہونا چاہئے جو آپ کمرے سے نکلتے ہی اپنے ذہن سے محو کر سکیں۔" پھر روس کے جدید ادب کی بات شروع ہوئی جس کا تذکرہ کانفرنس میں ہو چکا تھا۔ کہنے لگے "دیکھو بھئی انقلاب کے وقت ہماری بیشتر آبادی ناخواندہ تھی، ایک عام کسان مزدور نے کتاب پڑھنا تو کیا کبھی کتاب کو چھو کر بھی نہ دیکھا تھا کہ اس کا لمس کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے پہلا کام یہ تھا کہ پڑھے لکھے اور دانشور لوگوں کو بھول کر پہلے اس مخلوق کو جو ہماری اصل قوم ہے پڑھنے کی لذت سے آشنا کریں اور اس کے لئے لازم تھا کہ ہم وہی باتیں لکھیں اور اسی انداز سے لکھیں جو وہ سمجھ سکیں اور دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے ان کا تعلیمی اور ذہنی معیار بلند ہوگا ویسے ہی بتدریج ان کے جمالیاتی اور فنی ذوق کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔ اور یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پیشتر میں اور میرے ایک دوست جو یہاں کے کافی ممتاز ادیب ہیں ایک کارخانے میں کسی تقریب پر گئے۔ حسب معمول تقریریں ہوئیں اور نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں۔ ہم دونوں نے بھی کچھ کہا سنا۔ جب ہم لوٹ رہے تھے تو میں نے اپنے دوست سے کہا، دیکھئے ہمارے اصل پڑھنے والے سننے والے تو یہ ہیں۔ آپ ان کے لئے کچھ کیوں نہیں لکھتے۔ وہ کہنے لگے بھئی یہ لوگ میرے معیار کو نہیں پہنچتے اور میرے لئے ان کی سطح پر اتر کر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے۔" خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن حال ہی میں تیس پینتیس برس بعد مجھے اس کارخانے میں جانے کا اتفاق

ہوا تو میں نے دیکھا کہ کارخانے کی لائبریری میں اور کتابوں کے علاوہ اور میرے اس دوست کی کتابیں بھی رکھی ہیں، میں نے ان میں سے ایک دو کتابیں کسی پاس کھڑے ہوئے مزدور کو دکھائیں اور پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہنے لگے "کتابیں خیر ٹھیک ہیں لیکن یہ ہمارے معیار کو نہیں پہنچتیں۔" ایک اور مثال لے لو۔ آج کل ہماری سوویٹ ادیبوں کی انجمن کو دو مسئلوں کا سامنا ہے۔ ایک مسئلہ تو کاغذ کا ہے جو آج کل بہت کمیاب ہے اور دوسرا مسئلہ ایلیا اہرن برگ کا ہے اس لئے کہ آج کل ہماری آپس میں اَن بن ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تھوڑے دن پہلے میری خود نوشت سوانح عمری دو جلدوں میں اور دس لاکھ کی تعداد میں چھپی ہے جب اس کی اشاعت اور دکانوں میں پہنچنے کی تاریخ کا اعلان اخباروں میں کیا گیا تو مقررہ دن سے ایک رات پہلے سے لوگ کتابوں کی دکانوں پر قطاریں بنا کر کھڑے ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی۔

سارتر

اہرن برگ سے رخصت ہو کر ہم سارتر کے کمرے میں گئے۔ انھیں بھی کانفرنس میں دیکھ چکے تھے لیکن کسی وجہ سے میں ان کی تقریر نہیں سن سکا تھا شکل و صورت میں سارتر ایلیا اہرن برگ سے قطعی مختلف نظر آئے۔ پستہ قد کے گول مٹول، ہشاش بشاش، چاق چوبند آدمی ہیں، ایک آنکھ میں کچھ نقص ہے اس لئے موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں، دیکھنے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی عظیم اور معتدر مفکر یا ادیب ہیں۔ یہی گمان ہوتا ہے کہ کوئی بینکر یا کاروباری آدمی ہوں گے۔ ان کی قریب قریب سب کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں آسانی سے دستیاب ہیں اس کے علاوہ مغرب کی بیشتر تنقیدی کتب میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ پھر ان کی بیوی تو نہیں کہنا چاہئے رفیقۂ حیات سیمون دبوداَر کی کتابوں میں ان کی شخصیت کی بہت سی جھلکیاں بھی ہم لوگ دیکھ چکے ہیں اس وجہ سے انھیں ملے تو ہمیں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد سیمون دبوداَر بھی اپنے کمرے سے ہمیں آملیں۔ عمر ڈھل چکی ہے لیکن بہت طرحدار، خوش وضع اور خوش لباس خاتون ہیں۔ سارتر کا چرچا تو پہلے پہل فلسفۂ وجودیت کے واسطے سے ہوا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے تجربات اور پھر ویتنام اور الجزائر کی جنگ آزادی نے ان کے نظریات بہت حد تک بدل ڈالے ہیں، خاص طور سے الجزائر میں فرانسیسی جارحیت کے خلاف اور الجزائر کے مجاہدین کی حمایت میں ان کی شجاعانہ قلمی اور عملی مہم ایک بہت قابلِ قدر معرکہ ہے اور اسی کے ذکر سے بات شروع ہوئی۔

سارتر کہنے لگے " دو تین سو برس سے سب سے مغربی ملکوں پر فتح مندی کا نشہ طاری تھا۔ اس دوران میں ان کی آپس میں ہار جیت ہوتی رہی لیکن ان لڑائیوں میں کسی ہارنے والے نے اپنی ہار تسلیم نہیں کی اور وہ اس کی ذمہ داری ہمیشہ غلط کار سیاست دانوں، نالائق جرنیلوں یا یہودی سرمایہ داروں اور غیر ملکی ایجنٹوں پر ڈالتے رہے۔ چنانچہ اس فتح و شکست سے ان کی انا اور احساس برتری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا تکبر اسی صورت میں ٹوٹ سکتا تھا کہ انھیں کسی ایسے غنیم سے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے جس کا انسانی یا قومی وجود وہ تسلیم ہی نہ کرتے تھے یعنی ایشیا اور افریقہ کے محکوم اور پس ماندہ عوام کا کوئی ملک۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ویت نام اور الجزائر کے حریت پسندوں نے اپنی فتح مندی سے اپنی سرزمین پر ہی نہیں فرانس اور امریکہ پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اہل فرانس کو اپنے ضمیر سے صفائی معاملات کرنے میں نہ جانے اور کتنے دن لگتے۔ تمھارے ہاں سے انگریز بغیر لڑائی کئے واپس چلے گئے تو انھوں نے تم پر یا اپنے لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ دونوں سے کچھ دھاندلی کی ہے۔ اگر وہ تمھیں بھی کچھ جہاد کا موقع دیتے تو شاید اول تو تمھارا آپس میں خون خرابہ ہی نہ ہوتا اور دوسرے تمھارے عوام کو اپنے دل و جگر اور دست و بازو کی طاقت کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا۔ پھر انگریز عوام بھی تمھیں اپنے سے برتر نہیں تو برابر کی مخلوق سمجھنے لگتے۔ خیر یہ بات چھوڑو، خالص ادبی اعتبار سے دیکھو تو اس خونچکاں جنگ و پیکار سے دامن بچا کر نہ جانے آپ لوگ کتنے عظیم ادبی شاہکاروں سے محروم رہ گئے ہیں۔ پھر خود ہی اپنی بات کاٹ کر کہنے لگے " نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے کہ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی ہمت آفریں شجاعانہ موضوع چاہئے جس میں انسان اپنے سے کسی بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اب یونانی زمانے کے دیوی دیوتا اور ان کے کارندے تو باقی رہے نہیں جن سے پرانے زمانے کے ہیرو نبرد آزما ہوا کرتے تھے۔ اب تو یہ تصادم مادی، معاشرتی اور سیاسی طاقتوں ہی کے خلاف ہو سکتا ہے۔ بھوک، افلاس، پس ماندگی، جبر و تشدد، اجتماعی درد و غم اور اجتماعی جہد و مشقت، عذاب و نجات، ایثار و استحصال، یہ موضوعات اگر کہیں ادیب کو دستیاب ہیں تو وہ ایشیا اور افریقہ ہی کی سرزمین میں ہیں یا پھر مختلف صورت میں سوشلسٹ ممالک ہیں۔ یہاں انسان انسان سے نہیں فطرت یا نیچر سے محو پیکار ہے اور تسخیر فطرت سے بڑا موضوع اور کیا ہوگا۔ لیکن ہمارے پاس یورپ یا مغربی ممالک میں اب لکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ بھوک، بیماری، غربت، غلامی، وہ سب کچھ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے، اب کوئی بڑا اعظم ہمارے پاس فتح کرنے کو نہیں۔ اپنے ملکوں کے سب کونے کھدرے کھنگال لئے کوئی بڑا موضوع ہی نہیں ملتا۔ طبقاتی کشمکش کا تناؤ

خلاقی نسخوں نے ڈھیلا کر دیا ہے۔ اب تو یہی ہے کہ جنس لاشعور کے جو ہڑوں پر بیٹھے گھٹیا جذبات کے کیڑوں مکوڑوں کا شکار کھیلا کریں یا ماورائی خلاؤں میں مختلف مفروضات کے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کسی کو لکھنے اور سوچنے کا ڈھب آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں اچھی کتاب لکھ لے گا اور اچھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن ان میں سے کسی کتاب کو آپ ہومر یا شیکسپئر یا ٹالسٹائی کے مقابلے میں تو نہیں رکھ سکتے۔ البتہ فن اور تکنیک میں بہت دلچسپ تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ ترقی بھی ہو رہی ہے اور اس میدان میں آپ لوگ ابھی تک گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ وہ اس لئے کہ آپ کے آباواجداد کی ادبی روایتوں کو تو ہم لوگوں نے آگے چلنے نہیں دیا اور آپ کو لامحالہ ہمارے اسالیب اظہار کی ابجد سے شروع کرنا پڑا۔ کچھ ہونہار لوگ اس پر قادر بھی ہو گئے لیکن وہ مستثنیات میں سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کئی اور لوگوں میں کہیں زیادہ جوہر موجود ہو جو محض اس وجہ سے نہیں کھل سکا کہ انھیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع ہی میسر نہیں آتے تو موجودہ صورت حال یہ ہے کہ تکنیک ہمارے پاس ہے، موضوعات آپ کے پاس ہیں، کوئی صاحب کمال ان دونوں کو یکجا کرے گا تو اس صدی کا ہومر یا شیکسپئر یا ٹالسٹائی جنم لے گا۔

ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ شیکسپئر، ٹالسٹائی تو پیدا ہو گا جب ہو گا آپ کے نظریہ ادب میں عاشقانہ یا غنائیہ ادب کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں؟ کہنے لگے "ہے کیوں نہیں، وہ تو ہر دل کا ایک فطری تقاضا ہے جس کی تسکین لازم ہے۔ لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی ہے، شاہراہ نہیں ہے ادب کی شاہراہ کو جو کسی دور میں اسے ایک منزل سے اگلی منزل تک پہنچاتی ہے اس دور کی ذہنی فکری، جذباتی اور اخلاقی افق پر پوری طرح محیط ہونا چاہئے ورنہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ قبائلی دور کے شاعر کو اپنے قبیلے کے افسانہ واساطیر اور قبیلے پر بیتے ہوئے واقعات اور تجربات کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے عہد کا تقاضا ہی اتنا تھا۔ لیکن آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے بے بہرہ ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی اور جبلی ردعمل خواہ کتنا ہی صحیح ہو اسے باہر کی دنیا تو کیا اپنے اندر کی دنیا کے کھوٹے کھرے کا بھی پورا اندازہ نہ ہو سکے گا اور تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں بھی ملے گی۔" ◻

شرون کمار ورما

جالے

وہ پریشان ہوگیا تھا۔

اٹھنا، بیٹھنا، راستہ چلنا، یہاں تک کہ سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔ ہر طرف جالے ہی جالے تھے، نظر نہ آنے والے، وہ انھیں خوش کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک دم رک جاتا اور ہوا میں ہاتھ مارنے لگتا، پھر ہاتھ صاف کرتا اور چلنے لگتا، پھر رک جاتا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیسے وہ دیکھنے کی کوشش کرتا۔ لوگ پہلے تو اسے حیرت سے دیکھتے تھے، پھر اسے پاگل سمجھنے لگے، اس پر ہنستے، آوازے کستے۔ وہ سنجیدگی سے کہتا۔

"بستی والو، مجھ پہ ہنسو مت، میں پاگل نہیں ہوں۔"

لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

"تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" کوئی کہتا۔

"تمھیں ہر طرف جالے تنے محسوس نہیں ہوتے۔" وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"دیکھو ——" وہ ہوا سے جیسے جالا نوچ کر انھیں دکھاتا۔ "ایک دن تم سب ان میں پھنس جاؤ گے پھر آزادی کے لیے تڑپو گے لیکن مکڑی تمھیں چٹ کر جائے گی۔" وہ ہوا میں ہاتھ مارتا جیسے جالوں میں پھنس گیا ہو۔

"تم گھر سے نکلتے ہی کیوں ہو؟" کوئی منچلا کہتا۔

"تمھارے لیے۔" وہ گمبھیر آواز میں کہتا۔ "مکڑی کی تلاش میں، تم سب بھی میرے ساتھ آؤ، مل کر مکڑی تلاش کریں، یہ بے حد ضروری ہے۔"

"ہمارے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے ——"

"پچھتاؤ گے۔"

بھیڑ اس کا مذاق اڑانے لگی۔

وہ ہوا میں ہاتھ مارتا آگے بڑھ جاتا۔

یہ روز کا معمول ہو گیا تھا۔ جب سورج یوکلپٹس کی ڈالیوں پر روشنی پھیلاتا تو بستی والے گھروں سے نکل کر یوں پورب کی طرف، جدھر سے وہ آتا تھا، دیکھنے لگتے جیسے ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ وہ ہوا میں ہاتھ مارتا، جیسے راستہ بناتا، آتا دکھائی دیتا، وہ خوش ہو جاتے۔ بازار میں چبوترے کے پاس، لوگ اسے گھیر لیتے۔ اس سے مکڑی اور جالوں کے بارے میں مذاق کرتے، ہنستے، وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا اور لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ وہ انھیں دکھ اور مایوسی سے دیکھتا، پھر رونے لگتا۔ لوگ اور بھی زور سے ہنسنے لگے، وہ اور بھی زور سے رونے لگتا۔ دھیرے دھیرے مجمع پر سنجیدگی طاری ہو جاتی، سناٹا چھا جاتا تب کوئی بزرگ بھیڑ سے نکل کر ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا، اسے تسلی دیتا اور پوچھتا۔

"تم روتے کیوں ہو؟"

"بستی والوں کے لئے کہ یہ اپنے انجام سے بے خبر ہیں اور بے خبری اچھی نہیں۔"

تب وہ بزرگ لوگوں کو اسے پریشان کرنے سے منع کرتا اور کہتا۔

"اس کی بات سن لینے میں کیا حرج ہے۔!"

"ہم یہ کیسے مان لیں کہ ہر طرف جالے تنے ہوئے ہیں، کوئی مکڑی ہے جو دکھائی نہیں دیتی ہمارا دماغ خراب نہیں ہوا ــــ"

"میری بات کا یقین کرو، دیر ہو گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔"

"جاؤ، جاؤ، ہمارا سر نہ کھاؤ۔"

وہ ہوا میں ہاتھ چلاتا چلا جاتا۔ لوگ تاش اور لوڈو کھیلنے میں محو ہو جاتے، ٹرانسسٹر پر فلمی گیت سنتے اور اسے بھول جاتے۔

ایک صبح اس کے ساتھ ایک عورت دیکھ کر لوگ اپنے کھیل تماشے بھول گئے۔ عورت بھی مرد کی طرح ہوا میں ہاتھ مار مار کر جالے توڑ رہی تھی۔ لوگ بے حد حیران ہوئے کہ یہ عورت اس کے ساتھ کہاں سے آ گئی۔

تب بستی والوں نے سوچ بچار کر ایک شخص کو جو دانا و چالاک سمجھا جاتا تھا، ان کے پیچھے لگا دیا۔ وہ بہت رازدارانہ ڈھنگ سے ان دونوں کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ کئی دن تک بستی سے غائب رہا، لوگ خوش تھے کہ اب ان دونوں کی حقیقت کھل جائے گی۔

حوالدار تارا سنگھ اور سیٹھ دولت رام کا خیال تھا کہ دونوں غیر ملکی جاسوس ہیں۔ سیٹھ
لت رام کی بیٹھک میں حوالدار کا آنا جانا بڑھ گیا وہ ان دنوں بہت پھرتی، چالاکی اور تندہی
ے کام کرنے لگے تھے۔

کئی دن گزر گئے۔ وہ دانا و چالاک شخص بستی میں واپس نہیں آیا۔ اب بستی والوں کو تشویش
ئی۔ آخر ایک صبح جب سورج یوکلپٹس کی ڈالیوں پر روشنی بکھیر چکا تو پورب کی طرف سے تین سائے
دار ہوئے، وہ تینوں ہوا سے جالے نوچ رہے تھے، مرد، عورت اور وہ دانا و چالاک شخص۔
لوگ سوچ میں ڈوب گئے۔

کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ بستی والوں نے تاش، لوڈو اور ریڈیو بند کر دیئے اور ہر
ڑی ان تینوں کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تینوں ہوا سے جالے نوچتے، چپ چاپ گزر جاتے،
الدار تارا سنگھ اور سیٹھ دولت رام اندر ہی اندر تلملا کر رہ جاتے۔ وہ اب روز ملنے لگے تھے
ے اپنے بیچ سے ایک دانا و چالاک شخص کے کم ہو جانے سے اداس ہو گئے تھے۔ وہ اسے
ک کر بستی میں لوٹ آنے کے لئے کہتے، لیکن وہ انہیں اس طرح دیکھتا جیسے کسی کو نہ پہچانتا ہو
ں کے اس طرز عمل نے بستی والوں کو اور بھی مایوس کر دیا تھا۔ اب وہ ان پر آوازے نہیں
تے تھے، انہیں دیکھ کر ہنستے بھی نہیں تھے۔ اپنی اپنی جگہ پر، سر جھکائے کھڑے رہتے اور
یں گزرتے دیکھتے رہتے۔ ان کے چلے جانے کے بعد سر جوڑ کر بیٹھ جاتے۔

بستی کا کام کاج ٹھپ ہو گیا۔ حوالدار اور سیٹھ کی تلملاہٹ اور پریشانی بڑھ گئی، امیر
م میں مشورے ہونے لگے۔ حوالدار تارا سنگھ روز بستی میں اعلان کرتا کہ لوگ ان تین پاگلوں
طرف توجہ نہ دیں، اپنے کام کی طرف دھیان دیں کہ بستی کے حق میں یہی بہتر تھا۔ لوگ
دلی سے اس کی بات سنتے وہ کام کرنے کی کوشش کرتے اور پریشان ہو کر بیٹھ رہتے
بستی میں ویرانی سی چھا گئی تھی۔

لوگ یوکلپٹس کی ڈالیوں پر روشنی دیکھتے ہی گھروں سے نکل آتے اور پورب کی طرف
یکھنے لگتے۔ جب وہ تینوں بستی میں پہنچتے تو لوگ کہتے۔

"ہم پریشان ہو چکے ہیں۔"

"ہمارے ساتھ چلو——"

"کہاں——؟"

"جالے صاف کرنے۔"

لوگ سر تھام کر بیٹھ جاتے اور وہ تینوں گزر جاتے بستی والے، ڈرے سہمے سے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ آخر ایک رات ایک بزرگ نے کہا۔

"پتہ نہیں کون کب ان کے قافلے میں شامل ہو جائے۔

"چپ رہو۔" سیٹھ چیخا۔

"یہ بوڑھا ہمیں خوفزدہ کر رہا ہے۔" حوالدار نے کہا۔ "اسے اندیشۂ نقص امن" میں گرفتار کر لینا چاہئے۔

بزرگ تو خاموش ہو گیا لیکن اس کی بات سن کر ہر شخص اپنے آپ سے ڈرنے لگا۔ آدمی کا خود پر سے یقین اٹھنے لگا۔ اب وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

"اس طرح ہم اپنا اطمینان، سکون، چین سب گنوا دیں گے۔"

اُس بزرگ سے پوچھ تاچھ کی جائے۔" حوالدار تارا سنگھ نے کہا۔

اس بزرگ کو پنچائت میں پیش ہونا پڑا۔

"بزرگوار، تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی، کسی وقت ان تین پاگلوں میں شامل ہو سکتا ہے۔" سیٹھ نے پوچھا۔

"مجھے ایسا محسوس ہوا، میں نے کہہ دیا۔"

"تم کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے، جس سے بستی میں دہشت پھیلے، یہ غیر قانونی ہے" حوالدار نے آنکھیں دکھائیں۔

"میں نے سچ کہا ہے۔" بزرگ نے نڈر تا سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں بستی والے سوچیں کہ وہ دانا و چالاک شخص ان دونوں میں کیوں جا شامل ہوا اور یہ کہ وہ مرد اور عورت ایسا کیوں محسوس کرتے ہیں، ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔"

"یہ بوڑھا بغاوت کی بات کر رہا ہے۔" حوالدار نے کہا۔

"یہ ہمارا دشمن ہے۔" سیٹھ نے کہا

اسی رات کسی نے بوڑھے کو قتل کر دیا، اب بستی کے تمام بوڑھے خوفزدہ اور خاموش رہنے لگے۔ ان سے کچھ پوچھا جاتا تو وہ خاموشی سے پورب کی طرف دیکھنے لگتے۔ دھیرے دھیرے وہ بولنا بھول گئے، بس بیٹھے ہواؤں سے جالے توڑتے رہتے۔

ایک صبح وہ تینوں بستی میں آئے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ دانا و چالاک
ں بازار کے بیچ چبوترے پر چڑھ گیا۔
"بھائیو" اس نے پکارا۔ "تم سب نے مجھے دانا و چالاک سمجھ کر مجھ پر بھروسہ کیا،
نے تمھیں دھوکہ نہیں دیا۔ راز جان لیا ہے، یہ دونوں جالوں کی وجہ سے پریشان ہیں،
نے بھی جالے محسوس کئے ہیں، کچھ دنوں سے یہ جالے زیادہ مضبوط اور تنگ ہوتے جا رہے
ہم تین انھیں نہیں صاف کر سکتے۔ اس سے پہلے کہ تم سب ان کا شکار ہو جاؤ، ہمارے
آؤ۔"

"ہمیں وہ جالے اور مکڑی دکھاؤ۔" حوالدار نے کہا۔
"سب کچھ دیکھایا دکھایا نہیں جا سکتا اور یہ بھی نہیں کہ جو نظر نہ آئے، وہ ہے بھی نہیں۔"
شخص نے سنجیدگی سے کہا۔ "راستہ چلتے یہ جالے میرے گرد لپٹ جاتے ہیں، میری آنکھوں
بھر جاتے ہیں۔ مجھے جکڑ لیتے ہیں اور یہ سب تمھارے ساتھ بھی ہوگا۔"
مجمع خاموش تھا، سر جھکائے، کسی سوچ میں گم۔ وہ تینوں آگے بڑھ گئے۔ بستی کے خاموش
ں چپ چاپ ان کے ساتھ ہوتے، اب بستی والے چونکے، انھوں نے بزرگوں کو روکنا چاہا
وہ نہیں مانے۔
اب وہ تیرہ[۱۳] تھے۔
حوالدار تارا سنگھ مسکرایا پھر وہ چبوترے پر چڑھ گیا اور بستی والوں سے مخاطب ہوا
"بستی والو، یہ لوگ اب امن کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں، انھیں گرفتار کرا دینا چاہئے
نے سیٹھ جی اور حکام سے بات کر لی ہے۔"
لوگ خاموش رہے۔ حوالدار وردی پہن کر تھانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ
یوں کے ساتھ بستی سے گزرا۔ جو ہتھیاروں سے لیس تھے اور ادھر چلا گیا۔ جدھر سے وہ
آتے تھے۔ شام پڑے جب وہ واپس آیا تو فتح کے نشے میں چور تھا۔ بارہ آدمی جن کے
پیٹھ پر بندھے تھے، سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ چبوترے پر چڑھ کر
نے اعلان کیا۔
"بستی والو، اب اطمینان سے کام کرو، یہ سارے پاگل، باقی زندگی پاگل خانے میں
دیں گے، یہ فیصلہ اوپر ہوا ہے۔"

لوگ سر جھکائے کھڑے رہے پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے حوالدار کو ان پر بے حد غصہ آیا، وہ انھیں گالیاں دیتا، قیدیوں کو لے کر تھانے چلا گیا۔

اگلی صبح جب سورج کی روشنی یوکلپٹس کی ڈالیوں پر بکھری تو پہلا مرد اکیلا بستی میں داخل ہوا۔ وہ ہوا میں ہاتھ چلا رہا تھا، لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے۔ حوالدار بھاگا بھاگا تھانے پہنچا۔ جب وہ سپاہیوں کے ساتھ واپس بستی میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بستی کے تمام لوگ، مرد، عورتیں بچے، اس مرد کے ساتھ ہوا میں ہاتھ چلاتے چلے جا رہے تھے — پورب کی طرف۔

حوالدار چبوترے پر کھڑا حیران بستی کو خوفزدہ سا دیکھ رہا تھا۔ ☐

FORM IV (*See Rule 8*)

1 Place of publication — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
2 Periodicity of its publication — دوماہی
3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
5 Editor's Name — اطہر پرویز
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or shareholders holding more than one percent of the total capital.
اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-83

Signature of Publisher
Asad Yar Khan

منظور ہاشمی
پوسٹ بکس ۱۱۰۴۸ ۔ ریاض
سعودی عرب

غزلیں

اک روز چمکنے کا امکان بھی رکھتے ہیں
ذرّے تو ہیں، سورج کا ارمان بھی رکھتے ہیں

اڑتی ہوئی خوشبو کا جاتا ہوا جھونکا ہیں
پھولوں سے مگر عہد و پیمان بھی رکھتے ہیں

اس بھیڑ میں شامل ہیں، پر اس کے حوالے سے
ہونے کی الگ اپنی پہچان بھی رکھتے ہیں

آوارہ بھٹکنے کی لذت بھی ہماری ہے
منزل کی رسائی پہ ایمان بھی رکھتے ہیں

آئینہ نہیں ہیں ہم بس پچھلی روایت کا
آئندہ زمانوں کا عرفان بھی رکھتے ہیں

ہم شہرِ وفا میں بھی اک زندہ روایت ہیں
جی جان سے اس کے ہیں پیمان بھی رکھتے ہیں

اس درجہ غنی کیوں ہیں ہم تیری گلی والے
غربت میں لٹانے کا سامان بھی رکھتے ہیں

لہو میں جس سے ابال سا تھا
تو کیوں وہ خواب و خیال سا تھا

جو زندگی تھی اسی سے کٹ کر
ہمارا جینا کمال سا تھا

اسی زمانے میں میں کہاں تھا
کہ جس کی زندہ مثال سا تھا

طلب اس کی ہی کیوں تھی ہم کو
کہ جس کا ملنا محال سا تھا

میں جس سے نظریں بچا رہا تھا
اس آنکھ میں اک سوال سا تھا

تمام موسم تھے اس کے موسم
کہ ہجر بھی تو وصال سا تھا

بیت السراج، ۱۶۰ - خاقانی منزل
وزیر گنج، لکھنؤ

سید حبیب اکبر نقوی

یادوں کا جنازہ

اللہ اکبر، اللہ اکبر ـــــ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔
میں اسی وقت شراب ساغر میں ڈھلتی ہے ـــــ قُل قُل قلت ـــــ اس کی سرخی سے چہرے کی چمک دمک اور بڑھ جاتی ہے اور اس پر مسرتوں کا ہجوم نظر آتا ہے ـــــ
"شروع کرتا ہوں ـــــ بڑے میاں کے نام سے جس نے یہ شراب پلوائی بڑا کاریگر ہے وہ" ـــــ چسکی لے کر رند بلا نوش فرماتے ہیں ـــــ
"حضور! اذان کے وقت تو نہ پیا کیجئے" ایک چہیتے صاحب نے فرمایا ـــــ
"آہا ـــــ کیا بات ہے میاں اللہ رکھو ـــــ ضد ہی میں تو مزا دو آتشہ ہو جاتا ہے ـــــ پی لو، زندگی کا مزا اسی میں ہے پیارے، شراب طہورا کا بھروسہ، ملے ملے نہ ملے ـــــ رند بدھوش کی باتیں ہیں بکواس نہیں ـــــ"
"لاحول ولا قوۃ ـــــ یہ کیا خرافات بکتے ہیں آپ" چہیتے مولوی صاحب نے بڑے غصے سے فرمایا۔
"خرافات؟ ـــــ واہ ری جنیا، ایسی بھڑکتی ہو جیسے بالکل سولہ سال کی چھپن چھری ہو رہی ہو گدرا انار جیسے لٹو ناچے، ڈم ڈما ڈم ـــــ رند نکتہ داں کے اقوال ہیں بنیئے کی کتاب نہیں" ـــــ
مولوی صاحب کا منھ پھول کر کپا ہو جاتا ہے اور بالکل "ہٹو مجھے چھیڑتے ہو" کے انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔
"میری سونی سوندیا ہار مان گئی، بڑا غصہ ہے اپنے حسن فرسودہ پر اچھا جاؤ اب کچھ نہ کہوں گا تمھارے اللہ میاں پیارے کو، چلو ہنس کر ذرا ادھر دیکھ لو میری جان ـــــ میاں اللہ رکھو ـــــ مگر یہ تمھارے بڑے میاں کا حساب کتاب کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے ـــــ اب

دیکھئے نا ـــــ نیر و شیر کو خود پیدا کیا، یعنی ایک طرف اٹھتی جوانی دوسری طرف سجدۂ پیشانی پھر کہتے ہیں، "بیٹا ذرا بچ کر رہنا" ـــــ کیا لغویت ہے یہ (اپنے اچھوتے انداز میں) واللہ، آہا ہا ـــــ جی ـــــ"

"ارے حضور، یوں تو نہ کہئے" ـــــ مولوی صاحب بھرپور سنجیدگی سے فرماتے ہیں "میری جان پھر کیسے کہوں؟ کھری کھری کہی تو مولوی اللہ رکھو چڑی، ہاہاہا، ہی ہی ہی ـــــ ارے بھئی تمھیں انصاف کرونا، آدم کو جنتی میوے اور پتہ نہیں کیا کیا الّم غلّم کھلایا، اور پھر کہتے ہیں ادھر نہ جانا، ادھر ایک کنیا کماری رہتی ہیں، مگر وہ اللہ کا بندہ کہاں مانا، کود پڑا کفن باندھ کر جوا پر ـــــ آہاہاہا۔ آہا ـــــ اُداُدو" ـــــ خود رند قدح خوار کے پیٹ میں بل پڑے جا رہے ہیں، جب ہنسی رکتی ہے تو یوں فرماتے ہیں ـــــ "کیسی کہی بٹیا ـــــ" اور ذرا بڑھ کر "میری جان" اور مولوی صاحب کو گلے لگا لیتے ہیں ـــــ

میں بھی ایک مصاحب خاص کی طرح "کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن" کا مصداق بنا ہوا بیٹھا تھا۔

یہ ہیں شاعر انقلاب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، جن کی صحبتوں کا شرف میں اپنے دوران قیام کراچی (پاکستان) میں حاصل کرتا رہا تھا۔

حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، دنیائے اردو ادب جانتی ہے کہ لسان الہند حضرت عزیزؔ لکھنوی کے نامور شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ حضرت عزیزؔ لکھنوی کے تین صاحبزادے ہیں۔ جناب ابو محمد صاحب، جناب محمد صادق تلمیذؔ لکھنوی، اور جناب حیاتؔ لکھنوی ـــــ یوں تو تینوں صاحبزادوں سے میرے خاندانی تعلقات ہیں مگر آخر الذکر جناب حیاتؔ صاحب سے مجھے ربط خاص ہے یعنی دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں، ایک جان دو قالب کی حقیقت نظر آتے ہیں، وہ مجھے اپنے حقیقی چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ جب انھوں نے میرا تعارف حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے کرایا تو یہی کہہ کر کہ یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ تب سے میں ان کا منہ بولا چھوٹا بھائی بن بیٹھا اور حضرت جوشؔ بھی مجھے حضرت عزیزؔ لکھنوی کا فرزند سمجھنے لگے۔

یہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۰ء کی صبح تھی۔ میں کراچی شہر کی پُر ہجوم اور ہنگامہ خیز شاہراہوں کو چیرتا پھاڑتا "ملیح آباد ہاؤس" پہنچا، معلوم ہوا، حضرت جوشؔ ملیح آبادی یہاں نہیں رہتے ہیں، لوگوں سے پوچھا مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ اس چلتی پھرتی دنیا میں ہوش کس کو، تو چل میں آیا کی مثال یہاں

صادق آتی تھی۔ اسی محلے کے معمر آدمی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب یہاں جوش ملیح آبادی کہاں رہتے ہیں ؟"

وہ بولے۔"کون جوش صاحب ؟"

وہ پاکستان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔" میں نے کہا۔"

"بھائی شاعر واعر کو تو میں نہیں جانتا۔" یہ کہہ کر وہ چلتے بنے۔

میں نے دل میں کہا کہ بیچارے جوش صاحب کی مٹی پلید ہو گئی، اُف یہ حالت ہے اس شہر کی۔ میں افتاں و خیزاں آگے بڑھا کہ شاید کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی پڑ جائے، مگر وہاں کے بیچارہ پریشان ماحول میں جس کو دیکھو آنکھیں بند منہ کھلا ایک طرف سر اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ کچھ آگے بڑھا تو دیکھا ایک شخص سنگین صورت، بال بڑھے ہوئے، ڈھیلی ڈھالی پتلون، چُرسوں دار قمیض پہنے ہوئے چلا آرہا ہے، میں سمجھا ضرور کوئی شاعر یا کلاکار ہے۔ اس سے بھی پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی مگر مجبوراً دریافت کرنا ہی پڑا ــــــ

"کیوں جناب آپ کو کچھ معلوم ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی جو پاکستان کے مشہور و معروف شاعر ہیں کہاں رہتے ہیں، وہ شاعر انقلاب بھی کہلاتے ہیں" ــــــ یہ کہہ کر میں اس غریب کی صورت بڑی معصومیت سے تکنے لگا۔

بڑی دیر تک تو وہ گم سم کھڑا رہا، پھر ہاں ہوں کر کے بڑی اداکاری کے ساتھ یوں بڑبڑایا ٹھیک ہے ــــ پہلے تو یہیں کہیں رہتے تھے ــــــ مگر اب کہاں رہتے ہیں ؟" اپنے سر پر انگلیوں سے ٹھنگی بھی لگاتا جاتا تھا ــــــ

"اوہاں ٹھیک تو ہے، خوب یاد آیا" ــــــ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ــــــ بس آپ یہ سمجھ لیجئے، کراچی میں جہاں سب سے زیادہ گدھے بندھتے ہیں وہیں جوش صاحب رہتے ہیں۔"

اس کا یہ جملہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا، مگر مرتا کیا نہ کرتا، میں نے کہا ــــ "کیوں مذاق کرتے ہیں۔"

اس نے برجستہ جواب دیا۔" ارے آپ مذاق سمجھ رہے ہیں۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے ایک صاحب آپ ہی کی طرح جوش کا پتہ پوچھ رہے تھے تو ایک صاحب نے جگہ کا نام بتاتے ہوئے اس بات پر زیادہ زور دیا تھا کہ یہاں کراچی شہر کے سب گدھے بندھتے ہیں، جگہ کا نام تو بھول گیا

گدھے ضرور یاد رہ گئے"۔۔۔۔ اور یہ تیر چلا کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اب میں نے سوچا کہ جوش صاحب کا پتہ پوچھنے کے بجائے گدھوں کا پتہ لگانا عین دانشمندی کا کام ہے۔ بظاہر احمقانہ حرکت لگ رہی تھی، مگر سوال درپیش تھا کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ وقت تھا کہ چھلانگیں بھر رہا تھا، بس اور رکشہ کے پھیر ہی میں دو گھنٹے برباد ہو چکے تھے۔ جوش صاحب سے ملاقات کرنے کے اوقات سے میں واقف تھا۔ وہ ۱۰ بجے دن سے ۱۲ بجے دن تک اور شام کو ۵ بجے سے ۸ بجے تک ملتے ہیں اور وہ پابندی وقت کے سخت قائل ہیں۔

بڑھ کر ایک گدھے گاڑی والے سے پوچھا۔۔۔۔ "میاں یہاں سب سے زیادہ گدھے کہاں بندھتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا، مجھے اس کی ہنسی پر سخت تاؤ آیا۔۔۔۔ پھر وہ خود ہی بولا۔۔۔۔

"کیوں صاحب وہاں جا کر آپ کیا کرو گے؟"

"تمھیں اس سے کیا، اس جگہ کا نام بتادو"۔۔۔۔ میں نے ذرا بھنویں چڑھا کر کہا۔

"جگہ کا نام تو صاحب" "۴ نمبر فیڈرل بی ایریا" ہے میں وہیں رہتا ہوں، آپ خفا بے کار ہو رہے ہیں۔ وہاں آپ کہاں جاؤ گے شاید میں ہی کچھ بتا سکوں"۔

"جوش صاحب ادھر کہیں رہتے ہیں"۔ میں نے سرسری طور سے اس سے کہا اور آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے جواب نے مجھے زمین پر چت کر دیا۔

"جوش ووش کو تو میں نہیں جانتا، مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہاں ایک بہت بڑے شاعر رہتے ہیں، نام اپن کو نہیں معلوم"۔۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے گدھے پر چابک ماری اور ٹک ٹک کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔۔۔۔ چابک اس نے گدھے پر ماری مگر دونوں شانے میرے بے ساختہ اوپر اچھل گئے۔ میں نے خوب زور سے چلا کر کہا۔۔۔۔ "گاڑی والے تمھارا بہت بہت شکریہ"۔

یہ ہیں پاکستان کے شہر کراچی کی بلندیاں اور پستیاں جو میرے ذوق جستجو کو تربیت دے رہی تھیں۔ آخر کار گنبد والی کوٹھی جو حضرت جوش ملیح آبادی کی رہائش گاہ ہے وہاں پہنچ گیا دستک دینے پر ان کا نواسہ باہر نکلا، میں نے دریافت کیا۔۔۔۔ "حضرت جوش تشریف رکھتے ہیں"۔

"جی ہاں۔۔۔۔ آپ کا اسم مبارک؟"

"کہہ دیجئے لکھنؤ سے حیات صاحب کا چھوٹا بھائی حبیب اکبر آیا ہے"۔

وہ بچوں کی طرح دوڑتا ہوا پہلی منزل پر گیا ـــــ اور اس نے جو اُس سے کہا تھا وہاں جاکر دہرا دیا۔ میں باہر جہاں پورٹیکو میں کھڑا تھا۔ وہاں سے پہلی منزل اتنی قریب تھی کہ جوش صاحب کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی ـــــ

"ارے بلاؤ جلدی بلاؤ، اپنے ساتھ لے کر آؤ" جوش صاحب نے بڑی بے قراری سے کہا۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرکے اوپر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ـــــ "آؤ بھئی آؤ، تم کہاں آ گئے اس کفرستان میں ـــــ رعشہ سے گردن ذرا ہلتی جاتی، مسکراتے ہوئے، دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

میری آنکھوں میں دفورِ مسرت سے آنسو ڈھلک آئے۔

"آنکھیں ترس گئیں تم لوگوں کو دیکھنے کے لئے" اور پھر ان صاحبین سے جو اس وقت حاضر دربار تھے مخاطب ہو کر فرمایا ـــــ یہ ہمارے استاد زادے ہیں حضرت عزیز کے چھوٹے صاحبزادے"۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر ـــــ "تم حیات سے چھوٹے ہو، نا"؟

میں نے کہا ـــــ "جی ہاں"۔

"کتنی صورت ملتی ہے"، جوش صاحب نے فرمایا۔

اتفاق سے میں رنگ روپ میں حیات صاحب سے کافی مشابہ ہوں۔ پاس ہی اُم الشعرا یعنی بیگم حضرت جوش بھی تشریف فرما تھیں ـــ

"اے ہے میں تو یہی سمجھی کہ حیات آ گیا"۔

میں نے جھک کر تسلیم کی۔ وہ ہوں کرکے رہ گئیں۔

"کہو سب کیسے ہیں"، جوش صاحب نے خیریت دریافت کی۔

"جی ہاں اللہ کا شکر ہے بحمد اللہ سب خیریت سے ہیں"، میں نے جواب دیا۔

"حیات اچھا ہے؟ اب کتنے بچے ہیں؟" ـــــ جوش صاحب نے تبسم لہجہ میں پوچھا۔

"ماشاء اللہ بالکل تندرست ہیں بچے اتنے ہی ہیں جتنے آپ دیکھ کر آئے تھے"۔ میں نے کہا۔

"شکر ہے خدا کا، بڑے صبر سے کام لیا"، جوش صاحب نے فرمایا ـــــ پھر بڑی بیقراری سے دریافت کیا ـــــ

"حضرت عزیز کی بیوہ کہاں رہتی ہیں؟"

"زیادہ تر دہلی میں صادق صاحب اور حیات بھائی ہی کے یہاں رہتی ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تم ان کے لئے پنشن کی کوشش کر رہے تھے، اس کا کیا ہوا؟" بالکل اس طرح دریافت کر رہے تھے جیسے کوئی معاملہ اپنے خاندان ہی کا ہو۔

"ان کی پنشن تو ہوگئی، وہی جو آپ نے خط لکھا تھا"۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔ چلو یہ ایک نیک کام ہوگیا، تم لوگوں پر کچھ بار کم ہوگیا"۔ جوش صاحب نے فرمایا ——"تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اردو میں ایم۔ اے کیا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"خوب، شاباش، تم تو وہاں ریلوے میں بھی ملازم تھے"۔ مصاحبین کو مخاطب کرکے بولے "دیکھئے صاحب اس پرآشوب زمانے میں صاحبزادے نے ملازمت کرنے کے ساتھ تعلیم بھی مکمل کرلی"۔ سبھی ایک زبان ہوکر بولے۔ "ماشاءاللہ"۔

"یہاں کہاں ٹھہرے ہو" —— پھر خود ہی فرمانے لگے "تمھاری ایک بہن بھی تو یہیں رہتی ہیں، وہیں ٹھہرے ہوگے، اچھا ٹھیک ہے"۔

میں نے کہا۔ "جی ہاں"۔

"وہ کہاں رہتی ہیں"۔

"ڈرگ روڈ پر"۔ میں نے کہا۔

"اُف فوہ، وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اور پھر یہاں کی بسوں اور رکشوں کی وہ دھکم پیل ارے توبہ۔ واللہ ایسے ہچکولے پڑتے ہیں کہ اگر کوئی حاملہ بیٹھ جائے تو ہینگ لگے نہ پھٹکری اسقاط حمل ہوجائے" —— سب نے خوب زوردار ٹھٹھا مارا اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ بولے۔

"واللہ قسم خدا کی میں سچ کہتا ہوں اکثر ٹیلسی سے گذرا تو دیکھتا گیا ہوں بلیوں اچھل رہی ہے —— اُف تھوڑی دیر خاموش ہوکر بولے —— "کیا ٹیل ہے اللہ کی پناہ" کچھ دیر بعد بولے۔

"کیا کچھ نیک ارادے ہیں؟" وہ بڑی بے قراری سے میرے جواب کے منتظر تھے۔

میں مسکرانے لگا، اسی اثنا میں گھڑی پر نظر گئی تو ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا "انشاءاللہ حاضر ہوتا رہوں گا"۔

تم بہتر یہی ہے کہ یہیں چلے آؤ، ڈرگ روڈ سے آنے میں تو بڑی زحمت ہوتی ہوگی، ایسا کیجیے

تمھارا ہی گھر ہے۔ کچھ میری بھی مدد ہو جایا کرے گی۔" بڑی محبت سے جوش صاحب نے فرمایا۔

"یہ آپ کی عزت افزائی ہے، میں انشاءاللہ روز حاضر ہوتا رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا میاں، خدا حافظ، جیتے رہیئے۔"

میں نے جھک کر سلام و مصافحہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوا۔

دوسری ملاقات کے لئے جب میں وہاں پہنچا، تو نیچے ہی سے حضرت جوش کی گھن گرج آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ ادبی مباحثہ میں معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی نے ان کو چھیڑ دیا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی معلوم ہوا کہ غصہ رفو چکر ہو گیا۔

میں نے جھک کر تسلیم کی۔

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا ـــــ "جیتے رہیئے، یہ خوب روز آنے کا وعدہ فرما گئے تھے، کیوں خیریت سے تو ہو؟"

"شکر ہے خدا کا، بس کچھ پیچش کی شکایت ہو گئی تھی۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"ارے میاں بڑا ذلیل شہر ہے یہ، یہاں کا پانی، دانہ، ہوا ہر ایک چیز بدترین اور سب میں ملاوٹ ہے، ابھی کیا ہے آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا ـــــ اچھا آؤ بیٹھو ـــــ کچھ اقبال کے رسیا بیٹھے ہیں، وہی بحث ہو رہی تھی، اتفاق سے وہ جملہ میں کہنے جا رہا تھا کہ تم آگئے، چلو اچھا ہی ہوا ـــــ ہاں تو جناب ـــــ ایک اقبال پنجاب میں کیا پیدا ہو گئے سر علامہ اقبال بن گئے اور میں کہتا ہوں، ہمارے لکھنؤ میں بادر چی ٹولہ اور نخاس کی گلیوں میں ہزاروں اقبال مارے مارے اب بھی پھر رہے ہیں، ہائے یوسف ہزاروں ہیں مگر خریدار کوئی نہیں۔"

میں نے دل میں کہا ـــــ حضرت جوش نے دریا بہا دیئے لکھنؤ کی شان میں، اس سے بڑھ کر اب لکھنؤ سے عقیدت و محبت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر میرا چلو دُوں خون بڑھ رہا تھا، میں نے بڑی محبت بھری نظروں سے جوش صاحب کو دیکھا، دل تو چاہا جا کر ہاتھوں پر بیعت کر لوں، مگر خُردی کا احساس مانع آیا ـــــ کاش میرے پاس اس وقت ٹیپ رکارڈ ہوتا۔

"کیوں صاحب کیا آپ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان سونا اگل رہا ہے، بس دو تین بار جو دوڑنا پڑا تو پتلون ڈھیلی اور آنکھیں دھنسی جا رہی ہیں، کوئی یہاں ملازمت آپ کے لئے دھری تو نہیں تھی۔ ارے میاں آئے ہو ذرا یہاں کے لیل و نہار دیکھو، اب چاہتے ہیں بڑھیا نوکری بھی

لے اور جلدی بھی لے ۔ ذرا جوتے کی ایڑیاں تو گھس جانے دو، ابھی کیا ہے، ابھی تو پھنگی میں پھنسے ہو"۔ تیسری ملاقات میں جب میں بیٹھا ہوا جوش صاحب سے محو گفتگو تھا، ایک صاحبزادے جو ملازمت کے لئے دوڑ رہے تھے یہ ان کی ضیافت کی جا رہی تھی ـــــ جب وہ صاحبزادے وہاں سے چلے گئے تو جوش صاحب فرماتے ہیں: ۔

ـــــ "اماں ـــــ جس کو دیکھو چلا آرہا ہے، یہاں کوئی ٹھیکا لے رکھا ہے ۔" کچھ غصہ میں چہرہ سرخ ہوگیا تھا ـــــ" ہاں نہیں تو ـــــ" پھر آہاہا کر کے ہنسنے لگے ـــــ "لائیے اکبر میاں ذرا پان کی ڈبیہ اٹھائیے، معاف کرنا بھائی"۔

" ارے یہ آپ کیا فرماتے ہیں" ـــــ میں نے جھٹ سے پان کی ڈبیہ پیش کی ۔

" عجیب بات ہے یہاں کی مٹی میں واللہ، ایک سے بڑھ کر ایک مکار و دغاباز شیطان اور حیوان سے بدتر"۔ وہاں کے باشندوں کی ہجو کرتے ہوئے جوش صاحب فرماتے ہیں۔ سامعین میں قریب قریب سبھی مہاجر تھے ۔ مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔" اکبر میاں ! وہاں تو ایک سے خطرہ تھا، یہاں ہر ایک سے ڈر ہے، بس چلے تو دو آنے پر جان لے لیں، پانی کی لائین میں گڑ بڑ کر کے خون خرابہ کر لیں گے ۔ بڑی جاہل قومیں بسی ہوئی ہیں"۔

حضرت جوش ملیح آبادی مے نوشی میں مصروف تھے ۔ میں جالب دہلوی اور کوئی ایک صاحب بیٹھے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے ۔ اردو ادب کی ترویج و ترقی پاکستان میں کس منزل سے گذر رہی ہے یہ موضوع زیر بحث تھا۔ دیر سے ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے شام کے ساڑھے سات ہو چکے تھے ، دیکھتے کیا ہیں دو صاحبان چلے آرہے ہیں ۔ جوش صاحب کے تیور بدلے اور بدبدائے ـــــ "دیکھئے صاحب ، یہ کون بلائیں نازل ہو رہی ہیں"ـــــ

یہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی نشست برخاست ہونے کا وقت ہوا چاہتا ہے یا پھر ایسے لوگ آجاتے ہیں جن سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ ہو ـــــ مگر اس کے باوجود جب ان دونوں حضرات نے تسلیم کی تو بڑے تپاک سے جواب دے کر فرمایا ـــــ "آئیے تشریف لائیے" (منہ چڑھانے والی ہنسی لبوں پر لاتے ہوئے)

تھوڑی دیر خاموشی رہی ـــــ ترنگ میں تو آہی گئے تھے ـــــ "کیوں بھئی یہ کیا ہوا ، سب کو سانپ سونگھ گیا" ـــــ ایک قہقہہ فضا میں بلند ہوا ۔ رعشہ سے گردن ہلتی ہوئی

——"معاف کیجئے گا آپ حضرات کو میں نے پہچانا نہیں —— یہ بڑھاپا یونہی بہتوں سے شرمندہ کرا چکا ہے"۔

دونوں میں سے ایک نے اپنا تعارف کرایا ——" میں مجتبیٰ حسین سراج الدولہ انٹر کالج میں اردو کا لکچرر ہوں۔ کافی عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس لئے شاید آپ بھول گئے"۔

دونوں حضرات تھوڑی دیر بیٹھے، پھر "سلام علیکم" کر کے چلتے بنے۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جب تعارف ختم ہوا تو جوش صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ کچھ بے چین ہو گئے تھے یہ راز اس وقت فاش ہوا جب وہ دونوں حضرات کوٹھی کے پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

جوش صاحب ہم لوگوں کو مخاطب کر کے بولے ——"سراج الدولہ انٹر کالج میں "اردو لکچرر" (لکچرر پر زور دے کر) مجتبیٰ حسین صاحب اور ——" عرصہ کے ساتھ "کافی" —— یہ قابلیت کی حدیں ہیں تو جو ہونٹے پڑھ کر نکلیں گے ان کا عالم کیا ہوگا —— ارے جناب "عرصہ" خود ایک طویل مدت کو ظاہر کرتا ہے اس میں "کافی" کی کیا ضرورت تھی" ——

ہم لوگ بولے —— "جی ہاں درست فرماتے ہیں"۔

"اچھا بھائی خدا حافظ، ہمارا وقت تو ہو گیا"۔ چلتے چلاتے بھی جوش صاحب نے تمسخر کیا۔ "ارے جالب صاحب، اکبر میاں کو جہاں تک وہ کہیں پہنچا دیجئے گا، بچارا بڑی دور سے میری محبت میں کھنچا چلا آتا ہے"۔ جالب دہلوی بولے —— "بہت اچھا حضور، آپ فکر نہ کریں"۔

ابھی تک جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں، میں نے جوش صاحب کو اکیلے نہیں پایا، آج چھٹی ملاقات میں اتفاق سے بالکل تنہا تشریف رکھتے تھے اور شاید کوئی ترجمہ فرما رہے تھے، میں جب پہنچا تو جوتے کی چاپ سے جو آہٹ ہوئی اس سے عینک کو ناک کی پھنگی پر پھینک اور آنکھیں نیچے جھکا کر دیکھنے لگے ——" آؤ —— آؤ، آؤ —— میں تو سمجھا تھا کہ پتہ نہیں کون آگیا، دل دھک سے ہو گیا تھا مگر اللہ نے سن لی —— بیٹھو —— بس ایک منٹ" کاغذ وغیرہ جو کچھ پھیلے ہوئے تھے درست کر کے گاؤ تکیہ کا رخ میری طرف کر کے بیٹھ گئے" ہاں اب فرمائیے اکبر میاں" —— پان کی ڈبیہ سے ایک ایک پان بڑے سلیقہ سے نکال کر نوش کرتے جاتے تھے —— تم نے دیکھا، جتنی بار تم آئے کوئی نہ کوئی چمر گدھ اس زندہ لاش کو نوچنے کے لئے بیٹھا رہتا تھا، تم سے تو کھل کر باتیں ہی نہیں ہو پائیں، خدا کی قسم یہاں آ کر پچھتا رہا ہوں —— جنگل ہے جنگل۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"یں تو یونہی گھومنے آیا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"بہت اچھا بلکہ زریں خیال ہے جتنی جلدی ہو یہاں سے بھاگ جاؤ، شریفوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے میں تو اب اپنے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا"۔

آپ سے ملئے، آپ منور عباس صاحب، کراچی کے نامور وکیلوں میں سے ہیں اور اگر یہ بھی کہوں کہ جوش صاحب کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف حضرت جوش کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے مالک بنے ہوئے بیٹھے ہیں یعنی جملہ حقوق ان کی تمام تخلیقات کے منور عباس صاحب کے حق میں محفوظ ہیں۔ جوش صاحب کی مخصوص نشست ہر ہفتہ منور عباس صاحب کے دفتر واقع سٹی کورٹ ڈیسو ہال میں ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ جوش صاحب نے مجھے بھی وہیں بلایا، میرا ہی کام تھا، خوب دھواں دھار محفل جمی، میرا تعارف بھی بڑی دھوم دھڑکے سے کرایا اور پھر مجھ ہی سے جوش صاحب فرماتے ہیں ـــــ "ہاں اکبر میاں میں نے تمھیں یہاں کیوں بلایا تھا؟" ایسے بھولے اور معصوم انداز سے کہ مجھے ہنسی آگئی اور وہ بھی خود ہنسنے لگے ـــــ رعشہ سے گردن ہلتی ہوئی ـــــ "دیکھو میاں یہ حالت ہو گئی ہے کہ کل کی بات بھی یاد نہیں رہتی"۔

حضرت جوش ملیح آبادی اپنا نو تصنیف مرثیہ بڑے زور و شور سے پڑھ رہے تھے ایک ٹھسے کے ساتھ مرثیہ کے اتار چڑھاؤ کے لفظوں کی میناکاری و مرصع سازی میں ڈھال کر کر سامعین جھوم رہے تھے۔ واہ واہ کے فلک شگاف نعروں سے اس وقت ان کی کوٹھی گونج رہی تھی۔ مرثیہ ختم ہوا تو ہم لوگ تعریفوں کے پل باندھنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے جوش صاحب ـــــ ارے کیا بس ـــــ آہا کہتے اور پان کی ڈبیہ سے پان نوش کرتے جاتے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب لمبے تڑنگے مع اپنی اہلیہ کے داخل ہوئے، فطری طور سے ہم سب کی نگاہیں بھی ادھر اٹھ گئیں۔ نو وارد نے بڑھ کر جوش صاحب سے مصافحہ کیا، اس کے بعد جوش صاحب نے خود ان کی بیوی کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا، بیوی نے تسلیم کر لی ـــــ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ـــــ "اب اس بڈھے سے کیا خطرہ" ـــــ سب نے اتنی زور سے قہقہہ مارا کہ چھتیں اڑ گئیں اور بیوی، ام الشعرا کے پاس اندر بھاگتی ہوئی تشریف لے گئیں ـــــ جوش صاحب نے ادھر دیکھ کر کہا ـــــ "ہاں صاحب آپ کی جگہ وہی ہے" اور پھر ہنسنے لگے۔ نو وارد بولے ـــــ "یہ "یادوں کی برات" میں نے خرید لی ہے"۔

جوش صاحب نے کہا ___ "بڑا احسان آپ نے مجھ پر کیا ہے"۔
وہ صاحب خفیف ہو گئے اور آگے یوں گویا ہوئے ___ "اور چاہتا ہوں کہ اس پر آپ کے آٹو گراف لے لوں"۔
جوش صاحب بولے "لائیے دیر نہ کیجئے پتہ نہیں کب دم نکل جائے" ___ بڑے موڈ میں تھے جوش صاحب پھر وہی بلند و بالا شخص بولے ___ "آپ سے عزیز داری بھی ہوتی ہے"۔
جوش صاحب نے فرمایا ___ "آپ سے یا آپ بیوی سے، کیونکہ بیوی کا رنگ صاف ہے اور آپ تو ماشاءاللہ، ماشاءاللہ ہیں"۔ وہ ٹھٹھا مار کر خود بھی ہنسنے لگے۔
اور پیچھا نہ چھوڑنے کے انداز میں نووارد نے کہا ___ "یہ بات نہیں، آپ میرے بہت قریبی عزیز دار ہیں"۔
جوش صاحب نے فرمایا ___ "تو بڑی دیر میں آپ نے خبر لی" ___ اور اسی جملے کے ساتھ محفل برخاست ہو گئی۔
جوش صاحب کی باتیں گھر تک یاد کرتا ہوا ہنستا رہا اور آج بھی جب وہ مکالمے یاد آتے ہیں تو بے ساختہ ہنستا رہتا ہوں۔
حضرت جوش ملیح آبادی کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر ظرافت و مزاح بھرا ہوا ہے وہ جس عالم میں ہوں ان کے مزاج کی کیفیت میں ایک باغ و بہار عالم نظر آتا ہے۔ وہ ایک مخصوص نشست میں اپنا کلام سنا رہے تھے لوگوں نے اصرار کیا "حرف آخر" کے چند اشعار عطا ہوں ___ فرمانے لگے ___ "ارے بھائی اس چنگاری کو بھس ہی میں رہنے دو" ___ مگر لوگوں کا اصرار بڑھتا گیا ___ آخر کار چند اشعار پڑھے۔ پھر بیاض رکھ کر بالکل بچوں کی طرح فرمایا "بھئی اب تو بالکل تھک گئے" ___ اور خود اپنی پان کی ڈبیہ سے پان نوش کرنے لگے۔ پروفیسر یوسف حسین موسوی کی بھانجی شیریں موسوی حضرت جوش سے بولیں ___ "حضور اگر اجازت ہو تو چار چلادی جائے"
جوش صاحب نے برجستہ فرمایا ___ "اگر چائے چل سکتی ہے تو ضرور چلادیجئے"۔
خوب زوردار قہقہے بلند ہوئے جس میں خود شیریں موسوی بھی شامل تھیں۔ میں یوں تو ہمیشہ، جوش صاحب کے دولت خانہ پر دس بجنے کے بعد ہی پہنچا کرتا تھا، مگر ایک دن ٹھیک آٹھ بجے صبح پہنچ گیا، وہ بیچارے پریشان ہو گئے ___ کہنے لگے ___ "کیوں بھئی سب خیریت تو ہے، آج یہ اتنے سویرے کیسے"۔

میں نے کہا ــــ "آج آنکھ ذرا جلدی کھل گئی کوئی کام دام تو اپنے ذمہ ہے نہیں، بس کہا دیر کیوں کرو، چلا آیا۔"

جوش صاحب نے فرمایا۔ "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ ناشتہ ؟"

"وہ تو میں کرکے آیا ہوں"۔

"اچھا بھئی چائے تو پی لو"۔

"جی ہاں اس سے کب انکار ہے"۔

"چلو اچھا ہوا آج صبح سے آگئے، کچھ خریداری ہو جائے، موسم بھی اچھا ہے ــــ کیا خیال ہے اکبر میاں ــــ کچھ تمھیں بھی شوق ورق ہے" کندھے پر ہاتھ مارکر ــــ میں ہنسنے لگا ــــ "مگر بیگم صاحبہ کہیں نہ چلنے پر تیار ہو جائیں تو بیڑا غرق ہو جائے گا ــــ دیکھو ذرا ہیں کدھر، کہیں ہم لوگوں کی باتیں نہ سن رہی ہوں ــــ مگر وہ بھی تو میری طرح اونچا سنتی ہیں ــــ اچھا جب وہ یہاں آکر بیٹھیں تو تم کہنا کہ مجھے مجتبیٰ حسن کے یہاں جانا ہے تیار ہو جائیے، ان کا فلیٹ کلفٹن پر ہے صدر ہوتے ہوئے جائیں گے بس پھر اپنا کام بن جائے گا ــــ کیسی کہی ــــ شی شی آرہی ہیں شاید، تیار ہو جاؤ" ــــ میں کچھ بوکھلا گیا تھا ــــ اُم الشعرا اسی تخت پر ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گئیں ــــ میں نے تسلیم کی ــــ "جیتے رہو ــــ ہائیں! آج تمھیں یہ کیا ہو گیا، کیا یہیں سوئے تھے" ؟ ــــ جوش صاحب نے لقمہ دیا ــــ "لو سنا، یہ تمھارے اوپر چارج لگایا جارہا ہے، ارے بھئی کبھی تو کچھ عقل کی باتیں کیا کرو ــــ ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں وہ بچارا ہماری محبت میں اپنے گھر اُف یعنی ڈرگ روڈ سے آتا ہے اور آپ ہیں کہ الٹی سیدھی الاپ رہی ہیں"۔

بیگم جوش فرماتی ہیں ــــ "ان کی محبت میں" ! مجھ سے دیوانے پن کی باتیں مت کیا کرو، صبح بھی پینے لگے کیا ؟"

میں دونوں کی باتوں سے خوب محظوظ ہو رہا تھا ــــ کیا کوئی جوانی میں باتیں کرے گا جو جوش صاحب آج کر رہے تھے ان کے یہاں تو ہر شب جوانی رات کی بانہوں میں نظر آتی ہے۔ میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق خوب زور سے کہا ــــ "آج دس بجے تو آپ کو مجتبیٰ حسن صاحب کے یہاں تشریف لے جانا ہے"۔

"ہاں بھئی ہاں، تم نے خوب یاد دلایا، نہیں تو وہ کمبخت پھانسی پر چڑھا دیتا، اچھا

تو میں تیار ہو جاؤں"۔ میں نے کہا "اور کیا"۔۔۔ جوش صاحب نے جلدی سے تہمند اتاری، پاجامہ پہنا، کرتا چڑھایا۔ موزے پہنے۔ پھر شیروانی کی باری آئی اور جوتا پہن کر پھرتی سے کھڑے ہو گئے۔۔۔ "چلو بھئی میں تیار ہو گیا، کہیں دیر نہ ہو جائے"۔۔۔ اُم الشعرا بڑی مشکوک نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جوش صاحب۔ بیگم صاحبہ سے بڑے معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں۔ "ذرا کنجی دیجیئے گا"۔

وہ بولیں ۔۔۔ "کنجی کیا ہوگی؟"

جوش صاحب نے کہا۔ "کچھ پیسے لوں گا"۔

بیگم بولیں ۔۔۔ "پیسے کیا ہوں گے، ابھی کل ہی تو آئی تھی"۔

اس پر جوش صاحب نے جواب دیا۔ "ارے بھئی ٹیکسی کا کرایہ بھی تو کل دیا تھا، آپ تو واللہ بس موڈ خراب کر دیتی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے کمربند سے کنجی کھولنا شروع کر دی۔

جوش صاحب بولے ۔۔۔ ایک گھنٹہ تو کنجی کھولنے میں لگے گا"۔۔۔ چپکے سے اپنی دانست میں کہا مگر بیگم نے سن لیا ۔۔۔ "جاؤ ایک گھنٹہ لگے گا، تمھیں جلدی ہے تو یونہی سدھارو"۔

"نہیں نہیں ایسا نہ کیجئے کچھ تو دے دیجئے"۔۔۔

"کھول تو رہی ہوں ۔۔۔ لو ۔۔۔ مگر زیادہ مت نکالنا"۔

"لائیے شکریہ" یہ کہہ کر جس کمرے میں تجوری رکھی تھی اس کا دروازہ کھولنے لگے، مگر چابی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں ۔۔۔ "میں بھی بالکل یوں ہی ہوں، مگر قسم کھانے کو پہلی بار کبھی نہیں لگی"۔۔۔ آخر دروازہ کھول کر اندر گئے اور چٹخنی لگالی ۔۔۔ قریب بیس منٹ گذر گئے تو ام الشعرا یوں گویا ہوئیں ۔۔۔ "یہ اندر کیا کرنے لگے اتنی دیر ہو گئی"۔

مجھے بھی تھوڑا سا مذاق سوجھا میں نے کہا ۔۔۔ "کوئی دوسرا دروازہ تو نہیں ہے"۔۔۔ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھیں کہ اس میں کہیں یہ بھی تو شریک نہیں ہے۔ اُم الشعرا نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "نہیں ۔۔۔ کوئی ۔۔۔ دوسرا دروازہ تو نہیں ہے"۔۔۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چپکے سے جوش صاحب نکلے ۔۔۔ اور کہا ۔۔۔ "ہاں صاحب ہاں دوسرے دروازے سے بھاگ گیا ہوگا"۔

"اچھا یہ بتاؤ ۔۔۔ تم اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے"۔ اُم الشعرا نے پوچھا۔

جوش صاحب کسی ملزم کی طرح اپنی صفائی پیش کرنے لگے ـــــ "بات دراصل یہ تھی کہ بہت تلاش کرنے کے باوجود کوئی چھوٹا پتہ نہیں مل رہا تھا تو میں نے بڑے پر ہی اکتفا کرلی"ـــــ

گھر کے نوکروں کی بات چل رہی تھی، حضرت جوش ملیح آبادی بھی اس میدان میں کسی سے کم تھوڑی تھے فرمانے لگے ـــــ "ایک دفعہ میں کسی استقبالیہ میں جانے کے لئے تیار ہورہا تھا داڑھی بنانے کے بعد مونچھوں پر خضاب کی رگڑ گھس کررہا تھا، آئینہ سامنے رکھا تھا خضاب لگاتا جاتا تھا اور آئینہ دیکھتا جاتا تھا، کافی دیر سے یہ حرکت میرا پرانا خادم بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا، جب اس سے میری یہ حرکت برداشت نہ ہوئی تو اس نے کہا ـــــ "میاں جہاں آپ تشریف لے جارہے ہیں وہاں کیا لوگ آپ کی مونچھیں ہی دیکھیں گے"۔ میں لاجواب ہوگیا اور بولا ـــــ

آ میرے گلے سے لگ جا، تو نے آج حقِ ملازمت ادا کردیا۔

میرے ایک رشتے کے خالو جان، شہید یار جنگ کے صاحبزادے ہیں، ان کے صاحبزادے یعنی شہید یار جنگ کے پوتے حیدر شہیدی سلمۂ مجھ سے کئی بار بڑے اشتیاق کے ساتھ حضرت جوش سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے کہہ چکے تھے، میں ایک دن صاحبزادے کو لے کر جوش صاحب کے یہاں پہنچ گیا، میرے ساتھ صاحبزادے کو دیکھ کر جوش صاحب فرمانے لگے "آپ کی تعریف ؟"

میں نے عرض کیا ـــــ "شہید یار جنگ کے پوتے ہیں"ـــــ

"علیؑ کو کہتے ہیں پروردگار کہنے دو" ان کا یہ مصرع پڑھ کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا اور فرمانے لگے ـــــ "ہائے ـــــ کیا کیا لوگ دنیا سے اٹھ گئے"ـــــ آنکھوں میں آنسو بھی ڈھلک آئے۔

حضرت جوش کا یہ معمول ہے کہ تاروں کی برات میں ٹہلنے نکل جاتے ہیں۔ آندھی آئے یا طوفان جائے، پانی برسے یا اولے پڑیں اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا ہے۔ حضر میں ہوں یا سفر میں ٹہلنا تو جیسے ان کی زندگی کا اولین فریضہ ہے۔ ایک دن فرمانے لگے ـــــ "جب ٹہل کر واپس آتا ہوں تو وہ منظر جب صبح صادق، صبح کاذب سے گلے ملتی ہے، اس وصال سے مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ گریبان پھاڑنے کو جی چاہتا ہے۔ ہائے یہ منظر کس نے بنایا بس اسی وقت کسی کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے"۔

دربارِ جوش میں چند مولوی اور کچھ مولوی ٹائپ حضرات بیٹھے ہوئے ان کی سمع خراشی کر رہے تھے اور جوش صاحب شمشیر برہنہ ہو کر ان کی تکا بوٹی کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ان لوگوں پر ذرا بھی اثر نہیں قسم کھانے کو سوائے کھیس کھاڑنے کے۔ جوش صاحب نے چھیڑا۔" آج کل آپ لوگوں کا مارکیٹ کچھ ڈاؤن چل رہا ہے کیا معاملہ ہے اس بے ساختگی پر کچھ کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کچھ راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ اس کا اندازہ جوش صاحب نے فوراً کر لیا جلدی سے فرمانے لگے ــــ" اب آپ ہی لوگ دیکھئے نا ــــ کہیں "نٹنی" کا ناچ اگر ہو رہا ہے تو جوق در جوق لوگوں کا ایک ٹھٹھ لگ جائے گا" بے چینی کا یہ عالم ہوگا کہ لوگ ایڑیوں کے بل گردنیں اونچی کر کے اس کے جوبن، نکھار، دست و بازو، کولہے اور اس کی رسیلی آنکھیں دیکھنے کے لئے گر گر پڑیں گے، اور مسجد میں تشریف لے جائیے تو دو مولوی ایک اس کونے میں اور دوسرا اس کونے میں بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑا کرتا ہوا ملے گا اور سناٹے میں اس کی مہیب اور ہولناک آواز بھاگنے پر مجبور کرے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "نٹنی" کے گانے میں جو لذت و اثر ہے وہ مولوی کی بکواس میں نہیں ــــ ہاہاہا ــــ ہو ہو ہو۔ مولوی اور نیم مولویوں کا جھرمٹ لگا ہوا تھا، میرے مطلب کی کوئی بات نہیں ہو رہی تھی اس لئے کچھ بے تعلق سا ہو کر بیٹھا ہوا تھا حضرت جوش کی چٹخارے لے لے کر باتیں، معلوم ہوتا تھا کہ ان کو کوئی مرغوب غذا مل گئی ہو، لب و لہجہ میں آمد تھی میں نے جوش صاحب کے یہاں دیکھی، ایک پولیس انسپکٹر نے جو حادثہ جوش صاحب سے بیان کیا تھا اس کو یوں دہراتے ہیں ــــ" ایک پولیس انسپکٹر تفتیش کے سلسلے میں کسی گاؤں میں گیا، وہاں اس نے دیکھا ایک مسجد ویران پڑی تھی اور اس کے اندر گھوڑوں، گدھوں کی لید اور دنیا بھر کا ملغوبہ پڑا ہوا تھا، تفتیش میں مغرب کا وقت آ گیا، مسلمان تھا آخر اس کو بھی مسجد کی کسمپرسی پر رحم آ گیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جا کر مسجد کو صاف کرو اور اذان دو، وہ خود بھی ساتھ ہو لیا۔ ایک سپاہی نے اذان دینا شروع کر دی، چوتھی بار جب سپاہی اللہ اکبر کہہ کر ٹھہرا تو قرب و جوار کے کچھ لوگ آ کر حیران و پریشان اس کو دیکھنے لگے، اور ایک دوسرے سے کہنے لگے یہ کیا کہہ رہا ہے، اس میں سے ایک نے کہا ــــ" یہ ہمارے اکبر خاں کو پکار رہا ہے، یہ بھی تو ہمارے سردار سے ڈرتا ہے، اس کے اس تمسخر پر سب خوب زور سے ہنسنے لگے"۔ جوش صاحب نے بڑے غضب ناک لہجہ میں مولویوں سے کہا ــــ

"یہ آپ کی تبلیغ اور وعظ کا اثر ہے۔ اسلام یہاں خطرے میں ہے یا وہاں؟"

جس بھولے پن سے جوش صاحب گفتگو کرتے ہیں، دیکھی اور نہ کبھی سنی، پان کی ڈبیہ کے کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ "اے ہے کوئی نہیں، معلوم ہوتا ہے سب ختم ہو گئے ـــــ اکبر میاں ایک آپ ہی لگا دیجئے مگر چونا نہ لگا دیجئے گا ـــــ" خوب زور سے "آہاہاہا" کر کے ہنسنے لگے ـــــ

دوسرے کمرے سے بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی ـــــ "تمھیں کچھ شرم ہے کہ نہیں، یہ ہنستے کیسے ہو، جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے" ـــــ

جوش صاحب چپکے سے بولے ـــــ "اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی میں زور سے ہنسا تھا کہ بیگم نے بھی سن لیا اچھا صاحب معاف کر دیجئے آئندہ سے احتیاط کروں گا" ـــــ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک صاحب ٹپک پڑے۔ جوش صاحب بولے ـــــ "اچھا آپ آ گئے" ـــــ ہم لوگ تیار تو بیٹھے ہی تھے۔ "چلئے صاحب" ٹیکسی وہ صاحب ساتھ ہی لیتے آئے تھے ہم تینوں آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے ـــــ جوش صاحب ہمیشہ ٹیکسی یا اپنی کار میں آگے کی سیٹ پر بیٹھتے ہیں "وجہ اس کی یہ بتاتے ہیں" ـــــ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ مزا نہیں آتا اس لئے کہ چلتی پھرتی دنیا آدھی سے زیادہ دھنس جاتی ہے" ـــــ میں سمجھ گیا تھا کہ موصوف کی سفارش کے سلسلے میں کسی صاحب کے پاس جا رہے ہیں، پندرہ بیس منٹ کے بعد وہاں پہنچ گئے۔ جن صاحب سے سفارش کرنا تھی ان کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے، اور جن کی سفارش کے لئے جوش صاحب تشریف لائے تھے ان کو مخاطب کر کے ـــــ "ہاں صاحب کیا معاملہ ہے پہلے آپ فرمائیے" ـــــ ان کی پوری روداد سن کر جوش صاحب نے کہا ـــــ "ٹھیک فرماتے ہیں" اب ان کی طرف مخاطب ہوئے جن حضرت سے سفارش کرنا تھی۔ انھوں نے بھی معاملات کی نزاکت کے پیشِ نظر کچھ گول مول جوش صاحب کو پڑھا دیا، اس پر جوش صاحب نے فرمایا۔ "آپ بھی ٹھیک فرماتے ہیں"۔ اس پر وہ صاحب جن کی سفارش کرنے جوش صاحب آئے تھے بے چین ہو کر بولے۔ "میں بھی ٹھیک فرماتا ہوں، وہ بھی ٹھیک فرماتے ہیں" ـــــ اس پر جوش صاحب نے برجستہ کہا ـــــ "میں بھی ٹھیک ہی فرماتا ہوں" ـــــ قہقہہ ایسا پڑا کہ در و بام ہلنے لگے۔

حضرت جوش اور جناب یونس سلیم دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں، جوش صاحب، یونس سلیم کے پیروں تک کو صلواتیں سنا دیتے تھے مگر وہ کبھی ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لاتے تھے۔ یہ ان کی عقیدت اور احترام کا عالم تھا۔ گرمی شدت سے پڑ رہی

تھی، سہ پہر کا وقت تھا جوش صاحب غسل فرما رہے، یونس سلیم صاحب بھی تشریف لے آئے اور غل غپاڑہ میں اضافہ ہوگیا۔

یونس سلیم صاحب نے فرمایا ــــ "کیوں بھئی یہ اس وقت کیسے نہانے کی ضرورت پڑگئی؟"

اس پر جوش صاحب نے غسل خانہ سے فرمایا۔

"عقل آمادۂ تباہی شد

یونس اندر دہان ماہی شد"

میں، حیات صاحب اور حضرت جوش مصروف گفتگو تھے۔ کسی نے آکر خبر دی کہ یونس سلیم صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ نرسنگ ہوم میں بھرتی ہیں۔ یہ سن کر جوش صاحب کا چہرہ فق ہوگیا، ایک حالت اضطراب کی سی تھی، فرمایا ــــ "چلو بھئی جلدی چلو" ــــ اسی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے شیروانی سنبھالی، حیات صاحب نے ڈبیہ اٹھائی اور لینا پکڑنا کے مصداق دوڑے۔ دس منٹ کے اندر ہم لوگ نرسنگ ہوم پہنچ گئے ــــ

جوش صاحب بولے۔ "واللہ جان میں جان آئی"۔ یونس سلیم صاحب کو دیکھ کر ــــ "میں تو سمجھا تھا کہ اب آپ سے ملاقات ہونا مشکل ہے"۔ یونس سلیم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ چہرہ تھا کہ کھلا جا رہا تھا ــــ

جوش صاحب نے مذاق کیا ــــ "آجاؤ راہ راست پر انجام بخیر ہونا چاہئے"۔

"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے" ــــ ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود بھی یونس سلیم صاحب سے خاموش نہ رہا گیا ــــ

"حکومت سے کچھ خط و کتابت اردو بورڈ کے سلسلے میں آپ سے چل رہی تھی اس کا کیا ہوا؟" میں نے خاموشی کو توڑا۔

"ہاں ہو تو رہی ہے مگر کس کل اونٹ بیٹھے نہیں معلوم، ارے میاں، ــــ کیا خط کتابت کیا اردو بورڈ، جانوروں سے سابقہ پڑا ہے اور پھر "ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا"۔ بڑے مترنم لہجہ میں جوش صاحب نے پڑھا ــــ

تنقید و تبصرہ کے معاملے میں بڑے سے بڑا شاعر و ادیب، کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اور ہمت کرکے شاعر یا ادیب اپنی تخلیق پر تنقید یا تبصرہ سنتا بھی ہے تو بعد میں اول فول بکنے لگتا ہے مگر حضرت جوش صاحب ہر نقاد کو دعوت عمل دیتے ہیں۔

ایک دن مجھ سے فرمانے لگے "— کہو تم نے بھی یادوں کی برات پڑھی ؟" بڑی بے چینی سے میرے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جواب دیا — "جی ہاں، خوب لکھی ہے، اردو ادب میں ایک لازوال اضافہ ہے۔"

" تمھاری اس تنقید سے مجھے تشفی نہیں، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف اور بالکل منھ پھٹ کہو۔" میں نے پھر دبی زبان سے کہا — "جس جرأتِ رندانہ کا آپ نے مظاہرہ کیا ہے وہ صرف ایک اصلی پٹھان ہی کر سکتا ہے۔"

" یہ بات کچھ ہوئی، یعنی جو بے حیائی کا طوق میں نے لادا ہے وہ کسی اور نامرد کی گردن میں نہیں ڈالا جا سکتا، کیوں بھئی یہی نا ؟" میں حیرت سے ان کا تابناک چہرہ تکنے لگا۔

" اتنی لمبی داڑھی، ماتھے پر گھٹا اور شراب و کباب کی ایسی باتیں کہ توبہ توبہ، میں کہتا ہوں اگر شراب سے شوق نہیں کیا، لبِ لعلیں کے بوسے نہیں لئے، دست و بازو کو چوما نہیں، عارض و رخسار کو چاٹا نہیں اور عشق میں جگر نہیں لگائے، تو اس شاعر کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی شاعری میں ایسے مضامین باندھے اور اگر وہ کہتا ہے تو جھوٹا ہے۔" کسی ایسے شاعر کی تعریف کر دی گئی جس کا زہد و تقویٰ مشہور تھا اور وہ ایسے عشقیہ مضامین بھی باندھتا تھا — بس جوش صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے جھاڑ کر رکھ دیا —

کسی صاحب نے کہا — "جوش صاحب رمضان شریف اس مہینے کے بعد ہے۔"
جوش صاحب نے فرمایا — "جی ہاں پھر کیا ہے، چلنا پھرنا دو بھر ہو جائے گا، سڑکیں، گلیاں جدھر دیکھو تھوک ہی تھوک نظر آئے گا۔"

"کیوں اکبر میاں آج چپ چپ کیوں ہو؟" جوش صاحب نے میری خاموشی کو توڑا۔
میں نے کہا۔ "بس یونہی۔"
"کیوں لکھنؤ یاد آرہا ہے ؟ ہائے لکھنؤ ہے بھی تو یاد آنے کی جگہ۔" جوش صاحب نے جیسے میری دُکھتی رگ پکڑ لی۔
"وزیر گنج میں جہاں تم رہتے ہو وہاں ایک ڈرل ماسٹر محمد رضا رہا کرتا تھا۔" میں

نے کہا — "جی ہاں اب بھی وہیں رہتے ہیں"۔

"کیسا ہے، بڑھا ہو گیا ہوگا"۔

"جی ہاں بالکل" میں نے جواب دیا — اور — سوچنے لگا کہ لکھنؤ کے کسی شخص کو نہیں پوچھا یہ ڈرل ماسٹر محمد رضا میں کیا بات تھی، بظاہر ادب وغیرہ سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا —

"ارے بھئی وہ میرا لنگوٹیا یار تھا، میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ جوش صاحب نے میری گتھی خود ہی سلجھا دی۔

"یادش بخیر۔ ہندوستان سے خطاب"۔ نظم جوش صاحب نے کراچی ٹیلیویژن پر پڑھی، میں نے بھی سنی۔ مگر تعجب یہ تھا کہ جوش صاحب نے وہ نظم پڑھ کیسے دی، میں حسب معمول صبح جوش صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا — "کل جو نظم آپ نے پڑھی اس کے آخری اشعار پڑھتے وقت آپ کی آواز گرفتہ تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے"۔

جوش صاحب نے فرمایا — "اب کیا بتاؤں اکبر میاں" — اور بس خاموش ہو گئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کے ضمیر کے خلاف آواز تھی مگر مجبور تھے — یہی میری آخری ملاقات بھی تھی۔ □

مصور سبزواری
P.O. NUH
DISTT. GURGAON (HARYANA)

غزلیں

سبھی مکان تو گرتے نہیں چھتوں کے بغیر
بہت سے لوگ ہیں زندہ ضرورتوں کے بغیر

زمیں ہری ہوئیں اور تتلیوں کے پر نہ کھلے
اداس بیٹھے ہیں بچے شرارتوں کے بغیر

میں سنگِ راہ تھا کل بھی مسافروں کے لئے
میں اب بھی سنگ ہوں سب کی عنایتوں کے بغیر

یہ میں جو بن گیا خمیازۂ جرس کی صدا
وہ تم کہ بن گئے منزل مسافتوں کے بغیر

بہت مہیب تھا صحرائے بے کنار سا وہ
جو ہانپتا تھا غزالوں کی وحشتوں کے بغیر

گنوا دی آج بھی یہ ساعتِ عزیز اس نے
کہا گیا نہ کچھ اس سے علامتوں کے بغیر

وہ لڑکی ہے کسی دشمن قبیلے کی ناموس
تم اس سے مل بھی سکو گے محبتوں کے بغیر؟

وہ سفر میں ساتھ ہے مجھ سے جدا ہوتا ہوا
ایک پیکر میرا جیسا دوسرا ہوتا ہوا

لذتوں نے کھینچ لی سب نرم مٹی کی مہک
دیکھ پانی کا بدن عکسِ ہوا ہوتا ہوا

راکھ ہوتے سارے منظر دھند میں گرتا گئے
سرمئی سا اک جزیرہ لاپتا ہوتا ہوا

بین کرتا سنگِ میل آخری ہے سامنے
ہے یہیں ختمِ سفر کا فیصلہ ہوتا ہوا

میں پرانا ہو رہا ہوں بھاگتے لمحوں کے ساتھ
اور ہر عکسِ مقابل ہے نیا ہوتا ہوا

میں اسی لمحے تو اس کو کر رہا تھا پاش پاش
تیرے حق میں جب وہ پتھر تھا خدا ہوتا ہوا

پرویز ید اللہ مہدی

دستکِ نیم شب

دستکِ نیم شب، بڑا ہی رومان پرور عنوان ہے، سن کر دل ہی دل میں کچھ ہونے لگتا ہے اور اگر کسی دل کی ڈل جھیل میں اس رومانی کنکری نے کوئی ارتعاش پیدا نہیں کیا تو جان لیجئے کہ ایسے سمندری سکوت والے اہل دل حضرات یا تو بہت پہلے ہی سات سمندر پار کر چکے ہیں یا پھر ان کے دلوں میں ہلچل کی جگہ " جمود " کا غلبہ ہو چکا ہے۔ ایسے منجمد افراد کو چاہئے کہ فوراً سے پیشتر فلمی رسالوں کے اشتہارات سے جھانکتے ان ماہرامراضِ خبیثہ نیم حکیموں سے رجوع فرمائیں جو مرض اور مریض دونوں کو صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ عموماً اس طرح نباہتے ہیں کہ دوران علاج ہی مریض مریض کے متعلقین اس کا نام 'صیغۂ ماضی' میں استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ـــــ

دستکِ نیم شب ایک خالص شاعرانہ عنوان ہے جو کسی رومانی نظم افسانے یا ناول کا تو ہو سکتا ہے لیکن کسی طنزیہ یا مزاحیہ انشائیے کا عنوان ہرگز نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس میں نزاکت ہے، لطافت ہے، حلاوت ہے جب کہ مزاح پیدا کرنے کے لئے حماقت چاہئے شرارت آمیز حماقت ـــــ لیکن ٹھہریئے۔ عنوان کو الٹنے پلٹنے، لفظوں کی نشست و برخاست کو آگے پیچھے کرنے سے شاید کوئی مضحکہ خیز پہلو نکل آئے ـــــ دستکِ نیم شب، شبِ نیم دستک، نیم دستکِ شب، نیم شب کی دستک، یعنی آدھی رات کی دستک یہ الفاظ دیگر بارہ بجے رات کا کھٹکا ـــــ لیجئے بات کچھ کچھ بننے لگی۔ بارہ بجے کے کھٹکے پر یاد آیا کہ یہ نیم شبی دستک بے شمار رازہائے سربستہ پر سے ایک ایک کر کے اسی طرح پردے ہٹاتی ہے جیسے فائیو اسٹار ہوٹلوں کی نیم تاریک روشن شبوں میں چکنے فرش پر تھرکتی نیم برہنہ "کیبرے ڈانسر" آہستہ آہستہ اپنے برائے نام کپڑے، بدن سے الگ کرتی ہے ـــــ!

اگر دستکِ نیم شب کے اوقات بدل کر اسے دستکِ نیم روز، یا دستکِ نیم شام کر جائے تو یقیناً وہ بات نہیں بنتی بلکہ ساری سنسنی ختم ہو جاتی ہے، پس یہ ثابت ہوا کہ دستک

کے ساتھ نیم شب کے نتھی ہوتے ہی ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے دل میں نقرئی گھنٹوں کے ساتھ سرود ستار کی ملی جلی جگل بندی شروع ہو جاتی ہے، اور اس طرح ایک معمولی دستک، نیم شب کی وجہ سے "وی۔ آئی۔ پی" (V.I.P) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو جاتی ہے ویسے بھی نیم شب ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں وقوع پذیر ہونے والے اکثر جغرافیائی حادثات آگے چل کر تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ بن جاتے ہیں ـــــ مثلاً یہی دیکھئے، ہمیں آزادی، کی بیش بہا نعمت نیم شب ہی کو حاصل ہوئی، اس کے علاوہ نیم شب ہی کو نقب زن، نقب لگاتے ہیں، نیم شب ہی کی تاریکی سے فائدہ اٹھاکر یار لوگ پڑوسن کو بھگالے جاتے ہیں، نیم شب ہی کو پرانے سال کو دھکا لگاکر نئے سال کا استقبال کیا جاتا ہے ـــــ غرض یہ کہ زندگی کی ساری گہما گہمی تمام رونق نیم شب ہی کی مرہون منت ہے ـــــ!!

شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، اور فنکاروں کے حق میں تو دستک نیم شب، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے سے کم نہیں، البتہ ان حضرات کی بیویوں کی نظر میں یہ دستک، 'موت' سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے ـــــ فنکاروں کے اس وطیرے سے ہم سبھی اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ مخلوق نیم شب سے پہلے گھر لوٹنا کسرِ شان سمجھتی ہے بلکہ اس برادری کے بعض افراد تو ہفتوں گھر نہیں لوٹتے اور اس طرح گھر کے دیگر افراد کو ہفتوں نارمل زندگی گزارنے کا موقع عطا فرماتے ہیں ـــــ مملکت آرٹ کے ان بے تاج بادشاہوں کی بے یار و مددگار رعایا، عرف بیویاں ان کی دستک نیم شب کی اس قدر عادی ہوتی ہیں کہ پہلی ہی دستک پر نیند میں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچتی ہیں اور پھر دروازہ کھول کر اس سرعت سے واپس پلٹ جاتی ہیں کہ شوہر نامدار کی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتیں، چنانچہ اس عادت کی وجہ سے ایک مرتبہ ایک شاعر کی بیوی عجیب جنجال میں پھنس گئی ـــــ پہلی ہی دستک نیم شب پر بحالت نیند میں لبیک کہتے ہوئے بے چاری نے دروازہ کھولا اور حسب عادت شوہر موصوف پہ ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور دوبارہ بستر میں پہنچ گئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد چیخ مار کر اٹھ بیٹھی کیوں کہ پیچھے پیچھے جو شخص جھومتا جھامتا آکر بستر میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا وہ شوہر ضرور تھا مگر شاعر نہیں تھا ـــــ!

اگلے وقتوں میں دستک نیم شب کا تصور ہی کچھ اور تھا معنی ہی کچھ اور تھے، صرف ایک عدد دستک کے انتظار میں لوگ پہاڑ جیسی ہزاروں راتیں تارے گن گن کر کاٹ لیتے تھے لیکن اس کے باوجود بیشتر بدنصیبوں کو اپنے من پسند چاند کی دستک نیم شب، سنائی نہیں دیتی تھی

نتیجتاً ان امیدواروں میں جو ذرا سخت جان ہوتے وہ دستک نیم شب کی آس میں "تارۂ نیم شب" کے مستقل آزار میں مبتلا ہو جاتے، اور جن کے دل کمزور ہوتے انھیں دستک نیم شب سے پہلے "دستک ملک الموت" سنائی دے جاتی ــــ جب کہ آج دستکِ نیم شب کے معنی ہی بدل گئے ہیں ــــ موجودہ دور کی دستکِ نیم شب کا تازہ تازہ تجربہ ہمیں ایک درمیانہ قسم کے ہوٹل میں ہوا جہاں ہم فلمی کہانی پر بیٹھنے" کی سزا بھگت رہے تھے۔ اس قیدِ بامشقت کے دوران ایک رات اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔ ہم نے اس غیر متوقع دستک پر گھبرا کے سوچا اتنی رات گئے یا تو پروڈیوسر ہوگا یا پھر اس کا کوئی آدمی جو یقیناً یہ بری خبر لایا ہے کہ فلم بنانے کا پروگرام یک لخت منسوخ کر دیا گیا ہے لہٰذا آپ ابھی اور اسی وقت اپنا بوریا بستر باندھئے اور چلتے پھرتے نظر آیئے ــــ اس خیال نے ہمیں دہلا دیا، ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں، ہمارے روبرو دستکِ نیم شب، اپنی تمام تر شعلہ فشانیوں، حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی ہماری پریشانیوں اور پشیمانیوں کو ہوا دے رہی تھی ہمارے ذہن میں ہوش کا یہ مصرع جوش مارنے لگا سے گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے ....

زندگی میں پہلی بار کسی دستکِ نیم شب کا سامنا اس قدر قریب سے ہوا تھا، وہ بھی اس قدر روشن اس قدر اجلی کہ دن کا اجالا بھی اس نیم شب کے آگے ماند پڑ جائے۔ نیم شب کا مکمل چاند ہماری مکمل دسترس میں تھا لیکن اس کے باوجود ہمارے بیچ میلوں کا فاصلہ تھا۔ دستک کی پیشہ ورانہ مسکراہٹ اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ یہ آوارہ چاند، صبح کا تارا نکلنے تک ہوٹل کے مختلف کمروں میں اپنی روشنی لٹاتا بھیلنے کی طرح گردش کرتا، زد میں آنے والے نئے ستاروں کی گردش پر اچھے برے اثرات مرتب کرتا، اگلی رات پھر ایک بار دستکِ نیم شب کا وعدہ کر کے روپوش ہو جاتا ہے ــــ دستک نیم شب کے اس نئے روپ انوکھے بہروپ نے ہمارے وجود کے اندر چھپے دقیانوسی آدمی کے رونگٹے کھڑے کر دیئے، ہم نے التجا آمیز لہجے میں کہا ــــ معاف کیجئے "مس دستک" آپ نے غلط دروازے پر دستک نیم شب دی ہے۔ پلیز کسی اور جگہ ٹرائی ماریئے گا ــــ!"

اس رات پہلی بار یہ علم ہوا کہ جو دستک اگلے زمانے میں دلوں کے دروازوں پر سنائی دیتی تھی وہ اب ہوٹلوں کے دروازوں پر "شب بخون" مارنے لگی ہے اور اس دستک نیم شب کو سننے کے لئے دس بجے تک بھی گننے کی ضرورت نہیں ــــ!!

حالیہ سروے کے مطابق بڑے شہروں کی "پنج تاری" ہوٹلیں اپنے معقول انتظامات اعلیٰ خدمات اور لذیذ کھانوں کی وجہ سے اتنی مشہور نہیں جتنی کہ دستک نیم شب والے خصوصی "آئیٹم" کی وجہ سے ان کی شہرت قومی حدود سے نکل کر، بین الاقوامی سطح تک پہنچ چکی ہے، چنانچہ بڑے شہروں میں غیر ملکی باشندوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد کے پس پردہ اس دستک نیم شب کی کارفرمائی ہے بلکہ اب تو "فارن ایکسچینج" کے بل پر غیر ملکی سیاحوں نے دستک نیم شب کو جو صدیوں سے شب کے حصار میں قید تھی، آزاد کروالیا ہے ——جب زر مبادلہ کی شکل میں آئے ہوئے وزن دار سکے کھنکھناتے ہیں تو دستک نیم شب، دن کے بارہ بجے بھی گنگناتی، چھماتی سنائی دیتی ہے——!!

ایک اور عجیب وغریب قسم کی دستک نیم شب کا تجربہ ہمیں اس وقت ہوا جب کچھ عرصہ پہلے ہل اسٹیشن پر واقع دیہات کے ڈاک بنگلے میں رات گزارنے کا اتفاق ہوا —— شہری ہوٹل کی نیم شبی دستک کی کھٹک ذہن میں چونکہ تازہ تھی اس لئے نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بلکہ آدھی رات کے وقت تو ہم اس قدر چوکنا ہوگئے جیسے دستک نیم شب کی جگہ آج صورِ اسرافیل کی لے پر قیامت "ڈسکو ڈانس" کا مظاہرہ کرنے والی ہو——لیکن جب کافی دیر تک دستک تو در کنار چیکلی بھی سنائی نہیں دی تو خود پر لعنت بھیجی کہ خواہ مخواہ ایک چھوٹے سے معصوم گاؤں کے ڈاک بنگلے کو بڑے شہر کا ہوٹل سمجھ لیا، گاؤں ابھی شہروں کی اس قماش کی لعنتوں اور کثافتوں سے پاک ہیں... ان ہی سوچوں کے درمیان اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ہم ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کچھ توقف کے بعد دستک دوبارہ سنائی دی۔ دبے قدموں کے ساتھ دروازے تک پہنچے پھر بڑی پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر در آیا، دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ ہم نے اندھیرے میں دور تک دیکھا کہیں بھی دستک نیم شب دکھائی نہیں دی دروازہ بند کر کے دوبارہ بستر میں پہنچے ہی تھے کہ دستک پھر سنائی دی، پھر وہی عمل دہرایا پھر وہی سناٹا ہاتھ آیا——سوچا، ہو سکتا ہے دستک نیم شب کا یہ پہلا پہلا موقع ہے، نئی نئی راؤنڈ پر نکلی ہے، شرمارہی ہوگی——چنانچہ اس مرتبہ کمرے سے باہر نکل کر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر باہر وہی ہو کا عالم تھا، ہمیں کامل یقین ہوگیا کہ دستک وغیرہ کچھ نہیں ہے، اصل میں ہمارے ہی کان بج رہے ہیں، لہٰذا دروازہ اندر سے مقفل کر کے دوبارہ بستر میں دبک گئے—— دستک پھر سنائی دی اور پو پھٹنے تک وقفے وقفے سے برابر سنائی دیتی رہی، اور ہم متواتر اپنی سماعت کو قصوروار ٹھہراتے رہے——لیکن جب صبح چوکیدار کو سارا ماجرا کہہ سنایا تو اس کا رنگ

فق ہوگیا کپکپاتے لہجے میں بولا "پہلی دستک ٹھیک بارہ بجے سنائی دی ہوگی ــــ؟" ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مزید بولا ــــ

"ضرور وہ آئی تھی ــــ!!"

"وہ ــــ کون ــــ؟" ہم نے متحیر لہجے میں دریافت کیا وہ فوراً بولا ــــ "چمپا ــــ!"

"چمپا ــــ یہ چمپا کون ہے ــــ" ہم نے گڑبڑا کر پوچھا ــــ

"ہے نہیں بابو جی! تھی ــــ!" وہ روہانسے لہجے میں کہنے لگا "اسے مرے ہوئے پچیس سال ہوگئے، گاؤں کے بڑے بوڑھے کہتے ہیں، اس ڈاک بنگلے کی جگہ پہلے ایک کنواں تھا جس میں کود کر چمپا نے خودکشی کی تھی، اور اب اس کی بے چین آتما بھٹکتی پھرتی ہے ــــ!!" چوکیدار کے اس آسیبی انکشاف کے بعد ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً بوریا بستر باندھا اور قبل اس کے کہ اگلی رات چمپا کی پراسرار دستک نیم شب سنائی دیتی پراسرار طور پر خود وہاں سے غائب ہوگئے البتہ اس آسیبی تجربے کے بعد ہم نے دستک نیم شب میں اتنا اضافہ کر لیا ہے کہ یہ دستک صرف رومان پرور نہیں ہوتی، پُراسرار بھی ہوتی ہے ــــ!!

پتہ نہیں کیوں دستک نیم شب کا وہ نازک رخ ہمارے سامنے کبھی نہیں آیا جس کا پیارا پیارا تجربہ ہر انسان کو عمر کے اس دور میں ایک بار ضرور ہوتا ہے جب اس کی زندگی میں امنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دلوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ جب ایسے رنگین دور میں بھی کچھ نہیں ہوا تو مجبور ہو کر ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر دو والا شاعرانہ مشورہ مان لیا کہ شاید اس بہانے دستک نیم شب سننے کا موقع میسر آجائے لیکن یہاں بھی قدرت نے ہمارے ساتھ بڑا انوکھا مذاق کیا ــــ نئے فقیر کو بھیک کی جلدی کے مصداق ہم سر شام ہی اپنی ہونے والی 'دستک' کے در پر پہنچ گئے تاکہ نیم شب سے پہلے پہلے ہی رخصت کرا کے گھر لے آئیں، اور پھر نیم شب سے آخر شب تک، اپنی شرعی دستک سے کما حقہٗ محظوظ ہو سکیں ــــ
لیکن اسی روز محلے کا ہر کنوارا نوجوان اس معاملے میں ہم سے بازی لے جانے پر تل گیا تھا اس لئے قاضی صاحب قبلہ سب کو ٹھکانے سے لگاتے ہوئے جس وقت ہمارے یہاں پہنچے نیم شب ہو چکی تھی چنانچہ دستک کی جگہ ہمیں نکاح نامے پر "دستخط" کرنے پڑے اور یوں ہماری زندگی میں پہلی اور آخری بار سنائی دینے والی "دستک نیم شب" بھی "دستخط نیم شب" میں بدل گئی ــــ

اب آپ ہی کہئے جو شخص دستخط نیم شب کا مارا ہو وہ بھلا نیم شب کے بارے میں میٹھی میٹھی باتیں کر سکتا ہے؟ اس لئے دستک نیم شب، آپ سب کو مبارک ہمارے لئے دستخط نیم شب ہی بہت ہے۔!!! ☐

غزلیں

اے۔ رفیق
ایگزیکیٹو انجینیر ٹی۔ ڈبلو۔ ڈی۔ چندوسی

سطوتِ کوہ تو دریا سے نہ پانی مانگے
موجِ دریا نہ سمندر سے روانی مانگے
شمع رو کر مرا اندوہِ نہانی مانگے
ایک محفل میں سنانے کو کہانی مانگے
رشکِ گلشن سے ہی گلشن بھی جوانی مانگے
ندرتِ تشنہ لبی شعلوں سے پانی مانگے
امتحاں حسن کا جو طرزِ بیانی مانگے
تو کہانی کوئی پھولوں کی زبانی مانگے
رنگِ رخِ پھول سے اک شام سلونی دیدے
شامِ غم یاد سے اک صبح سہانی مانگے
سنسنی پھیلی ہے گلشن کے ہر اک گوشہ میں
غنچۂ دہن بھری بزم میں ثانی مانگے
بے ترا آئے ہے گلشن میں صبا کی صورت
پھول بھی کوئی نہ شبنم سے نشانی مانگے
درس پھولوں سے لیا میں نے ترا تجھ کو
شوقِ بسمل مری آشفتہ بیانی مانگے
ایک رفتار پہ موقوف ہے دستورِ بقا
وہ فنا ہوتی ہے جو لطف مکانی مانگے
کس طرح پاؤں گا وہ یاد اگر دل میرا
باتوں باتوں میں کوئی یاد پرانی مانگے
بے اثر اپنی دعائیں نہ رہی ہوں گی رفیق
درد کی آج دوا درد کا بانی مانگے

محمد غلام رسول اشرف
تکیہ معصوم شاہ مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

غور سے مجھ کو دیکھتا کیا ہے
میرا چہرا تو میرا چہرا ہے
سنگِ الفاظ کس نے پھینکا ہے
ضرب کاری ہے، زخم گہرا ہے
سر پھرے لوگ سر پھری باتیں
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے
کل بھی مجروح تھا مرا چہرا
آج بھی زخم زخم ہنستا ہے
اچھے لگتے ہیں زرد پھول مجھے
کچھ نہیں جانتا سبب کیا ہے
بن گیا رائی کا پہاڑ اشرف
راستہ اب لہو کا دریا ہے

انور خان

وقوعہ

مطلع صاف ہے۔ پورنیما کے چاند کی رونق پورے شباب پر ہے۔ زرتار کرنوں کے جال نے شہر کی تمام ذی حس اور بے جان اشیا کو اپنے سحر میں باندھ لیا ہے۔ بحر العند کی بپھری موجیں بھارت کے کٹے پھٹے ساحل پر آباد شہر سے پاگلوں کی طرح سر ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی ہیں۔ شہر دن بھر کے شور و غوغا کے بعد اب نیند کی آغوش میں ہے۔ سرکاری دودھ گاڑیاں اور فسادات، ہنگاموں، سیاست دانوں کی چیرہ دستیوں اور فلمی ستاروں کی ہوس رانیوں کی خبروں سے لبریز اخبارات کی گاڑیوں کے ابھی سڑک پر آنے میں دیر ہے۔ بس ریکی جھلیاں اوس کی مانند اسکائی اسکریپرس اور تین چار منزلہ عمارات کی مختلف منزلوں سے وقفے وقفے سے گزر رہی ہیں گرتی چلی جا رہی ہیں۔ گٹرس لبریز ہو کر سڑکوں پر چھلک پڑی ہیں۔ شہر کی غلاظت سمندر اس وقت قبول کرتا ہے جب وہ اپنا سارا جوش ختم کر کے کسی تھکی ماندی بیاہتی عورت کی مانند سکون سے کنارے سے دور لیٹا ہوتا ہے۔ شہر کی رصدگاہوں اور لیباریٹریوں میں البتہ مضطرب ذہن جاگ رہے ہیں تاکہ قدرت کے سربستہ رازوں کو جان سکیں یا کسی خستہ حال مکان میں سوچ میں ڈوبا کوئی شاعر داناؤں اور تمناؤں کے انسانی سمندر کو سمجھنے کی کوشش میں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کوئی ریاضی داں اس فکر میں غلطاں ہو کہ یہ کائنات ریاضی کا کوئی انتہائی پیچیدہ فارمولا ہے یا کسی کائناتی ذہن کی مصروف لعب امواج۔

ایک شخص اور جاگ رہا ہے۔ میوزیم کا چوکیدار! دروازے پر کھڑا وہ اس رولس رائز گاڑی کا منتظر ہے جو اب کسی بھی لمحے آ سکتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھے غیر ملکی کو اسے کرشن کا چوتھی صدی عیسوی کا ایک مجسمہ دینا ہے جس کے عوض وہ اپنی لڑکی رادھا کے ہاتھ پیلے کر سکے گا جو ابھی ابھی کنہیا کا بھجن کرتے کرتے سوئی ہے اس اعتماد کے ساتھ کہ جگ پالنہار کسی کو نراش نہیں کرتا۔ اسے یقین ہے کہ ایک روز اس کے محبوب کی سونے سے لدی کشتی درسوا کے ساحل پر ضرور

لگے گی اور اس کا بیزار یار سوجائے گا۔ اس کا محبوب درسوا کے ساحل پر ایک جھونپڑے میں بیٹھا تصورات میں اپنا نشیمن تعمیر کر رہا ہے۔ پانچ کمروں کا فلیٹ۔ جدید ترین انداز کے فیشن سے آراستہ و پیراستہ۔ سوئمنگ پول۔ ریلوے اسٹیشن سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر۔ گھر بسانا آدم کی اولاد کے لئے ہمیشہ سے مشکل ترین مسئلہ ہے۔ سونے کی اینٹوں سے لدی کشتی رات کے کسی لمحے پر ساحل مراد سے لگے گی اور بس ــــ اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

میوزیم کے پہلے منزلے پر ایک چھوٹے سے کمرے میں کرشن بھی رولس رائس کا انتظار کر رہے ہیں۔ سامنے شیشم کے کپ بورڈ میں بند بدھ ہمیشہ کی طرح دھیان میں کھوئے ہوئے ہیں ان کے ہونٹوں پر وہی پراسرار مسکراہٹ ہے جو نروان پانے کے بعد نمودار ہوئی تھی۔ ان کی روشن بے شکن پیشانی میں نہ جانے کتنے ازلی راز جگمگا رہے ہیں۔ ایک گوشے میں معروف دعا سینٹ (SAINT) سب سے بے خبر اس مرکز سے لو لگائے ہوئے ہیں جہاں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ کمرے کے ناف میں نرتیہ کے کسی بھاؤ کے درمیان رک کر چنچل رقاصہ تجسس نگاہوں سے کرشن کو دیکھ رہی ہے۔

'اب کب ملاقات ہوگی؟' اس نے سوچا ہے۔

'دو صدی بعد شنگھائی کے ایک جھونپڑے میں'، کرشن نے فوراً اس کی ذہنی لہروں کو وصول کر کے جواب بھیجا ہے۔

کرشن سے اس نے اور کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ اب وہ جان چکی ہے کہ کائنات کی بڑی چھوٹی ہر حرکت ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہے۔ کائنات جو لمحہ لمحہ خود کو منکشف کر رہی ہے۔

میونسپلٹی کی پیلی روشنی میں اونگھتی خاموش سڑک پر اچانک ایک رولس رائز کار نمودار ہوئی ہے اور بے آواز پھسلتی ہوئی میوزیم کے دروازے سے قدرے فاصلے پر اندھیرے میں رک گئی ہے۔ کار میں بیٹھے غیر ملکی نے کرشن کی ایک مورتی زنگ آلود مڑی ہوئی سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ بڑھا کر چوکیدار کو تھمائی ہے۔ اور چوکیدار ننگے پیروں سے زینے طے کرتا پہلے منزلے پر پہنچا۔ کمرے میں پھیلی پورنیما کے چاند کی دودھیا روشنی میں اس نے کرشن جی کی مورتی کو اٹھا لیا ہے اور ویسی ہی دوسری مورتی اس جگہ رکھ دی ہے۔ چوکیدار کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے جیسے وہ کوئی گناہ کر رہا ہو شاید اسے پتہ نہیں کہ گزشتہ پچاس سالوں میں یہ مورتی کتنی بار بدلی

جاسکتی ہے۔ چوکیدار مورتی لے کر باہر آیا ہے اور کمرے کو تالا لگا کر سیڑھیوں سے اتر تا سلاخوں کے جنگلے کے قریب پہنچا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے غیر ملکی نے غور سے ایک نظر مورتی کو دیکھا ہے۔ پھر مطمئن ہو کر جیب سے سو سو کے دو بنڈل چوکیدار کے ہاتھ میں تھما دیئے ہیں۔ گاڑی پھر سڑک پر پھسلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

رادھا کے محبوب کو دور سمندر میں روشنی کا نقطہ سا نظر آیا ہے اور وہ مضطرب ہو کر جھونپڑی کے باہر آ کھڑا ہوا ہے۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ پیر کپکپا رہے ہیں۔ اس نے خود کو ریت پر گرا دیا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لی ہیں۔

رادھا نیند میں مسکرا رہی ہے۔ کرشن کی بنسی کی سریلی آواز اس کے کانوں سے اتر تی رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ اور اسی لمحے چوکیدار کوٹھری میں داخل ہوا ہے۔ اسے مسکراتے دیکھ کر چوکیدار کا گناہ کے احساس سے بوجھل زرد چہرہ بھی کچھ کھل اٹھا ہے۔ سیہ کار بستی میں کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

دو گھنٹے بعد بنسی ہونٹوں سے لگائے کرشن آئس کریم کی لاریوں کے بیچ تھرمو کول کے خوبصورت ڈبے میں دو بجے کی فلائٹ سے مشرق وسطیٰ کے لئے روانہ ہوئے جہاں سے انھیں کیلی فورنیہ پرواز کرنا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ کائنات کی صدیوں پر محیط کہانی کا ایک چھوٹا سا موڑ تھا جسے کسی عظیم الشان واقعے کا پیش خیمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ☐

دور سیفی
۴۸۔ نوپاڑہ، باندرہ بمبئی ۴۰۰۰۵۱

غزلیں

تمھیں میں اپنے دل کی بات لکھوں
یا روز و شب کی تفصیلات لکھوں
مہک لاتی ہیں یہ تیرے بدن کی
تری یادوں کو، کیا برسات لکھوں؟
ہری ہے اب تلک شاخِ تمنا
اسے میں عشق کی سوغات لکھوں
عجب الٹا زمانہ آگیا ہے
نفی پر کیا کیا، اثبات لکھوں!
زمینِ شعر کی رعنائیوں کو
جہاں تک ہے مری اوقات لکھوں
ملاقاتیں، ملاقاتیں رہی ہیں
قلم قاصر ہے کیا جذبات لکھوں
غزل میں دور سیفی نے کہا ہے
کہ انسانوں کو اپنی ذات لکھوں

انسان کے وجود کی تفسیر تک گیا
کتنا حسین خواب ہے تعبیر تک گیا
چرچا نہ ہوتا حرفِ تمنا کا آج تک
لیکن جمالِ یار سے تشہیر تک گیا
ترسیل حال کے بھی وسائل بدل گئے
اگلا زمانہ نالۂ شب گیر تک گیا
اپنے اسیر ہونے کا الزام کس کو دیں
جب پاؤں خود ہی رونقِ زنجیر تک گیا
اک حرفِ حق نکل کے ہماری زباں سے
دنیا کے ذریعہ زمرۂ تقصیر تک گیا
اے دورؔ جب غزل کا کہیں ذکر چھڑ گیا
میرا خیال میر تقی میرؔ تک گیا

صبیحہ ناز لاری
اقبال منزل
نزد سٹی ریلوے اسٹیشن، لکھنؤ

ہم زباں کہاں کہاں

دلی سے چلتے وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ جب کالج گروپ کے ساتھ جا رہی ہوں تو اپنے محلوں کے خوابوں کو دلی میں تین مورتی مارگ کے اس عالیشان "مینشن" ہی میں چھوڑ جاؤں گی جس کی فرانسیسی کھڑکیوں پر پڑے دبیز مخملیں پردے اندر کے مناظر کو چھپا دیتے ہیں اور باہر یوکلپٹس اور سرو کے درختوں میں ہوا سر سراتی رہتی ہے ـــــ اور جس کے آہنی گیٹ پر بیلجیم گلاس کے گلوبوں کے نیچے سنگ مرمر پر کالے حروف کندہ ہیں ـــــ "قیصر مینشن" اور جس کے مکین جولیس سیزر کی ڈکٹیٹر شپ والی صفات رکھتے ہیں یعنی I CAME I SAW I CONQUERED – VENI VIDI VICI حالانکہ اسیتوش نے اتنا یقین تو مجھے دلا ہی دیا تھا کہ بمبئی پونہ ہوسٹل میں ٹھہریں گے تو، لیکن اپنی میمونہ دیدی کو تاج کورومنڈل کے میور ریسٹورنٹ میں " سافٹ لائٹ کے نیچے اڈلی اور رم اور سانبھر اور جو بھی وہ کہے گی یعنی مغلئی سے لے کر کونٹی نینٹل تک سبھی خوشبوؤں اور ذائقوں سے مستفید کرادیں گے۔

بلکہ اسی بات پر فہد نے اپنی بکواس بھی شروع کر دی تھی جو رفتہ رفتہ بحث اور پھر گراں بار جھڑپ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ فہد ویسے کہتا تو صحیح تھا کہ جب میمونہ قیصر صاحبہ کے ابا حضور خالص دلی والے تھے اور ان کی امی جان بھی لکھنؤ کے عطر گلاب اور چٹ پٹی کے فرشی غراروں والے ماحول ہی کی پیداوار تھیں اور خود میمونہ صاحبہ بھی بشیرن بوا جیسی ماہر لسانیات کی گود میں پلی بڑھی تھیں تو ان کے اس قدر اترانے اور مغرب زدہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عاشق ہونے کی کیا وجہ ہے؟ یہ الگ بات تھی کبھی ان کے آباو اجداد کراکورم اور ہندوکش اور درۂ خیبر پار کر کے یہاں تک پہنچے تھے لیکن اس سلسلہ کوہ سے پرے بھی وہ کون سے مغرب پرست ہی رہے تھے؟ تب مشرق اور اور مغرب کے بیچ اور بھی تو فاصلے تھے ـــــ کہیں آلپس، کہیں یورال کی پہاڑیاں، کہیں بحر کیسپین اور کہیں صرف وہی بات کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم ـــــ

مجھے فہد کی باتوں پر غصہ تو بہت آیا تھا ـــــ آخر یہ مجھ سے مرعوب کیوں نہیں ؟ کیوں نہیں یہ سمجھتا کہ میں سیمونہ قیصر، سید فاروق قیصر کی بیٹی، قیصر مینشن کی مکین ـــــ اسپین، فرانس اور ڈینمارک اور امریکا تک پہنچی ہوئی سیمونہ قیصر "کلچرڈ" ہی نہیں بلکہ "ہائی سوسائٹی" کی پیداوار ہوں۔ پھر بات آگے بڑھی تھی اور فہد نے مجھے چیلنج کر دیا تھا کہ جنابہ سیمونہ صاحبہ تم اچھی تو مجھے بہت لگتی ہو لیکن میں ٹھہرا بھارت واسی اور تم "اینگلو انڈین" اس لئے میل ہو تو کیسے ہو ؟ پھر بھی اگر تم مان گئیں کہ تم دلی میں ہو اور دلی ہندوستان میں ہے تو مائی ڈیر ایک دن اپنی شادی میں تمھیں تو ضرور مدعو کرنا پڑے گا ورنہ بنا دلھن کے بارات کس طرح واپس جائے گی ـــــ ؟ اور میں مزید تلملا گئی تھی ۔ ایک لمحے کے لئے دل کو چاہا تھا کہ مدراس جائے بھاڑ میں، مرینا بیچ جائے بھاڑ میں، مہابلی پورم جائے بھاڑ میں، لیکن پھر اسٹوش اور سلیمان کی ڈانٹ جو فہد کو پڑی تھی اور راگنی موہنی مسکراہٹ اور آرتی کی مزیدار باتیں ـــــ سب نے مجھے مجبور کر دیا۔ فہد میری آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا لیکن کالج ٹور میری وجہ سے بدمزہ ہو ـــ یہ مجھے گوارہ نہ تھا اس لئے میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنے محلوں کے خوابوں کو دلی میں مین مورتی مارگ کے اس عالیشان مینشن ہی میں چھوڑ جاؤں گی جس کی .....

مدراس سنٹرل پر جب ہچکولے کھاتی ہوئی ٹرین رکی تو ہم میں سے سبھی نے سکون کی ایک لمبی سانس کھینچی ـــــ ایسی جیسی کہ بہت زوروں کی بھوک لگنے پر ہر کھانا کھانے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کھینچی جاتی ہے۔ جوڑ جوڑ درد کی شدت سے ٹوٹ رہا تھا۔ پنڈلیاں تشنج کا شکار ہو رہی تھیں اور سر تو جیسے درد کے مارے بھک سے اڑ چکا تھا۔ راستے بھر میں ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کے پردے پڑی کھڑکیوں اور بستر لگی نرم سیٹوں کا تصور کرتی آئی تھی۔ کتنا پرسکون ہوتا تھا وہ سفر جب میں گومتی ایکسپریس میں ایسے ہی کمپارٹمنٹ میں مما کے ساتھ مزے سے لکھنؤ جایا کرتی تھی ! حالانکہ میں نے خوابوں کو بھول جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن جو زندگی میں پہلی دفعہ سیکنڈ کلاس میں انسانی اژدحام، دھکم پیل، ایک پتلی سی سیٹ پر چار چار افراد، پان کی پیک، بلغم بھری کھنکار، پسینے اور گرم بھبھکوں سے بھرے قید خانے میں سفر کرے اور جس کے چشمِ تصور میں اس کا محبوب شیورلیٹس اور مرسڈیز میں سن گلاسیز لگائے ROTHMANS کے کش لگاتا ہوا پھرے۔ وہ اب کھلی آنکھوں کے سامنے کسی سڑے بھسے دیہاتی کے زنگ آلود ٹین کے ٹرنک پر بیٹھا کڑوی کسیلی نظروں سے اسے گھورے جائے ـــــ نوجوانوں کا آنا اور آکر

بکھر جانا کوئی عجیب بات تو نہیں ___ فہد نے ٹن کے ٹرنک پر بیٹھے بیٹھے مجھے مزید چھیڑا بھی تھا
"کیوں میڈم؟ مزا آ رہا ہے؟ SWEET ARE THE USES OF ADVERSITY ___ ہوں؟"
اور میں پھر راستے بھر پیچ و تاب کھاتی رہی تھی ___ اوڈیم!!

مدراس میں آرمینین اسٹریٹ پر ہمارا یوتھ ہاسٹل اچھا خاصا آرام دہ تھا۔ چونکہ ہم چھ لوگ تھے اس لئے تین بیڈ والے دو کمرے بک کروائے گئے تھے۔ ایک میں اسیتوش، فہد اور سلیمان اور دوسرے میں راگنی، آرتی اور میں یعنی میمونہ قیصر ___ زیادہ تر وقت تو مدراس کی خاک چھاننے میں گزرتا تھا اس لئے ہوسٹل میں رہنے کا اتفاق کم ہی ہوا۔ صبح جب ناریل کے پیڑوں کے پنکھے جیسے پتے ہوے ہوے ڈولتے اور پرندوں کا شور بڑھتا جاتا اور ٹھیک ہوسٹل کے اوپر سے ایک طیارہ گزر جاتا تب ہم سب نہا دھو تازہ دم ہوکر نکلتے تھے۔ بریک فاسٹ کا جہاں تک سوال تھا تو وہ تو ہوسٹل کی کینٹین سے ہی لینا پڑتا تھا کیوں وہاں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے کسی ریسٹوران میں جا بیٹھنا کسی کو پسند نہ تھا اور پھر اس وقت بھوک بھی تو شدید ترین مراحل سے گزر رہی ہوتی تھی۔ فہد حسب عادت اپنے زہریلے جملوں سے مجھے نوازتا رہتا تھا اور میں جھنجھلاہٹ کے باوجود اس کی KIDDISH باتوں کو نظر انداز کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

اس جگہ میں اَسیتوش کی تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتی۔ وہ ہمیشہ ہی میری پشت پناہی کرتا تھا۔ بات بڑھنے سے پہلے ہی فہد کے ہاتھوں سے نکال لیتا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز پسند تھا۔ کم از کم اسے میرے STATUS کا تو خیال تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ میں بیچ ہائکنگ والے انداز کے ٹور کی کبھی عادی نہ تھی۔ ہمیشہ قیصر مینشن سے لمبی سی امپورٹیڈ کار میں نکلتی ___ سیدھی پالم ایرپورٹ پہنچتی اور وہاں کی مغربی گہما گہمی، آٹومیٹک دروازے، یونیفارم میں ملبوس اسمارٹ پائلٹوں، اسٹوڈیولز پر کھلکھلاتی ہوئی ایرہوسٹس اور فرفر انگلش بولتے ہوئے ایک ہجوم سے محظوظ ہوتی ہوئی زوروں سے کبھی انڈین ایرلائنز کبھی ایر انڈیا کبھی لفتھانزا کبھی ایر فرانس اور پین ایم کے بوئنگ اور جمبو جیٹوں میں ہوا ہو جاتی تھی۔ اگر کبھی ٹرین سے بھی جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ بھی ایرکنڈیشنڈ میں ___ اور پھر فائیو اسٹار یا سپر ڈیلکس ہوٹلوں کے SUITE میں عمارت کا دبدبہ ___ ریلیکس منٹ کا سکوت اور ریسٹورانٹ کے کینڈل لائٹ ڈنر میں FILIGREE کے کانٹے چھری کی کھٹ کھٹ ___ سفید کلفدار نیپکنوں کا نفاست سے کھلنا

ہینڈسم ویٹروں کا بڑے مودبانہ انداز میں پوچھنا ؟ "ANYTHING ELSE MADAM"
اور اب جب کہ اسپتوش کی پوری کوشش تھی کہ میرے STATUS کا پورا خیال رکھے۔
لیکن نہ جانے کیوں مجھے مرینا بیچ کے سنہری ریت پر ڈھیری جلائے ہوئے بھیل پوری والے کے دونے کی بھیل پوری سوں سوں کرکے کھانے میں عجیب سا لطف آرہا تھا۔ نیشنل آرٹ گیلری کے باہر اسنیک کارنر پر مسالہ دوسا کی ایسی چھینا جھپٹی ہوئی کہ دوسے کے پرنچے تو سلیمان اور آرتی کے ہاتھ میں اور کچھ گھاس پر بکھر گئے لیکن اندر کا سارا مسالے دار ہلدی والا آلو میرے جاپنیز سلک کے جمپر پر آرہا۔ سلیمان اور آرتی کچھ سہم سے گئے تھے اور فہد مجھے شاطرانہ مسکراہٹ سے گھورتا رہا لیکن میں مسکرا دی تھی۔ نہ جانے کیوں ؟ اور اسی طرح ہلدی کے دھبوں والے کپڑوں میں گیلری کی سیڑھیوں پر راگنی کے گلے میں باہیں ڈال کر اسپتوش کے دیسی کیمرے سے ایک پوزبھی کھنچوالیا تھا۔

پھر موٹر مارکیٹ سے سلیمان نے اپنے لئے ایک بانک پرنٹ کی لنگی خریدی تھی اور میں نے بالوں کے لئے نارنجی اور سفید پھولوں کی دوہری لڑی والی بھیگی بھیگی وینی — جو میں نے اپنے جوڑے میں فہد سے بندھوائی تھی اور اس نے بنا کچھ کہے گمبھیرتا سے مسکرا کر باندھ بھی دی تھی اور میں سوچتی رہی تھی کہ میری گردن پر فہد کے ہاتھوں کا لمس اچھا تھا یا قیصر مینشن کے اس سوشل گیٹ ٹوگیدر میں ANDRE NICHOLS کے ہاتھوں کا جو عجب پھرتے انداز میں میری کمر کو تھامے تھے !

پھر ماؤنٹ روڈ اور وکٹوریہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے ہم سب نے نہ جانے کیا خرید ڈالا۔
آکسڈائزڈ سلور کے گہنے، ہاتھی دانت کا پیپر کٹر اور صندل کی لکڑی کے ننھے ننھے ہاتھی اور مدراس کانونٹ کے نفیس رومال اور ڈیزی سیٹ — اور بھی نہ جانے کیا کچھ —
گورنمنٹ ٹورزم ڈپارٹمنٹ کی جانب سے مہابلی پورم اور کانچی پورم کے ایک دن کے ٹور کے لیے بس جاتی تھی۔ حالانکہ مدراس شہر میں ہم نے اپنی ساری سیاحی خود سے کی تھی۔ کیوں کہ ٹورسٹ بسوں سے گھومنے میں قدرے وقت کی پابندی کرنا پڑتی ہے — اور یہاں مدراس آکر وقت کی پابندی تو ہم سب کے لئے ایک بھولی ہوئی یاد بن گئی تھی۔ نہ کھانے ناشتے کا وقت — نہ سونے اٹھنے کا وقت — جب جی چاہتا، جہاں کی گردن نظر میں سماتی ہم وہیں کی راہ لیتے — بے فکری — لاپرواہی — عیش ہی عیش — ! ہر ڈسپلن ٹوٹ رہا تھا، ہر اصول

پنی پذیرائی نہ ہونے کے غم میں تڑپ رہا تھا اور ہم سب یہ سمجھ رہے تھے کہ وقت کو تو ہم نے اپنی
ِقت میں لے لیا ـــ اے وقت تیری رفتار کو مات دے دی ہے ہم نے ـــ لیکن ـــ شاید ہم
ہی اسیر ذات ہو گئے تھے۔ ہم ہی اپنے وجود کے حصار میں مقید تھے کہ وقت تو ہم نہیں گزارتے
بلکہ وقت ہمیں گزارتا ہے ـــ! یہ میں کیا سوچنے لگ گئی ـــ؟ میں میمونہ قیصر ـــ میری سوچیں
تو پہلے کبھی ایسی نہ تھیں! اب بھی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ جو کچھ میں سوچ رہی تھی، یہ جو کچھ ہو رہا
تھا یہ ہی فطرت شناسی ہے ـــ یہ ہی حقیقی زندگی ہے اور یہ سڑکوں پر پھرنے والی سادہ سی
زندگی ہی انجانی لذتوں سے ہمکنار کر سکتی ہے ـــ قیصر مینشن کی ہر دیوار میرے چشم تصور میں
منہدم ہونے لگی ـــ تمام ستون گرنے لگے اور مجھے لگا جیسے پرت پرت، تہہ در تہہ میری شخصیت
کھلتی جا رہی ہو ـــ آہ! کتنا سکون ہے؟

مہابلی پورم کی مونولیتھک سنگ تراشی دیکھ کر تو ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ آج ایک
ٹیڑھی لکیر کھینچ کر ہر کوئی اپنے آپ کو آرٹسٹ سمجھنے لگا ہے لیکن جن لوگوں نے اتنی باریک بینی
سے اپنے دور اور اپنی تاریخ کی عکاسی کی تھی وہ کتنے بڑے فن کار رہے ہوں گے؟ جب ہم پانچ
رتھوں والے مندر کے پاس آئے اور تو وہاں کی کچھ مورتیاں دیکھ کر مجھے بڑی شرم سی لگی ـــ اور
میرے ذہن کے اندر کسی کونے میں فن کا تصور بدلنے لگا ـــ ایسا فن کس کام کا جو حیا سوز ہو، جو
عریاں ہو، جو اخلاقی اقدار کی پستی کا نمونہ پیش کرے ـــ اور جسے کسی مرد کے ہمراہ دیکھتے
ہوئے آنکھیں زمین میں گڑی جائیں ـــ جیسا کہ اب مجھے ہو رہا تھا۔ فہد میری بغل میں کھڑا تھا۔
شاید اس نے میری جھکی ہوئی نظروں اور میرے اندر رونما ہونے والے تغیر کو محسوس کر لیا تھا۔
اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ تھاما اور ساتھ پگوڈا یا شور ٹیمپل کی طرف چلنے لگا کسی نے توجہ ہی نہیں
دی۔ سب گائڈ کی لسانی مہارت کے تسلسل میں کھڑے ہوئے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ
ننگے پیروں والا گائڈ جو مجھ سے بھی اچھی اور FLUENT انگریزی بول رہا ہے ـــ اس میں
اور مجھ میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا ہی تو کہ میرے جسم پر شفان کی قیمتی ساری لہرا رہی ہے اور
میں قیصر مینشن کی مکین ہوں اور یہ ـــ یہ معمولی سی بنیائن اور سوتی لنگی باندھے ہے اور اس کا
گھر ناریل کے پتوں سے چھپا ہوا یہیں کہیں اپنی کس مپرسی کی داستان کہہ رہا ہوگا۔

مدراس واپسی پر اسٹوش اپنا وعدہ بھولا نہیں تھا جب کہ میری آنکھوں سے اب تاج
کورومنڈل اور اس کے میوزر ریسٹورانٹ کے عکس مندمل ہو گئے تھے لیکن اب فہد کے زہرآگیں

جلے بھی نہ جانے کہاں کھو گئے تھے بلکہ اس نے اسیتوش کی زور دار حامی بھری تھی کہ تاج میں ضرور ڈنر لیا جائے اور میں اسے متحیر دیکھتی رہ گئی۔ وہ گنگنا رہا تھا ــ کھلنے لگے ہیں راز ترے میرے سامنے :

تاج کورومنڈل کے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی نظر سب سے پہلے دور سامنے میور ریسٹورانٹ تک جاتی ہے جو وسیع ہال کے آخری سرے پر ہے اور جس کے نقشیں دروازے کے بغل میں واضح حروف میں MAYUR لکھا ہے۔ میرے من میں کہیں ست رنگے پنکھوں والا مور ناچنے لگا کیوں کہ یہ من اب بھی میمونہ قیصر ہی کا تو تھا ــ برسوں کے فاصلے ایک ہی جست میں کس طرح پار ہو سکتے ہیں؟ لاؤنج کے داخلی دروازے کے بائیں جانب اندر کو شاپنگ آرکیڈ تھا جس کے چند شوکیس سامنے ہی جگمگ کر رہے تھے۔ اس کے آگے لمبا ریسپشن کاؤنٹر اور اس سے بھی آگے ELEVATORS یعنی لفٹ کی قطار ــ داہنی طرف بھی کچھ دیدہ زیب دوکانیں تھیں، جن میں سب سے پہلے کتابوں کی تھی اور جس کے شیشوں سے AMERICAN BEST SELLERS اور ٹورسٹ گائڈ بکس اور پوسٹ کارڈ جھانک رہے تھے۔ دوکانوں کے سلسلے کے آگے ایک کالی BALUSTRADE والا زینہ بڑی کج روی سے بل کھاتا ہوا نیچے چلا گیا تھا اور زینے کے اوپر کی دیوار پر ٹن اور کاپر کا ABSTRACT کولاژ دور ہی سے چمک رہا تھا۔ ہال کے وسط میں آرام دہ صوفے شیشے کی شفاف میزیں۔ ٹخنے دھنسنے والا کارپیٹ اور چھت میں ان گنت بلبلوں والے بگوڑانما جھاڑ

سب کتنا خوبصورت، کتنا ماڈرن، کتنا WELLSET تھا! ہم سب یوں ہی ادھر ادھر گھومنے لگے۔ نیہہ اور اسیتوش کو کتابوں کی کشش کھینچ لے گئی۔ راگنی ٹن اور کاپر کی تابناکی میں مسحور ہو گئی۔ آرتی اور سلیمان کو کوئی امریکی نوجوان مل گیا تھا جس نے اپنے چکن کے کرتے کو بینٹ کے اندر کھونسا ہوا تھا اور جس سے وہ بے تحاشا بکواس کئے جا رہے تھے۔ میں اس امریکی کے حلیے پر دل ہی دل میں ہنستی ہوئی بائیں طرف کی جگمگ SHOP WINDOWS کی طرف متوجہ ہو گئی تھی ــ! مینا کاری کے ننھے ہاتھی اور ہرن جن کی آنکھیں عقیق کی تھیں ــ جیڈ کی قیمتی مٹر مالا ــ ہاتھی دانت کا جویلری بکس ــ پکھراج کے ٹاپس ــ چاندی کا حقہ ــ مرادآبادی خاصدان ــ سب کتنی نایاب اشیاء تھیں۔ غیر ملکی تو ان پر ہزار جان سے نچھاور ہوتے تھے۔ تقریباً ایسا ہی چاندی کا حقہ قیصر مینشن کے ڈرائنگ روم میں بھی تو تھا ــ!

تبھی مجھے لگا جیسے کوئی مسلسل کسی کونے سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ دو آنکھیں کہیں

سے میری ہر حرکت کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ارادتاً پیٹ کر دیکھا۔ میری بائیں طرف جدھر موڑ مڑ کے دکانوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا ——— وہاں ایک بے حد سُرخ و سفید، بیحد اسمارٹ سا نوجوان دیوار سے ٹیک لگائے، گالوں کے نیچے ایک ہاتھ رکھے، دوسرا ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ میرے پلٹ کر دیکھنے پر وہ ایسے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے میرا وجود منفی ہو گیا ہو۔ میں بھی گھبرا کر لاؤنج میں چلی آئی لیکن پھر کچھ لموں بعد فہد کے پاس کھڑے ہو کے کتابیں دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہی بھوری آنکھیں پھر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ واقعی پھر اسی پوزیشن میں کھڑا تھا۔

سات بجے ہم لوگ میور میں گئے۔ مدھم مدھم سی دودھیا روشنی پورے ہال میں چھائی تھی۔ بڑے بڑے TERRA COTTA کے مور پنکھ پھیلائے کھڑے تھے اور خاص روایتی انداز کے سنگ مرمر کے فلور پر ایک ہندوستانی کجراری آنکھوں والی حسینہ گلابی کانجیورم کی ساری میں بھارت ناٹیم کا رقص پیش کر رہی تھی۔ سازندے تھیاگراج کی کوئی دھن بجا رہے تھے اور ایک سحر سی خاتون کرناٹک سنگیت کو لفظوں میں پرو رہی تھیں۔ ہم نے کونے کی ایک بڑی میز منتخب کی۔ ایک کم عمر ویٹر بلوریں طشتری میں موتیا کے تین ننھے گجرے لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ مسکرایا ———

"A WELCOME TOKEN FOR THE LADIES"

بہت خوب! میں نے سوچا۔ بھارت کا ہر خطہ نفیس ہے۔ دہلی اور لکھنؤ ہر جگہ ہیں۔ موتیا یہاں بھی کھلتا ہے۔ فہد کی خوابیدہ آنکھیں مسکرا مسکرا کر یہاں بھی کچھ کہہ رہی ہیں ———!

مینو دیکھا گیا۔ آرڈر دیا گیا اور پھر وہی FILIGREE کے کانٹوں چھری کی کھٹ کھٹ ——— سفید کلفدار نیپکنوں کا نفاست سے کھلنا ——— ہینڈسم ویٹروں کا بڑے مودبانہ انداز میں پوچھنا ——— "ANYTHING ELSE MADAM?" ——— اور ماحول کا دودھیا پن ——— موتیا کی سرسراتی ہوئی خوشبو اور فہد کی خوابیدہ آنکھوں کا تبسم! میں کھانا ختم کر چکی تھی۔ سامنے اب رقاصہ ایک الٹے گھڑے پر متحرک رہی تھی لیکن وہاں بھی فہد کی آنکھیں ——— میں اجازت لے کر باہر لاؤنج میں چلی آئی۔ سب رقص میں مگن تھے۔

غیر اختیاری طور پر میری نظریں بائیں جانب کی SHOP WINDOWS طرف اٹھ گئیں۔ دو بھوری آنکھیں اب بھی مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ پھر جینز والے پاؤں میری طرف بڑھے ———

"EXCUSE ME —— ARE YOU A KASHMIRI?" (معاف کریں — کیا آپ کشمیری ہیں ؟)

"DO I LOOK LIKE ONE?" (کیا میں ایسی لگ رہی ہوں ؟) میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

"BUT — THEN THIS — ?" (لیکن — پھر یہ — ؟) اس نے میری کلائی میں پڑی ہوئی چاندی کی کشمیری بریسلیٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک زنجیر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شکارے، حقے، ٹوکریاں اور کانگڑیاں لٹک رہی تھیں۔ میں بے ساختہ مسکرا پڑی۔

"ARE ONLY KASHMIRIS SUPPOSED TO WEAR THIS?" (کیا صرف کشمیری ہی اسے پہن سکتے ہیں ؟)

وہ بھی مسکرا دیا — "NO BUT WHERE HAVE YOU COME FROM?" (نہیں — لیکن آپ کہاں سے آئی ہیں ؟)

"FROM DELHI —— WHY?" (دہلی سے — کیوں ؟)

"ARE YOU A MUSLIM?" (کیا آپ مسلمان ہیں ؟)

"YES!" (ہاں!) میں نے متحیر ہو کر اسے دیکھا۔ آخر اس کا مطلب کیا تھا ؟

"تب آپ اردو ضرور بولتی ہوں گی !"

"ہاں بولتی ہوں !" میں نے سوچا، اردو تو ہم سب بولتے ہیں — میں — ایستوش — راگنی — ANDRE اور اب تم —!؟

"میں اردو میں بات کرنے کے لئے ترس گیا ہوں۔ آپ کے ہاتھ میں یہ چین دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید آپ کشمیری ہیں۔ میں بھی کشمیری ہوں نا....." وہ تو شکل و رنگ سے ہی ظاہر ہے۔ میں نے سوچا۔ "میرا نام اسلم نبی ہے۔ چار مہینے ہوئے ہمارے دو شو روم یہاں کھلے ہیں۔ میرے دو کزن اور ہیں۔ تب سے اب تک اردو بولنے کے لئے ہم لوگ ترس رہے ہیں۔ یہاں تو سوائے انگریزی، تامل اور ملیالم کے کچھ بھی نہیں بولا جاتا۔ تامل اور ملیالم ہم لوگ جانتے نہیں — اور انگریزی تو بدیسی زبان ہے۔ بولی تو جا سکتی ہے لیکن اپنائیت نہیں پیدا کر سکتی — وہ — شاید آپ کے ساتھی آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں" : میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فہد میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسلم نبی کا تعارف فہد سے کرایا اور ساتھ ہی اسلم نبی کے گھورنے سے لے کر اب تک کا قصہ بھی

کہہ ڈالا۔ پھر تو اتنے زور دار طریقے سے السلام علیکم کہا گیا اور اتنی گرم جوشی سے مصافحہ ہوا کہ میں اسے اپنا معرکہ سمجھ کر اپنی حقے والی چین کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

اسلم نے اپنے باقی دونوں کزنس سے بھی ملایا۔ اپنا شو روم دکھایا ـــ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے ایک کشمیری کرتہ بھی خرید لیا۔ پھر تو وہ چاروں ایسی دقیق و سلیس اردو چھیڑ بیٹھے کہ مجھے لگا کہ مدراس کا یہ فائیو اسٹار ہوٹل، دہلی کے چاندنی چوک اور لکھنؤ کے گول دروازے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

اسلم کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا ـــ "اور انگریزی تو بدیسی زبان ہے۔ بولی تو جا سکتی ہے لیکن اپنائیت نہیں پیدا کر سکتی ـــ" میری نظروں سے تمام اپ ٹو ڈیٹ MODERNITY غائب ہوتی گئی اور اس کی جگہ ایک سُرخ اینٹوں والے آنگن کا عکس متحرک ہونے لگا جہاں میرے بالوں میں وینی ـــ ہاتھوں میں موتیا کے گجرے۔ لباس پر ہلدی کے دھبے۔ فہد کی خوابیدہ آنکھیں اور ہاتھوں کا لمس تھا ـــ اردو فر فر بولی جا رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی ـــ ہم زباں کہاں کہاں ـــ!! □

ظفر مُرادآبادی

۱۸۲۰ - کٹرا شیخ چاند
لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

غزلیں

خوش گلو، خوش فکر، خوش گفتار کوئی بھی نہ تھا
دلربا چہرے تو تھے دلدار کوئی بھی نہ تھا

عمر بھر تپتے رہے رشتوں کے نخلستان میں
پیڑ تھے کتنے ہی، سایہ دار کوئی بھی نہ تھا

نیند میں ڈوبی ہوئی پرچھائیوں کے عکس تھے
سورجوں کے دشت میں بیدار کوئی بھی نہ تھا

تھے زمانہ ساز، حق دشمن، وفا نا آشنا
آئینے میں وقت کے کردار کوئی بھی نہ تھا

دربدر پھرتے رہے خانہ بدوشوں کی طرح
صاحبانِ فکر کا گھر بار کوئی بھی نہ تھا

زرد چہرے، بوجھل آنکھیں، خشک لب، بھرّا گونج
زندگانی! کیا ترا شہکار کوئی بھی نہ تھا

اب تو ہر پل ہے ہمیں خود اپنے قاتل کی تلاش
زندگی سے اس قدر بیزار کوئی بھی نہ تھا

شعلہ شعلہ تھی چراغوں کو سحر کی جستجو
شب میں ایسا مرگِ زندہ دار کوئی بھی نہ تھا

آئینہ بھی رخ بدل لیتا ہے ہر چہرے کے ساتھ
کیا یقیں کا اے ظفر معیار کوئی بھی نہ تھا

کوئی فکرِ مطمئن، کوئی خیالِ معتبر
کچھ تو اے اہلِ سخن! حُسنِ کمالِ معتبر

ڈوبتا ہوں آج، کل ابھروں گا آب و تاب سے
ڈھلتے سورج کی طرح میں ہوں زوالِ معتبر

ہے مگن خوش فہمیوں میں آج ہر بے چہرگی
آئینے میں کون پرکھے خط و خالِ معتبر

روز افزوں ہے صلیبوں کی پشیمانی یہاں
جرأتِ بیباک! پھر کوئی مجالِ معتبر

زندگی! تیرا تجسس آگہی در آگہی
اور اس کے بعد بھی خود ہی سوالِ معتبر

ہوں سراپا تشنگی، دشتِ تپیدہ کی طرح
نے فروغِ ابر ہی، نے برشگالِ معتبر

مجھ سے ہے درد آشنا، ہر لمحہ موجِ نشاط
رکھ حفاظت سے کہ ہوں گردِ ملالِ معتبر

ہے مزاجِ عصر، ہر لمحہ تغیر آشنا
تند خوئی مستند، نے خوش خصالِ معتبر

تجھ کو پا کر بھی گرفتارِ تذبذب ہوں ظفر
خواب ہے یا فی الحقیقت ہے وصالِ معتبر

نجیب اختر
سنٹر آف انڈین لینگویجز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پریم چند اور ہم

زبان، انسان کی معاشرتی زندگی کے رابطوں کو استوار کرتی ہے، مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، ان کے مفہوم متعین کرتی ہے اور نئے معنوی امکانات دریافت کرتی ہے، ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ ہم ایک "بے لفظ معاشرے" میں زندہ ہیں تو یہی نہیں کہ ہمیں "گونگے پن" کی اذیتوں کو سہنا پڑے گا۔ بلکہ یہ بھی ہوگا کہ تمام مادی ترقیوں کے خواب سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ مانوس الفاظ موجود نہ ہوں تو خیالات بھی ساتھ نہیں دیتے اور تمنائیں بھی منور نہیں ہوتیں۔ ہم ان لفظوں کے وسیلے ہی اپنے آپ کو پہچانتے، دوسروں کو جانتے اور خود کو پیش کرتے ہیں۔ "خود پیش کشی" کی بلند ترین منزل اور بہترین صورت فن و ادب میں نظر آتی ہے۔ جہاں ادیب زبان اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کو تمام معنوی تہہ داریوں کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اس پر الفاظ کی پوشیدہ خصوصیت، رمزی معنویت اور تاریکی قوت پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ اسی لئے لفظوں کو وہ اپنی اختراعی بصیرت اور تخلیقی شعور کے وسیلوں سے نت نئے معنوی رنگوں میں استعمال کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ چونکہ فن اور فنکار کے سلسلے کی ایک اہم کڑی قاری بھی ہے۔ اس لئے اپنے قاریوں کے لسانی معیار کو ادیب یکسر نظر انداز نہیں کرتا۔ جہاں کہیں ایسا ہوا ہے، ادب کا تعلق عوام سے ٹوٹنے لگا ہے اور یہ طبقۂ خواص کی محدود فکر و نظر کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے۔ ماؤزے تنگ نے اسی لئے کہا تھا ـــــ

IF WE DO NOT EVEN UNDERSTAND THE LANGUAGE OF THE MASSES, HOW CAN WE POSSIBLY TALK ABOUT CREATING LITERATURE AND ART.[1]

عوام کی زبان سمجھے بغیر، کوئی بھی عوامی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر

[1] MAO TSE-TUNG, PROBLEMS OF ARTS AND LITERATURE, P 8

سکتا اور عوامی مسائل کی آگہی کے بغیر عوام دوستی اور انسانی دوستی جیسے نعرے، کھوکھلے ہی ہوں گے۔ بہترین ادیب، بہترین انسانی دوست ہے مگر جب، کہ عوام کے دکھ سکھ اور رنج و راحت سے قریب ترین بھی ہو۔ یہ عوامی شعور عوام کی زبان جانے بغیر ممکن نہیں۔ نہایت شفاف و پاکیزہ اور مرصع و اعلیٰ زبان کو استعمال کرنا ہی ادب نہیں ہے۔ ادب پر جب طبقۂ شرفا کی اجارہ داری تھی اور درباروں میں اس کی پرورش ہوا کرتی تھی تو اس کا لسانی مزاج بھی درباری تکلفات سے آراستہ تھا، اس کے تجربات بھی محدود تھے۔ انداز حیات بدلا تو آئینِ فکر میں بھی تبدیلی برپا ہوئی، مسائل نے نیا ڈھنگ اختیار کیا تو تصورات بھی تبدیل ہونے لگے، زندگی کا مزاج بدلا تو ادبی مزاج میں بھی تغیر پیدا ہوا اور لسانی رویے بھی بدل گئے۔ ان تغیرات نے ادب کو آہستہ آہستہ "خود نوری" (SELF LUMINOUS) بنا دیا جس کی تشریح و تعبیر کے لئے مفسروں کا الگ ایک طبقہ اب پیدا کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ اب ایک مضبوط ادبی تصور رالف فوکس، کے لفظوں میں یہ منظر عام پر آیا۔

"ART THAT IS NOT SENSOUS, THAT IS NOT CONCERNED WITH PERCEPTION OF THE REAL WORLD, WITH THE SENSIBLE OBJECTS, IS NOT ART AT ALL, NOT EVEN THE SHADOW OF ART. THE ESSENCE OF THE CREATIVE PROCESS IN THE STRUGGLE BETWEEN THE CREATOR AN EXTERNAL REALITY, THE URGENT DEMAND TO MASTER AND RE-CREATE THAT REALITY."[لے]

گویا احساس کی لطیف کرنوں سے ساتھ حقیقی دنیا کے ادراک کی پیشکش کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ اردو میں اس ادبی شعور کا مرحلۂ آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہے کہ جب دانشوروں، ادیبوں اور مصلحوں نے باغوں اور محلوں میں بیٹھ کر خوبصورت لفظوں میں سوچنے اور محسوس کرنے کا شیوہ ترک کر دیا اور زندگی کی تلخ سچائیوں سے مردانہ وار مقابلے کے لئے دنیائے آب و گل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ زمین تیار ہوتی گئی، ذہن ہموار ہوتا گیا، حتیٰ کہ صرف پچیس ۲۵ برسوں کے بعد اردو نظم اور اردو فکشن دونوں ہی نے انقلابی رُخ اختیار کر لئے۔ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں اقبال کی شاعری اور پریم چند کی افسانہ نگاری سامنے آئی۔ دونوں ہی نے زبان کی عظیم قوت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے مشاہدات و احساسات کو ایسے وسیلۂ اظہار میں پیش کیا جو عوامی بھی تھا، عمومی بھی

[لے] THE NOVEL AND THE PEOPLE P. 80

جس میں شادابی بھی تھی، توانائی بھی، جہاں ندرتیں بھی تھیں اور قوتیں بھی، فرسودہ زبان، فرسودہ خیالات کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ زندگی کے نئے معاملات و مسائل اور تازہ تر خیالات کی پیشکش کے لئے اقبال ہی کی طرح پریم چند نے بھی عوامی زبان کی نئی قوتیں دریافت اور استعمال کیں۔
آج کہ جب ہم پریم چند صدی تقریبات منا رہے ہیں، جابجا یہ سوال سامنے آرہا ہے کہ پریم چند سیکولر تھے یا نہیں؛ پریم چند پہلے اردو کے ادیب تھے یا ہندی کے؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اول و آخر ادیب تھے، ہندوستانی عوام کے ادیب۔ انھوں نے اردو یا ہندی کو وسیلہ ضرور بنایا، اسے مقصد تصور نہیں کیا۔ انھیں احساس تھا کہ وہ ادب کی تخلیق کیوں کر رہے ہیں؟ اور کس لئے کر رہے ہیں؟ اس سلسلے میں خود پریم چند کا خیال ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں ــــ

"ہمارے ملکی پھیلاؤ کے ساتھ ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت پڑگئی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے، جسے ہم ہندی یا گجراتی یا مراٹھی یا اردو نہ کہہ کر ہندوستانی زبان کہہ سکیں، جسے ہندوستان کا پڑھا، بے پڑھا آدمی اسی طرح سمجھے یا بولے جیسے ہر ایک انگریز یا جرمن یا فرانسیسی، فرنچ یا جرمن یا انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے"[1]

یہ تو ان کا نقطۂ نظر تھا، تخلیق کی سطح پر انھوں نے عمل کی جو راہ اختیار کی تھی، اس کی وضاحت بھی خود انھوں نے کی ہے ــــ

"میری ساری زندگی اردو کی خدمت کرتے گزری ہے اور آج میں جتنی اردو لکھتا ہوں اتنی ہندی نہیں لکھتا اور کایستھ ہونے اور بچپن سے فارسی کی مشق کرنے کی وجہ سے اردو میرے لئے جتنی فطری ہے، اتنی ہندی نہیں ہے۔"[2]

چنانچہ انھوں نے کل تیرہ ناول تحریر کئے۔ اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوہ ایثار، بیوہ، بازار حسن، گوشہ عافیت، نرملا، غبن، چوگان ہستی، پردہ مجاز، میدان عمل، گئودان اور منگل سوتر۔ ان میں سے صرف ایک ناول "منگل سوتر" اردو میں طبع نہیں ہو سکا۔ اس کی معقول وجہ بھی ہے۔ اس ناول کو پریم چند نے ۱۹۳۶ء میں بستر علالت پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اسی سال ان کا انتقال (۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء) ہوگیا۔ یہ ناول وہ نامکمل ہی چھوڑ گئے۔ انتقال کے بعد اسی نامکمل شکل میں ان کے صاحبزادے امرت رائے نے اسے چھپوایا۔ ہم اردو والے اس ناول کو اردو میں منتقل کرنے کی توفیق اب تک حاصل نہیں کر سکے ہیں۔

---

[1] پریم چند۔ ساہتیہ اودیشیہ ص۲۰۹۔

[2] ایضاً ص۱۵۱

افسانہ نگاری کی ابتدا انھوں نے ۱۹۰۵ء میں کی اور اردو ہی میں لکھنے کا آغاز کیا۔ پہلا مجموعہ "سوز وطن" اردو ہی میں جون ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد سے اخیر وقت تک کے دوران ان کے مزید دس معیاری مجموعے چھپے۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی، خاک پروانہ، خواب و خیال، فردوس خیال، پریم چالیسی، آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت اور واردات۔ ایک افسانہ بعنوان "روٹھی رانی" الگ کتابی شکل میں چھپا۔ ان تمام مجموعوں میں پریم چند کے کل ایک سو چورانوے افسانے موجود ہیں۔ امرت رائے اور ڈاکٹر قمر رئیس نے ایسے مزید دس افسانے بشمول "کفن" دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جو ان میں سے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ ویسے یہ دسوں افسانے مختلف رسالوں کی زینت بنے ہیں۔ اس طرح اردو میں پریم چند کے کل افسانے دو سو چار ہوئے۔ دوسری طرف ہندی میں ان کے افسانوں کی کل تعداد دو سو چھاسٹھ ہے۔ یعنی باسٹھ افسانے زیادہ ہندی میں ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے کہ اب تک ان زائد باسٹھ افسانوں کو ہم اردو میں منتقل نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کہ ان کے باسٹھ افسانے اور ایک ناول "منگل سوتر" اردو میں نہیں ہیں، ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بنیادی طور پر اردو زبان و ادب سے کمزور تعلق رکھتے تھے۔ ہاں! یہ صحیح ہے کہ ان کے موضوعات "مسلم معاشرے" سے کم تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اس سے اردو میں ان کی فنکارانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ انھوں نے ہندو سماج میں جنم لیا تھا، ہندو سماج میں پرورش پائی تھی، کھانے پینے، لین دین، شادی بیاہ، مرنے جینے کے معاملات میں ہندو سماج کی رسوم و روایات ہی سے ان کا تعلق تھا۔ اس لئے فطری طور پر ان کے افسانوں اور ناولوں کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر کے بڑے حصے کو "ہندوانہ" ہونا تھا۔ اس کی وجہ سے ہم اردو ادب کے اس عظیم محسن کی قیمت با قامت کم نہیں کر سکتے۔ اگر پریم چند کے فکشن کا تہذیبی پس منظر اور تمدنی مزاج وہ نہیں ہوتا کہ جو ہے ـــــ اور انھوں نے "مسلم سماج" کی پیشکش کو ترجیح دی ہوتی تو فنی طور پر ان کے افسانوں کی اہمیت کے کم ہو جانے کا امکان تھا، اظہار کے مرحلوں میں اپنے تخلیقی شعور کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے اور ان کے افسانوں اور ناولوں میں سطحی فوٹو گرافی کے انداز کے غلبے کا احتمال تھا۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اردو کے ادیب نے "ہندو معاشرے" کی آئینہ داری کی ہے یا "مسلم معاشرے" کی ترجمانی کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اپنی شخصیت سے متعلق معاشرے کی عکاسی میں فنکاری کی ہے یا نہیں۔

فکشن کا اسلوب، زندگی کی سرگرمیوں اور تلخ و تند سچائیوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں ہی افسانہ و ناول کو وہ قوتیں بخشتی ہیں جو ان کے فنی حسن و اثر کو نکھارتی،

کشش انگیز اور دبر پا بناتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اصلاحی تحریکوں کا جو زور بندھا تھا، پریم چند ان سے متاثر ہی نہیں تھے، خود ایک مصلحانہ شعور رکھتے تھے جو انسانی ہمدردی اور عوام دوستی کے احساسات سے سرشار تھا۔ فرسودہ رسموں، بے جان عقیدوں اور کھوکھلی روایتوں سے وہ متنفر تھے اور عوامی استحصال کے موجود اور مروجہ ہتھکنڈوں سے انتہائی بیزار۔ غیر ملکی حکمراں طبقے کا سراپا تو ان کے سامنے تھا ہی، وہ ملکی حکمرانوں کے کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ پریم چند، ان سب کے بالمقابل، انسان دوستی کے غیر متزلزل جذبے کے ساتھ صف آرا ہو گئے۔ اردو میں تخلیقی شعور کی جسارت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔ اولین ناول "اسرارِ معابد" کی تخلیق کے وقت ان کی عمر ۲۲ برس کی تھی اور افسانہ نگاری کی ابتدا انھوں نے لگ بھگ ۲۸ برس کی عمر میں کی تھی۔ عہد شباب میں شخصی احساسات و تصورات، خود مرتکز ہوتے ہیں، جمالیاتی نگاہ میں اضطراب چھلکتا ہے اور رومانی شعور پُر فشاں ہوتا ہے۔ پریم چند کی اوّلین تخلیقوں کو دیکھیے، ان میں ایسی کوئی کیفیت نہیں ملتی۔ ان کی شخصیت پر انفرادیت کے بمقابلہ اجتماعیت کا گہرا سایہ شروع سے رہا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں احساس و فکر کا ارتکاز نہیں، انتشار ہے۔ ان کی اپنی "فردیت" بھی سماجی بصیرت کا آئینہ خانہ ہے۔ اسرارِ معابد، ان کا پہلا ناول ہے لیکن اس میں بھی ۲۳ برس کے نوجوان کے خوبصورت اور دلکش خیالات نہیں ملتے۔ عبادت خانے کے پُر اسرار ماحول میں پلنے اور پنپنے والی مہنتوں اور پجاریوں کی ان سیاہ کارگزاریوں پر جرأت کے ساتھ پریم چند نے روشنی ڈالی ہے۔ جن کو اس وقت تک خوف اور احترام کے ملے جلے جذبے کے زیر اثر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ مذہبی رسوم کے پردوں میں حرص و ہوس کی جو گرم بازاری تھی، ان کو اس عہد میں بے نقاب کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ نوجوان پریم چند کا یہ پہلا قدم بھی اصلاحی نقطۂ نظر کا حامل تھا جیسے جیسے ان کا فنی شعور ارتقائی سفر طے کرتا گیا، ان کا یہ نقطۂ نظر پختہ تر ہوتا گیا اور گئودان[1] میں ان کے ناولی شعور کا بھرپور اور مکمل مظاہرہ ہوا ہے۔ ہندوستان کی عوامی زندگی کے گوشے گوشے کی تلخ سچائیوں کو انھوں نے انتہائی خلوص اور انہماک کے ساتھ جمع کیا اور معتدل اصلاحی فکر کے ساتھ ناول کے دلچسپ فنی اسلوب میں پیش کر دیا۔

۱۹۰۷ء میں پریم چند افسانے کی طرف متوجہ ہوئے تو یہاں بھی ان کے تخلیقی شعور کی

---

[1] چونکہ یہ بات اب پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ اقبال ورما سحر نے ہندی گئودان کو اردو میں منتقل کیا تھا اور نظر ثانی کے بعد ہی پریم چند نے اس کی اشاعت کی طرف توجہ دی اس لئے میں گئودان کو تصنیف ہی کا تصور کرتا ہوں۔ (ن۔ا۔)

انفرادیت نے اپنا سکہ جما لیا۔ ان کے موضوعات میں حقائق کی تلخی تھی تو افسانوی اسلوب میں شیرینی، تجربوں میں تندی تھی تو تخلیقی زبان میں نرمی اور عام فہمی، جون ۱۹۰۸ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوا۔ اس میں پانچ افسانے تھے۔ دنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، صلۂ ماتم اور عشق اور حبِ دنیا۔ اس سے پہلے افسانوی مجموعے میں بھی کوئی تصوریت نہ تھی۔ واقعیت تھی اور اس کی آنچ اتنی تیز تھی کہ برطانوی حکومت نے اس مجموعے میں باغیانہ احساس کو پلتے دیکھا اور اسے بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اردو فکشن کی دنیا میں یہ پہلی صدائے احتجاج تھی۔ یہ ایک ایسا علامتی موڑ ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برطانوی حکمرانوں نے اس شعوری احتجاج کو کچلنے کی کاوش تو کی مگر انھیں کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ "سوزِ وطن" کی جلدیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ لیکن ان افسانوں کے پس منظر میں موجزن شعوری احتجاج پنپتا رہا۔ ہمارے معتوب افسانہ نگار نے نواب رائے کی جگہ پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کر دیا اور پھر ایک طویل مدت تک اردو افسانہ کا فن اس تخلیقی فکر و نظر سے مالا مال ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک ایسا حلقہ تیار ہو گیا۔ جس نے دنیائے فکر و فن میں پریم چند کی قیادت تسلیم کی اور اس کے افسانوی مزاج کی رہنمائی کو قبول کرتے ہوئے واقعیت شعاری کی وہ راہ اختیار کی جس پہ چل کر اردو افسانہ آج فن و فکر کی اس منزل کمال پر پہنچا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانہ نگاروں کی دوسری صف ہی کو متاثر نہیں کیا۔ ان کے اثرات تیسری صف پر بھی مرتسم ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادیبوں کا پہلا کل ہند اجتماع لکھنؤ میں ہوا تو اس کی صدارت کے لئے پریم چند ہی کی شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت کے دوران ہندوستان کے ادیبوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے حسن کے معیار کو تبدیل کر لیں۔ کیونکہ تغیر پذیر حالات و مسائل میں ادیب اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرتا رہا تو یہ "ادبی جرم" آئندہ نسلوں کے لئے ناقابلِ فراموش ثابت ہوگا۔ انھوں نے اپنی تخلیقی اور تحریکی سرگرمیوں کے وسیلے سے گویا پچیس برسوں میں اردو افسانے کے دامانِ فکر و نظر کو اتنا وسیع اور وقیع کر دیا، نایافت تجربوں کا ایک نئی صنفِ افسانہ میں ایسا ڈھیر لگا دیا اور حقیقت و افسانہ کے اتنے دلکش فنی امتزاج کی انھوں نے نشوونما کی کہ آج بھی ان کی فنکارانہ عظمت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

مختصر یہ کہ پریم چند نے فنی، فکری، تکنیکی اور موضوعی جہتوں سے اردو فکشن کی دنیا میں جو انقلاب برپا کیا ہے اس سے کوئی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ ان کی فکر بھی انقلابی تھی اور اسلوب بھی انقلابی

انھوں نے عوام سے دکھ سکھ کو عوام کی زبان میں سنا اور سنایا۔ عوام کی زبان میں دیکھا اور دکھایا۔ جہاں بے پناہ اپنائیت، پُر خلوص محبت اور دردمندانہ بصیرت تھی۔ انھوں نے غلام ہندوستان کے عوام کے دلوں میں آزادی کے لئے جو تڑپ پیدا کی تھی، کیا اس کی صحیح تقویم ممکن ہے؟ وہ انسانیت کو، ہندوستانی عوام کو استحصال آمیز اذیتوں، ذلتوں اور شرمناک بستیوں سے نجات دلانے کے لئے تخلیقی سطح پر جس انداز میں کوشاں رہے، اس کے پیش نظر ان کی کاوشوں کو ہندو اور مسلم کے محدود پیمانوں میں رکھنا، ناانصافی ہے۔ اردو اور ہندی کی تفریق تنگی فکر ونگاہ کا شکار بنانا غیر مستحسن ہے۔ پریم چند نے اردو فکشن کو موضوعات اسلوب و تکنیک اور زبان و بیان کا بیش بہا خزانہ دیا ہے اور ہندی فکشن پر بھی ان کا احسان کم نہیں ہے۔ ہم اردو ہندی والے پریم چند کے کارناموں کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ایسی کوئی یادگار قائم نہیں کر سکے ہیں، جس سے ہم سب کو تحریکات حاصل ہو سکتی ہوں۔ البتہ ان کی سالم شخصیت کو ٹکڑے کر کے محدود ٹکڑوں میں تولنے کی کاوش جاری ہے۔ کیا تاریخ ہماری اس مصلحت اندیشی اور تنگ نظری کو فراموش کر سکے گی؟ ڈاکٹر محمد حسن کے لفظوں میں "انسان کے گم شدہ تقدس کی بازیافت کی کوشش، پریم چند کا کرشمہ بھی ہے اور کارنامہ بھی۔"[۱] ہم لوگوں نے ان کے اس ممتاز فکشنل اسٹائل کی معنی خیز عظمت تک رسائی کی کوشش ابھی کم کی ہیں۔ ہندوستانی ادبیات کے اس عظیم محسن کی فنی نگاہ اور فطری بصیرت ہمیں آج بھی دعوت دے رہی ہے کہ ذہنی تحفظات اور لسانی تعصبات سے بالا ہو کر اس کے فن و فکر کی تفہیم و تقویم کی جائے۔ □

---

[۱] پریم چند، زمانہ، ذہن و آرٹ۔ عنوان مضمون۔ مطبوعہ۔ آج کل۔ دہلی اگست ۱۹۸۰ء صفحہ
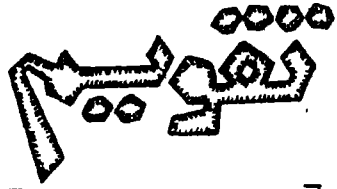
[تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور رہے گا۔ (ادارہ)]

جستجو ○ تحسین فراقی ○ مکتبہ نگلس، ۵ بخشی سٹریٹ، بیرون موری دروازہ، لاہور ○ قیمت: ۳۶/۰۰ روپے

تحسین فراقی نوجوان نقاد ہیں۔ انھوں نے ادب میں قدم رکھتے ہی اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ان کی تحریر کی رواقی و برجستگی اِس امر کی علامت ہے کہ خیالات کے اظہار میں زبان ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اپنی بات کو بہت سلیقہ مندی و سنجیدگی کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں 'جستجو' ان کے آٹھ تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے، اور ہر مضمون میں انھوں نے موضوع کا حق ادا کیا ہے ان کا سب سے اچھا مضمون "اردو تنقید کے دس سال" ہے۔ دوسرے مضامین میں "اردو ادب میں اسلاقی اقدار کی پیش کش"، "بھٹائی اور اس کی شاعری"، "علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ" اور "محمد حسن عسکری" خصوصی توجہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ تحسین فراقی میں اچھے نقاد کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ اگر انھوں نے اِس سنجیدگی اور خلوصِ مطالعہ کو برقرار رکھا تو وہ اپنی شناخت نمایاں طور پر کرا سکیں گے۔ "جستجو" کا مقدمہ سراج منیر نے لکھا ہے جو خود ابھرتے ہوئے نقاد ہیں۔ انھوں نے مصنف کا تعارف بڑی سلیقہ مندی سے کرایا ہے۔ میں ان کی اس رائے سے متفق ہوں کہ تحسین فراقی کی "موضوعات پر گرفت، علم، تجزیاتی فراست اور سب سے بڑھ کر دیانت" انھیں منفرد حیثیت عطا کر دیتی ہے امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اس معیارِ تنقید کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی مزید تصنیفات منظر عام پر لائیں گے۔

استفادہ ○ عتیق احمد ○ مکتبہ ارژنگ۔ خیابانِ بابر۔ بوستان آباد، پشاور ○ قیمت: ۲۰/۰۰ روپے

کسی تعلق کا شکار ہوئے بغیر عتیق احمد کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں لیکن شہرت کی خاطر

نمود و نمائش کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے تنقیدی مضامین کے مجموعہ کا کوئی اِدّعائی نام نہیں رکھا ہے۔ "استفادہ" خود اظہار انکسار ہے۔ اس مجموعہ میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں جن کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ شاعری پر اور دوسرا حصہ تنقید و افسانہ پر تنقیدی مضامین کا حامل ہے۔ ان کا دائرۂ مطالعہ خسرو و غالب سے فارغ بخاری و تاج سعید تک اور نیاز فتحپوری و احتشام حسین سے شوکت صدیقی و ممتاز شیریں تک پھیلا ہوا ہے۔ مطالعہ کا یہ تنوع ان کے ذہنی افق کی وسعت کا غماز ہے۔ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل ہیں چنانچہ ان کے یہاں نظریاتی پہلو زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ اس کمٹ منٹ (COMMITMENT) کے باوجود وہ تنقیدی توازن کا خاص حد تک احترام کرتے ہیں۔ ان کی تحریر پروفیسر احتشام حسین ہی کی طرح سادہ اور راست ہوتی ہے اپنے دیباچہ میں انھوں نے اس قدر انکسار سے کام لیا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ کہتے ان پر رحم آتا ہے۔ شاید اسی انکسار کی سزا ہے کہ ان کی کتابت و طباعت اور سیٹنگ کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس فروگذاشت کو نظر انداز کیا جائے گا اور رفیق احمد کی تحریروں کو وہ اہمیت دی جائے گی جس کے وہ حق دار ہیں۔

گردشِ کوزہ ○ محشر بدایونی ○ سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور ○ قیمت: ۳۰/۰۰

محشر بدایونی کہنہ مشق شاعر ہیں اور ہند و پاک میں بڑا وسیع حلقۂ تعارف رکھتے ہیں۔ "گردشِ کوزہ" ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو کلیتہً غزلیات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے بھی عصری مشاہدہ و تجربہ کو اپنا تخلیقی سرمایہ بنایا ہے۔ غزل کے بنیادی مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے روایتی اصطلاحات کے بجائے انھوں نے وہ لفظیات استعمال کی ہے جو ان کے اشعار کو ان کے ذاتی تجربات کا عکاس بنا سکے۔ ان کے یہاں جذباتی انگیخت نہیں، لیکن دھیما دھیما گداز 'تیرِ نیم کش' بن جاتا ہے۔ عام سے مضمون کو بڑی سادگی کے ساتھ وہ پہلو دار بنا دیتے ہیں۔ ان کا کلام ہمیں اپنی مانوس دنیا کا کلام معلوم ہوتا ہے:

ہنر کا حق تو ہوا کی بستی میں کون دے گا
اِدھر میں اپنا دیا جلا لوں یہی بہت ہے

زمینوں پر نہ یوں قبضہ کریں شہر
کوئی تو راستہ صحرا کا رہ جائے

آوازِ دل تھا میں، مجھے دائم سنا گیا
آوازِ پا نہ تھا جو سفر تک سنائی دے

کچھ نہیں، کوئی پریشانی نہیں، تنہائیو!
ذہن میں اُڑنے لگا تھا طائرِ فردا ذرا

یہاں تو خاک بھی دامن میں اب نہیں باقی
ہوا نے کل سے تو بہتر یہ راستے میں تھا

لباسِ حرف ہے کوتہ، قدِ خیال بلند
عجب ایسی بات ہو محشر تو کیا کہا جائے

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ "گردشِ کوزہ" کی بیشتر غزلیں ردیف 'ی' میں ہیں۔ ان کے یہاں گھر، راستے، سفر اور تشکیل و تخلیق کے موضوع پر کافی اور متنوع اشعار ہیں۔ ہم ان کے تازہ مجموعہ کلام کا

نیر مقدم کرتے ہیں۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔

سازِ سخن بہانہ ہے ○ ادا جعفری ○ غالب پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۴۰۷۹، لاہور

○قیمت: ۳۶/۰۰

شاعرات میں ادا جعفری اپنا مقام صفِ اوّل میں رکھتی ہیں۔ 'ساز سخن بہانہ ہے' ان کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ ہے جس میں حمد، نعت اور سلام کے بعد غزلیں اور پابند و آزاد نظمیں دعائیہ نظم "یارحمتاً للعالمیںؐ" پر ختم ہوتی ہیں۔ ادا کی شاعری کی کائنات انھیں کے الفاظ میں "زندگی کے خاکے ہیں، کچھ میری ذاتی کچھ ہماری اجتماعی زندگی کے" ان پیکروں کو شعری پیرہن انھوں نے تخلیقی تقاضوں کے تحت عطا کئے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے ہر صنفِ شعر کو اپنایا ہے۔ ادا کبھی اپنے آپ سے باہر نہیں ہوتیں۔ وہ لاکھ اپنی "بغاوت" کا اعلان کریں، ان کی طبیعت کا ٹھہراؤ اور ان کی شخصیت کا رکھ رکھاؤ ان کے کلام میں جھلکتا ہے:

صبا کا ہاتھ تھام کر ادا نہ چل سکو گی تم
تمام عمر خواب خواب ساعتوں کے درمیان

جانے کیا بات اس روز کوئی در نہ کھلا
غم مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانا چاہے

میں اک نگہ کی روشنی میں اتنی دور تک گئی
غبارِ ہجر چھٹ گیا، شبِ فراق تھک گئی

اور ایک مختصر ترین نظم "وہ":

وہ صداقت زماں تا زماں
وہ محبت کی خوشبو کراں تا کراں
اس کے سائے میں مجھ کو ملی جب ملی ہے اماں

ادا کی شاعری خاصی ذاتی (PERSONAL) ہوتی ہے، زبان کا رجحان فارسی سے زیادہ ہندی کی طرف ہے۔ ان کے کلام ہی کی طرح یہ مجموعۂ کلام بہت خوبصورت ہے۔

محمد عمر مہاجر: احوال و آثار ○ فریسہ عقیل ○ عصری مطبوعات، اے ۳۲۲ بلاک ڈی، شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳ ○ قیمت: ۲۰/۰۰

فراموش کاری کے تہہ خانوں سے نکال کر، گرد و غبار جھاڑ کر، جب کوئی گوہر نایاب پیش کیا جاتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ آخر ہم نے اسے اب تک کیوں نظر انداز کیا۔ محمد عمر مہاجر سابق ریاست حیدرآباد کے سپوت تھے، بہادر یار جنگ کے حلقہ بگوش تھے۔ تقریر، تحریر، ڈرامہ و افسانہ پر عبور تھا، موسیقی مصوری دسنگ تراشی کے رموز آشنا تھے۔ کئی تصانیف اپنی زندگی میں منظر عام پر لا چکے تھے، لیکن اس کے باوجود بہت سا سرمایہ منتشر چھوڑ گئے۔ ان کی لائق صاحبزادی فریسہ عقیل نے ان کے متفرق مضامین، دیباچے، خطبۂ صدارت، افسانے اور خطوط زیر تبصرہ کتاب میں یکجا کر دیئے ہیں۔ مہاجر مرحوم نے تاریخ ادب اردو، ترقی پسند نظریہ، روایت اور ادب، افسانہ، نظر و ذوق، غالب، حالی، امراؤ جان ادا،

حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، بہادر یار جنگ، نظر حیدر آبادی، ماہر القادری، ممتاز مفتی، رشید احمد صدیقی اور دوسرے بہت سے عنوانات اور شخصیات پر خیال انگیز مضامین لکھے ہیں۔ (افسانے روداجی ہیں) یہ تنوع اور منفرد علمی و ادبی بصیرت دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ محمد عمر مہاجر کا مطالعہ ہمیں بعض اچھے نکات سے آشنا کرتا ہے۔

بے ارادہ ○ جوگیندر پال ○ زمزم بک ٹرسٹ، وشوکرما نگر، شاہدرہ، دہلی ۳۲
○ قیمت: ۲۵/..

جوگیندر پال اردو افسانہ میں سینئر لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ پہلے افسانے ہی لکھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے منی کہانیاں بھی لکھنی شروع کر دیں اور اب (خدا خیر کرے) پرندوں کی جھنڈ میں مڑنے لگے ہیں۔ یہ سب بے ارادہ ہے یا با ارادہ؟ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ گلشن کے جن کو عطر کی شیشی میں بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں (یہ تو بے تکلف دوستی کی بات ہوئی!) ان کا اس تخلیقی سیمابِ پائی کا ایک لائق ستائش ماحصل یہ ہے کہ وہ اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہوئے بھی اسلوبی و تکنیکی تجربوں سے اردو افسانہ کو مالا مال کر رہے ہیں۔ وہ افسانہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں اتنی جہتیں پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کی کہانی محض کہانی نہیں رہتی۔ سوچنے اور فنی آسودگی حاصل کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ بے ارادہ ۳۲ افسانوں اور منی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں خود کلامی سے تاثراتی اظہار تک اور سوچ کی کھوج سے بیانیہ تک مختلف تکنیکی روپ ہیں۔ جوگیندر پال اتنے جانے پہچانے لکھنے والے ہیں کہ ان کا تعارف کرانا ان کا منہ چڑانا ہوگا (اور میں یہ گستاخی نہ کروں گا) ہمیں تو خوشی ہے کہ آخر انھوں نے بے نیازی کے ساتھ ایک اور افسانوی مجموعہ شائع کرا دیا لیکن ادبی حلقہ یقیناً اسے بے اعتنائی کی نذر نہیں کرے گا بلکہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی کرے گا۔

ابن فرید

صلاح الدین پرویز — کی تقدیسی نظموں کا مجموعہ
محمدؐ
* جو عشقِ رسولؐ کا آئینہ دار ہے * سے تک کا تقدیسی کلام
* اردو کی پہلی تقدیسی شاعری۔
قیمت: ۲۵/۰۰
نئی نسل کے طرحدار فنکار — صلاح الدین پرویز
کا نیا ناول
سارے دن کا تھکا ہوا پُرش
* ایک علامتی ناول ہے
— جو زمان و مکان کی قیود سے بالا ہے
— تخلیقِ کائنات کی دو تہدار ایک بھولی بسری یاد ہے
* اردو ادب میں اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا اور منفرد ناول۔
قیمت { ڈی لکس ایڈیشن ۳۰/۰۰
عام ایڈیشن ۲۰/۰۰
نمرتا
صلاح الدین پرویز کا عہد آفریں ناول
محمد ہاشمی لکھتے ہیں —
"پرویز کی یہ تخلیق اپنے بیانیہ اسلوب و آہنگ میں اس عہد کی تمام تخلیقات اور تخلیقی رویوں سے منفرد ہے۔"
قیمت: ۴۰/۰۰
صلاح الدین پرویز کا
تازہ ناول
ایک دن بیت گیا
* اردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز
قیمت: /
لو پوئمز
صلاح الدین پرویز کی نظموں کا مجموعہ
* صلاح الدین پرویز نے مشرق کی شاعری کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔
* صلاح الدین پرویز نے اپنی شعری تخلیقات میں بھی مشرق اور مغرب کی مصنوعی دیواروں کو توڑا ہے۔
قیمت: ۲۰/۰۰
صلاح الدین پرویز کی شاعری کے مجموعے
* جنگل ۲۵/۰۰
* دھوپ سمندر سایہ ۲۰/۰۰
* گھر (نیا مجموعہ کلام) (زیر طبع)
تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

Regd. No. L. ALG/270 Jan., Feb., March, April 198

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/"

جلد ۸ | مئی، جون، جولائی، اگست ۱۹۸۳ء | شمارہ ۳، ۴

زر سالانہ ---- ۱۶ روپے
قیمت ---- ۳ روپے

پرنٹر و پبلشر ---- اسدیار خاں
مطبوعہ ---- جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی
کتابت ---- ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی — اطہر پرویز

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

سرورق پر: اختر انصاری

پتہ: دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

گوشۂ اختر

افسانے

غزلیں اور نظمیں

ایک مضمون اور ایک انشائیہ

اور
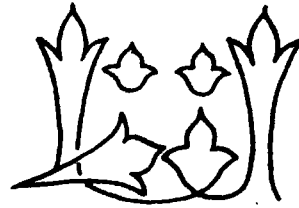
اداریہ

کہتے ہیں کہ سفر کی آسانیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بڑی آسانی سے سفر کر سکتے ہیں اور دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے قریب آگئے ہیں۔ تہذیبی اعتبار سے حدیں ٹوٹتی جا رہی ہیں لیکن اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ صورت حال ایسی نہیں ہے۔ آج کل جب کسی ملک کا سربراہ ہمارے یہاں آتا ہے یا ہمارے وزرا باہر جاتے ہیں اور دوسرے ملکوں سے معاہدے کرتے ہیں تو اس میں تہذیبی لین دین کی بات ہوتی ہے۔ لیکن صورت حال میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ہمارے ملک میں گنے چنے افراد ہیں جو اس "تہذیبی لین دین" سے برابر باری باری دنیا کی سیر کرتے رہتے ہیں لیکن عام لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس سفر میں انھوں نے کیا سیکھا، کیا سکھایا۔ یہ لوگ واپس آکر پھر کسی اور ملک کے دورے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ یہ لوگ کم سے کم ایک سفرنامہ ہی لکھ دیتے کہ ان کے پڑھنے والے اس کے توسط سے ہی ان ملکوں کی سیر کر لیتے۔

سنا ہے کہ اس قسم کا ایک معاہدہ پاکستان سے بھی ہوا ہے۔ ہم اردو والوں کی دلچسپی پاکستان سے بھی ہے کہ وہاں اردو کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اور ہم ہندوستانی بھی برے بھلے کچھ نہ کچھ کام تو کر ہی رہے ہیں۔ لیکن سرحد کی دیواریں کچھ اس طرح سے حائل ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے کاموں سے بے خبر ہیں۔ ڈاک کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ آسانی سے کتابیں بھیجی نہیں جاسکتیں۔ اگر دونوں ملکوں کی حکومتیں اس معاملے میں دلچسپی لیں اور اس کا کاروباری حل تلاش کر لیں تو پھر کتابوں کے کاروبار کو بھی سہارا ملے اور دونوں ملکوں کے ادب پر بھی اس کے واضح اثرات ہوں۔ دونوں ملکوں میں بڑے پیمانے پر تحقیقی کام ہو رہا ہے لیکن ریسرچ اسکالرز کو آنے جانے میں دشواریاں ہیں۔ اگر حکومتیں دلچسپی لیں تو تحقیق کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوگا اور لوگ ہندوستان و پاکستان کی لائبریریوں سے صحیح معنوں میں استفادہ کر سکیں گے —— تہذیبی لین دین کے معنی ہم کچھ اسی طرح سمجھتے ہیں —— ہمیں امید ہے کہ تمام ممالک مختلف سطح پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو آنے جانے کی سہولتیں فراہم کریں گے تاکہ یہ حضرات جب ان ممالک سے دورہ کر کے آئیں تو وہاں کے بارے میں اپنے تاثرات سے پڑھنے والوں کو باخبر کریں۔

ہم وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ دوسرے ممالک کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، محققوں اور دانشوروں کو ہندوستان آنے کی دعوت دیں اور وزارت خارجہ اور تعلیمات کے متعلقہ افسروں کو ہدایت کریں کہ بار بار صرف گنے چنے چند لوگوں کو ہی نہ بلائیں کہ اس سے وہ مقاصد ہی فوت ہو جاتے ہیں جس کے لئے ایسے معاہدے کئے جاتے ہیں۔

مجلسِ ادارت

صلاح الدین پرویز

کنفیشن

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارا گھر
اس زمین کے جغرافیے میں کہیں نہیں ہے
تم! اتہاس کا ایک بھولا بسرا واقعہ ہو
جو کتابوں میں لکھا جاتا ہے اور بچے اسے پڑھ کر خوش ہوتے ہیں
اور وہ بھی غلط ہوتا ہے؛
کیوں کہ تاریخ لکھنے والے ہماری طرح منافق اور جھوٹے ہوتے ہیں

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم بنگلہ دیش سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
جسے آسام کے جنگلوں میں قتل کر دیا گیا ہے......
دن دہاڑے، جب تم اپنے نوزائیدہ بچے اور بیوی کے ساتھ
ملک کے درشن کو جا رہے تھے!
کہ تمھیں ایک چاول کا ٹکڑا اور ایک مچھلی کا چھلکا مل جائے
آہ! تمھاری حفاظت کے سارے وعدے اور ساری قسمیں
ذمہ داری کے بیلیٹ باکس میں اسٹیمپ لگا کر دفنا دی گئیں
اور تم نے اذان دینے سے پہلے ہی
اپنی موت کی نماز پڑھ لی
اللہ اکبر اللہ اکبر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

CONFESSION

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم تل ابیب سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
جیسے لبنان کے سوئمنگ پول میں برہنہ عورتوں کے درمیان قتل کر دیا گیا
تمھاری بیوی کی آواز کا ایک دروازہ بند ہوا
اور ہجوم نے اس کا دوسرا دروازہ کھول دیا
سرخ خون سے لکھا ہوا سارا فلسطین زمین پر پھیل گیا
تمھارے بچے نے بندوق تھامی تو آسمان پر دوڑتے ہوئے طیارے نے،
اسے زمین کی کشتی پر سلا دیا.....
ٹھائیں!
صرف ایک معصوم ننھی سی آواز آئی
گولی کسی کو نہیں لگی
بس پناہ کے سرٹیفکیٹ لئے ہوئے شرنارتھیوں کے
خیمے دھڑا دھڑ جلنے لگے ـــــ!!

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم ایران سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
یا
عراق سے بھاگے ہوئے مسافر ہو
تم جو بھی ہو لیکن تمھاری آستینوں سے خون بہہ رہا ہے
تم خود،
اپنے بدن کے حصے کاٹ کاٹ کر
اپنے جسم کی بدی کی فتح کا جشن مناتے ہو
بے وقوفی کے ڈرم پر ناچتے ناچتے،
تمھارے تیل کے سارے کنویں خالی ہو گئے ہیں
اور تمھاری بیویاں بچے جننے کے بجائے

بارود اور خوف جننے لگیں
صلاح الدین ــــ !
تم نے اپنی عقل کہاں بیچ دی
کہ تم اپنے آقاؤں کی بچھی ہوئی تجارتی اور منافقی شطرنج پر،
ان کے گھوڑوں، ہاتھیوں، وزیروں اور بادشاہوں سے
پیادوں کی طرح مرنے لگے ....

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
تم سنی اور شیعہ کب سے ہو گئے ہو
تم ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان پہنچے
لیکن پاکستان سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے ؟؟؟
ایک کربلا کا قصہ ابھی مدھم نہیں ہوا
کہ تم نے ہزاروں کربلاؤں کو جنم دے دیا
لوگوں نے تمھیں بانٹ دیا
.... اور تم بنٹ گئے !!

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
دراصل صلاح الدین اب تم بزدل ہو گئے ہو
اب تم آواز نہیں دے سکتے ــــ صرف سُن سکتے ہو
اب تم دوڑ نہیں سکتے ــــ صرف چھپ سکتے ہو
صلاح الدین، تم بھول گئے
تمھیں حکم دیا گیا تھا
تمھارے پاس ایک کتاب ہے جو پسِ پشت نہ ڈالنا
سو تم نے اسے طاق پر رکھ دیا
تمھیں حکم دیا گیا تھا

تم اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھنا
سو تم نے اسے جزدان میں باندھ دیا
صلاح الدین ،
ذرا پناہوں سے نکلو اور دیکھو :
وداع کی گھاٹیوں سے چاند طلوع ہو رہا ہے
تمھاری روحوں کا قافلہ مدائن سے بہت آگے جا چکا ہے
فرات کی لہریں مُثنّیٰ بن حارثہ کا خیر مقدم کر رہی ہیں
لیکن صلاح الدین تم وہ کیوں نہیں کہتے ،
جو تمھیں کہنا چاہیے
کہ تم نے ،
ماسکو اور واشنگٹن جانے والے طیاروں میں
خود اپنے آپ کو بٹھا کر ہائی جیک کر لیا ہے
وداع کی گھاٹیاں بند ہو گئی ہیں
قسم رات کی اور دن کی !
وداع کی گھاٹیاں پھر کھل سکتی ہیں
لیکن :

I CONFESS

MY NAME IS SALAHUDDIN

I AM DEAD FROM BOTH THE ENDS

BUT MY VOICE LIVES ....!!

'THE END'

پروفیسر وحید اختر
شعبۂ فلسفہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اختر انصاری

(رومانیت سے جدیدیت تک)

"ہماری زبان" (علی گڑھ) کے شمارے بابت ۱۵ ر اپریل ۱۹۶۸ء میں اختر انصاری کی دو کتابوں "پرِ طاؤس" اور "مطالعہ تنقید" پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یہ سطور قلم بند کی تھیں:۔

اختر انصاری ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو لگ بھگ ۴۰ برس سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز رومانی دور کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے کے مقبول اور کامیاب افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے۔ تنقید میں ان کی انفرادیت نے "افادی ادب" اور "ایک ادبی ڈائری" کی صورت میں اپنا اظہار کیا۔ شاعری میں انھوں نے نظم اور غزل کے ساتھ قطعات پر بھی توجہ کی اور قطعے کو اس کی موجودہ شکل اور اسلوب میں روشناس کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمات کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی تدریس کے مسائل کی تفہیم و تشریح میں بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی اور تصنیفات کے علاوہ "غزل اور درسِ غزل" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر لکھنے والوں کے تخلیقی سرچشمے اتنے کم مایہ ہوتے ہیں کہ جب تک جذبات کا ابال باقی رہے تحریر کا یہ سلسلہ باقی رہتا ہے اور پھر قلم کی روشنائی مدھم ہوتے ہوتے خشک ہو جاتی ہے۔ بہت سے شاعر و ادیب جنھوں نے اختر انصاری کے بعد لکھنا شروع کیا برسوں قبل اساتذۂ متقدمین کی صف میں شامل ہو کر محض تبرک بن کر رہ گئے ہیں مگر اختر انصاری کا قلم اور ذہن اب بھی رواں ہے۔ اسی سے ان کے علمی و ادبی انہماک، سنجیدگی، خلوص اور ذہنی زرخیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادب صحیح معنوں میں ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتابوں کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک مثنوی "درد و داغ" اور نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اختر انصاری بھی اپنے بیشتر معاصرین کی طرح جدید ادب اور شاعری سے اپنے آپ کو ذہنی

ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں کر پاتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی طرح ان کے یہاں یہ کیفیت ذہن کے بنجر ہونے سے پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ادب کے اس مخصوص تصور کا نتیجہ ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے معیاروں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک خاص عمر کے بعد ہمیں پرانے لکھنے والوں سے یہ توقع بھی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ ہر نئی تبدیلی کا خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ جس ادیب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تخلیقی کاوشوں میں صرف کیا ہو اور جس کا ایک مخصوص رویہ بن چکا ہو اسے اس کے اپنے معیاروں اور رویوں ہی کی روشنی میں سمجھنا اور پرکھنا چاہئے۔

اختر انصاری کی شاعری اور تنقید دونوں ہی کا سلسلہ رومانیت اور ترقی پسندی کے ادبی تصورات سے ملتا ہے۔ تنقید میں ان کے یہ میلانات زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن شاعری میں ان میلانات کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے کرب، بے یقینی، بیزاری اور ایک حد تک تکنیک نے بھی ان کی آواز میں اپنے اظہار کے امکانات ڈھونڈ لئے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری آج کی شاعری سے مزاج اور موضوعات کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ قریب ہے!

"پرِ طاؤس" میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کے بہترین قطعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ ان کے منتخب قطعات کا مجموعہ ہے۔ گزشتہ تیس سال میں اس صنف کو مقبول کرنے میں اختر انصاری نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ قطعات کے موجودہ فارم (چار مصرعوں) کے امکانات کو اجاگر کرنے میں ان کے بعد کچھ اور شاعروں کا نام بھی لیا جا سکتا ہے لیکن جس طرح اختر انصاری آج تک اس صنف کے جدید سے جدید تر امکانات کو برت رہے ہیں اس کی مثال اور کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ حال ہی میں اختر انصاری نے زنش کمار شاد کے قطعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے (گفتگو ۳) ان کی بنا پر یہ التباس ہوتا ہے کہ شاید اختر انصاری اور شاد کے قطعات میں کوئی معنوی اور ذہنی ربط بھی ہوگا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ شاد بنیادی طور پر عدم کے قبیلے کے شاعر ہیں۔ اس کے برخلاف اختر انصاری کی شاعری میں زندگی کا گہرا تجربہ اور اس سے پیدا ہونے والا ارتیابی تفکر ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذریعۂ اظہار کے مشترک ہونے سے خود اختر انصاری بھی دھوکا کھا گئے ہیں۔ کم سے کم میں تو ان دونوں شاعروں کا نام ایک سانس میں لینا سخن فہمی کی شریعت اور آئین کے لحاظ سے کفر سمجھتا ہوں۔ دونوں کی سطح میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اختر انصاری نے واقعی قطعے کو وہ لہجہ اور آہنگ دیا ہے، عصر حاضر کی پیچیدہ کیفیات جس کی متقاضی تھیں۔ اسی نے نظریے کی سطح پر جدید شاعری سے تعصب کی حد تک اختلاف رکھنے

کے باوجود تخلیق کی سطح پر وہ آج کی شاعری سے بہت قریب ہیں۔

اختر انصاری کے ابتدائی دور کے قطعات موضوع کے انتخاب اور ذہنی رویے کے لحاظ سے بھی رومانی ہیں اور لہجہ و طرزِ ادا کے لحاظ سے بھی۔ رومانیت کا یہ رجحان ترقی پسند دور کے قطعات میں بھی نمایاں رہا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں وہ وہ موضوعات و مسائل نظر نہیں آتے جو بہت واضح طور پر ترقی پسند کہلائے جا سکیں اور جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ہماری شاعری کے غالب موضوعات تھے۔ ان قطعات کا موضوع فطرت کے حسین مظاہر اور زندگی کے وہ تجربات و واردات ہیں جن کا تعلق رومانیت اور داخلیت کے ساتھ گہرا ہے۔ شعر کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ جوش کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے

شعر یوں کہنے کو کہہ لیں لیکن اختر یہ سچ ہے
دل کے محسوسات کو لفظوں میں بھر سکتے نہیں

لیکن ان کے لہجے میں انقلاب کی وہ گھن گرج نہیں جو جوش اور اس دور کے دوسرے ترقی پسند شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ان کے یہاں نغمۂ زیرلبی کی خوش گوار کیفیت خودکلامی، دروں بینی اور تفکر کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔ بعد کے دور کے قطعات میں رومانیت سے ان کا رشتہ بظاہر ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں ان کے رویے کو بڑی حد تک مخالف رومانیت (ANTI-ROMANTICISM) کے رجحان کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اب رومانی تصورات کی دھند چھٹ گئی ہے۔ اور زندگی اپنی اصلی شکل میں جو بہت روح فرسا اور بھیانک ہے عریاں نظر آنے لگی ہے۔ رومانی آدرشوں کی یہ شکست جس کا اظہار وہ پورے کرب سے کرتے ہیں ان کی رومانیت ہی کی ایک نئی شکل ہے۔ اور اسی مقام پر وہ جدید شاعری اور جدید شاعری کی حقیقت پسندی اور کرب و افسردگی کی سطح کو چھو لیتے ہیں۔ بعد کے قطعات میں زندگی زیادہ سنجیدہ، گمبھیر اور بڑی تلخ حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔ زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں نے کہیں کہیں کلبیت کی شکل بھی اختیار کر لی ہے۔ لیکن میں اس بات کو اس لئے ناگزیر سمجھتا ہوں کہ یہ آج ہر اس شخص کا مقدر ہے جو اپنے ذہن میں زندگی کا کوئی اونچا تصور رکھتا ہے اور عملی زندگی میں ہر ہر قدم پر ہونے والی سمجھوتے بازی، بددیانتی اور ریاکاری سے نباہ نہیں کر سکتا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے اختر انصاری جبر کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہیں اور ارادہ و اختیار کی تہی دستی کے شکوہ سنج ہیں۔ لیکن دراصل ان کی جبریت بھی زندگی اور موجودہ معاشرے

پر گہرا طنز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس کلبیت و جبریت کو ان کے مزاج کا حصہ سمجھنے کے بجائے ان کے طنزیہ لہجے کے عناصر سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ زندگی پر طنز کرنے کے باوجود زندگی سے ان کی بے پایاں محبت چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ان کا لگاؤ اور ان کی معصوم نشاط کوشی جو طنزاً اذیت پسندی بھی بن جاتی ہے، زندگی اور انسان پر ان کے غیر متزلزل ایمان ہی کا اظہار کرتی ہے۔ ان موضوعات و مسائل پر ان کے قطعات کا انتخاب کرنا اور مثالیں پیش کرنا اس لئے مشکل ہے کہ آخری دور کے سب ہی قطعات اپنی جگہ منتخب، منفرد اور ممتاز ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں اختر انصاری نے قطعات کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر رباعیات کی طرف توجہ کی ہے۔ قطعے پر انھیں جو خلاقانہ دسترس حاصل ہے اس کے پیش نظر وہ رباعی میں بھی اتنے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی رباعیات کا مجموعہ قطعہ نگاری میں ان کی مشق اور انفرادیت کا اگلا قدم ہوگا۔

"مطالعہ و تنقید" اختر انصاری کے سولہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۵ء تک کی نثری نگارشات کا احاطہ کرتا ہے۔ "ادب اور سیاست" ــــ "اردو غزل" "جنگ، سیاست اور شاعری" ــــ قدیم انسان، احساس فن اور اظہار" مسائلی مضامین ہیں۔ ان میں اور ان کے علاوہ دوسرے مضامین میں جیسے "مجاز کی شاعری" اور اقبال کی شاعری کا نیا آہنگ" میں ان کا نقطۂ نظر مقصدی اور افادی ہے۔ ان مضامین میں ان کا طرز فکر ترقی پسند مارکسی ناقدین سے مختلف نہیں۔ یہ مضامین اس دور کی سیاسی نظریہ سازی ہی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان مضامین میں جو سلامتی فکر، توازن اور اعتدال ملتا ہے وہ اس دور میں اتنا عام نہیں تھا۔ بعض مضامین تحقیقی اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ جیسے "مرزا فرحت اللہ بیگ" ــــ "اردو ڈراما اور انارکلی" ــــ گوئٹے ــــ "ڈان کوئگ زو اور سانکو پین زا" ــــ اور وہ تمام مضامین جو ناول اور افسانے سے متعلق ہیں۔ اختر انصاری کی نظر اردو ادب کے ساتھ عالمی روایات پر جتنی گہری ہے اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی معلومات اور ادبی بصیرت کو کام میں لاکر ناول اور افسانے کی تنقید میں زیادہ ٹھوس، وقیع اور اہم کام کر سکتے ہیں۔ ان مضامین میں ان کی معلومات اور ادبی بصیرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خصوصیات کو کسی بڑی تعمیر کے لئے بروئے کار لایا جائے۔

اس مجموعۂ مضامین کا سب سے اہم، دلچسپ اور فکر انگیز حصہ وہ اندراجات ہیں جو "ایک

ادبی ڈائری" سے منتخب کئے گئے ہیں۔ ان اوراق میں اختر انصاری کی پوری شخصیت اپنی انفرادی آب و تاب، اپنی متنوع دلچسپیوں اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان اوراق میں ایک تخلیقی فن کار کی فسانہ گوئی اور نقاد کی بصیرت دونوں نے مل کر تنقید میں بھی ایک تخلیق کی شان پیدا کر دی ہے۔ یہ مجموعہ ادب کے طالب علموں اور استادوں کے لئے یکساں طور پر مفید اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔ اس کے مطالعے میں ہمیں اپنی تنقید کے ان راستوں کا علم ہوتا ہے جن سے اردو تنقید اپنے سفر میں گزری ہے۔

ادب کے ایک مخلص قاری کو اِن دونوں کتابوں کی قدر کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسے ادیب کی تخلیقی کاوشیں ہیں جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ادب اور صرف ادب کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ یہ احساس ہی کتنا خوش گوار ہے کہ ہمارے یہاں کچھ ادیب تو ایسے ہیں جن کا قلم چالیس برس تک لکھتے رہنے کے باوجود آج بھی رواں اور جواں ہے۔

(۲)

آج چودہ برس بعد مجھے یہ بات دہراتے ہوئے کوئی تکلف نہیں کہ اختر انصاری کے تخلیقی سرچشمے ۷۵ برس کی عمر میں بھی جوان و توانا ہیں۔ اس دوران میں ان کی کئی نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ تنقید میں "غزل کی سرگزشت"۔۔۔ "غزل اور غزل کی تعلیم"۔۔۔ اردو فکشن: بنیادی و تشکیلی عناصر"۔۔۔ غالب پر ایک مختصر کتاب انگریزی میں، شاعری میں "وقت کی باہوں میں" اور ان کے علاوہ قطعات، رباعیات، غزلیں اور نظمیں وہ مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہرا نہیں رہے ہیں۔ بلکہ وہ ہر تخلیق کے ساتھ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ روحانی حقائق اور خارجی کائنات کو از سرِ نو دریافت کر رہے ہیں۔ اپنی ذات اور اس کے توسط سے حیات و کائنات کی مسلسل بازیافت ہی تخلیقی تجربہ و اظہار کا اصل مدعا و منتہا ہے۔ نظریات بستہ، ادعائیت زدہ، خود گرفتہ ذہن آپ اپنا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ تخلیقی ذہن ذات اور خارج کے درمیان نئے رشتے دریافت کرتا اور ان سے ہم آہنگ ہوتا رہتا ہے۔ "ایک قدم اور سہی" جو ان کا تازہ ترین مجموعۂ شعر ہے اسی بازیافت کے تخلیقی سفر کی نئی منزلوں کی نشان دہی ہے۔

اپنی ادبی تنقید میں اختر انصاری اردو کے اولین مارکسی نقادوں میں رہے ہیں۔ چنانچہ آج بھی نقد و نظر کے باب میں اپنے عہدِ مقبولیت و شہرت کے پابند نظر آتے ہیں۔ اور نظم و غزل

کی تنقید میں بعد کے تجربات کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ عمر اور شہرت کے عروج سے گزر کر زندگی کی اس چڑھائی تک پہنچنے والے ہر شاعر یا نقاد کا عموماً یہی رویہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دورِ مقبولیت ہی کو تنقیدی محاکمے کا معیار و اساس مان لیتا ہے۔ اختر انصاری "غزل کی سرگزشت" میں تنقید غزل کا تیسرا دور ترقی پسند ادبی تحریک کے زمانے کو مانتے ہیں۔ وہ اسے حسرت، اقبال اور فانی کے بعد کا دور قرار دیتے ہیں۔ یگانہ کا ذکر وہ برائے نام کرتے ہیں، حالاں کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی کی طرف ان کا رویہ اور پورے زمانے سے الجھنے اور موت سے نبرد آزما ہونے کا جو جذبہ یگانہ کے یہاں ہے، اگر صحیح معنوں میں اس رویے، حوصلے اور جذبے کی توسیع بعد کی شاعری میں کسی کے یہاں ملتی ہے تو وہ صرف اختر انصاری ہیں۔ ایک حد تک جمیل مظہری اور فراق پر بھی یگانہ کا اثر ہے۔ لیکن لاشعوری طور پر ہی سہی، اختر انصاری نے غزل کے اسی کلاسیکی لہجے کو نئے انداز بیان اور عصری مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے جس کو یگانہ نے دریافت کیا اور اپنے خون سے سینچا تھا۔ یگانہ اور اختر انصاری کے یہاں کئی رویے مشترک ہیں۔ انانیت کا طنطنہ، زمانے اور زندگی سے مبارزت طلبی، زندگی کی ہزیمتوں، اربابِ فن کی قدر شناسی، تلخیوں، آلام و مصائب پر تمسخر کرنے کا انداز، ایک طرح کی کلبیت (CYNICISM) جس میں رواقی (STOIC) شانِ بے نیازی بھی ہے۔ اختر انصاری نے اس رواقیت میں ایک مخصوص انداز کی لذتیت (HEDONISM) کو بھی آمیز کر دیا ہے وہ مے خانۂ حافظ و خیام کے بادہ نوش ہیں۔ اور شدائد حیات کو جام بکف ہو کر چیلنج کرنا جانتے ہیں۔ مے خانہ و بادہ جام کو ان کے لغوی معنی میں سمجھنا سطح بینی ہوگی۔ یہ جرأت رندانہ کے استعارے ہیں۔ یہ جرأت رندانہ یگانہ کے یہاں بھی تھی۔ استعارے الگ تھے اکثر شعرا کو اپنے ماضی قریب کے صحیح اثرات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اگر اختر انصاری کو یگانہ سے اپنی مماثلت کا پورا اندازہ ہوتا تو شاید وہ "غزل کی سرگزشت" میں ان پر زیادہ توجہ صرف کرتے۔

ترقی پسند تنقید غزل کو اختر انصاری نے خاصی اہمیت دی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندی اور جوش کے اثر نے غزل کو اس دور میں پوری طرح پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ ترقی پسند تنقید کا یہ کہنا کہ "غزل کی شاعری دوسری اصناف کی بیشتر شاعری کی طرح فراری، انفرادی اور انحطاطی رہی ہیں جس میں سماج کے حقیقی اور بنیادی مسائل کی ترجمانی

کبھی نہیں ہوئی اور جو اجتماعی شعور سے بیگانہ رہی (غزل کی سرگزشت ص ۹۲) اردو شاعری کے پورے کلاسیکی سرمایے کی نفی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قلی قطب شاہ سے میر اور میر سے غالب اور اقبال و یگانہ تک غزل بھی دوسری اصناف سخن کی طرح کبھی محض عاشق و عاشقی کے پیش پا افتادہ مسائل و موضوعات اور گل و بلبل کے استعاروں کے روایتی مفہوم کی پابند نہیں رہی۔ عصری مسائل اور سیاسی بے چینی کی مثالیں میر تک کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں :۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی جن کی خاک پا
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر
کہ ہم غریب ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

یہ طبقاتی شعور کا اظہار ہے۔ انگریزوں کے استحصالی رویے پر اٹھارویں صدی میں مصحفی نے تنقید کی :۔

ہندوستاں میں دولت و ثروت جو کچھ بھی تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اس طرح کے اشعار اساتذہ متوسطین کے یہاں کثرت سے ملیں گے۔ سودا، قائم، میر، اور دوسروں کی ہجویات، حتیٰ کہ جعفر زٹلی ایسے شاعر کے یہاں سیاسی نظام پر سخت طنز ملتا ہے۔ اردو کے شہر آشوب سماجی افراتفری پر طنز بھی ہیں اور اردو شاعری کے سیاسی، سماجی شعور کے آئینہ دار بھی۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو انیس کی مرثیوں اور سلاموں میں بھی سماجی شعور کے نقوش بکھرے ہوئے مل جائیں گے۔ اختر انصاری نے ترقی پسند تنقید کے ابتدائی دور کی منفی تنقید پر تنقید نہیں کی ہے اس لئے گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ خود سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند نقادوں کی بعد کی تنقیدی تحریروں میں کلاسیکی شاعری کے سیاسی، سماجی شعور کا اعتراف ملتا ہے۔ ترقی پسند تنقید نے "غزل کو جانچنے اور پرکھنے کے جو معیار قائم کئے وہ عمرانی شعور، غایتی میلان، اجتماعی مقصدیت اور فنی اقدار کے احترام کے ساتھ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی متابعت پر مشتمل تھے۔" (غزل کی سرگزشت ص ۹۲) لیکن ان معیاروں نے غزل کی نشو و نما کو روکا۔ جب یہ معیار ٹوٹے اور ان کی گرفت شاعرانہ تخلیق پر کم ہوئی تب ہی مخدوم، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، پرویز

شاہدی، سلیمان ادیب اور دوسرے بہت سے ترقی پسند شعرا نے غزل کے امکانات کو پوری طرح دریافت کیا۔ فیض نے "دست صبا" کے کلاسیکی اسالیب اور لہجوں کو غزل میں رواج دینے کی کوشش سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد کی۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے بحران اور جدید شاعری کے آغاز کا دور تھا۔

اختر انصاری ترقی پسند رہے ہیں انھیں اب بھی اس نظریۂ و تحریک سے پوری ہمدردی ہے۔ ان کی خود کی شاعری اور افسانہ نگاری کا آغاز رومانی دور میں ہوا۔ افسانے میں وہ پریم چند سے کبھی متاثر نہیں رہے۔ بلکہ پریم چند اور ان کے معاصرین کے علی الرغم انھوں نے "واقعاتی" افسانوں کے برخلاف "تاثراتی" افسانے اور بغیر پلاٹ کی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔ اور یہ چیز فی الحقیقت اردو افسانہ نگاری کے فن میں ایک نیا اور اہم موڑ ثابت ہوئی اور آگے چل کر دیرپا اور دور رس اثرات کا باعث قرار پائی۔ شاعری میں انھوں نے کبھی ترقی پسندی کے دورِ عروج کا برہنہ، براہِ راست اظہار نہیں اپنایا۔ لیکن تنقیدی نظریات اور مطالعوں میں وہ ادب کی افادیت اور غایتی قدروں کو ہمیشہ اہمیت دیتے رہے۔ ان کی تنقید اور تخلیق میں تھوڑا فاصلہ ہمیشہ برقرار رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے انھیں وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔

اختر انصاری یگانہ کی طرح زمانے کی روش سے ہٹ کر چلنے کے قائل ہیں۔ یگانہ کی غزل میں جو امکانات تھے وہ ترقی پسند عہد کی شاعری کے لئے چشمۂ فیضان بن سکتے تھے لیکن وہ ترقی پسند شاعری کا مذاق اڑاتے رہے اور اس طرح ان کے اور ترقی پسندوں کے درمیان ایک طرح کی مخالفت رہی۔ ترقی پسند اور رومانی دور کے مقبول شعرا میں اختر انصاری کے یہاں سب سے زیادہ اس بات کے امکانات تھے کہ وہ مابعد ترقی پسند میلانات کے سربراہ اور پیش رو مانے جاتے، کیوں کہ یہ اختر انصاری ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کلاسیکی غزل کے مخصوص علائم اور ذرائع اظہار کی طرف سے روگردانی اختیار کی تھی اور رسمی عناصر سے مبرا غزل کہنا شروع کی تھی۔ لیکن انھوں نے جدید نظم و غزل پہ شدید تنقید کی اور اس دور کو نہ صرف "غیر معمولی ادبی انتشار، بالخصوص روایت غزل کی شکست و ریخت (بلکہ تخریب و انہدام) کا دور (غزل کی سرگذشت ص ۹۳)" قرار دے کر اپنے اور جدید شاعروں کے درمیان خلیج خود پیدا کر لی۔ آزادی کے بعد جدید نسل نے ہی صحیح معنوں میں کلاسیکی غزل کی روایات اور امکانات کو دریافت کیا اور اسے آج کی زبان دی۔ اس دور میں داخلی تجربے اور انفرادی طرز اظہار کو پھلنے پھولنے اور گل و ثمر

لانے کا موقع ملا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہم جدید غزل گو شعرا نے لسانی شکست و ریخت کا نعرہ لگا کر خود اپنی اچھی پرواز امکان غزل کا خون کیا (مثلاً ظفر اقبال اور سلیم احمد) اور جدید تر نسل کے شعرا کو گمراہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ آج کل عموماً جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں نہ صرف یہ کہ موضوعات بندھے ٹکے ہیں، بلکہ علائم و استعارات، جذباتی ردعمل اور تجربات تک میں یکسانیت ہے لیکن اس طرح کی خراب تقلیدی غزل قدیم دور میں بھی لکھی جاتی رہی ہے۔ ترقی پسند دور میں بھی۔ اور آج کے بیشتر روایتی اور مشاعرہ خواں شعرا ایسی ہی بے جان، انفرادیت سے بیگانہ بے رنگ غزلیں لکھ رہے ہیں۔ جدید غزل اور شاعری کے خلاف تعصب کے باوجود میرے نزدیک اختر انصاری نہ صرف غزلیں بلکہ نظمیں بھی اسی داخلی رویے، ذاتی کرب، روحانی بحران اور حیات و کائنات کے نئے معانی دریافت کرنے اور سماجی، سیاسی نظام کی لایعنیت کے خلاف احتجاج کرنے میں ہمارے دور کی شاعری، اس کے لہجے اور محاورے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ رومانی دور سے ترقی پسندی اور جدیدیت کے دور تک کوئی شاعر ہم عصر میلانات اور تخلیقی امکانات کی دریافت میں اتنا شریک و فعال نہیں رہا جس قدر اختر انصاری تخلیقی سطح پر رہے ہیں۔ ان کا نیا مجموعۂ کلام "ایک قدم اور سہی" اس کا ثبوت ہے۔

اختر انصاری کی زبان میں کلاسیکیت ہے، لفظوں کے دروبست میں فنکارانہ اہتمام ہیئت کو برتنے میں اصولوں کی پیروی۔ یہ سب کچھ کسی طرح ان کے لہجے کی منفرد تلخی اور ردعمل کے انوکھے اظہار میں مانع نہیں۔ اس کے برخلاف ان کے امتزاج ہی سے ان کی انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ قطعات کی صنف کو نئے دور میں وسیلۂ اظہار سب سے پہلے انھوں نے ہی بنایا۔ "دہان زخم" کے قطعات میں ان کے یہاں جو لہجہ بنا وہ موضوعی ردعمل اور انداز بیان کی تلخی سے اور تیکھا ہو گیا۔ آسمان یا فلک کج رو روایتی شاعری میں عشاق کا دشمن سمجھا جاتا رہا ہے۔ اختر انصاری نے فلک کے استعارے کو توسیع دی اور زمین کے ٹیڑھے پن کو اس سے منسلک کر کے زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کے مقابل زندگی کے تلخ و سخت حالات میں شدائد جھیلنے والے فرد انسانی کی ذات کا اثبات کیا ہے۔ اقبال نے RE-CONSTRUCTION میں لکھا ہے کہ "انسان کائنات کے اتھاہ گمبھیر اور ہیبت ناک سکوت میں کہیں سے جواب کا طلب گار ہے۔" اختر انصاری جواب کے طالب نہیں۔ وہ خود ہی سوال ہیں اور خود ہی اس ہیبت ناک سکوت کا جواب جو کائناتی مقدر اور سماجی نظام کے خوف نے چہار سمت مسلط کر رکھا ہے۔ وہ اپنے شعری

اظہار کے وسیلے سے کائنات اور سماج دونوں کو چونکانا اور جھنجوڑنا چاہتے ہیں۔" ایک قدم اور سہی" کی رباعیات پچھلی رباعیوں کی طرح ان کے قطعات کا اگلا قدم ہیں۔ چار مصرعوں میں پوری بات بھرپور انداز میں کہہ دینا بہت مشکل ہے۔ رباعی کے فن پر گرفت اور اس کے چوکھٹے میں رہ کر اپنی انفرادیت کا بھرپور اظہار اتنا مشکل ہے کہ اس فن میں انیس، یگانہ، امجد، جوش اور قطعات میں اقبال اور کسی حد تک فراق ہی کو کامیابی ہوئی ہے۔ اختر انصاری نے اپنے بعد کے قطعات کی طرح رباعی کے فارم کو بھی تازہ تر اور جدید فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ایک رباعی زیر نظر مجموعے سے ملاحظہ کیجئے جس میں فلک کا کام اپنے لئے شاعر خود کر رہا ہے ؎

دن رات کوئی زہر پیا ہے ہمدم! زخموں سے جگر کو بھر لیا ہے ہمدم!
جلادِ فلک خونی و قاتل ہی سہی! اک قتل تو ہم نے بھی کیا ہے ہمدم!

زندگی اور موت ہی نہیں، خالقِ حیات و ممات بھی شاعر کے سوالات کی زد میں ہے۔ یہ دیکھئے کہ رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرعے مضمون کو کس طرح سمیٹ لیتے ہیں:۔

راس آئے گی یارب نہ مجھے راحتِ مرگ میں خوگرِ آزار ہوں، جینے دے مجھے

یہ ہستی برباد، یہ جان ناشاد میری ہے کہ تیری آزمائش یارب؟

تو جشن حیات آپ منائے اپنا دنیا نہ منائے گی تیری جنم صدی

اور یہی نہیں۔ خود اپنے اوپر طنز ؎

کس درجہ رہے بے خود و بے راہ نہ پوچھ کس قہر کی غفلت رہی اللہ نہ پوچھ
اب جاکے ہوا شعورِ ہستی پیدا بالغ ہوئے کس عمر میں ہم آہ! نہ پوچھ

وقت اختر انصاری کے یہاں مستقل موضوع ہے۔ لیکن یہ اقبال کا زماں ہے نہ خالق کائنات کی قوت تخلیق کا ابدی مظہر۔ یہ شخصی وقت ہے۔ ایک شخص کی عمر اور زندگی کے تجربات پر محیط ــــ ان کا مشکل گر، گر فرد سے نبرد آزما" وقت کی باہنوں میں" شعری خود نوشت سے ٹیپ کا مصرع ہے:۔

ابھی کچھ اور جی لیتا، ابھی کچھ اور جی لیتا!

شاعر کی جیتے رہنے اور وقت پر فتح پانے کی بے محابا خواہش کا اظہار ہے، جسے خواب عدم کی راحتیں

راس نہیں آسکتیں اور جو حوادث زمانہ سے اپنی سخت جانی، الم کوشی اور زہر آشامی کی داد لینے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ شاعر نہ رہے تو پھر جگنوں سماں، راتوں کے سناٹے، صبا کی سرگوشیاں، جام و مینار کی رنگینیاں کس کو غمیں کریں گی حلا

ابھی باقی ہے حق مجھ پر جہاں بھر کے خرابوں کا

یہی نہیں ابھی تو گیسوئے حیات کو سنوارنا ہے اور مسئلہ انسانی کو سلجھنا باقی ہے ؎

ابھی انسان خود صیاد خود صید زبوں بھی ہے
ابھی سے پر تیم تقدیر آدم سرنگوں بھی ہے
اسی عقدے کے حل کا منتظر میرا جنوں بھی ہے

ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

یہ طویل نظم "کارِ جہاں دراز ہے" کی تفصیل ہے، مگر یہ کارِ جہاں شاعر کے اپنے داخلی واردات کا جہاں ہے جس کے سیطے میں کائنات اور انسانی معاشرت و سیاست سب کچھ آجاتا ہے۔ ابھی عرش کا پایہ ہلتا نظر نہیں آیا، ابھی نہ شاعر کے دلوں میں روزِ آدینہ آیا، نہ شاعر کے حصے کا روزِ ینسا سے ملا، نہ جینے کا سلیقہ میسر ہوا۔ بالواسطہ یہ سب خود اپنی معصومیت پر بھی طنز ہے اور اس نظام کائنات پر بھی جو تنازع للبقا میں صرف طاقتور و عیار کو جینے کا حق دیتا ہے اور اسی احساس کا ردعمل یہ ہے ؎

جس کو مرنا مرے، ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کئے جائیں گے
شہدا کو جو شرف ہے وہ شرف پائیں گے

(نظم زمانہ)

وہ قاتل، ظالم، جاہل، خون آشام زمانے کو یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنے سیل بے اماں میں بہائے جائے۔ وہ مرنے کے انداز اور وقت کا خود انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی میں آزادی و اختیار کی بات تو بہت شعرا نے کی ہے، کر رہے ہیں، لیکن مرنے کے لئے اختیار و انتخاب کی یہ بات تو بالکل نئی ہے۔ اسی لئے وہ ابھی ایک قدم اور جینا چاہتے ہیں۔ "فنا" میں غالب کے متصوفانہ تجربے اور اقبال کے فلسفہ کی گونج ملے گی۔ لیکن خیال دونوں سے مشتق نہیں نظم کی بنیاد ایک حدیث نبوی پر ہے ؎

ہے، اور" نہیں ہے" کے غوامض سے گزر جا
جو ہے وہ خدا ہے، جو نہیں ہے وہ خدا ہے

یہ وحدت الوجودی نظر موجودات ہی کو تغیر پذیر دفانی نہیں مانتی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اعلان کرتی ہے:

ہر شے کو فنا ہے، مگر اس سے بھی کچھ آگے
بندہ یہ کہے گا کہ فنا کو بھی فنا ہے!

جوش ملیح آبادی کی موت پر "گوہر نایاب" جوش کا مرثیہ نہیں، ہماری قریب المرگ صدی کا مرثیہ بھی ہے اور ہجو بھی۔ جوش کی خلاقانہ دسترس کو اس سے بہتر خراج عقیدت کیا پیش کیا جا سکتا ہے ؎

کہنے کو سمندر میں ندی ڈوب گئی
سچ یہ ہے کہ اک پوری صدی ڈوب گئی

ان نظموں کے اسلوب اور لفظیات کی بنا پر بعض ناقدین و قارئین کو میرے اس بیان سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ لہجہ و محاورہ جدید شاعری کا نہیں۔ میں نے دراصل عرض یہ کیا ہے کہ ظاہری لباس نہیں، بلکہ اختر انصاری کی روح شعر ہمارے عہد سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے شواہد ان کی غزلیات میں نمایاں طور پر مل سکتے ہیں۔ میں ایسی چند غزلوں کی نشان دہی کر دوں گا جن میں وہ طرزِ احساس ہے جو نہ زمانۂ قدیم میں مل سکتا تھا، نہ رومانی دور کی غزل میں، نہ ترقی پسند غزل میں۔ یہ آج کا طرزِ احساس ہے۔ اور طرز اظہار جدید غزل کے لہجے سے مختلف ہے اور اُسے ہونا بھی چاہئے۔ اگر اختر انصاری کی غزل کا پورا کا پورا آہنگ جدید غزل کے مماثل ہوتا تو پھر اختر انصاری کی انفرادیت کیا رہ جاتی۔ مثال کے طور پر یہ غزلیں دیکھئے جن کے صرف مطلعے لکھتا ہوں:

بطور زیست سے کٹ کے اٹھا جو فرد تو کیا!
ہوا خلاؤں کے میدان کا بھی مرد تو کیا!

اس وحشتِ جاں کو کیا کہئے آگو مائل گریائی دل ہے
وہ شور ہے جس میں کان پڑی آواز بھی سننا مشکل ہے

نہ جانے کتنوں نے صدیوں یہاں دیاں لب جو
بہائے ہوں گے اس رود آب میں آنسو

در و بام جہاں لرزاں ہیں، ہیبت سی برستی ہے
فرازِ آسماں سے کوئی دہشت سی برستی ہے

طرب کے ذکر ا نہیں، اس دل حزیں سے نہیں!
کرید د زخم، مگر خاک نشتریں سے نہیں!

اس مجموعے کی بہترین غزلیں اتفاق سے طویل بحروں میں ہیں جن میں اختر انصاری کے لیے کی وہ انفرادیت جس کے عناصر کی اوپر تشریح کی جا چکی ہے، کلاسیکی انداز بیان کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہوئی ہے۔ وہ غزلیں یہ ہیں۔ ان کی ردیفیں بھی بحر کی مناسبت سے طویل ہیں سے

دل مزا بو الہوس، رجا بیزار تن! ہائے دیوانہ پن! ہائے دیوانہ پن!
زیست کی بھی تڑپ، موت کی بھی لگن! ہائے دیوانہ پن! ہائے دیوانہ پن!

ترا آسماں نادکوں کا خزینہ! حیات آفرینا! حیات آفرینا!
ہماری زمیں لعل و گل کا دفینہ! حیات آفرینا! حیات افرینا!

اپنے جوشِ جنوں کی حقیقت یہ تھی چند قطرے تھے خوں کے اچھلتے رہے
کرب! گویا وہ آنسو جو ہم پی گئے، بن کے نشتر رگوں میں چلتے رہے

زمانے کی بیداد! کیا پوچھتے ہو؟ بہت پانی دریاؤں میں بہہ چکا ہے
قیامت کی روداد! کیا پوچھتے ہو؟ بہت پانی دریاؤں میں بہہ چکا ہے

اُف اس ستم انگیز زمانے! کاش تجھے اللہ نہ بخشے
تجھ کو جتا کس کا فریاد اسنے! کاش تجھے اللہ نہ بخشے

ان غزلوں میں سے اشعار منتخب کرنا اس لئے مشکل ہے کہ اختر انصاری ابتدائے عشق سخن کے دور سے ہی کسی مخصوص کیفیت کی غزل کہتے ہیں، جس کے اشعار مسلسل ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح گتھے ہوتے ہیں کہ انھیں الگ کرنے سے غزل کی وہ پوری فضا سامنے نہیں آسکتی جس کا وہ حصہ ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کے اشعار الگ الگ کلیت نہیں رکھتے اور خود مکتفی نہیں ہوتے۔ غزل کا یہ انداز انھیں تمام غزل گویوں سے منفرد کرتا ہے۔

اختر انصاری کی شاعری کا آغاز رومانی دور میں ہوا تھا جس کے سب سے اہم نمائندے جوش ہیں۔ جوش کی غزلوں میں نظمیت اور نظموں میں غزل کے اشعار کی کیفیت ملتی ہے۔ یہ خصوصیت اختر انصاری کے یہاں بھی ہے۔ ان کی نظمیں مثال کے طور پر "وقت کی باہوں میں" یا "زمانہ" یا "ایک قدم اور سہی" یا "گوہر نایاب" "ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے میلان سے غیر متاثر نہیں۔ لیکن آج کی جدید مختصر نظم یا مختصر ترنظم (MINI POEM) ہی کو معیار نظم کیوں مانا جائے۔ شاعری اور نظم، غزل اور رباعی میں ہر شاعر کو اپنا انداز بنانے اور اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی نہ ہو تو پھر شاعری میں تنوع اور مختلف اسالیب اور لہجے کیسے پروان چڑھیں گے۔ نظم کو علامیہ، رمزیہ، بیانیہ، استعاراتی وغیرہ میں تقسیم کرنا اور شاعروں کو انھیں کے لحاظ سے قبیلوں میں بانٹنا، ادب میں قبیلہ واریت کے میلان کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک ہی شاعر مختلف موضوعات کے لئے مختلف طریق ہائے کار اور مختلف اسالیب ہی نہیں، بلکہ موضوع کے لحاظ سے مختلف نظموں میں مختلف طرح کی لفظیات بھی برتتا ہے۔ شاعری میں اسلوب، زبان ہیئت کا تنوع نہ ہو تو شاعری کا مختلف جہتوں میں ارتقاء، افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں رک جائے گا۔ اختر انصاری کی شاعری کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں۔ ان میں رومانیت اور ترقی پسندی کے برگ و بار ہیں لیکن ان کی شاخیں آج کے تقاضوں کا بھی حق ادا کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری ہماری شاعری کے نصف صدی سے زیادہ کے سفر و ارتقاء کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

آج سے ربع صدی قبل تک اختر انصاری کا گھر زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ علی گڑھ کے طلبہ اور باہر سے آنے والے ادبا و شعرا ان کے گھر جانا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے رہن سہن کا مخصوص انداز، ان کے ڈرائنگ روم میں ایک منفرد انداز میں لٹکی ہوئی تصاویر، سلیقے سے مجلد کئے ہوئے رسائل کے فائلوں سے بھرے بک شیلف، میزوں پر انواع و اقسام کے پائپوں اور ایش ٹریز کی قطاریں، اعلیٰ درجے کا فرنیچر، خود ان کا لباس مخصوص تکلم، یہ سب مل کر ہر باہر سے آنے والے

کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کی باتوں میں جو انفرادیت تھی، وہ فقروں کی تیزی، گفتگو میں مخصوص الفاظ اور خود ان کے بنائے ہوئے مخصوص مرکبات کا استعمال، تنقیدی حاکموں کی بے دردی اور عام مقبولیت کے پیچھے چلنے والے نقادوں پر ان کے طنز سے مل کر چمکتی تھی۔ اب بھی ان کی نشست گاہ کا مخصوص انداز ہے۔ لباس میں رنگوں کا انتخاب منفرد، اور ان کے طرزِ گفتگو میں کچھ اور نشتریت اور کلبیت آگئی ہے۔ ان کے ساتھ یونیورسٹی نے بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ جو شخص اردو کے ساتھ اچھی انگریزی لکھنے پر بھی دسترس رکھتا ہو، اور جو ادب کے ساتھ اپنے پیشے یعنی تعلیمات میں بھی اختصاصی مہارت رکھتا ہو اور جس نے عمر بھر ایم ایڈ کو پڑھایا ہو اسے یونیورسٹی نے ریڈرشپ بھی دی تو آخری عمر میں اور عارضی! شعبۂ اردو نے جس میں وہ آنا چاہتے تھے اور جس کو ان کی تخلیقی صلاحیت، ان کی افسانہ نگاری کی مہارت، عالمی ادب کا وسیع مطالعہ اور تنقیدی بصیرت سے بہت کچھ مل سکتا تھا، ان کے لئے اپنے دروازے بند رکھے۔ انفرادیت کے ساتھ ہمارے معاشرے اور جامعات میں یہی سلوک ہوتا ہے۔ اس کا انتقام اختر انصاری نے یوں لیا کہ سماجی تقریبات ہی نہیں، ادبی محفلوں، شعری نشستوں، مذاکرات، سیمیناروں اور کانفرنسوں سے بھی گریز کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اس کے لئے جس صبر و جہاد سے انھیں گزرنا پڑا ہوگا شاید اس پر درد کا یہ شعر صادق آئے ؎

آساں مداں بنغز چنیں مانشستہ ایم
از سر گزشتہ ایم کہ از پا گزشتہ ایم

ستم ظریفی یہ ہے کہ چند برس پہلے انھوں نے ایک افسانہ کسی رسالے کو بھیجا۔ اس کے مدیر نے جو شاید "جدید محض" تھا اور ترقی پسند اور رومانی دور کے ادیبوں کے نام تک سے واقف نہ تھا، افسانے کو "جدید" نہ پاکر واپس کر دیا معاشرے اور درس گاہوں کی نامنصفی تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن ادب کی ادب سے بے نیازی، جدید نسل کی اپنے سے پہلے کی نسل کے ممتاز ترین نمائندوں سے بے خبری ایسی چیز ہے جو کسی طرح قابلِ معافی نہیں۔

اختر انصاری ان تمام ہزیمتوں اور مایوسیوں، گوشہ گیری اور زمانہ بیزاری کے باوصف اپنی عہد، اطراف اور مسائل سے بے خبر نہیں رہے۔ "ایک قدم اور سہی" اس کا ایک ثبوت ہے، ایسا ثبوت جس پر ایک خلاق اور زندہ ذہن، ایک حساس اور درد مند دل، زمانہ و حیات سے نبرد آزما ایک فرد اور اس کے اظہارِ ذات کی چھاپ ہے۔

اختر انصاری کی تخلیقات سے چشم پوشی بیسویں صدی میں اردو ادب کے متنوع میلانات سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ ہم اپنے ماضی، خصوصاً ماضی قریب سے بے نیاز ہو کر ادب میں تخلیق نہیں کر سکتے۔ پھر ایسا ماضی جو ہمارے حال میں زندہ ہے یقیناً ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ▢

اختر انصاری

قطعات

دل کو برباد کئے جاتی ہے ۔۔۔ غم بدستور دیئے جاتی ہے
مر چکیں ساری امیدیں اختر ۔۔۔ آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے

اپنے دل کے باغ سے چن چن کے پھول ۔۔۔ عمر بھر اک ہار میں گوندھا کیا
کس کو پہناؤں گا یہ سوچا نہیں ۔۔۔ آہ اے اختر یہ میں نے کیا کیا

طلسمِ گلشنِ ایجاد بھول ہے کس کی ۔۔۔ فسونِ ہستیٔ برباد بھول ہے کس کی
یہ زندگی تو ثمر ہے گناہِ آدم کا ۔۔۔ نظامِ دہر کی بنیاد بھول ہے کس کی

خاک کے ذرّوں میں جذب و شوق و مستی دفن ہے ۔۔۔ مرقدوں میں حسرتوں کی چیرہ دستی دفن ہے
حشر کے دن آہ! کس کا حشر ہوگا اے خدا ۔۔۔ اس زمیں کے بطن میں تو سوزِ ہستی دفن ہے

اس میں ارماں دفن ہیں، اس میں امنگیں دفن ہیں ۔۔۔ اس میں امیدیں تمنائیں مرادیں دفن ہیں
حشر کے دن یہ زمیں اگلے گی سوزِ آرزو ۔۔۔ اس میں انسانوں کے بدلے آرزوئیں دفن ہیں

یہ بوسیدہ پھٹی گدڑی یہ سر را خوں بھری کملی ۔۔۔ جسے سب آسماں کے نام سے موسوم کرتے ہیں
تری رحمت کے قرباں! اس کو نیچے پھینک دے یا رب ۔۔۔ زمیں والے بہت راتوں کی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں

راندۂ مسلکِ آئینِ مبیں ہیں ہم بھی ناکس و دل زدہ و خاک نشیں ہیں ہم بھی
تیری نااہل نوازی کے تصدق اے چرخ! کچھ بہت اہل و خردمند نہیں ہیں ہم بھی

یہ سچ ہے اے فلکِ کور چشم و تیرہ ضمیر! کہ تیرے وار سے کوئی نہ زینہار بچا
مگر۔ وہ کنگرۂ بامِ انجمیں پہ ترے زمین والوں نے ڈالی کمند، وار بچا

جگمگاتا ہی رہا جذب و جنوں کا سر پہ تاج سنگِ ہستی سے گراں تر ہی رہا اپنا زجاج
ہم نے اختر عشرتِ ایام کا تو ذکر کیا زندگی کی تلخیوں کو بھی نہ چھوڑا بے خراج

جنونِ شوق نہ زنہار بے عمل ہوگا جو عیش آج نہیں ہو سکا وہ کل ہوگا
خوشا کہ عالمِ فردا مراد ہے جس سے ہماری خاک سے تعمیر وہ محل ہوگا

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

خوں بھرے جام انڈیلتا ہوں میں ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

جو پوچھتا ہے کوئی سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی کبھی ہنسا کبھی آہیں بھریں کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

کشتیٔ امید ہوں، کھینا مجھے موجِ طوفاں سے بچا دینا مجھے
ڈالب آیا چاہتی ہے دل پہ یاس اے فریبِ آرزو لینا مجھے

اجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو — غم کی محفل کو سجایا ہے، ذرا دیکھو تو
چشم گریاں، دل پرخوں جگر زخم آلود — میں نے اک باغ لگایا ہے، ذرا دیکھو تو

غزلیں

محبت کے غمزوں سے کب تک نباہیں — بتا اے جدائی کہاں تک کراہیں
اِدھر سوزشِ دل، اُدھر کاہشِ جاں — اِدھر جلتے آنسو اُدھر ٹھنڈی آہیں
الٹ کیوں نہ دیں اس بساطِ الم کو — نہ تم ہم کو چاہو نہ ہم تم کو چاہیں
بہت ہو چکا پیار اے یادِ ماضی — ہٹا ہاتھ اپنے سمیٹ اپنی باہیں
حقائق کی زد سے بچا دل نہ اختر
بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈی پناہیں

ہمدمو! مجھ سے ترنم کے طلب گار نہ ہو — نالہ کرتا ہوں طبیعت پہ اگر بار نہ ہو
کیسے ممکن ہے کہ دنیا ہو، یہ آزار نہ ہو — کیف و کم، سود و زیاں، اندک و بسیار نہ ہو
اب تو رند ایک جہاں ایسا بنالیں جس میں — حرم و دیر نہ ہو، سبحہ و زنار نہ ہو
ناتکمل رہے نیچ و خم تقدیر اگر — زلفِ پُرپیچ نہ ہو، ابروئے خمدار نہ ہو
تم سمجھتے ہو جسے زمزمۂ عیش و طرب — وہ مرے ٹوٹے ہوئے ساز کی جھنکار نہ ہو
دور اس پار بھڑکتے ہیں فضا میں شعلے — دیکھنا ہم نفسو! یہ کوئی گلزار نہ ہو
ہم نشیں مقتلِ ہستی کو ذرا غور سے دیکھ — کہیں اس پردۂ خوں میں کوئی گلکار نہ ہو
ہائے وہ فکر و تصور کی غلامی اختر
جس غلامی کے لئے طوق بھی درکار نہ ہو

خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں — نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں
ملا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل — کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں
اچھال دو گل و لالہ کو ماہ و انجم تک — نرالی دھوم مچاؤ بہار کے دن ہیں

تصورات میں افکار میں عقائد میں   چمن کی روح بساؤ بہار کے دن ہیں
پرانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے   نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں
گراں گزرتی ہے دل پہ نوائے فرسودہ   اچھوتے زمزمے گاؤ بہار کے دن ہیں
لچک رہی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات   یہ بار ہنس کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں
چٹکتی کلیوں کے چادر بھرے ترنم کو   بہشت گوش بناؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اخترِ جاں دادۂ رخِ گُل کو
امام وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

نہ یہ کہ فقر شعاری پہ حرف آتا ہے   کمی سے رحمتِ باری پہ حرف آتا ہے
دل و جگر کو نہ چینِ جبیں سے برماؤ   مژہ کی نیچہ داری پہ حرف آتا ہے
مچل پڑے اگر اشکوں کے ساتھ حسرتِ دل   خلوصِ گریہ وزاری پہ حرف آتا ہے
میں اپنے لحن میں شیون ملا تو دوں لیکن   مری سلیقہ شعاری پہ حرف آتا ہے
شراب خانہ ہستی کی ابتری افسوس   شعور بادہ گساری پہ حرف آتا ہے
غمِ حیات و غمِ دل کی یہ کہن روداد   مذاق نادرہ کاری پہ حرف آتا ہے
یہ عصرِ نو کی حکایت کے بے پناہ اجزا   ہماری سحر نگاری پہ حرف آتا ہے

خدا کے واسطے اخترؔ جگر کے زخم چھپا
گلوں کی سینہ فگاری پہ حرف آتا ہے

اس وحشتِ جاں کو کیا کہئے ! گو مائل گویائی دل ہے   وہ شور ہے جس میں کان پڑی آواز بھی سننا مشکل ہے
کیسا یہ سفر ہے بارِ خدا ! اللہ ہمیں جانا ہے کہاں ؟   رہزن ہے یہاں جو رہبر ہے، جادہ ہے یہاں جو منزل ہے
اب کون کہے منزل ہے کہاں ! ساحل ہے طلسمِ وہمِ دگر   جو راہ تھکا دے منزل ہے، جو موج ڈبو دے ساحل ہے !
جب شاخ سے ٹوٹا پھول کوئی، کس نجم فلک پہ کیا بیتی ؟   ہم اہلِ زمیں بے حس ہی سہی، خود محفلِ انجم غافل ہے !
دل اور جگر کے زخم بجا ! اب زخمِ دہن بھی کیوں کھولو   ہم اہلِ جہاں گھائل ہیں تو کیا ! خود روحِ زماں گھائل ہے
اشعار میں اک بے نام تڑپ ہے دل کی بساط اتنی ہی فقط   تخئیل بھی اپنی بسمل ہے، تخئیل کی زد بھی بسمل ہے
زاہد کے خصائص نے مارا بغرقاب ہوں زندگی میں اخترؔ   اب کس سے کہوں، کس منھ سے کہوں، دل زہد پہ اب مائل ہے

اپنے جوشِ جنوں کی حقیقت یہ تھی چند قطرے تھے خوں کے اچھلتے رہے
کرب اگویا وہ آنسو جو ہم پی گئے بن کے نشتر رگوں میں مچلتے رہے
عرش سے رحمتوں کا نزول اور یہاں خلق سوزِ جہنم سے جلتی رہی
چاند کرنیں زمیں پر بچھاتا رہا، بطنِ گیتی میں انگارے پلتے رہے
ہم فقیروں نے دنیا سے جو کچھ لیا، کم تو کیا کچھ زیادہ ہی لوٹا دیا
زہر پیتے رہے مسکراتے رہے، زخم کھاتے رہے، لعل اگلتے رہے
وہ جو اک ناوکِ زہر افشاں کبھی، کھو گیا تھا کسی ناوک انداز کا
مدتوں میرے اشکوں کے سیلاب میں، اس کے پیکاں کے ریزے نکلتے رہے
اس کشاکش میں عمر اپنی اچھی کٹی، زیست کی بھی ہوس اک مزہ دے گئی
کشتِ امید پر اوس پڑتی رہی، نخلِ غم پھولتے اور پھلتے رہے
جیسے برحق بہاروں کی گل پاشیاں، یوں ہی جھلسے ہوئے گلستاں بھی بجا
پھول کھلنے کے عادی تھے کھلتے رہے، فرض جلنا تھا جن کا وہ جلتے رہے
کائناتی فضاؤں کی آبادیاں بہرِ تقریب حق رات دن پُر فشاں
اور ہم اس طلسمِ شب و روز کے مبتذل شعبدے سے بہلتے رہے
یہ زمیں لمحہ بھر سے سوا جانِ من! اپنے سینے پہ ٹکنے نہ دے گی تمہیں
ہم بھی کیا جم سکے، تم بھی کیا جم سکے، صرف گرتے رہے اور سنبھلتے رہے
استقامت ملی جس کو سب سے سوا وہ ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا
گردشِ بخت اپنی مسلسل رہی، دورِ ایام پیہم بدلتے رہے
ہم بھی اختر تہی دست قسمت سہی، کچھ تو پاتے رہے بہرِ عیش بھی
جوئے کیف و طرب خشک ہوتی رہی، فکرِ رعنا کے سوتے ابلتے رہے

اطہر پرویز

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

ہمارا معاشرہ عجیب ہے۔ لیکن ہم بھی کم عجیب نہیں۔ اوروں کی کیا بات۔ ہم ہی کون سے بھلے ہیں۔ اب ادیبوں اور شاعروں ہی کو لیجئے۔ جہاں ہم کسی منصب پر پہنچے ہمارے اندر کا فنکار شرمندہ ہو کر کہیں چھپ جاتا ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ لوگ ہم کو ہمارے منصب ہی سے پہچانیں۔ چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب ہم کسی بڑے ادیب سے محض اس لئے ملنے جاتے ہیں کہ وہ بڑا ادیب یا شاعر ہے تو بس اس کے منصب سے گلے مل کر چلے آتے ہیں اور شاعر بیچارہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ہم دولت مندوں کی بڑائی کو محض اس لئے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی تجوریوں اور بنکوں میں روپیہ بھرا پڑا ہے۔ حالانکہ اگر یہی ہوتا کہ ہم کو اس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا اور پھر ہم اپنا سر اور اپنی کمر خم کرتے تب بھی کوئی بات ہوتی، لیکن ہم تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ محض اس بات سے خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی تجوریاں بھری ہوئی ہیں۔ اور جب ہم ان سے ملتے ہیں تو عجز و انکسار کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہمارے پٹھوں کی طرح ہماری ہڈیاں بھی لچک سکتیں کہ ہم ان کے سامنے رشتہ تہی ہو جاتے۔ سچ پوچھیے تو یہ ادب کی طرح دولت برائے دولت ہوتی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سماجی حالت ہے کہ شاعر اور ادیب بھی منصب اور تجوری کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں اور جب یہ لوگ کسی بڑے منصب پر پہنچ جاتے ہیں یا دولت مند ہو جاتے ہیں تو ہم ان کے منصب اور ان کی تجوریوں سے گلے ملتے اور خوش ہوتے رہتے ہیں — لیکن اگر اس سے بھی تسکین ہوتی تو کوئی بات نہ تھی اپنی اپنی مرضی — لیکن ہم تشنگی کا شکار رہے۔

میں اب سے ۳۲ سال پہلے جب علی گڑھ آیا تو بڑی بڑی ممتاز ہستیوں سے ملا — علی گڑھ میں بھی اور دہلی میں بھی — لیکن عام طور پر یہی تجربہ رہا کہ فنکار سے ملنے کے بجائے اس کے منصب سے گلے مل کر چلا آیا — لیکن ان سے گلے ملنے کے عمل میں ہڈیوں کے بل کھٹے

ہونے کے باوصف ان کے کندھوں کو ہی چھو سکا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان سے قربت کا احساس نہ ہو سکا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں ان کو کبھی اپنے قبیلے کا فرد نہ سمجھ سکا۔

لیکن اچانک ایک روز پتہ چلا کہ اختر انصاری علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ وہی اختر انصاری جن کے قطعات، غزلیں، نظمیں، اور افسانے ہم برسوں سے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ ہم تو ان کو اسی طرح جانتے تھے جیسے اقبال، جوش، مجاز، پریم چند، عصمت چغتائی کو ـــــ اور ہمیں اس سے دلچسپی نہ تھی کہ یہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اختر انصاری کے خیال کے ساتھ ہم نے کسی شہر کو وابستہ نہ کیا تھا۔ ایک روز عزیز احمد کے توسط سے اختر انصاری سے ملاقات ہو گئی۔ عزیز احمد ہمارے ہم جماعت تھے۔ ایونگ کرسچن کالج الہ آباد کا ساتھ تھا۔ بعد میں وہ ادارہ "آج کل" سے وابستہ ہو گئے۔ پھر پاکستان چلے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے ان کو خوش رکھا ہوگا۔ بڑے ملنسار اور زود آمیز تھے۔ ادیبوں اور شاعروں سے دوستی رکھتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا۔ ان ہی کے توسط سے ہماری ملاقات اختر انصاری سے ہوئی۔ اودے دیر کپاؤنڈ (جیل روڈ) کے ایک مکان کے چھوٹے سے کمرے میں عشا کا وقت تھا۔ اختر انصاری اپنی سیٹی پہ دراز تھے۔ لیمپ کی روشنی میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم بیٹھے ـــ وہ بھی بیٹھے ـــ تعارف ہوا۔ اس تعارف سے فرق بھی کیا پڑتا ہم کون سے ہنر میں یکتا تھے۔ لیکن چند لمحوں میں یہ احساس ہوا پانی کا چھینٹا پڑا جس کے پڑتے ہی بیر بہوٹی نکل پڑی۔ ہم پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔ بیر بہوٹی نے اپنے پنجے اندر کر لئے۔ بیجان سی ہو گئی۔ جتنا ہم اسے چھوتے ہیں اتنا ہی وہ سکڑتی جاتی ہے۔ ہم کہتے رہتے "بیر بہوٹی پنجا کھول ـــ بیر بہوٹی پنجا کھول ـــ" لیکن بیر بہوٹی کبھی کھولنے کی کوشش کرتی لیکن ہمیں دیکھ کر پھر پاؤں اندر کر لیتی۔ اور اس روز ہم اختر انصاری سے مل کر بڑے مایوس لوٹے ـــ کبھی کبھی خیال ہوتا کہ اے کاش ملاقات نہ ہوتی۔ کیا شاعر اور افسانہ نگار کی تخلیقات کافی نہیں ہیں۔ کیا اس سے ملنا ضروری ہے۔ چھوئی موئی کو دیکھئے ننھا منا پودا دیکھنے میں کتنا بھلا لیکن آپ اک ذرا چھوئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد پھر ہم بہت دنوں تک اختر انصاری سے نہیں ملے۔ ان کی شاعری کو اپنے لئے کافی سمجھا ـــ ایک روز مجاز علی گڑھ آئے۔ محمود حسن صاحب شعبہ انگریزی کے استاد تھے انھیں عام طور پہ طالب علم قاری محمود کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کی آواز میں قرات کا لحن تھا۔ بڑے

شفیق اور اچھے معلم تھے۔ جس موضوع کو پڑھاتے، ڈوب کر پڑھاتے ـــــ جس کتاب کا ذکر کرتے طالب علم اس کو لائبریریوں اور دکانوں میں تلاش کرتے پھرتے۔ ایسے استاد بہت کم ہوتے ہیں مجاز، جب علی گڑھ آتے، ان کا قیام محمود صاحب کے یہاں ہوتا۔ ہم بھی کچھ کچھ ترقی پسند ہو گئے تھے پیاز کا استعمال گویا ذرا زیادہ شروع کر دیا تھا۔ مجاز صاحب بہت جلد گھل مل گئے۔ ان کے ساتھ پھر اختر انصاری کے یہاں جانا ہوا۔ مجاز سے اختر انصاری کے بڑے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ اب جو بیر بہوٹی نے پنجے کھولے تو پھر اپنے پنجے اندر نہیں کئے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہم اتنے دن سے کیوں الگ الگ رہے۔ اس زمانے میں ترقی پسند نقاد ممتاز حسین بھی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ مونس رضا، حسن امام، ممتاز حسین اور راقم الحروف گویا چار یار تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ اختر انصاری سے پہلی ملاقات ان کی بھی مایوس کن تھی ـــــ میں نے ان کو دوبارہ ملنے پر آمادہ کیا ـــــ اور اس کے بعد وہی ہوا کہ سب نے بیر بہوٹی کو چلتے دیکھا۔

مجھے بہت دنوں تک یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اختر صاحب کیا کرتے ہیں۔ ہم تو ایک فنکار ـــــ ایک انسان سے مل کر ہی مطمئن تھے۔ ان کے یہاں جانے والے ہر زمانے میں مخصوص رہے ہیں ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور اسی پر مطمئن ہوتے ہیں کہ اختر انصاری ان سے محبت کرتے ہیں ـــــ ان میں طالب علم بھی ہیں، استاد بھی ہیں ـــــ اور سیدھے سادے عام لوگ بھی۔ علی گڑھ چونکہ ایک ادارے کا نام ہے اس لئے یہاں کسی کو قیام بجز ان کے، جن کا رزق اللہ تعالیٰ علی گڑھ ہی سے مہیا کرتا ہے۔ اس لئے ان کے احباب کی حیثیت قافیے کی ہوتی ہے ـــــ اختر انصاری بے ردیف غزلیں نہیں کہتے ـــــ ان کے ایک ردیف بھی ہے جسے نوری شاہ کہہ لیجئے۔ ۴۲ سال سے میں اسی ردیف میں ان کی غزلیں سن رہا ہوں۔ سیکڑوں قافیے آئے گئے لیکن یہ ردیف برقرار ہے۔ اس تعلق کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے نظیر اکبر آبادی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن

لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانتے ہیں

اختر انصاری کو زمانے سے شکایت ہے۔ زمانے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ انھوں نے زمانے کے طرح طرح کے نام رکھ چھوڑے ہیں یہاں تک کہ اسے قادر مطلق بھی سمجھنے لگتے ہیں ـــــ اختر انصاری کے ساتھ مجھے خانہ انوری کا خیال ہمیشہ آیا۔ اگر کوئی بلا ان کے پاس سے گزر جائے تو وہ اسے بلا نہیں سمجھتے انھیں خیال آتا ہے کہ ضرور یہ کوئی بھلائی ہو گی اور پھر ان کو شکایت ہوتی ہے کہ انھیں اس

سے فیضیاب ہونے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ (ویسے یہاں مختصراً اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب برسوں سے اختر انصاری کا انداز فکر بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔ اب وہ تقدیر اور زمانہ اور آفات ارضی و سماوی کا رونا جیسی باتوں کو طفلانہ بات سمجھتے ہیں اور اپنی دینی، دنیوی اخلاقی، عملی اور نظری زندگی کی رہنمائی کو اپنے ہی مرتب کئے ہوئے ایک مخصوص زاویے کا تابع خیال کرتے ہیں۔ یہ مخصوص رویہ انھوں نے بقول خود توحید وجودی، وحدت الوجود، تاریخی جبریت جدلیاتی مادیت، رواقیت اور لاادریت جیسے فلسفوں کی ترکیب سے وضع کیا ہے!)

غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "روح عصر" لاہور میں چھپ رہا تھا، مہینوں سے اس کا انتظار تھا لیکن ڈیڑھ سو صفحات کا یہ مجموعہ "چھپ ہی نہیں چکتا تھا۔" بالآخر ایک روز ناشر کا خط آیا کہ "روح عصر" شائع ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو دیدار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اطلاع آئی کہ ڈاک سے دس کاپیاں بھیجی جا رہی ہیں۔ اب اس کا انتظار شروع ہوا۔ میں ہفتوں سے "روح عصر" کی خیریت پوچھتا رہتا تھا لیکن وہی سناٹا ــــ اب معلوم ہوا کہ ناشر نے بھیج دیا تو ڈاک کی تاخیر کا سبب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک روز شام کو پہنچا تو شاید یہ پہلا روز تھا کہ میں نے مجموعے کے بارے میں ان سے کچھ بھی تو نہ پوچھا۔ لیکن یہ محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ میں نے پوچھا ــــ "اختر صاحب! کیسی طبیعت ہے؟" کہنے لگے "آپ بھی روز کتاب کے بارے میں پوچھتے ہیں آج جب کتاب آگئی تو آپ بھی بے نیاز ہو گئے۔ میں اچھل پڑا کتاب میز پر رکھی تھی۔ خوبصورت سی کتاب۔ اختر صاحب نے اس پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے "اس کی کہانی تو سن لیجئے ــــ" آج جب میں ایک بجے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کتابوں کا ایک پارسل لاہور سے وی۔ پی سے آیا ہے۔ ڈاک خانے جا کر چھڑا لیں۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ میرے نام وی۔ پی کیوں آیا۔ بہر حال روپیہ لے کر ڈاک خانے پہنچا معلوم ہوا کہ ڈاکیے دو بجے واپس آتے ہیں۔ انتظار کرتا رہا ــــ دو بج گئے ــــ ڈھائی بجے تین بجے ــــ ساڑھے تین بجے ــــ اور بالآخر چار بجے۔ بارے ڈاکیے کی شکل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ آج پہلا موقع ہے، جب کہ ڈاکیہ اتنی تاخیر سے واپس آیا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا ــــ ڈاک خانے کی حالت بھی آج جیسی نہ تھی۔ بہر حال ڈاکیے نے وہ پیکٹ نکالا، انھوں نے وی۔ پی کی رقم حوالے کی۔ کتاب موصول کی۔ شام کی ڈاک سے پبلشر کا خط ملا کہ غلطی سے کتاب کا پارسل وی۔ پی سے چلا گیا۔ آپ چھڑا لیں۔ میں روپیہ واپس کر دوں گا۔ گویا یہ حادثہ بقول اختر صاحب ان کے ساتھ پیش آنا تھا اور سبب صرف اتنا تھا کہ اختر انصاری

کو یہ بھی کی مسرت بھی نہ مل سکے۔ کہنے لگے میاں غالب نے اپنے بارے میں نہیں میرے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس روز اختر صاحب کو اس غنی ساقی پر اتنا غصہ تھا کہنے لگے "میاں بلا وجہ یہ آتی بڑی طاقت میرے ستانے پر آمادہ ہے۔ مجھے تو ایک انگلی سے مسلنے کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین ہی کافی ہیں۔ الجھنا ہے تو ٹاٹا اور برلا سے الجھ کر دیکھو، تب پتہ لگے گا کہ کیسی برابر کی ٹکر ہے۔

اختر صاحب نظریاتی اعتبار سے ہمیشہ مارکسی رہے ہیں اور ان کا مارکسزم ان کے ذاتی مطالعے پر مبنی رہا ہے۔ یہ وہ مارکسیت نہیں ہے جس کو چالیس سال پہلے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہر ہر نو عمر طالب علم اپنے اوپر لاد دیتا تھا۔ انھوں نے اپنی اشتراکیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا —— نہ انھوں نے کبھی روس اور چین کا کوئی دورہ کیا —— سویٹ لینڈ کا انعام سیاست کی نذر ہو گیا —— حالانکہ انھوں نے ان گنت لکھنے پڑھنے والوں سے روس اور چین کا تعارف کرایا۔ ترقی پسندوں میں انھیں کوئی نمایاں مقام اس لئے نہیں ملا کہ انھوں سے ڈھول تاشے اور دھوم دھڑکے جیسے مشاغل سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ انھیں ترقی پسندوں نے وہ مقام بھی نہیں دیا جو ان سے پست تر ادیبوں کو مل چکا ہے۔ انھیں ساہتیہ اکیڈیمی کا کوئی ایوارڈ نہیں ملا انھیں ایوارڈ ملا تو یو۔ پی اردو اکیڈیمی کا جو اطہر پرویز جیسے چھٹ بھیوں کو بھی مل جاتا ہے۔ اِں تو میں بہک گیا —— میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختر انصاری اشتراکی ہیں۔ لیکن ان کی اشتراکیت اتنے بہت سے حادثوں سے کبھی ٹکر نہ لے سکی۔ اگر کوئی ان سے محض دو ایک بار ملے تو وہ یہی سمجھے گا کہ اختر انصاری قنوطیت پسند ہیں، حالانکہ ان کی شاعری میں جو رجائیت ہے وہ بہت سے مارکسی ادیبوں کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔

اختر انصاری دہلی کے ایک بڑے سول سرجن کے بیٹے ہیں۔ جب وہ پیدا ہوتے تو انھیں سونے کے چمچوں سے دودھ پلایا گیا —— لیکن وہ لندن میں تھے تو سارا محل اٹا اٹا دھم کرکے گر پڑا —— انھوں نے اس ملبے میں سے ٹوٹی پھوٹی چند چیزیں اٹھائیں —— اور نو چھوٹے بہن بھائیوں کی انگلی پکڑی اور زندگی کے راستے پر چل پڑے۔ انھوں نے اپنی آدھی زندگی اپنے بہن بھائیوں کی خدمت میں گزاری —— اور جب ان کے بال دو پنہ نکل آئے وہ اڑسنے

کے قابل ہوئے اور ایک ایک کرکے پھر سے اڑ گئے تو انھوں نے اپنے آشیانے پر نظر ڈالی۔ ان کے اپنے بال و پر جھڑ گئے ـــــ زندگی کی جدوجہد نے انھیں کمزور کر دیا تھا ـــــ ان کی اپنی یونیورسٹی کے اکابرین کو ان کے علم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی ڈگری دیکھ کر ان کو اسکول کے کلاس روم میں بٹھا دیا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے ـــــ وہ دل و دماغ کو استعمال کرتے رہے۔ لیکن دل و دماغ سے شعر کہے جا سکتے تھے ـــــ افسانے لکھے جا سکتے تھے ـــــ مضامین لکھے جا سکتے تھے ـــــ روپیہ نہیں کمایا جا سکتا تھا ـــــ مناصب نہیں حاصل کئے جا سکتے ـــــ اختر انصاری نے وہی کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ اگر ہمارا معاشرہ کچھ سلجھا ہوا ہوتا اور مناصب کو کسوٹی نہ سمجھتا تو شاید اختر انصاری، اسکول کی ملازمت کو ترک نہ کرتے ـــــ وہ احساس کمتری کا شکار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ احباب کے زور دینے پر اردو میں ایم۔ اے کر لیا ـــــ ظاہر ہے کہ پہلی پوزیشن آئی۔ عارضی طور پر شعبہ اردو میں جگہ مل گئی لیکن تابکے ـــــ آخر ایک روز معلوم ہوا کہ وہ پھر سرِ راہ کھڑے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے پروفیسر حبیب الرحمٰن (پرنسپل ٹریننگ کالج) کا ـــــ انھوں نے اپنی چھتری کے نیچے جگہ دے دی۔ ان کا سر تو محفوظ ہو گیا ـــــ لیکن چھتری کہیں بھیگنے سے بچاتی ہے۔ اختر انصاری نے ۲۵ سال بحیثیت لکچرر گزارے۔ لیکن پروفیسر ہونا تو درکنار وہ ریڈر بھی نہ ہو سکے، اور آخر کار لکچرری کی پوسٹ سے ہی سبکدوش ہوئے۔ اختر انصاری بہت اچھے استاد تھے، مؤدب تھے، معلّم تھے ـــــ انھوں نے تخلیقی ادب کا انبار لگا دیا۔ شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے تو تعلیم کے مسائل پر اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں۔ لیکن یونیورسٹی میں مناصب کاموں پر نہیں دیئے جاتے۔ ان کے لئے صدور ہائے شعبہ کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ ان کے بچوں کو کھلانا پڑتا ہے اور اگر یہ سب کام کسی نے کر لئے تو پھر اہلیت اور لیاقت کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ میں نے بڑی بڑی باتیں کرنے والوں کو دیکھا ہے ـــــ زمین سے آسمان تک کی جست لگانے والوں کو دیکھا ہے۔ لیکن مناصب ملتے ہی، اس چند روزہ زندگی میں ان کو بلندیوں سے پستیوں میں گرتے دیکھا ہے ـــــ میں کہا کرتا ہوں کہ یونیورسٹی کا پروفیسر "ہیڈ" ہونے کے بعد پھر "ہیڈ" سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اتنے دن بغیر "ہیڈ" کے کام چلاتا ہے۔ آج اگر یونیورسٹیوں میں تعلیمی معیار گر رہا ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ لوگوں نے خدمت گاروں کو معلّم بنا دیا ہے۔ اس کے بعد اگر یہی لوگ شکایت کریں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ـــــ

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اختر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ اختر انصاری شعبۂ تعلیم میں لکچرر تھے۔ وہ ام۔ اے بی ایڈ تھے اور ان گنت کتابوں کے مصنف ـــــ پی ایچ ڈی کی تھیسس کے ممتحن ـــــ اور ان گنت کتابوں کے مصنف ـــــ لیکن وہ ریڈر نہ ہو سکے۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ ان کے پاس ام۔ ایڈ کی ڈگری نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ام۔ ایڈ کی کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کو توسیع محض اس لئے ملی کہ جو مضمون وہ پڑھاتے تھے اس کا پڑھانے والا اور کوئی نہ تھا۔ ویسے بھی اختر انصاری جیسے استاد تو یونی ورسٹیوں کو شاذ ہی ملتے ہیں۔ اختر انصاری کو اس حق تلفی کا بڑا ملال رہا اس میں محض ریڈر ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے کہیں اور لکھا ہے ـــــ ہم پیشوں میں سبکی ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ بے انصافی محض اختر انصاری کے ساتھ نہیں ہوئی علی گڑھ میں ایسے قتل آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ فلسفے کے ایک معلّم اس زمانے میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے اور جو اقدار کے بھی بڑے پاسدار تھے ـــــ جب وہ اختر صاحب کی تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے تو انھوں نے بھی سچائی کو مصلحت کی قربان گاہ پر ـــــ رکھ کر ذبح کر دیا ـــــ اور "ہم معلّم" دیکھتے رہ گئے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ اختر صاحب حسبِ معمول صبح صبح سیر کرکے واپس آرہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اختر صاحب نے لمبی ٹہل کی تھی ـــــ سامنے سے ایک جنازہ آرہا تھا۔ کسی نے اطلاع دی" حضور! فلسفے کے پروفیسر کا جنازہ ہے۔ آپ بھی کندھا دے دیجئے۔ اختر صاحب اپنی ترنگ میں تھے۔ برجستہ بولے" آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی مقتول نے اپنے قاتل کے جنازے کو کندھا دیا ہو"

ایسے لوگ جو کبھی جھکتے نہیں، بالآخر ٹوٹ جاتے ہیں لیکن میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ اختر صاحب کسی کے سامنے جھکے اور نہ ٹوٹے ـــــ وہ ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی کبھی چین سے نہ بیٹھے انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا، تصنیف و تالیف میں اسی لگن کے ساتھ لگے رہے۔

یوں سمجھئے کہ اختر انصاری نے ایک جہنم میں زندگی گزاری۔ لیکن اس آنچ کو کم کرنے میں بلا بسے رہے۔ انھوں نے اپنے گھر میں اپنی جنت بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ جب وہ ذاکر باغ کے پاس انجنیرنگ کالج کے کوارٹرز میں رہتے تھے تو باہر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اسے انھوں نے بانس

سے معمولی فرنیچر سے آراستہ کیا تھا ـــــ اس کمرے کا سارا سامان ایسا ہی تھا ـــــ یہاں تک کہ اس کمرے میں بیٹھ کر وہ بانس کا خود ساختہ پائپ پیا کرتے تھے ۔ حبیب تنویر اسٹیج کے مشہور ڈائرکٹر ہیں ـــــ لیکن ان کا فن خالص عوامی ہے ۔ ان کا مزاج عوامی ہے ۔ انھیں اختر صاحب کا یہ بانس کا پائپ بہت پسند آیا اور اختر صاحب نے یہ پائپ ان کو نذر کر دیا ۔ حبیب تنویر اس پائپ کو انگلستان لے گئے ـــــ ہاں تو میں کمرے کی بات کر رہا تھا ۔ اختر صاحب کے اس مکان میں ایک اور بڑا کمرہ تھا ـــــ اسے انھوں نے بڑے شاندار طریقے سے سجایا تھا ۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر تھا ۔ ان کی اپنی تصنیف کا سٹ تھا ۔ کتابیں اور رسائل سلیقے سے الماریوں میں رکھے تھے ـــــ دو ایک پینٹنگ بھی تھیں ایک تصویر تا منگیشکر کی ـــــ جس کی آواز کے اختر صاحب عاشق ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وہ مغنیہ ہے جو لاکھوں کروڑوں غم نصیب انسانوں کو مسرت عطا کرتی ہے ۔ کمرے میں مختلف رنگوں کے بلب تھے جن کے سوئچ اختر صاحب کی سیٹی سے لگے ہوئے تھے اور اختر صاحب حسب منشا اپنے کمرے کو منور کرتے رہتے تھے ۔

اس کمرے سے ملحق ایک اور کمرہ تھا جس کو انھوں نے اور اچھی طرح سجایا تھا ۔ یہ کمرہ بھی فرش سے عرش تک سجا ہوا تھا ـــــ

یہ تینوں کمرے اختر صاحب کی شخصیت کا آئینہ دار تھے ۔ یہی ان کی جنت تھی ـــــ جسے انھوں نے اپنی پسند کے مطابق سجایا تھا ۔ اس کے اندر وہ جہانگیرانہ انداز سے بیٹھتے تھے ۔ اور یہاں بیٹھ کر وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔

پھر جب وہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے اپنا ذاتی مکان بنایا ۔ جس کا نام انھوں نے "شہزاد" رکھا ۔ اختر صاحب سچ پوچھئے تو خود بھی الف لیلوی شخصیت رکھتے ہیں انھوں نے شہزاد کی طرح کہانیاں کہیں ـــــ لیکن وہ ہر روز قتل ہوئے ان کی کہانی انھیں قتل ہونے سے نہ بچا سکی ۔ یہ اور بات ہے کہ ہر قتل کے بعد وہ جی اٹھتے ہیں ۔

اختر انصاری نفاست پسند ہیں ۔ وہ اچھے سے اچھا اور قیمتی سے قیمتی کپڑا پہنتے اور خوش ہوتے ہیں ۔ ان کے اندرونی کمرے میں جوتوں کی جوڑیوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں جنھیں وہ مختلف کپڑوں کے ساتھ میچ کرکے استعمال کرتے ہیں ۔ وہ دھول کے شہر میں رہتے ہیں ۔ اس لئے جب وہ کہیں جاتے ہیں تو دو رومال اپنے ساتھ رکھتے ہیں ایک سے گرد جھاڑتے ہیں اور دوسرا قدم قدم پر ان کی نفاست کی آئینہ داری کرتا ہے ۔

اختر صاحب جمال پرست ہیں۔ انھوں نے برسوں تاج محل کو اس لئے نہیں دیکھا کہ وہ اسے سکون سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت جب ان کا ذہن پریشانیوں اور فکروں سے آزاد ہو۔ ورنہ وہ اس خوبصورت عمارت کے ساتھ انصاف نہ کرسکیں گے اور تاج محل کو برسوں اختر صاحب کا انتظار کرنا پڑا۔

اختر صاحب نے لفظوں کا کاروبار کیا اور اس کو اجناس اور سیم وزر کے ترازو سے نہیں تولا۔ وہ الفاظ کے مزاج شناس ہیں انھوں نے پوری زندگی زبان کی کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا یہ بڑی بات نہیں ہے۔

اختر صاحب سیدھے سادے، صاف ستھرے آدمی ہیں جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر —— میرے عزیز دوست اور بزرگ محمد حسن عسکری الہ آباد سے جاتے ہوئے علی گڑھ رُکے۔ میرے ساتھ قیام کیا۔ یہاں کے ادیبوں سے ملنا چاہتے تھے۔ اس روز اختر صاحب کے یہاں ایک دعوت تھی جس میں یونیورسٹی کے بہت سے ادیب اور شاعر اکٹھا ہونے والے تھے۔ اختر صاحب نے اس میں شرکت کے لئے عسکری صاحب کو بھی دعوت دی۔

شام کو میں اور حسن عسکری، اختر صاحب کے یہاں پہنچے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ بے تکلف احباب جمع تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ عسکری صاحب اجنبی تھے اور میں طالب علم —— ہمیں دیکھ کر محفل میں ایک سنجیدہ سی فضا قائم ہوگئی۔ عسکری صاحب سے تعارف ہوا تو سب چونک پڑے۔ حسن عسکری ادب کے میدان میں بڑے دھماکے کے ساتھ داخل ہوئے تھے ترقی پسندوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ادب میں ان کا بول بالا تھا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "جزیرے" چھپ کر آگیا تھا۔ انھوں نے "ساقی" میں باتیں کے عنوان سے لکھنا شروع کر دیا تھا —— یہ صفحات ادبی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ عسکری صاحب، ہمیشہ سے چونکا دینے والی باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان سے بڑے احتیاط سے بات کی۔ اختر صاحب نے ان سے جیمس جوائس کی کتاب یولیسس کا ذکر کیا کہ کوشش کے باوجود "یولیسس" سمجھ میں نہیں آتی۔ عسکری صاحب کہنے لگے "ہاں بغیر کسی امدادی کتاب کے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ میرے پاس ایک کتاب ہے وہ بھیج دوں گا —— اس میں یولیسس کے متن میں جو حوالے آئے ہیں، ان کی شرح ہے۔ اس کی مدد سے آپ اسے آسانی سے سمجھ لیں گے۔ میں نے بھی اس سے مدد لی تھی۔

اس کے بعد حسن عسکری صاحب نے ایک پیالی چائے پی۔ لوگوں کی باتوں میں "ہاں" "نہیں" سے زیادہ شرکت نہیں کی۔ ذرا سی دیر میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جیسے ہی ہم لوگ باہر نکلے اک دم سے لوگوں نے باتیں شروع کر دیں۔ عسکری صاحب پلٹ پڑے اور کہنے لگے "میں معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی، دراصل افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔"
رشید صاحب نے بہتیرا بات بنائی۔ مگر عسکری صاحب بہر حال عسکری تھے ــــ لگا جیسے "ساقی" میں "باتیں" کے عنوان سے انھوں نے علی گڑھ والوں کی خبر لی اور یہ بھی لکھا کہ ایک ادیب سے ملاقات ہوئی جو "یولیسس" کو سمجھنے سے معذور ہیں۔"
مجھے بے حد افسوس ہوا۔ عسکری صاحب میرے مہمان تھے۔ یہاں مجھے بڑی شرمندگی بھی ہوئی۔ میں نے عسکری صاحب کو خط لکھا کہ آپ سے ہم لوگ یہ توقع نہیں رکھتے۔ خاص طور پر اختر انصاری صاحب کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ قطعاً نامناسب ہے۔ عسکری صاحب نے گول مول جواب دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ اختر صاحب کو افسوس تو ہوا لیکن محض اس بنا انھوں نے حسن عسکری صاحب کے بارے میں کوئی خراب رائے نہیں قایم کی۔
اختر صاحب کی پسند اور ناپسند، دونوں میں شدت ہے۔ لیکن وہ اپنی رائے کو بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ دوسرے فرد پر ان کو اعتماد ہو۔
اختر صاحب نازک مزاج ہیں انھوں نے کبھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی۔ ان کے مزاج میں غیر معمولی صفائی پسندی ہے۔ ان سے مل کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چھوٹے موٹے گھریلو کام بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک دردناک حقیقت یہ ہے کہ ان کا نواسا بالکل مفلوج ہے۔ برسوں سے بستر پر پڑا ہوا ہے۔ بیگم اختر کے انتقال کے بعد اختر صاحب خود اس کی تیمارداری کرتے ہیں۔ اختر صاحب نے پوری زندگی اپنے معمولات کی پابندی کی لیکن اس لڑکے کی تیمارداری نے اس معمول کو درہم برہم کر دیا اور اب وہ اس لڑکے کے لئے اپنا شب و روز قربان کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے ماتھے پر کوئی بل نہیں ہے۔ اگر آج بچے کی ماں دیکھ سکتی تو اسے بھی تسکین ہوتی کہ اس کا بچہ کتنے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فنکار ہونا معاشرے سے بے نیاز کر دیتا ہے انھیں اختر صاحب کو مدر ٹریسا کے روپ میں دیکھنا چاہئے۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ اختر صاحب کبھی کبھی زندگی سے مایوس بھی ہو جاتے ہیں لیکن اپنے اندر کے آرٹسٹ کو بڑے پیار سے پالتے پوستے ہیں اور یہ کبھی نہیں مر سکتا کہ اس میں اختر صاحب کی ساری عمر کی ریاضت کا راز ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اختر صاحب نے ایک ناکام زندگی گزاری۔ میں سمجھتا ہوں کہ کامیابی اس کا نام نہیں کہ اختر صاحب ہزاروں لاکھوں روپیہ جمع کر لیتے ــــ اختر صاحب وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر ہو جاتے۔ اختر صاحب کی کامیابی اس میں ہے کہ انھوں نے جیسی زندگی گزارنی چاہی گزاری۔ انھوں نے کسی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ انھوں نے زمانے کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، زمانہ اگر ساز گار نہیں ہوا تو انھوں نے زمانے کے ساتھ جنگ کی۔ انھوں نے ادبی تخلیقات کیں۔ اپنی مرضی کے مطابق لکھا۔ ان کی دکان میں اگر فرمائشی مال نہیں تھا تو یہ مال جو کچھ تھا، ان کا اپنا انتخاب تھا۔

انھوں نے اپنی مرضی سے اپنا حلقہ احباب بنایا۔ کسی دربار میں جا کر کسی فرعون کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ کسی کی خوشامد میں اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے دوستوں کی دلداری کی اور یہی ان کا حج اکبر تھا۔

آج کل پبلک ریلیشنز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ زندگی میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو پھر ادھر بھی توجہ دینا چاہیے۔ کن لوگوں سے کب اور کیسے ملنا چاہیے۔ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ لیکن اختر صاحب نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ اگر ان کا آپ سے تعلق خاطر ہے اور آپ شہر کے بہت پس ماندہ حصے میں رہتے ہیں۔ آپ کا مکان بھی بوسیدہ ہے تو اختر صاحب جب جی چاہے گا بلا تامل چلے جائیں گے ــــ لیکن اگر آپ وزیر ہیں اور اختر صاحب کی تقدیر آپ کی مٹھی میں بند ہے تو اختر صاحب اس مٹھی کو کھولنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو بھی جنبش نہ دیں گے۔ ایسے دنیا کے لوگ اس کے مزاج کی کجی سمجھتے ہیں جسرت نے کیا سوچ سمجھ کر شعر کہا تھا ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بعض لوگ اختر صاحب سے کہتے ہیں کہ انھیں ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں بھی اپنے آپ کو ان بعض لوگوں کی صف میں رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اختر صاحب سے بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ اصل ادبی شہرتیں معاصر ادیبوں اور نقادوں کے ہاتھوں نہیں تھیں ورنہ غالب کا درجہ ذوق سے بہت نیچے رہتا اور نظیر اکبرآبادی کو جدید شاعری کا امام نہ مانا جاتا بلکہ ان کے کلام کو سوقیانہ سمجھ کر اسی طرح نظر انداز کیا جاتا۔

اختر صاحب! آپ نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ نے افسانے لکھے، قطعات غزلیں اور نظمیں لکھیں، تنقیدی مضامین لکھے ـــــ اور یہی نہیں آپ نے صحیح معنوں میں ایک فنکارانہ زندگی گزاری۔ اپنی شخصیت کا بہترین حصہ فن و ادب کی نذر کیا۔ آپ نے مصلحتوں کے سامنے سچائیوں کا گلا نہیں گھونٹا ـــــ آپ نے کسی کی حق تلفی نہیں کی ـــــ کیا یہ معمولی بات ہے۔ اس سیم و زر کی دنیا کے لوگ ان اقدار کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں ـــــ یہ لوگ جو عام طور پر قد آور دکھائی دیتے ہیں ـــــ اختر صاحب! یہ آپ کے سامنے بونے ہیں ـــــ آپ نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ کی تخلیقات آنے والی نسلوں کی امانت ہیں ـــــ اور فیصلہ آنے والی نسلیں ہی کریں گی اور ان سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ـــــ آپ نے یگانہ چنگیزی کا یہ شعر تو پڑھا ہی ہوگا ؎

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

□

اختر انصاری

نظمیں

پردیسی

خاک کیسی جمی ہے بالوں میں
کیوں گڑھے سے پڑے ہیں گالوں میں
کھوئے رہتے ہو کن خیالوں میں
کون ہو تم کہاں سے آئے ہو؟
اس قدر کیوں اداس رہتے ہو
کس لئے بے حواس رہتے ہو
دھیان میں کس کے پاس رہتے ہو
کون ہو تم کہاں سے آئے ہو؟
سوز آیا کہاں سے آہوں میں
لوچ کیسا ہے یہ نگاہوں میں
کس کو تکتے ہو دور راہوں میں
کون ہو تم کہاں سے آئے ہو؟
دیکھا کرتے ہو کس جہاں کے خواب
کس زمیں اور کس آسماں کے خواب
ہائے کس گلشنِ جناں کے خواب
کون ہو تم کہاں سے آئے ہو؟

اجنبی

شب کو بستی کے جب تمام افراد
دن کے کاموں کی بھولتے ہیں یاد
ہوتے ہیں ہر خیال سے آزاد
تم خیالوں میں ڈوب جاتے ہو
ہم سے کیوں اتنے مختلف ہو تم
مل کے ہم ساونی مناتے ہیں
چہلیں کرتے ہیں گیت گاتے ہیں
ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں
اور تم صرف مسکراتے ہو
ہم سے کیوں اتنے مختلف ہو تم
وقت پر مینھ نہیں برستا جب
دیوتاؤں کا اف وہ غیظ و غضب
دیکھتے ہیں سوئے فلک ہم سب
تم زمین پر نظر جماتے ہو
ہم سے کیوں اتنے مختلف ہو تم

زمانہ

جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
جس کو مرنا ہے مرے، ہم نہیں مرنے والے
ہم نہیں جان سے بے صرفہ گزرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
شہدا کو جو شرف ہے وہ شرف پائیں گے
ہم تو مشہورِ زمانہ ہیں، خدا رکھے ہمیں
تھوا گر موت کی ناپاک زباں چکھے ہمیں
جس کو مرنا ہے مرے، ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
زہر کا گھونٹ پیا ہم نے تو جو سانس لیا
دامِ تزویر میں قاتل نے ہمیں پھانس لیا
یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے
بخدا ظالم و جاہل جو نہیں تو کیا ہے
اس کے جبڑوں سے تو ہر آن ٹپکتا ہے لہو
کہنیوں سے بھی بالاعلان ٹپکتا ہے لہو
کند چھریوں سے ہمیں ذبح کیا ہے اس نے
قطرہ قطرہ لہو اس طور پیا ہے اس نے

کتنے رِستے ہوئے زخموں کو بھنبھوڑا میں نے
کتنی سوتی ہوئی ٹیسوں کو جھنجھوڑا میں نے
اس نے بخشی وہ عجب بَرِشِ انفاس ہمیں
لذتِ نیش بھی آئی نہ کبھی راس ہمیں
خاک اور خون میں غلطاں رہے اس کے ہاتھوں
سرنگوں، سربگریباں رہے اس کے ہاتھوں
یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے
ہم نے تقدیرِ الٰہی سے جو حصہ پایا
وہ اس اکّال نے بے دغدغہ لوٹا کھایا
ہائے، کیا کیا نہ رگِ جاں کو نچوڑا اس نے
بھیک میں پھیلتی بانہوں کو مروڑا اس نے
تھے جو تقدیس کے رشتے سبھی توڑے اس نے
محنتِ غم سے پسینے بھی نہ چھوڑے اس نے
یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے
جس کو مرنا ہے مرے، ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے

معبدِ ویراں

گِھسی پِٹی یہ چٹائی کھجور کی، یعنی
رہینِ سجدہ کو سجّادہ لاجواب ملا

کہاں کے گنبد و مینار! چھت بھی غائب ہے
خوشا کہ سایۂ پُر نور آفتاب ملا

وضو کے برتنے کہاں ہیں؟ کسی نے گر پوچھا
یہاں وضو کی ضرورت نہیں! جواب ملا

اس احتیاج کی ماری ہوئی عبادت میں
عذاب پہنچا کسی کو نہ کچھ ثواب ملا

غرض کہ خیر سے ہم خانماں خرابوں کو
خدا بھی اپنی طرح خانماں خراب ملا

خرابیوں کی یہ ہے انتہا! خدا رکھے!
شریکِ طالعِ بد ہے خدا! خدا رکھے!

ایک قدم اور سہی

میرے ساغر میں الٹ دو کوئی مے خانۂ سم!
چند دن عیش کے و عشرتِ جم اور سہی!

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جتنی نہاں ہو تجھ میں
اے فلک! آخری اک دورِ ستم اور سہی!

برق وش اک نگۂ نیم نظر ہی اے کاش!
کچھ گمانِ نظرِ لطف و کرم اور سہی!

سامنا پھر ہو کسی ہوش ربا منظر کا
دل ہے غم دیدہ تو کچھ پرسشِ غم اور سہی!

جاں سلگنے کو سلگتی ہی رہی ہے، پھر بھی
زلف و رخسار کی کچھ آتشِ نم اور سہی

پھر کوئی خواب مرے ذہن میں انگڑائی لے
کچھ گریز اور سہی، لذّتِ رم اور سہی!

پھر مرے قلب میں جاگے کوئی وحشی جذبہ
صفحۂ زیست پہ اک نقشِ ارم اور سہی

"زندگی کاٹ دی سائے میں سیہ بختی کے
اب تباہی کی طرف ایک قدم اور سہی!"

۱؎ دیکھو احسن کلیم کا شعر۔

گوہرِ نایاب

(جوش ملیح آبادی مرحوم کی یاد میں)

اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل!
ناظورۂ نیکی و بدی کی چھل بل!
کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے انبارِ علوم
انبارِ علوم اور جبین زارِ علوم
وہ بوجھ کہ جس بوجھ سے شانے چھل جائیں
ایوانِ حضارت کے ستون تک ہل جائیں
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل!
جیسے کسی پرشور ندی کی چھل بل!
پرشور ندی شورِ قیامت کی نقیب
یا غیرتِ فطرت کے عناصر کی حریف
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل
گندم کے خمارِ سرمدی کی چھل بل

یہ سب تو بجا ہے، مگر اب غم یہ ہے
قانونِ فنا بھی ہے غضب، غم یہ ہے
مطلب یہ کہ اب ہو چلی بوڑھی یہ صدی
ہوجانے کو ہے لقمۂ سیلِ ابدی
وہ وقت کسی وقت بھی دم سے آجائے
پیغام کوئی ملکِ عدم سے آجائے
حسرت سے نظر ڈال رہی ہے ہر سو
کہتی ہے کوئی فاختہ کوکو! کوکو!

القصہ یہ خودمست و خودی مست صدی
اک دن یوں ہی چپ چاپ چلی جائے گی
گنتی ہے کوئی چیز نہ گنوائے گی
البتہ وہ اک گوہرِ رشکِ گہرِ نور!
تھا عکس فگن جس پہ کوئی لمعۂ طور!
نایاب جو تھا اس کی نظر میں شاید
مضمر جو رہا اس کے جگر میں شاید
ساتھ اپنے اسے بھی لے چلی ہے لے دائے
سینوں سے نکلتی ہے تو نکلا کرے ہائے

کہنے کو سمندر میں ندی ڈوب گئی
سچ یہ ہے کہ اب پوری صدی ڈوب گئی

متفرق اشعار

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجہ تھام لیتا ہوں
فغانِ غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آیا چلو اچھا ہوا
میری آنکھوں کو مرا احوال کہنا آگیا

دل کے شکستہ ساز سے نغمے ابل پڑے
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

یاس کا ہے یہ تقاضا کہیں مر بھی کمبخت
ہے یہ امید کا فرمان ابھی جینا ہوگا

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو
مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

نصیب آج تک ایسی کوئی خوشی نہ ہوئی
ہمارے حق میں بالآخر جو دشمنی نہ ہوئی

ہجومِ یاس میں ہم نے یہ رنگ بھی دیکھا
جلا چراغ مگر گھر میں روشنی نہ ہوئی

حیات دل کے لہو سے رچائی جاتی ہے
بڑے ریاض سے یہ شے بچائی جاتی ہے

صدا کچھ ایسی مرے گوشِ دل میں آتی ہے
کوئی بنائے کہن جیسے لڑکھڑاتی ہے

سوال ہے غمِ ہستی کے بیت جانے کا
یہ زندگی تو بہر حال بیت جاتی ہے

فغانِ درد! لبوں پر نہ آئیو زنہار
مری سلیقہ شعاری پہ بات آتی ہے

ہو گئے دیدۂ نمناک سے دریا لیکن
دل وہی ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے

رباعیات

پایا نہ تجسس سے طبیعت نے فراغ
خالی نہ ہوئے فکر کی کاوش سے دماغ
گوتم کبھی، سقراط کبھی، مارکس کبھی
جلتے رہے تاریخ کے طاقوں میں چراغ

اک بحث میں کہنے لگے اک صوفیٔ مور
ہے عمر مری اسّی برس کی بھرپور
اس پہ یہ کہا میں نے کہ پھر بھی مجھ سے
دو ڈھائی ہزار سال چھوٹے ہیں حضور

کیا قہر کہ معبود! بنے بیٹھا ہے
انصاف کے ہونٹوں کو سیے بیٹھا ہے
آدم نے بنا ڈالے جہنم لاکھوں
تو ایک جہنم کو لئے بیٹھا ہے!

افکار کی گرمی سے پگھلے جاتے ہیں!
دم سیلِ حقائق سے رکے جاتے ہیں!
اللہ رے افزونیٔ سرمایۂ ذہن!
اس بوجھ سے تو شانے جھکے جاتے ہیں!

جیسے شبِ غم بیت رہی ہو کوئی!
یا وقت نے خود چوٹ سہی ہو کوئی
یہ کرب، یہ لذت، یہ تفکر، یہ نشاط
فطرت نے غزل جیسے کہی ہو کوئی!

بالیدگیٔ جسم کی خاطر نہ جیے!
زخمِ جگرِ زیست ہی دن رات سیے!
یہ جانِ نزار و بدن کاہ نما!
یوں بھی ہے بہت قبر کے کیڑوں کے لئے

ترکیبِ زماں ہے کس کی سازش یا رب!
ہر نقش یہاں کس کی تراوش یا رب!
یہ ہستیٔ برباد، یہ جانِ ناشاد
میری ہے کہ تیری آزمائش یا رب!

احساس کے تاروں کو جھنجھوڑا میں نے
غفلت کی کلائی کو مروڑا میں نے
ٹپکے مہ و خورشیدِ درخشاں کیا کیا
جب اپنی شبِ غم کو نچوڑا میں نے

ہنس ہنس کے زمانے کو ہنسانے والے
گفتار کو عنبر میں بسانے والے!
کیوں تو نے نظر بچا کے آنسو پونچھا!
محفل کو طرب زار بنانے والے!

□

ادارہ

اختر انصاری ــ حیات اور خدمات

اختر انصاری کا مولد بدایوں اور سنہ پیدائش ۱۹۰۹ء ہے۔ آپ کے والد بہ سلسلۂ ملازمت ایک مدت تک دہلی میں رہے اور پھر دہلی ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ اختر انصاری نے تربیت اور تعلیم کی منزلیں دہلی میں طے کیں۔ پہلے قدیم اینگلو عربک ہائی اسکول میں اور پھر سینٹ اسٹیفنس مشن کالج میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔ اے (آنرس) کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ لیکن والد کی ناوقت موت کے باعث وہاں کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر دہلی واپس آئے۔ اس کے چند سال بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ ٹی اور ایم۔ اے کے امتحان پاس کئے۔ جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک یونیورسٹی کے سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس ملازمت کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے تا اختتام ملازمت یعنی ۱۹۷۱ء تک یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم (ٹیچرس ٹریننگ کالج) میں لکچرر رہے اور یہیں سے ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب تک (۱۹۷۱ء) علی گڑھ ہی میں اپنے ذاتی مکان میں مقیم ہیں۔ اور ادبی مشاغل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اختر انصاری نے ۱۹۲۶ء میں شعر کہنا شروع کیا، اور ۱۹۳۲ء میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ روح" شائع کیا جو قطعات، غزلیات، اور نظموں پر مشتمل تھا۔ اس وقت کی دنیائے شعر و ادب میں اس مجموعے کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ اور لب و لہجے کی تازگی اور ندرت اسلوب کی بنا پر اس کو اردو شاعری میں ایک نئی آواز سے تعبیر کیا گیا۔ اس دور کے معتدد نقادوں نے اس کی پذیرائی میں قابل ذکر فراخ دلی سے کام لیا اور نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے ارباب نظر کی وہ تحریریں جو اس مجموعے کے بارے میں ان کے قلم سے نکلیں یا تنقیدی رائیں جن کا اظہار مختلف جرائد میں ان کی جانب سے ہوا۔ آج بھی اس خاموش شعری انقلاب کی شہادت دیتی

ہیں جس کا سرچشمہ اختر انصاری کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ روح" تھا۔ "نغمۂ روح" کی غزلیات میں غزل کا ایک نیا آہنگ اور غزل کے علامتی اظہار کے بارے میں ایک نیا رویہ سامنے آیا۔ جو دراصل مروجہ اسالیب بیان اور روایتی علائم و رموز سے اجتناب بلکہ انحراف کا رویہ تھا اور جو غزل کی آئندہ رفتار اور ارتقار پر دور رس اور دیرپا اثرات پیدا کرنے کا سبب بنا۔ اسی طرح "نغمۂ روح" کے قطعات گویا اولین نقوش تھے اس شاندار شعری کارنامے کے جس کو "اختر انصاری کے قطعات" کہا جاتا ہے۔ اور جس کی بدولت اردو شاعری میں قطعے کی صنف نے نئے وزن و وقار کے ساتھ ایک وقیع و معتبر اور منفرد اسلوب فارم کی حیثیت سے ایک مستقل مقام حاصل کیا۔

"نغمۂ روح" کی اشاعت کے بعد اختر انصاری کی شعری فکر نے مسلسل اور عہد بہ عہد ارتقائی منزلیں طے کیں اور ۱۹۷۱ء تک ان کے تقریباً دس شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے اس شعری مجموعوں کا ایک جامع و ضخیم انتخاب "دہان زخم" کے نام سے مرتب اور شائع کیا۔ جس کو اس دور کے اکثر نقادان کرام نے اپنے تبصروں اور مستقل تنقیدی مضامین میں گزشتہ پچاس سال کے چند بہترین شعری کارناموں میں سے ایک، اور خاص اس دور کا ایک نہایت وزن دار شعری مجموعہ قرار دیا۔ اختر انصاری کی تازہ ترین طویل نظم "وقت کی بانہوں میں" جو ایک طویل عمر کی شعری مشق اور گزشتہ چند سالوں کی عمیق شعری فکر کا ماحصل ہے حال ہی میں شایع ہوئی ہے اور دیکھنا چاہئے کہ کلاسیکی طرز اور جدید فکر کا یہ شاہکار یہ موجودہ دور کی اردو شاعری پر کن اثرات کو پیدا کرنے کا ضامن و نقیب ثابت ہوتا ہے۔

اختر انصاری شعر گوئی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی گامزن رہے ہیں انھوں نے ۱۹۳۳ء کے آس پاس اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور اس صدی کے چوتھے دہے میں ان کے افسانوں نے اردو کے اہم رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہو کر افسانے کے فن کو بھی ایک نئے موڑ سے روشناس کیا۔ اس وقت تک اردو میں واقعاتی افسانے کا چلن رہا تھا، اور اس کے دو دھارے ناول اور مختصر افسانہ دونوں صنفوں کے میدان میں رواں دواں تھے۔ ایک دھارا پریم چند اور ان کے معاصرین اور متبعین کے اسلوب سے عبارت تھا اور دوسرا راشد الخیری اور ان کے اہم رنگ کے لکھنے والوں کی روشنی سے۔ اختر انصاری نے اس مروجہ واقعاتی طرز سے ہٹ کر اور چیخوف اور دوسرے روسی افسانہ نگاروں، نیز انگلستان کے انشائیہ نگاروں کی تخلیقات سے متاثر ہو کر "تاثراتی" افسانے کا آغاز کیا اور بے پلاٹ کی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ مجموعی حیثیت

سے اختر انصاری کی افسانہ نگاری کو "اردو افسانے کا ایک نیا اسکول" قرار دیا گیا۔ اس نئے افسانوی دبستان کے واضح اثرات بعد کی افسانہ نگاری پر واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ اختر انصاری کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو ابھی منتظر اشاعت ہیں۔

شاعری اور افسانہ نگاری سے آگے بڑھ کر اختر انصاری نے تنقید اور تنقید فکر کے قافلے کی بھی رہنمائی کی۔ ترقی پسند تحریک کے عین ابتدائی سالوں میں ان کی تصنیف "افادی ادب" کو ترقی پسند نظریۂ شعر و ادب پر بہترین مقالہ تصور کیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ مسلسل اردو میں مارکسی تنقید اور عمرانیاتی زاویۂ نقد و نظر کی راہیں صاف کرنے میں منہمک رہے۔ ان کی "ایک ادبی ڈائری" جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کے چار سالوں کو محیط ہے اس سلسلے کی ایک نادر الاسلوب تصنیف ہے۔ بعد کی تنقیدی تحریریں اور مضامین متعدد تنقیدی مجموعوں اور مستقل تنقیدی تصانیف کی شکل میں چھپتے رہے ہیں، اور من حیث المجموع ادبی تنقید کے ایک پر وزن پر وقار دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ انشائیہ نگاری کے ذیل میں آنے والی اختر انصاری کی بعض تحریریں ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ اور اختر انصاری کی شگفتہ و شفاف نثر کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ "یادوں کے چراغ" اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہے۔

اردو ادبیات کے ان اہم شعبوں سے ہٹ کر اختر انصاری نے متعدد علمی موضوعات پر کام کیا ہے اور "تعلیم" نیز دیگر شعبہ ہائے فکر و نظر سے متعلق قابل قدر تصانیف پیش کی ہیں "غزل اور درس غزل" اور اس کی توسیعی شکل "غزل اور غزل کی تعلیم" ادبیات کی تدریس کے موضوع سے متعلق وہ اولین تصانیف ہیں جو اردو زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ تعلیم و تعلیم کے باب میں اختر انصاری کی انگریزی تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔

اختر انصاری کی انگریزی زبان کی تصانیف میں ANECDOTES FROM THE LIFE OF GHALIB خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ جس میں غالب کے بعض مطائبات کو انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال معنی کے دشوار گزار مرحلوں کو لکھنے والے نے جس کامیابی اور عمدگی سے سر کیا ہے اس کا اعتراف انگریزی جرائد کے کالموں میں بھی ہو چکا ہے۔

اخترانصاری اور ان کی ادبی فتوحات کے بارے میں کسی نقاد کا یہ کہنا غالباً مبالغہ نہیں کہ "اس دور کے شاید ہی کسی دوسرے مصنف نے ادب کی اتنی اصناف میں اور فنی معیاروں کی اس درجہ یکساں بلندی کے ساتھ تخلیقات و تصنیفات پیش کرنے کا امتیاز حاصل کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاکستان کے ہم عصر اردو شاعروں اور ادیبوں میں اخترانصاری کی حیثیت اس لحاظ سے قطعی منفرد ہے کہ انھوں نے شعر و ادب اور نظم و نثر کی جتنی متنوع اور مختلف اصناف میں لکھا ہے کسی دوسرے ادیب یا شاعر نے نہیں لکھا۔ ▢

اختر انصاری کے ادبی سفر کی روداد

(اربابِ نقد و نظر کی زبانی)

نیاز فتحپوری (مرحوم)

جناب اختر ملک کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی موجودہ فکر سے ان کے درخشاں مستقبل کا پتا چلتا ہے ..... اس مجموعے میں قطعات بھی ہیں اور منظومات بھی، غزلیں بھی ہیں اور متفرق اشعار بھی۔ لیکن ایک ذہین اخلاق اور فکر صحیح کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں ......

(لکھنؤ ۱۹۳۴ء)

مولوی عبدالحق (مرحوم)

.... اختر صاحب کے حق میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ سچے شاعر ہیں....

(اورنگ آباد، دکن ۱۹۳۴ء)

ڈاکٹر عابد حسین (مرحوم)

... اختر صاحب کا کلام بہت اچھا ہے اور وہ نوجوان شاعروں کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

(دہلی ۱۹۳۶ء)

جعفر علی خاں اثر (مرحوم)

حضرت اختر انصاری کو نغمۂ شباب کا شاعر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نئے دور میں اور نوجوان بھی یہ راگ الاپتے ہیں، مگر اختر صاحب کو جو شے دوسروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ ان کے مطالعے کی گہرائی ہے جو موضوعات کی سطحی رعنائیوں سے گزر کر ان کے اثرات اور کیفیات کو نمایا

کرتی ہے ... ان کے اصول شعر مغرب سے مستعار ہیں، تاہم ایک ایشیائی شاعر نے ان کی رہنمائی میں کامیابی ہی حاصل نہیں کی، بلکہ متعدد ایسے تخیلات کا اضافہ کیا جو مشرق و مغرب کے خوشگوار و مناعاً امتزاج کے باعث بالکل نئے اور اچھوتے معلوم ہوتے ہیں۔ مغربی خیالات پر ایک ایشیائی ذہن کے اجتہادانہ تصرف سے جو خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں " نغمۂ روح " میں جا بجا اس کی بہترین دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ... یہ ادعا بے جا نہ ہوگا کہ مغربی ادب سے جو شخص ناواقف ہو یہ انداز بیان اختیار یا وضع نہیں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی شاید مبالغہ آمیز ثابت نہ ہو کہ چاندنی کی تعریف میں اس سے بہتر کوئی مغربی نظم بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

(لکھنؤ ۱۹۳۷ء)

ڈاکٹر عندلیب شادانی (مرحوم)

... میری یہ پیش گوئی یاد رکھئے کہ وہ دن دور نہیں جب دورِ حاضر کے اساتذہ کی معمولی شاعری کا طلسم ٹوٹ جائے گا، ان کی نقالی کا پول کھل جائے گا، اور اربابِ ذوق اختر جیسے حقیقی شاعر کے لبریز صداقت کلام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے پیدا کریں گے اور سینوں سے لگا کے رکھیں گے۔

(ڈھاکا ۱۹۳۸ء)

فراق گورکھپوری (مرحوم)

... اختر صاحب کے یہاں عشقیہ جذبات سے تھرتھراتے ہوئے وہ قطعات ہیں جو ہمارے دھکتے دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کر دیتے ہیں اور ہماری سانس اور آواز رکی سی جاتی ہے۔ ان کا پٹیلا پن محتاج بیان نہیں۔ مغربی شاعری کا بھی لب دلجہ ان میں حلاوت کئے ہوئے ہے ....
اختر انصاری کے قطعات وہ اولین اشارے ہیں جو وقت کی انگلیاں دورِ حاضر کی طرف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ...

(الٰہ آباد ۱۹۳۹ء)

میراجی (مرحوم)

... میرا خیال ہے کہ جس طرح قدیم سنسکرت ادب میں اماروکی شاعری نے پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جا سکتے ہیں اسی طرح اردو کی موجودہ شاعری میں اختر انصاری نے اپنے شعری عمل سے اس نظریے کی تائید کی ہے ...

(لاہور ۱۹۴۱ء)

مکین احسن کلیم (مرحوم)

اختر انصاری نے بے حسی کے دور سے گزر کر ہیجان اور انتشار کے زمانے میں آنکھیں کھولی ہیں۔ داخلی زندگی کی تاریک پیچیدگیوں اور الجھنوں نے ان کے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی آگ مشتعل کر دی ہے۔ انھوں نے بیم خواہشوں اور تمناؤں کی بے پایاں خلش کو محسوس کیا ہے۔ ان کے ذہن میں زمانے کا غمناک احساس و ادراک تھرتھرا رہا ہے۔

اختر انصاری کی شاعری ایک ایسی حقیقت نگاری پر مبنی ہے جو شوخ، رنگین اور شگفتہ جذباتیت میں ابھری، پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ اس دور کی یادگار ہے جب عنفوان شباب بے انتہا طوفانی اور ہیجانی تھا۔ یاد ماضی، مناظر فطرت اور شوریدگی فکر و نظر نے ان کے جذبات اور خصوصاً غم محبت کو ایک بے پناہ اور اتھاہ شدت دے دی ہے۔ اپنی شخصیت کے انحطاط، طبیعت کی غم زدگی، پُر آشوب انجام کے خیال اور زندگی میں کسی ٹھوس اور مضبوط بنیاد کے نقدان نے ان کی شخصیت کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی شاعری اسی کچلی ہوئی شخصیت کی دل دوز کراہ ہے۔ ممکن ہے لوگ اس شاعری کو مریضانہ اور سقیم کہیں، لیکن شاعر کے مشتعل تخیل نے اس میں اتنا زور اور توانائی بھر دی ہے کہ اس میں ایک عجیب اور مخصوص عظمت نظر آتی ہے۔

آنے والی نسلیں اگر اختر انصاری کی شاعری میں روحانی سکون کے چھپے ہوئے خزانے نہ بھی پا سکیں تو کم از کم اس ہیجان اور انتشار کا بآسانی اندازہ لگا سکیں گی جو عصر حاضر میں جاری و ساری ہے۔ اختر انصاری کی شاعری کے عظیم الشان محل ان کی شخصیت کے کھنڈروں پر کھڑے ہیں۔

ان کے لہجے کی تلخی اور ترشی، ان کا طنز، ان کی قنوطیت ان کے خلوص کے بت۔ شوکت ۲۲۔ انھوں نے غم کو ایک لامحدود لچک، ایک نیا لہجہ اور تمدن، ایک عجیب گونج اور ا (علی گڑھ ۱۹۵۵ء)

انسانی ہوتے ہوئے بھی عامیانہ احساسات سے بلند معلوم ہوتا ہے

اختر انصاری کی شاعری ایک مسحور تخیل کے متلون اور ... ف ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر خود کو کھو کر پا لیا ہے اور ان کی شاعری سے ایک ایسے حسن کی کہ تمام تصنیفات کے پیش نظر اردو ہماری داخلی زندگی اور ٹھوس اور بھرپور مادے کو روشن اور منور کیا۔۔۔ جس طرح فارسی میں نامعلوم حقیقتوں کی راہ میں شمعیں جلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لہے، وہی کام اردو میں

بہر حال اختر انصاری کی شاعری کو صرف قبروں کا کتبہ یا شمع مزار کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ انداز بیان میں توانائی اور گرمی، احساسات میں نرمی اور شگفتگی، مناظر قدرت کے مسکراتے ہوئے مطالعے اور ان کی روح پر ایک عمیق اور غائر نظر میرے نزدیک ایک وسیع تر انسانیت کے تصور کے مترادف ہیں۔ کوئی شاعر صرف ذاتی ہجر و فراق اور انفرادی اندوہ و حرماں کے بل بوتے پر غم کو وہ لچک اور وہ لہجہ نہیں دے سکتا جو اختر انصاری کی شاعری میں ملتا ہے۔ اختر کا ہاتھ شاعری کی نبض پر کچھ اس طرح سے ہے کہ وہ وضع شدہ قوانین پر عمل کرتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت نہیں کھوتے ...

(الہ آباد ۱۹۴۵ء)

مسعود احمد قریشی

میں اختر کو دل کا شاعر کہتا ہوں۔ "آبگینے" کے ایک افق سے لے کر "روح عصر" کے دوسرے افق تک کوئی بھی ارتقائی تسلسل ہے تو وہ دل ہے۔ یہی چیز اختر کو آبگینوی دور میں فراری گروہ سے ممتاز کر رہی تھی اور یہی اب نئے ادب والے ترقی پسند گروہ میں اسے نمایاں کر رہی ہے۔ یہ دونوں گروہ ہر طرح سے مختلف ہوتے ہوئے ایک لحاظ سے مشترک رشتہ رکھتے ہیں ــــــ دماغی پیچ! اختر نے یہ دونوں قسم کی شاعری دماغ سے نہیں دل سے کی ہے۔ اختر کی رومانی شاعری میں جو چیز سب سے ممتاز نظر آتی ہے وہ اس کا داخلی انداز نظر ہے۔ "نغمۂ روح" "آبگینے" اور "روح عصر" کا ذہنی فاصلہ ۳۱-۱۹۳۰ اور ۴۵-۱۹۴۴ کا زمانی اور تاریخی فاصلہ ہے۔ اختر کی مخصوص ذہنی ترکیب اور افتاد کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ذہنی تبدیلی معجزے کے طور پر واقع نہیں ہوئی۔ اسے اپنی انقلابی مقام پر آنا ہی تھا۔ اس تبدیلی میں سب سے زیادہ ہاتھ تاریخ کی انقلابی رفتار کا ہے۔

اختر کے ہاتھ میں غزل بھی ایک انقلابی صنف سخن بن گئی ہے۔ اس کی غزلوں میں فیض اور
ظرائی ہیں ...
...دوراں" والی دورنگی نہیں۔ غزل اب اس کے لئے تھکے ماندے منفرد

میراجی (مرحوم) ...نہیں۔ بلکہ اس میں بھی ایک تند توانائی ہے۔ دیپک سی لپک جس سے
... میرا خیال ہے کہ جس ط... ...الق کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ اب یہ گھر کا بھیدی غزلیہ مضامین
حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ...روں کے چہرے سے جو اس ارتقائی عمل میں پیچھے رہ گئی ہیں اور
ہیں اسی طرح اردو کی موجود... ...روایت و تقدس کا حسین کفن پہنائے ہوئے ہیں اختر تقدیس کا نقاب
...ن دور کی غزلوں میں لوچ بھی ہے اور لپک بھی۔ لیکن یہ فولاد کی لوچ
کی ہے ...

اور لچک ہے۔ ان کی غزل اب ایسے مقام پر ہے جہاں نظم و غزل کی مصنوعی سرحدیں ختم ہو کر صرف ادبیت، صرف شعریات رہ جاتا ہے .....

(لاہور ۱۹۴۶ء)

کامل القادری

... اختر انصاری کا تغزل ایک طرف ۱۹۲۰ء کے شعرا سے اپنی الگ آواز، آہنگ تاثر اور لب و لہجہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ۱۹۳۵ء کے بعد کے شعراء کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ آج کل ناصر کاظمی کو غزل گو شعرا میں خاصی اہمیت دی جا رہی ہے اور کئی معیاری نقادوں نے اسے صاحب طرز اور نیا غزل گو گردانا ہے۔ یہ نقاد اگر غزل کا ارتقائی مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو وہ اس قدر غیر محتاط اور مضحکہ خیز رائے ہرگز نہ دیتے۔ اصل میں موجودہ دور کے غزل گو شعراء اختر انصاری سے تغزل کی لطافت اور شگفتگی کو اپنا رہے ہیں اور یہی چیز ناصر کاظمی کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن وہ شائستگی اور رکھ رکھاؤ نہیں ملتا جس کی اختر انصاری کی روایت قایم کی ہے ...

(کراچی ۱۹۵۴ء)

ڈاکٹر محمد حسن

اختر انصاری کے خالص رومانوی اور ہلکے پھلکے قطعات بھی اردو میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور پہلی بار اردو کے ایک شاعر نے قطعے کو اپنا امتیازی نشان بنایا ..... اختر انصاری ساغر اور روش دونوں کے مقابلے میں نئی نسل سے قریب تر ہیں۔ ان کے احساس اور اضطراب کا انداز کچھ مغرب کے رومانوی شاعروں کا سا ہے۔ وہ ایک جدید ذہن کی بے تابیوں کے داستان گو ہیں ...

(علی گڑھ ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

اختر انصاری اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے معروف ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار اور ایک سلجھے ہوئے نقاد ہیں .... ان کی تمام تصنیفات کے پیش نظر اردو زبان کا کوئی مورخ ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا... جس طرح فارسی میں خیام نے صرف اپنی رباعیات میں اپنی پوری شخصیت کو منتقل کر دیا ہے، وہی کام اردو میں

اختر انصاری نے قطعہ نگاری کے سلسلے میں کہا ہے۔ یہی ایک ایسا میدان ہے جس میں اب تک ان کا کوئی حریف نہیں۔ بعد میں فیض، مجاز اور ساحر نے بھی بعض اچھے قطعات لکھے، لیکن ان کے یہاں اس کی حیثیت محض منہ کا مزہ بدلنے کی ہے... اختر انصاری کی غزل گوئی ہماری مروجہ عشقیہ شاعری سے ہٹ کر اپنے اندر بعض نئے احساسات رکھتی ہے جس میں طرز بیان کی سجاوٹ کی بجائے ایک طرح کی رومانوی افسردگی اور آرزومندی ملتی ہے۔ بعد میں انھوں نے افسانہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور تنقید نگاری کو بھی اپنا لیا۔ ان کے افسانے ترقی پسند رجحان کے اولین نقوش ہیں جن میں سماجی زندگی کے پیچ و خم کا تجزیاتی اور فنکارانہ اظہار ہے۔ لیکن فن کے اعتبار سے بھی ان کے یہاں بہت تنوع ملتا ہے۔ وہ اردو کے ان چند افسانہ نگاروں میں ہیں جو افسانے کے حسن اور آداب سے واقفیت رکھتے ہیں ... اختر انصاری کی شاعری میں جو رومانی افسردگی ملتی ہے وہ ہمیں انیسویں صدی کے بعض انگریزی شعراء کی یاد دلاتی ہے۔ ان کا کلام بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعض اردو شعراء مثلاً جوش، اختر شیرانی، حفیظ، ساغر اور روش وغیرہ کے ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو اس کی نوعیت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اختر انصاری کے یہاں شبابیات کی پُرجوش لہر، بے باکی اور بلند آواز کی تیز موسیقی نہیں ملتی۔ ان کے یہاں آرزومندی اور تصور پرستی ہے، افسردگی، کسک اور ایک تحت نغمہ کی سی کیفیت ہے جو انھیں اردو کے دوسرے رومانی شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے انگریزی کے بعض رومانی شعراء کا انھوں نے شعوری طور پر بھی اس زمانے میں اثر قبول کیا اور کیٹس، شیلے اور بائرن وغیرہ کی جواں مرگی کو اپنا آئیڈیل بنایا... ان کے نئے قطعات میں فکر کے عنصر کے ساتھ ساتھ ایک تیکھا پن اور طنز کی ایسی دھار ہے جس کا سلسلہ خیام کی رباعیات سے ملتا ہے....

(علی گڑھ، ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر ابن فرید

خاموش گر سنجیدہ شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار اختر انصاری تشہیر اور پروپیگنڈے سے اس قدر دور رہتے ہیں کہ انھیں اپنی تحریروں کے جائز تعارف کا خیال بھی نہیں آتا۔ "مطالعہ تنقید" کا بھی یہی حشر ہوا۔ اختر انصاری کے تنقیدی مضامین کا یہ اس قدر اہم مجموعہ ہے کہ ہر معیاری اور موقر جریدے میں اس پر تبصرہ شائع ہونا چاہیے تھا۔ تنقید میں اختر انصاری کا ایک خاص

اسلوب ہے جو انتہائی سنجیدہ، مدلل اور دقیق ہے۔ ان کے یہاں وسیع مطالعہ اور مطالعے سے خاطرخواہ فائدہ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے۔ ادب ان کے لئے تفننِ طبع نہیں ہے۔ چنانچہ تنقید میں وہ نظریے کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ اس مجموعے میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران لکھے ہوئے پندرہ مقالات شامل ہیں۔ آخر میں مصنف کی مشہور کتاب "ایک ادبی ڈائری" کا انتخاب بھی شامل ہے۔

(علی گڑھ، ۱۹۶۶ء)

نظیر صدیقی

... اختر انصاری کی غزلیں اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ وہ اردو غزل کے رسمی عناصر سے بالکل پاک ہیں۔ ان کے یہاں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں سچے جذبے یا حقیقی تجربے کی عکاسی نہ کی گئی ہو۔ اختر انصاری نے رسمی عناصر سے پاک غزلیں اس دور میں کہیں جب غزل کا بڑے سے بڑا شاعر رسمی عناصر کے بغیر اپنی غزل مکمل نہیں کر پاتا تھا... (کراچی ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر وارث کرمانی

اختر انصاری نے "افادی ادب" میں ادب و شعر کا جو ترقی پسندانہ نظریہ پیش کیا تھا اور پھر "ایک ادبی ڈائری" جیسی نادر تصنیف میں مارکسی تنقید کے جو نمونے فراہم کئے تھے وہ تمام ادبی و فنی تصورات "روحِ عصر" کے مشمولات میں مجسم و متشکل ہوگئے ہیں... غالباً یہ کہنا ادعائے بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند شاعری کے جو معیار اختر انصاری نے وضع کئے ان کی بہترین کارفرمائی خود انہیں کے ترقی پسندانہ کلام میں ہمیں ملتی ہے۔ نیز یہ کہ ترقی پسند آرٹ کے کامیاب نمونے جتنی تعداد میں اور جس وافر مقدار میں اختر انصاری کے یہاں ملتے ہیں کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کے یہاں نہیں ملتے ..... ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ اختر انصاری کی زندگی ایک نئے اور اہم موڑ سے آشنا ہوتی۔ یہ ایک ذہنی دھچکا تھا جس نے ان کے فکر و تصور کو بعید و نامعلوم پہنائیوں کی طرف متوجہ کیا اور تمام کائنات مع اپنے خالق کے انہیں ناقابلِ فہم اور ناشدنی معلوم ہونے لگی۔ شعری صورت میں اس کا ردِ عمل ان کے یہاں ایک بلند و برتر سطح پر نمودار ہوا جس کی مثال اردو شاعری میں غالب کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ فارسی ادب میں فکر و تصور کی یہ سطح خیام کے حصے میں آئی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اختر انصاری

کا فکری اسلوب اور لب و لہجہ غالب کی بہ نسبت خیام سے قریب تر ہے ..... انسان کی ازلی تقدیر دنیا کی عظیم شاعری کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اختر انصاری نے اس موضوع پر اپنی قوت شعری کا بڑا حصہ صرف کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی تخلیقات بہترین متفکرانہ شاعری کی رفعتوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں.... غم ذات اور غم کائنات کے خانوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ زندگی اور زمانے کے بارے میں من حیث المجموع اختر انصاری کا رویہ کیا ہے تو ان کو محض قنوطی یا محض رجائی قرار دینا ممکن نہ ہوگا۔ نرا متشکک یا خالی خولی ابیقوری لذت پرست کہنا اور بھی مشکل ہوگا۔ ان کے یہاں لاادری اور ارتیابی فکر جگہ جگہ ملتی ہے لیکن زندگی اور زندگی کے لذائذ اور مظاہر سے گہری محبت اس کو کبھی ہمہ گیر حاوی رجحان نہیں بننے دیتی۔ دراصل ان کا رویہ ایک مرکب اور مخلوط قسم کی چیز ہے جو ان کی پہلودار شخصیت اور تہ دار فکر کی پیداوار ہے۔ چنانچہ نہ صرف ان کے قطعات میں بلکہ آخری دور کی غزلوں اور نظموں میں ہم اندوہ و نشاط اور قنوطیت و رجائیت کے ایک عجیب و غریب مرکب سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ شاید وہ رجائیت ہے جو قنوطیت کے بطن سے جنم لیتی ہے اور وہ کیف و نشاط ہے جو اندوہ و الم کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے...

(علی گڑھ ۱۹۷۰ء)

ڈاکٹر محمود الٰہی

اختر انصاری ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اس کے نظریات کو انھوں نے صدق دل سے قبول کیا۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری اور شخصیت کو اس تحریک میں ضم ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے اپنی انفرادیت ہر جگہ اور ہر حال میں قائم رکھی۔ انھوں نے ہنگامی نعروں اور ادبی صداقت کے فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ اسی لئے ان کی شاعری ہمیشہ شاعری ہی رہی انھوں نے رومانیت سے ذوق اظہار سیکھا، ترقی پسندی سے جرارت اور حرارت حاصل کی اور کائنات کے مطالعے اور مشاہدے سے فلسفیانہ انداز نظر پایا۔ اور پھر ان عناصر کے امتزاج سے اس شاعری کا نمونہ پیش کیا جو ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔

(گورکھپور ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر مغنی تبسم

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو کے جن ادیبوں، شاعروں اور نقادوں

نے ترقی پسند تحریک کی صحت مند نشو و نما اور نظریہ سازی میں اہم حصہ لیا ان میں اختر انصاری کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی طرح اختر انصاری نے اپنی تنقیدی نگارشات میں ادب اور زندگی کے درمیان پائے جانے والے فطری اور اٹوٹ رشتوں کی نشاندہی کر کے ادب کی جس افادیت پر زور دیا تھا وہ بڑی حد تک اس کی ماہیت سے مطابقت رکھتی تھی۔ اسی تنقیدی شعور کی رہنمائی میں اختر انصاری نے تخلیقی کام سرانجام دیا۔ ان کے نظریے اور عمل میں گہری گہری موانست پائی جاتی ہے.... اختر انصاری نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا افسانہ نگار۔ دونوں اصناف میں انھوں نے جو تخلیقی شاہکار پیش کئے ہیں وہ یکساں قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ انھوں نے جس صنف کو چھوا اس پر اپنے اسلوب اور شخصیت کی چھاپ لگا دی۔ جدید اردو ادب کو اختر انصاری کی جو دین رہی ہے اسے کوئی مورخ یا نقاد نظرانداز نہیں کر سکتا.....

(حیدر آباد ۱۹۷۹ء)

اختر انصاری کی تصانیف

۱۔ نغمۂ روح (قطعات، غزلیات اور نظمیں)	اشاعت اوّل	۱۹۳۲ء
۲۔ اندھی دنیا اور دوسرے افسانے (مختصر افسانے)	"	۱۹۳۹ء
۳۔ نازو اور دوسرے افسانے (مختصر افسانے)	"	۱۹۴۰ء
۴۔ آبگینے (قطعات)	"	۱۹۴۱ء
۵۔ افادی ادب (تنقید)	"	۱۹۴۱ء
۶۔ خونی اور دوسرے افسانے (مختصر افسانے	"	۱۹۴۳ء
۷۔ خوناب (غزلیات)	"	۱۹۴۳ء
۸۔ خندۂ سحر (نظمیں)	"	۱۹۴۳ء
۹۔ ایک ادبی ڈائری (تنقید)	"	۱۹۴۵ء
۱۰۔ روحِ عصر (قطعات، غزلیات اور نظمیں)	"	۱۹۴۵ء
۱۱۔ لو ایک قصہ سنو (مختصر افسانے)	"	۱۹۵۳ء
۱۲۔ انتخاب اختر انصاری (منتخب کلام)	"	۱۹۵۰ء
۱۳۔ یہ زندگی اور دوسرے افسانے (منتخب افسانے	"	۱۹۵۸ء
۱۴۔ غزل اور درسِ غزل (تعلیم)	"	۱۹۵۹ء
۱۵۔ بادۂ شبانہ (منتخب کلام)	"	۱۹۶۱ء
۱۶۔ حالی اور نیا تنقیدی شعور (تنقید)	"	۱۹۶۲ء
۱۷۔ STUDIES IN LANGUAGE AND LANGUAGE TEACHING (تعلیم)	"	۱۹۶۲ء
۱۸۔ ٹیڑھی زمین (قطعات)	"	۱۹۶۳ء
۱۹۔ سرورِ جاں (غزلیات)	"	۱۹۶۳ء
۲۰۔ مطالعہ و تنقید (تنقید)	"	۱۹۶۵ء
۲۱۔ A BACKGROUND TO EDUCATIONAL THEORY (تعلیم)	"	۱۹۶۵ء

۲۲۔ پرِطاؤس (منتخب قطعات)	اشاعت اول	۱۹۶۵ء
۲۳۔ چند نظمیں (نظمیں)	"	۱۹۶۶ء
۲۴۔ درد و داغ (مثنوی)	"	۱۹۶۷ء
۲۵۔ شعلہ بجام (رباعیات)	"	۱۹۶۸ء
۲۶۔ دامنِ زخم (منتخب شاعری)	"	۱۹۷۱ء
۲۷۔ ANECDOTES FROM LIFE OF GHALIB (مطائبات)	"	۱۹۷۲ء
۲۸۔ شعلہ بکف (منتخب رباعیات)	"	۱۹۷۳ء
۲۹۔ روحِ نغمہ (ہندی) (منتخب قطعات)	"	۱۹۷۴ء
۳۰۔ غزل کی سرگزشت (تنقید)	"	۱۹۷۵ء
۳۱۔ دلّی کا روڑا (سوانح)	"	۱۹۷۷ء
۳۲۔ وقت کی بانہوں میں (طویل نظم)	"	۱۹۷۹ء
۳۳۔ غزل اور غزل کی تعلیم (تعلیمات)	"	۱۹۷۹ء
۳۴۔ تعلیم، سماج اور کلچر (تعلیمات)	"	۱۹۷۹ء

اندھی دنیا اور دوسرے افسانے

مطبوعہ مکتبۂ 'جہاں نما' دہلی ۱۹۳۹ء

۱۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ (۱۹۳۴ء)
۲۔ ستارہ (۱۹۳۵ء)
۳۔ یوں بھی ہوتا ہے (۱۹۳۵ء)
۴۔ اسکول (۱۹۳۶ء)
۵۔ اٹھارویں صدی کا ظلم (۱۹۳۶ء)
۶۔ اسپتال (۱۹۳۶ء)
۷۔ متمدن دنیا کے غیر متمدن انسان (۱۹۳۶ء)
۸۔ بانو (۱۹۳۶ء)
۹۔ ایک شام (۱۹۳۶ء)
۱۰۔ ننھا بھکاری (۱۹۳۶ء)
۱۱۔ ڈپٹی صاحب (۱۹۳۷ء)
۱۲۔ ایک سبق (۱۹۳۷ء)
۱۳۔ ایک ملاقات (۱۹۳۷ء)
۱۴۔ چند خطوط (۱۹۳۷ء)
۱۵۔ دلّی کی سیر (۱۹۳۷ء)
۱۶۔ بھوک (۱۹۳۷ء)
۱۷۔ اندھی دنیا (۱۹۳۸ء)
۱۸۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ (۱۹۳۸ء)
۱۹۔ گرمیوں کی ایک دوپہر (۱۹۳۸ء)
۲۰۔ خام مواد (۱۹۳۸ء)
۲۱۔ جرائم پیشہ لوگ (۱۹۳۸ء)
۲۲۔ پروفیسر صاحب (۱۹۳۸ء)
۲۳۔ مظلوم (۱۹۳۸ء)

نازو اور دوسرے افسانے

مطبوعہ مکتبۂ 'جہاں نما' دہلی ۱۹۴۰ء

۱۔ "ببیں تفاوتِ رہ" (۱۹۳۴ء)

۲۔ ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا (۱۹۳۴ء)
۳۔ میرے بچوں کی قسمت (۱۹۳۵ء)
۴۔ نازو (۱۹۳۰ء)
۵۔ دوست کی بیوی (۱۹۳۶ء)
۶۔ بزدل (۱۹۳۶ء)
۷۔ وہ کہاں ہے؟ (۱۹۳۶ء)
۸۔ زبیدہ (۱۹۳۹ء)
۹۔ سید صاحب (۱۹۳۸ء)
۱۰۔ بیرسٹر صاحب (۱۹۳۹ء)
۱۱۔ کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی (۱۹۳۹ء)
۱۲۔ زینت (۱۹۴۰ء)
۱۳۔ کم نصیب (۱۹۴۰ء)
۱۴۔ جیسے کو تیسا (۱۹۴۰ء)

عرفی اور دوسرے افسانے

مطبوعہ مکتبہ اردو، لاہور (۱۹۴۳ء)

۱۔ عرفی (۱۹۳۶ء)
۲۔ نفرت (۱۹۳۹ء)
۳۔ فریب (۱۹۳۹ء)
۴۔ گونگا (۱۹۳۹ء)
۵۔ بھول (۱۹۴۰ء)
۶۔ لو ایک قصہ سنو! (۱۹۴۱ء)
۷۔ دعا (۱۹۴۱ء)
۸۔ شہزادہ (۱۹۴۱ء)
۹۔ اٹھارہ آنے (۱۹۴۱ء)
۱۰۔ ایک واقعہ (۱۹۴۱ء)
۱۱۔ دریا کی سیر (۱۹۴۲ء)

غیر مطبوعہ افسانے

۱۔ مذاق (۱۹۴۰ء)
۲۔ تیسری ملاقات (۱۹۴۶ء)
۳۔ وہ عورت (۱۹۴۶ء)
۴۔ ایک نہ شد دو شد (۱۹۶۹ء)
۵۔ غیر مرئی مہمان (۱۹۶۹ء)
۶۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی (۱۹۶۹ء)
۷۔ ازلی بدنصیب (۱۹۶۹ء)
۸۔ دو پیشن گوئیاں (۱۹۷۰ء)
۹۔ ایک شخص (۱۹۷۱ء)

حبیب تنویر
نیا تھیٹر، L-15، بیر سرائے
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

پہاڑی ندی

کہا تھا مجھ سے ندی نے
میں جاوداں ہوں مرا حسن جاوداں ہے
میں جاوداں مرے جذبات جاوداں ہیں

عجیب شان سے اٹھلا کے بہہ رہی تھی
قدم قدم پہ اٹھاتی فضول کا طوفان
کبھی چٹانوں کے سر سے یونہی نکل جاتی
بچھے تھے بیچ پہ کتنے ہی جھاڑ اور پہاڑ
ان ہی کے بیچ میں غرّا کے بہہ رہی تھی ندی
کہیں تو سوتے ہوئے پتھروں کو ٹھکراتی
کہیں پہ گھاس کی پتی کو دیکھ رک جاتی
کہیں پہ گھوم کے ہلکی سی ایک جنبش سے
خود اپنے آپ کو بس دیکھتی ہی رہ جاتی
خود اپنے حسن پہ اترا کے بہہ رہی تھی ندی

کہا تھا مجھ سے ندی نے
اسی ندی نے کہا تھا
نظر اٹھا کے ذرا میرا حسنِ عریاں دیکھ
مری جبیں کے ستارے
ابھار میرے تنفس کا لونگ کی یہ لپک
لپک جھپک مری بغلوں کی
یہ مرے کھنچے ہوئے ابرو مرا کماں سا جسم
نشیب وادیٔ فرحت کا یہ گلاب
لباس و تار مرے جسم و جاں کا نس تو دیکھ
اتر کے دیکھ میں تیری ہوں

میں آج تیری ہوں، کل تیری ہوں، سدا تیری
یہی ندی نے کہا تھا
مری ندی نے یہی تو کہا تھا

مگر وہ چھوٹی سی بپھری ہوئی پہاڑی ندی
وہ جھاڑ اور وہ پہاڑ
نظر کہیں نہیں آتے
وہ جنگلات خود اک ناز و تمکنت کی مثال
وہ سب نگاہ سے مستور ہو گئے ہیں آج

ہوا کچھ ایسا کہ پہلے تو کٹ گئے جنگل
درخت کٹتے ہی کٹتے ندی بھی سوکھ گئی
ندی کے سوکھتے ہی مٹ گئی جگہ کی شناخت
زمیں پہ بیٹھ گیا غرور پتھروں کا دماغ
طلسم ٹوٹ گیا
بہار ختم ہوئی

مگر ندی نے کہا تھا
میں جاوداں ہوں مرا حسن جاوداں ہے
میں جاوداں مرے جذبات جاوداں ہیں

مرے بدن میں ندی کا بہاؤ آج بھی ہے
خمار موجوں کا ہے آج بھی رگوں میں نہاں
مگر وہ چھوٹی سی بپھری ہوئی پہاڑی ندی
کہیں نظر نہیں آتی

عبدالصمد

مکالمے اور مرحلے

پہلا مکالمہ

دستک!
خاموشی لیکن ــــ زندگی!
دستک!
کون ــــ؟
گوتم بابو ہیں۔؟
نہیں ہیں!
کہاں گئے ہیں۔؟
کمپنی میں ہڑتال ہونے والی ہے نا، اس لئے یونین کے جلسے میں گئے ہیں۔
آئیں تو کہہ دیجئے گا کہ دو ورکلسٹ بنانے والے آئے تھے۔

مرحلے

(۱)

کمپنی کے اعلیٰ عہدیدار اور وہ سبھی افسران جمع تھے جو ہڑتال کی دست رس سے باہر تھے۔
سب سے پہلے تو یہ دیکھا گیا کہ کمپنی میں جو ہڑتال کی گئی ہے، اس کی نوٹس مقررہ سرکاری مدت کے مطابق دی گئی ہے یا نہیں۔ اس سے مطمئن ہو کے چند ایک اہم فیصلے کئے گئے جو سب کے سب کمپنی کے مفاد میں تھے۔
سرکار کو ہڑتال کی باقاعدہ اطلاع دینے اور ضلع افسران سے تحریری طور پر درخواست

کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ کمپنی کی حفاظت کے لئے مناسب اقدامات کریں اور توڑ پھوڑ کے پیش نظر ہڑتالی لیڈروں کو گرفتار کرنے کا جواز پیدا کریں۔ کمپنی کے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے۔

اس کے بعد طے کیا گیا کہ کام نہیں تو پیسہ نہیں، کے اصول پر سختی سے عمل کیا جائے تاکہ اس کے نتیجے میں گھروں میں روٹیاں نہیں پکیں اور روٹیاں نہیں پکیں گی تو سر پر چڑھا ہوا ہڑتال کا بھوت اتر آنے کے لئے مچل اٹھے گا۔

پیسہ، عہدہ، عیش وعشرت اور جو بھی ممکن ہو، اس کی جھلک دکھا کر ہڑتالی لیڈروں کو توڑنے کی کوشش کی جائے، ملازمین پر بھی یہ محنت کی جائے۔

بات چیت کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا جائے اور بات چیت کو خوب طول دیا جائے تاکہ ہڑتال کا دم ٹوٹنے لگے ـــــ اس ٹوٹتے ہوئے دم پر ہر وقت نگاہ رکھی جائے۔

عارضی ملازمین کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے کہ موقع بھی ہے، مصلحت بھی ہے۔

اتنا کچھ طے ہو جانے پر بڑا افسر اٹھ گیا ـــــ میٹنگ برخاست ہوئی۔

(۲)

صوبائی حکومت نے کمپنی کی درخواست کو ایک نہیں، دونوں کانوں سے سنا اور ضلع افسران کو ہدایات جاری کر دیں۔ ضلع مجسٹریٹ نے انتظامیہ اور پولس کے حکام کی میٹنگ بلائی جس میں سرکاری ہدایات اور کمپنی کی درخواست کی روشنی میں بہت سے مفید فیصلے کئے گئے جو سب کے سب سرکاری مفاد میں تھے۔

کمپنی کے آس پاس دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا گیا اور اہم مقامات پر پولس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ ہڑتالی لیڈروں کی گرفتاری کا فی الحال کوئی جواز نہیں تھا لیکن ان پر کڑی نگاہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ وہ ملازمین کو بھڑکانے اور بہکانے جیسے جرائم کے مرتکب ہوں اور سرکار اپنا فرض پورا کرے۔

کمپنی سے ہر وقت تال میل بنائے رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ لا اینڈ آرڈر کا کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تو ضروری کارروائی کی جا سکے۔

خفیہ کے افراد کو چوکس اور ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا گیا، نیز ان سے منٹ منٹ اور سکنڈ سکنڈ کی اطلاعات طلب کی گئیں۔

حزب مخالف کے لیڈروں کے جلسے میں یہ طے کیا گیا کہ ہڑتال کی بہ بانگ دہل حمایت کی جائے اور کمپنی کی سخت مذمت کی جائے اور سرکار کو کمپنی سے سازباز کرنے کے سلسلے میں ملوث بتایا جائے۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مزدوروں کی حمایت میں وہاں کا دورہ کیا جائے اور ضرورت پڑے تو جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے سے بھی ہچکچایا نہیں جائے۔

طے کیا گیا کہ مزدوروں کی مالی امداد کے لئے ایک فنڈ کا اجرا کیا جائے تاکہ وہ کسی قسم کی لالچ یا کمزوری میں نہ آجائیں۔

نہ جانے یہ سوال کیسے اٹھ گیا کہ جب ہم لوگ سرکار میں تھے تو اس طرح کی ہڑتال کو سختی سے کچل دیا گیا تھا اور اسی قسم کا مزدور مخالف رویہ اختیار کیا گیا تھا لیکن یہ سوال ہوا ہی میں رہ گیا ——— شاید سوال اٹھانے والا کوئی بہت ہی غیر اہم شخص تھا۔

(۴)

سرکاری جماعت کے جلسے میں ہڑتال سے پیدا شدہ صورت حال پر بہت ہی سنجیدگی سے غور و خوض کیا گیا اور طے کیا گیا کہ ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ جس سے مزدور بھی نہ بگڑیں اور کمپنی بھی ناراض نہیں ہو۔ مزدور ووٹ دیتے ہیں اور کمپنی پیسے۔ جمہوریت کے یہ دو ایسے پہیے ہیں کہ ان میں ایک اگر ٹوٹ جائے تو جمہوریت کی گاڑی وہیں پر ٹھپ ہو جائے، اس لئے ایسی پالیسی بنائی جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

کمپنی سے بات چیت کرنے اور جائز مطالبوں کو مان لینے کی درخواست کی گئی اور مزدوروں سے اپیل کی گئی کہ وہ تخریبی کارروائیوں سے باز رہیں اور اپنے مطالبات کے لئے جمہوری طریقہ کار اختیار کریں راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو یاد کر کے ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی گئی۔

سرکار سے بھی اپیل کی گئی کہ وہ ہڑتال کو ختم کرانے کے لئے ضروری کارروائی کرے ——— واضح رہے کہ اس جلسے میں کئی وزیر بھی موجود تھے اور تمام تجویزیں انھوں نے ہی پیش کرنے کی زحمت کی تھیں لیکن یہاں ان کی حیثیت جماعت لیڈروں کی تھی۔

(۵)

یونین کے جلسے میں اس بات پر اظہار اطمینان کیا گیا کہ توڑنے اور لالچ دینے کی ہر کوشش ناکام ہوئی ہے اور ہڑتال سو فی صد کامیاب ہے۔ اگرچہ مزدوروں پر ہڑتال سے معاشی زور پڑ رہا ہے لیکن حوصلے بلند ہیں اور آئندہ بھی بلند رہیں گے۔

فیصلہ کیا گیا کہ آپس میں چندہ کر کے ایک فنڈ قائم کیا جائے تاکہ کسی ہڑتالی کو ناگہانی ضرورت درپیش ہو تو اس کی فوری مدد کی جا سکے۔ فنڈ تو اسی وقت قائم ہو گیا لیکن اس وقت اس میں گیارہ روپے

پچاس پیسے سے زیادہ نہ آسکے۔ اگرچہ یونین کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اڈیٹوریل اسٹاف کی اخبار کے سرمایہ دار مالک کے ساتھ چائے پر ایک ملاقات تھی۔ ہڑتال کا ذکر آیا تو اڈیٹر نے مالک کو بتایا کہ اخبار نے ایسی پالیسی اختیار کی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کمپنی کو بھی شکایت کا موقع نہ ملے کہ اشتہارات دینے میں وہ ہمیشہ بازی لے جاتے ہیں اور مزدور بھی ناراض نہ ہوں کہ وہ ایک وقت کا فاقہ کر سکتے ہیں لیکن اخبار خریدنا اور پڑھنا بند نہیں کر سکتے۔ ہڑتال کے موقع پر اخبار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حکومت کی، کمپنی کی، ہڑتال کی اور خود ان کی خبر اخبار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ اخبار کے مالک نے اس پالیسی پر خوشی کا اظہار کیا، کچھ کارآمد مشورے دیئے۔ اڈیٹوریل اسٹاف کی تعریف کی اور مزید ہوشیار رہنے کی رائے دے کر آئندہ اس سے بھی زیادہ خوشگوار ملاقات کا وعدہ کرکے اٹھ گیا۔

(۷)

یونین کے لیڈروں کی انڈرگراؤنڈ میٹنگ تھی جس میں سب سے پہلے ہڑتال کا جائزہ لیا گیا اور اسے اطمینان بخش پاکر اسے مزید عزم اور حوصلے کے ساتھ جاری رکھنے کا اعادہ کیا گیا۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہڑتالی ملازمین چونکہ روزمرہ کام کرنے اور روز پیسہ خرچ کرنے والے لوگ ہیں، لہذا ہڑتال سے ان پر جو کچھ بیت رہی ہے، اس کے لئے کچھ کیا جائے۔ طے کیا گیا کہ یونین کے پاس جو پیسے ہیں، ابھی وہی کام میں لائے جائیں، کچھ قرضوں سے کام چلایا جائے۔ یوں سنہرے کل کے لئے کچھ تو قربانی دینی ہی ہوگی ــــــ اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ یونین کے لیڈران بہ نفس نفیس ان مزدوروں کے ہاں جائیں اور تشفی و تسلی کے الفاظ کے استعمال میں ہرگز کسی قسم کی کنجوسی نہ کی جائے۔

(۸)

سنار کی دوکان پر آئے ہوئے اس کے ایک دوست نے بہت سارے منگل سوتر رکھے دیکھے تو ان کی بابت دریافت کر بیٹھا جس پر سنار نے ہنس کر کہا کہ بہت سستے مل گئے اس لئے اتنے جمع کر لئے۔ دوست سمجھا کہ بزنس کا معاملہ ہے۔ کچھ الٹ پھیر ہو گیا ہوگا۔

(۹)

اخبار کا کارٹونسٹ، کئی کارٹون بنا کر ایڈیٹر کو دکھا چکا تھا لیکن ایڈیٹر کو کوئی پسند ہی نہیں آیا تھا۔ دراصل وہ اپنے اخبار کے لئے ایسا کارٹون چاہتا تھا جس کی ایک جھلک سے وہ تمام باتیں سامنے آجائیں جنہیں وہ اپنے اخبار میں نہیں لکھنے کے لئے مجبور تھا۔ اس کے اندر کا صحافی اسے ہمیشہ ٹھوکے دیتا

رہتا تھا لیکن اس اندر باہر کی جنگ میں فتح ہمیشہ باہر کی ہوتی تھی جس کے پاس مصلحتوں کے ان گنت خوشنما لباس موجود تھے۔ کارٹونسٹ اپنی سی کوشش کئے جارہا تھا لیکن ایڈیٹر کے ذہن میں کیا تھا، یہ بات اس پر واضح نہیں ہورہی تھی۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کرکے ایک کارٹون بنادیا کہ اگر یہ بھی پسند نہ آیا تو وہ اب مزید کوشش نہیں کرے گا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ وہ کارٹون ایڈیٹر کو پسند آگیا اور کارٹونسٹ نے اطمینان کی سانس لی۔

کارٹون میں جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ایک لہولہان فاختہ کو نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، اس کے چاروں طرف نالیں اٹھی ہوئی تھیں ـــــ نالوں کے باگ ڈور کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔

کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داران، مینجنگ ڈائرکٹر کے نہایت ہی خوبصورت بنگلے کے سجے سجائے باغ میں بہت ہی آرام دہ کرسیوں پر آدھے لیٹے، آدھے بیٹھے RELAX کے موڈ میں تھے۔ نوکر چاکر ٹرے میں مختلف قسم کے مشروب لئے گھوم رہے تھے۔

تقریب بہر ملاقات یہ تھی کہ کمپنی میں غیر معینہ مدت کی ہڑتال نے طول کھینچ لیا تھا جس سے یہ بات محسوس کی گئی تھی کہ اس طوالت نے مزدوروں کی کمر توڑ دی ہے اور اب وہ ہڑتال ختم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اگرچہ مزدوروں کی طرف سے اس قسم کی بات نہیں آئی تھی لیکن اپنی دور اندیشی اور ہوشیاری کی بنا پر کمپنی کے عہدہ داروں نے یہ بات محسوس کرلی تھی اور اب اس لئے جمع تھے کہ کیا کیا جانا چاہیئے۔

طے کیا گیا کہ بات چیت کا دروازہ کب بند کیا جائے اور رویہ ایسا اختیار کیا جائے کہ بات چیت میں امید کا پہلو نمایاں ہو اور مزید طوالت پیدا ہو تاکہ وقت خود اس میں دخل دینے پر مجبور ہو۔

مطالبات کے سلسلے میں کمپنی کی جو پالیسی تھی، اسے برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور کچھ ایسے مطالبات کو مان لینے کی منظوری دے دی گئی جن سے کمپنی کی بنیادی پالیسی پر کوئی حرف نہیں آتا اور غالباً مزدوروں نے بھی زیب داستان ہی کے لئے انھیں مطالبات میں شامل کیا تھا۔

فیصلہ کیا گیا کہ مزدوروں کے سلسلے میں اختیار کئے گئے سخت رویے میں لچک پیدا کی جائے تاکہ جنگ کی فضا ختم ہو سکے اور مفاہمت کے خدوخال ابھر سکیں۔

مزدوروں کے لیڈروں کو ہر طرح سے ملا کر رکھنے کا عزم کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک

ایسی کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو انفرادی طور پر لیڈروں کے گھروں، ان کے روزمرہ کے خرچ، ان کے بچوں کی پڑھائی لکھائی کے احوال، ان کی اور ان کی بیوی بچوں کے عادات و اطوار اور ان کی کمزوریوں کے بارے میں ایک مکمل فائل ترتیب دے۔ قبل ایسا نہیں ہونے پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ ذمہ داریاں تقسیم کی گئیں۔

ہڑتال واپس لینے کی صورت میں کاٹے گئے پیسوں کو ادا کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور مزدوروں کے تئیں کمپنی کے ایثار اور خدمات پر مشتمل ایک کتابچہ چھپوا کر فوری طور پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا۔

میٹنگ بہت ہی پُر امید اور خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی۔

(۱۱)

ضلع کے اعلیٰ افسران نے اپنی ایک میٹنگ میں ہڑتال کا جائزہ لیا اور کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر کے اس خط پر بھی غور کیا گیا جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ چونکہ مزدوروں کے رویے میں خوشگوار لچک آ رہی ہے اس لئے سختی کو ترک کر دیا جائے۔ ضلع مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ تبدیلی آ رہی ہے یا نہیں، یہ دیکھنا ان کا کام نہیں ہے۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ہڑتال ابھی جاری ہے۔ ہڑتال کے ختم ہو جانے پر ہی وہ اپنے رویے میں اس کی مناسبت سے تبدیلی لائیں گے۔ انتظامیہ اور پولس نے اپنے طور پر جو اقدامات کئے تھے۔ ان کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اس لئے کہ لا اینڈ آرڈر کا تعلق سرکار سے ہوتا ہے۔ کمپنی سے نہیں ہوتا۔ اس کی ناکامی یا کامیابی کا سہرا سرکار کے سر بندھتا ہے۔

(۱۲)

حزب مخالف کے لیڈروں کے جلسے میں کمپنی اور سرکار کی پھر مذمت کی گئی اور ہڑتالی مزدوروں سے پوری حمایت اور مدد کا اعادہ کیا گیا۔ کمپنی سے کہا گیا کہ وہ فوراً مطالبات کو تسلیم کر کے ہڑتال ختم کرانے کے لئے آگے بڑھے۔ سرکار پر زور دیا گیا کہ وہ کمپنی کو جھکنے پہ مجبور کرے اور دھمکی دی گئی کہ اگر جلد ہی معاملات حل نہیں کئے گئے تو ہم لوگ مزدوروں کی حمایت میں بھوک ہڑتال کریں گے اور مزدوروں کے کاز کے لئے جان دینے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔

(۱۳)

سرکاری جماعت کے جلسے میں، جس میں حسب معمول کئی وزیر بھی موجود تھے، ہڑتال کے

تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ حزب مخالف اور کچھ اخبارات سے ذریعہ ہڑتال کے سلسلے میں سرکار پر بے جا اعتراضات کی سخت مذمت کی گئی۔ کمپنی سے اپیل کی گئی کہ وہ مزدوروں کے تئیں ہمدردانہ رویہ اختیار کرے۔ مزدوروں سے درخواست کی گئی کہ وہ حالات کے پیش نظر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں۔ برسر اقتدار پارٹی کا مزدور طبقے کے لئے جو ہمدردی اور خلوص کا تواریخی رویہ رہا ہے، اس کو دہرایا گیا اور آئندہ بھی اس کو روا رکھنے کے عزم کا ارادہ کیا گیا۔

(۱۴)

یونین کے جلسے میں ہڑتال کی طوالت پر اظہار تشویش کیا گیا اور کمپنی کے رویہ کی سخت مذمت کی گئی۔ مزدوروں کو ان کے بے مثال ایثار اور قربانی پر مبارکباد دی گئی کہ ان کی اس تحریک سے دنیا کے مزدوروں کے جدوجہد کی نئی راہیں واضح ہوئی ہیں اور ان کے اندر ایک نیا جذبہ، ایک نئی زندگی پیدا ہوئی ہے۔

اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ اگر کمپنی اپنے رویے میں لچک لاتی ہے تو مزدور بات چیت کے لئے ہمیشہ تیار ہیں۔ مزدور خود چاہتے ہیں کہ ہڑتال ختم ہو تاکہ ملک کی ترقی میں وہ اہم کردار ادا کر سکیں لیکن اس کے لئے باوقار راستہ نکالنا کمپنی کا فرض ہے۔

(۱۵)

دھویں، مسالے اور کھنک سے آلودہ فضا میں، کافی ہاؤس میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ موضوع بحث کمپنی میں ہونے والی ہڑتال تھی لیکن یہ بات نمایاں تھی کہ اس سلسلے میں اتفاق رائے ہرگز نہیں تھا کچھ لوگ کمپنی پر الزام ٹھہرا رہے تھے کہ اس نے مزدور مخالف رویہ اختیار کر رکھا ہے کیوں کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مزدور صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں، ملک و قوم کی انہیں بالکل پروا نہیں، وہ دوسرے ملکوں کے اشارے پر اپنے ملک سے غداری تک پر اتر آتے ہیں۔

ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ حکومت کا کیا دھرا ہے کیوں کہ حکومت سرمایہ داروں کی ایجنٹ ہے۔ اگر حکومت سخت رویہ اختیار کرتی تو کمپنی کبھی بھی اتنی جرأت نہیں کر سکتی تھی کہ رائے عامہ کو اس طرح ٹھکرا دے۔

ایک نوجوان کا خیال تھا کہ اخبار والوں کو اچھا خاصہ مسالہ ہاتھ آگیا ہے اور وہ ہڑتال کا پورا COVERAGE دے رہے ہیں کھیلوں کے عظیم میلے کی خبروں کا ناس ہو کر رہ گیا ہے جب کہ ہڑتال سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

ایک طبقہ اس خیال کا حامی تھا کہ کمپنی اور مزدور، دونوں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانی چاہئے کیوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑنے کے بجائے بڑے مقاصد پر توجہ دی جائے۔
وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے یہاں تک کہ دھواں، سامنے سے ہٹ کر ایک کونے میں سمٹ گیا اور فضا صاف ہوگئی۔

(۱۶)

ہڑتالی لیڈروں کی انڈر گراؤنڈ میٹنگ تھی جس میں تفکر کی فضا غالب تھی، قبل دھویں کی فضا ہوا کرتی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ ہڑتال نے غیر معمولی طور پر طول کھینچ لیا تھا اور اب کیا کرنا تھا۔ جب ہڑتال کا پروگرام بنا تھا تو ان لوگوں کے ذہن میں اس طوالت کا شائبہ تک نہیں تھا انھوں نے ایک مدت کی حد مقرر کی تھی اور اب جو ہڑتال اس حد سے آگے نکل چکی تھی تو اس میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔
اس بات پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا گیا کہ اب تک تو مزدوروں کے حوصلے بلند رہے ہیں لیکن کس وقت کیا ہو جائے، کہا نہیں جا سکتا کیوں کہ اب جسموں پر جو کپڑے بچ رہے تھے، ان کی بقا بھی محفوظ نہیں تھی۔ کمپنی نے کتابچے اور دوسرے اعلانات کے ذریعہ یہ بات ثابت کرنے کی پوری کوشش کی تھی کہ وہ مزدوروں کی ہمدرد ہے، اس کوشش نے بہت سے لوگوں کے دماغ میں پہلے سے بیٹھی بٹھائی بہت سی باتوں کو کھرچ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ کمپنی نے اپنی سنجیدگی اس بات سے ظاہر کی تھی کہ اس نے ہڑتالی لیڈروں سے ایک لمحہ کے لئے بھی رابطہ منقطع نہیں کیا تھا اور آخر میں تو انھوں نے اس قدر گھریلو انداز اپنایا تھا کہ مزدور اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پا رہے تھے ـــــ ان کی خلوص نیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا کہ انھوں نے خیر سگالی کی علامت کے طور پر سبھی لیڈروں کو ایک ایک گھڑی تحفتاً پیش کی تھی اور جن چیزوں کی جھلک ان لوگوں نے دکھلائی تھی ، وہ من و عن یاد رکھنے کی چیزیں تھیں۔
آخر میں فیصلہ یہی ہوا کہ اب ہڑتال کا خاتمہ مزدوروں کے مفاد میں ہے!

آخری مکالمہ

دستک!
خاموشی ہی خاموشی!
دستک!

کون ــــــ ؟
گوتم جی ہیں ؟
نہیں ہیں !
کہاں گئے ہیں ؟
ہڑتال ختم ہو گئی ہے نا ــــــ اس کی خوشی میں ہونے والے جلسے میں گئے ہیں۔
آئیں تو کہہ دیجئے گا کہ ووٹر لسٹ بنانے والے آئے تھے۔ آج آخری تاریخ بھی ختم ہو گئی!

مغیث الدین فریدی
نئی دہلی

ڈاکٹر مظفر حنفی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

غزلیں

بجلیوں کو رنگ و بو کا پاسباں کہتے رہو
غم بہ اندازِ حدیثِ دیگراں کہتے رہو

کاروانِ رنگ و بو کب کا چمن سے جا چکا
اب غبارِ کارواں کو کارواں کہتے رہو

تیز ہیں خنجر ابھی بازوئے قاتل شل نہیں
قتل گاہوں کو مگر دار الاماں کہتے رہو

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا
اور کچھ دن تک قفس کو آشیاں کہتے رہو

وسعتِ قلب و نظر کی آزمائش ہی سہی
بے زبانوں کو بھی اپنا ہم زباں کہتے رہو

حرف کی محتاج کب ہے شوخیٔ فکرِ رسا
وقت نے لب سی دیئے ہیں، داستاں کہتے رہو

شخص فانی ہے فریدی فن مگر فانی نہیں
فن کے ہر لمحے کو عمرِ جاوداں کہتے رہو

میں قصبے کا بھولا پنچھی، اندر باہر ایک
جس شہری نے ہاتھ ملایا، کاٹ لیا پر ایک

سونے کی ہر لنکا ان کی اور مجھے بن باس
چتر سیانے دس دس سر کے، مجھ مورکھ سر ایک

چاروں جانب ہو کا عالم، سن سن ایک چراغ
دل کی بستی سے گزرا ہے غم کا لشکر ایک

گلشن پر دونوں کا حق ہے کانٹے ہوں یا پھول
ٹکرانے کی شرط نہ ہو تو شیشہ پتھر ایک

ٹوٹی پھوٹی ناؤ ہماری زخمی دونوں ہاتھ
لیکن بے پتوار کئے ہیں سات سمندر ایک

جتنے وار ہوئے اتنا ہی بڑھ جاتا ہے خون
شہ رگ میری گردن گردن، اس کا خنجر ایک

پھر بھی ہم نے قائم رکھی لہجے سے پہچان
غزلوں کے نقال کئی تھے اور مظفر ایک

حامدی کاشمیری

پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو
کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

غزلیں

دشتِ شب میں کوئی دمساز تو ہے
ماہِ گم گشتہ کی آواز تو ہے
وہ تراشیدۂ الفاظ، سہی
کوئی صورت کدۂ ناز تو ہے
یہ جہاں مسکن و مامن نہ سہی
ایک حیرت کدۂ راز تو ہے
گر نہیں اڑنے کی طاقت، نہ سہی
دیکھنے کو پرِ پرواز تو ہے
ہاں جہنم کے تھپیڑے ہی سہی
کم نہیں ہے کوئی در باز تو ہے
ایسے عالم میں بھی آنکھیں وا ہیں
حرف کاری ہی کا اعجاز تو ہے

دشتِ ظلمت میں پکار آئیں گے
خستہ لب، سینہ فگار آئیں گے
مٹھی میں حرف منور رکھنا
کتنے تاریک حصار آئیں گے
ٹوٹ جائے گی یہ زنجیرِ گلو
ایک دن اسپ سوار آئیں گے
اب سفر آئینہ خانوں کا ہے
کتنے صحرا میں غبار آئیں گے
بحرِ ظلمت میں اتر کے دیکھو
کتنے رخشندہ دیار آئیں گے
جائیں گی وادیٔ حیرت کی طرف
پیشوائی کو چنار آئیں گے

احمد سہیل
پاکستان

موت آگاہی ہے
(سال بیلو اور اس کا فن)

تعارف

سال بیلو (SAUL BELLOW) ۱۹۱۵ء میں کیوبک میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین یہودی مہاجرین میں شامل تھے جو امریکہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ جب وہ نو سال کا تھا تو وہ شکاگو آگیا۔ یہیں سے اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ نارتھ ویسٹرن اور وزکانسن یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں سال بیلو کو ادب کا نوبل انعام ملا۔ وہ ناولوں کے علاوہ کئی مختصر کہانیاں، ڈرامے اور مضامین لکھ چکا ہے۔ اس کی مشہور ناولوں میں:

(۱۹۴۴ء) DANGLINGMAN

(۱۹۴۷ء) THE VICTIM

(۱۹۵۳ء) THE ADVENTURES OF AUGIE MARCH

(۱۹۵۹ء) HENDERSON THE RAIN KING

(۱۹۶۴ء) HERZOG

(۱۹۷۰ء) MR. SAMMLER'S PLANET

(۱۹۷۵ء) AND HUMBOLDT'S GIFT

شامل ہیں۔

سال بیلو ان دنوں شکاگو یونیورسٹی میں "تخلیقی تحریروں" کا استاد ہے۔

○

اس صدی کی چوتھی دہائی میں جو گروہ ناول نگاری کے میدان میں آیا۔ جسے عہد کے نقادوں نے وجودی ناول نگاری کا نام دیا۔ ان میں سال بیلو سرِفہرست ہے۔

سال بیلو ہجرت کی اس لہر کی پیداوار ہے جو اس صدی کے اوائل میں مختلف یہودی بستیوں سے امریکہ منتقل ہوئی۔ یہ بیلو کے اجداد کا قصہ ہے۔ سال بیلو نے امریکی شہری کی حیثیت سے جو اس پورے مشینی ڈھانچے کے باہر کھڑا ہے۔ مغائرت (ALIENATION) کی نگاہ سے دیکھا بیلو اس عہد کی پیداوار ہے جس میں زندگی کو بے معنی اور خدا کو لاوجود سمجھا جانے لگا اس سے اخلاقیات میں ایک خلا پیدا ہوا اور فکری نظام کا تار و پود بکھر گیا۔ بیلو نے اس پوری لایعنی ABSURD صورتحال میں زندگی کے مفہوم کی تلاش جاری رکھی اور رجائیت کے ساتھ زندگی سے مماثلت پیدا کی اور ان اقدار کی ترویج کی جن کے بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔

سال بیلو کی پہلی کتاب "ڈانگ لنگ مین" (DANGLING MAN) آزادی کے جبر یہ مسئلے پر محیط ہے۔ اس میں مرکزی کردار آزادی سے تنگ آکر اپنے آپ کو معاشرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ بیلو وجودی ہوتے ہوئے بھی سارتر کے تصورِ آزادی سے کسی قسم کا اکتساب نہیں کرتا۔ بقول ژاں پال سارتر آزادی ہی تمام اقدار کی معنویت کی بنیاد ہے اور یہی زندگی کا تنہا جواز بھی ہے۔ آزادی تمام اخلاقی قدروں کو جذب کر لیتی ہے اور خود اخلاق کا بدل بن جاتی ہے مگر یہ آزادی مہمل ہے۔ بیلو کی پہلی لامحدود آزادی کا تصور منفی ہے۔ وہ آزادی کو ایک مخصوص دائرے میں دیکھتا ہے بیلو کی سب سے پہلی مشہور کتاب HERZOG ہے جو پورے معاشرتی نظام کو اعلیٰ دانشوارانہ سطح سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ بیلو اس صدی کی معتبر پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ زندگی دیوتاؤں کا قرض ہے اور بیلو اس قرض کو اتارنا جانتا ہے۔ وہ زندگی کی بے معنویت سے گھبرا کر تشدد، یاسیت اور بے اصولی کی طرف نہیں گیا بلکہ معاشرے میں ٹوٹتے ہوئے رشتوں میں نئے رشتے بنانے کی کوشش کی۔ موت اس کا خوف نہیں بلکہ موت سال بیلو کی آگاہی ہے۔

کرکے گرد (KIERKEGAARD) کے "وجودی جنون" کا اندازہ اس حوالے سے کیا جا سکتا ہے کہ "میری روح کیسی بوجھل ہے کوئی خیال اسے سہارا نہیں دے سکتا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ اسے فضا سے اوپر نہیں اڑا سکتی اگر میری روح حرکت بھی کرے تو بھی یہ اس پرندے کی مانند پھڑپھڑاتی رہتی۔ جو طوفان سے خوفزدہ ہو۔ میری اندرون میں مردہ دلی اور اندیشوں کا غلبہ ہے جیسے بھونچال آنے والا ہے۔" سال بیلو وجودی روایت میں سارتر سے زیادہ کرکے گرد کے

قریب ہے جو اسے یقین کی سرحدوں تک لے جاتا ہے۔

بیلو کو یہ شکایت ہے کہ جدید ناول لکھنے والے اپنی بات پوری ضمانت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، وہ ثابت قدمی سے لکھتے ہیں، وہ جدید زندگی کی منظر کشی بھی کرتے ہیں۔ اس کی کڑواہٹ کو سچائی سے بیان کرتے ہیں مگر وہ اسے کوئی موضوع دینے میں ناکام رہتے ہیں۔

امریکہ میں بیلو پر جتنا کام ہوا اس کے دو حوالے بنتے ہیں، ایک حلقہ بیلو کو وجودی کشمکش میں دیکھتا ہے جب کہ دوسرا طبقہ بیلو کو موافقت (CONFORMTY) کا ناول نگار قرار دیتا ہے ایک خاص مذہبی حلقہ بھی ہے جس کا بانی فرینک کرموڈ (FRANK KERMODE) ہے جو بیلو کی کوششوں کو امریکی معاشرے میں ایک رجائی جہت قرار دیتا ہے اور اس کی معاشرتی تنقید کی تعریف کرتا ہے۔ مارکوس کلائن (MARCIUS KLIEN) بیلو کو انجذاب (ASSMI-LATIOT) کا ناول نگار کہتا ہے جب کہ اے ہب حسن (IHAB HASSAN) اور لی ہان (LEHAN) بیلو کی کوششوں کو شیطانی تلاش کا نام دیتے ہیں۔

برصغیر میں بیسویں صدی کے نصف میں معاشرتی زندگی تیزی سے تبدیل ہوئی، ایک شہری اور صنعتی معاشرے کا عمل شروع ہوا اس حوالے سے مغائرت کا مسئلہ بے یقینی کی صورت حال تنہائی کا دکھ اور معاشرے سے کٹ جانے کا احساس لکھنے پڑھنے والے طبقے میں پیدا ہوا جس کے نتیجے میں صنعتی معاشرے کی شاعری عمل میں آئی اور تحقیق کے میدانوں میں ان لوگوں سے خاص دلچسپی لی جو وجودی مسئلے پر زندگی کی عمارت تعمیر کرتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے منسلک پروفیسر چرن تن کل شترا (PROF. CHRIN-TAN KULSHISTRA) سال بیلو کے فن پر مقالہ لکھ رہے ہیں، کراچی میں محمد انور خالد "سال بیلو اور امریکہ میں وجودی ناول۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۰ء تک" کے عنوان سے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ "بیلو وجودی فلسفے کا سب سے بڑا ناول نگار ہے۔"

یہاں البرٹ کامیو سے صرفِ نظر کر کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یورپ کا وجودی ناول فلسفے سے اس قدر متاثر ہے کہ "فلسفہ پہلے اور فن بعد میں" نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سال بیلو کے بارے میں یہ بات ایک اطالوی نقاد نے کہی ہے اور یہی بات بیلو نے اپنے انٹرویو میں بھی کہی کہ ناول کا بنیادی مقصد زندگی کی تشخیص ہے، فلسفہ زندگی کا استعارہ ہے مگر یہ زندگی سے پہلے نہیں۔

کامیو نے یہ بات غالباً سارتر سے اختلاف کرتے ہوئے کہی تھی کہ ناول تمثال میں فلسفہ ہے۔ جنھوں نے زندگی کے تمثال کی تشریح و تعبیر کی اور زندگی کی آنکھ سے فلسفے کو دیکھا نہ کہ فلسفے کی آنکھ سے زندگی کو پرکھا۔ ان میں سال بیلو سب سے زیادہ معتبر ہے۔ ہم جب ناول میں وجودی فلسفے کی بات کرتے ہیں تو ہم اس فلسفے کے حیاتی مسائل سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں وجودیت ایک فکر ہے، طرز زندگی ہے اور تمام لاادری زندگی میں سب سے معتبر بھی ہے جس میں نہ ہونے پر ہونے کی تعمیر کی جاتی ہے۔ امریکی ادب میں وجودی عناصر روز اول سے موجود تھے، امریکی معاشر فردیت، ہجرت اور سرحدی نیم پن میں زندگی کی تلاش پر قائم ہے۔ فردیت کے دو بنیادی ماخذ پیورٹن ازم (PURITANISM) اور سرحدی فردیت ہیں۔ جب پہلا انگریز امریکہ آیا تو اس نے ایک لامتناہی امکانات پر اپنے ہونے کو ثبت کیا۔ بریڈ فورڈ (BRADFORD) نے لکھا ہے کہ پہلے مرحلے میں وہ امریکہ کی سرزمین پر اترے تو ایک اتھالاشیئت (NOTHING-NESS) کے سامنے انھوں نے اپنے موضوعی حوالے سے اپنے خالق حقیقی کو یاد کیا۔ امریکی معاشرے میں یہ رشتہ آج بھی قائم ہے۔ تنہائی، اجنبیت اور ہیجان ولیم کوپر (WILLIAM COOPER) میل ول (MELVILLE) ہارتون (HAWTHORNE) سے لے کر ہیمنگوے (HEMINGWAY) تک اور ہیمنگوے سے لے کر سال بیلو اور اس کے ہم عصروں تک امریکی ادب وجودی ادب ہے۔ لیکن بیلو کے ہم عصر اسٹائرن (STYRON) نامن مَلر (MAILER) ایلی زن (ELLISON) اور بیلو سے کچھ پہلے رچرڈ رائٹ (RECHARD WRIGHT) اور بیلو کے بعد کچھ لوگ مثلاً برنارڈ میلامڈ (MALMUD) اپ ڈائک (UPDIKE) پن چن (PYNCHON) رائٹ مورس (WRIGHT MORRIS) اسی وجودی مسئلے کو اس قوت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے اور انھوں نے اپنی جہتوں کا اضافہ نہیں کیا۔ جن پر قدرت بیلو کو امریکہ کا سب سے بڑا وجودی ناول نگار بناتی ہے۔ سال بیلو کے یہاں تمام وجودی مسائل بیلو کی "نہ ہونے میں ہونے کی تلاش" اس فنکارانہ مہارت کے ساتھ ہے جو سارتر کو LA NAUSEA میں حاصل نہ ہو سکی اس ناول میں فلسفہ پہلے اور ناول بعد میں ہے۔ سال بیلو کا اصل مسئلہ ایک زندگی کی انتھک تلاش ہے جس کو موضوعی بنیادوں پر گزارا جائے۔

سال بیلو کے ہم عصروں میں وجودی مسائل یک جہتی ہیں۔ سب کے علیحدہ علیحدہ مسئلے

ہیں اور سب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا ایک معاشرتی تباہی سے دوچار ہے
بیلو وجودی اخلاقیات، ذمہ داری اور اعتبار کی بنیاد پر اس تباہی سے مقابلہ کرنا جانتا ہے۔
مسئلہ موت پر ختم نہیں ہوتا مسئلہ نفی یت (NIHILISM) پر ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی مسئلہ
"متلی" (NAUSEA) پر ختم ہوتا ہے بلکہ مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے، مسئلہ زندگی کی تلاش
ہے اور اس اعتبار کے ساتھ۔ ایک موضوعی حوالے کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کی ذمہ داری
ہے۔

سال بلیو نے جزوی یہودی وجدان کو عالمگیریت اور یہودی احساس محرومی کو کلیت
عطا کی۔ اس نے یہ کام دو طریقوں سے کیا۔ احساس محرومی کا اظہار یاسیت کے بجائے طنز میں
ظاہر ہوا جو اس کی تحریروں کا طرۂ امتیاز بن گیا اس طرح اس یہودی احساس کو عصری زبان
عطا کی کیوں کہ یہ عہد طنز کا عہد ہے اور طنز کا رخ اور خطاب دوسروں سے نہیں خود اپنی
ذات سے ہے یعنی بجائے خود پر ہنسنے کے خود پر طنز کرنے کا عہد ہمارا عہد ہے اور اس طرح
یہودی تاریخ و تجربے کو سال بیلو نے عصری ذہن و مزاج سے ہم کنار کر دیا۔

دوسری بات جس کی طرف بیلو نے خاص طور پر توجہ دی وہ یہودی احساس محرومی،
محرومی کا یہ احساس اس وجہ سے نہیں کہ یہودی بے ملک ہے اس کا نہ ملک ہے نہ اقتدار ہے
یعنی یہودی محرومیت سیاسی اور ثقافتی نہیں اقتصادی ہے اور طلب زر اور خود غرضی ہے
تلاش زر سے باہمی تعلقات مجروح ہوتے ہیں اور انسان کٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہودی تنہا
ہے، مگر وہ آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے یعنی یہودی ہونا تنہا ہونا ہے اور تنہائی
طلبِ زر یا انفرادی معاشی مقاصد کی پروردہ ہے۔

روایتاً یہودی اللہ تعالیٰ کا منتخب بندہ اور یہودی قوم اللہ تعالیٰ کی منتخب قوم
سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس محرومی اور اس تنہائی کی توجیہ کرنے میں روایت
سدراہ بن جاتی ہے۔ تاریخی طور پر یہودی قوم کا یہ المیہ اس کی زندگی میں طنز کا عنصر لے
آیا۔ ایک طرف تو مابعد الطبیعاتی روحانی افتخار ہے تو دوسری جانب احساس محرومی اور
تنہائی ہے۔

سال بیلو کے یہاں یہی صورتِ حال اپنے آپ پر طنز کی صورت اختیار کر جاتی
ہے اور بیلو کو عیسائی مفکر کرسکے گرد سے قریب کر دیتی ہے۔ جس کے یہاں اخلاقی زندگی

سے روحانی زندگی میں قدم رکھنے کی زندگی طنززدہ زندگی ہے۔ ایک زندگی چھوڑی نہیں جاتی اور دوسرے میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ انفرادیت سے اجتماعیت تک پہنچنا اور جزویت سے نکل کر کلیت سے ہم کنار ہونے کا عمل ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتا ہے ـــــ طنز اور بے چینی کا شکار رہتا ہے اور یہی چیز سال بیلو کو کرکے گرد سے قریب لے آتی ہے۔ یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ سال بیلو کی آفاقیت کا لنگر بہرحال یہودیت میں پڑا ہوا ہے اور یہی بات اس کو دوسرے وجودیت پسند ادیبوں سے مختلف کرتی ہے کہ سارتر اور دوسرے وجودی ناول نگار اپنے عہد سے سروکار رکھتے ہیں اور سال بیلو صرف اپنی قوم اور اس کے مزاج سے بحث کرتا ہے۔ ☐

غزلیں

حنیف کیفی
جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

پیشِ نظر جو نقش تھا نامعتبر لگا
منظر ترے بغیر فریبِ نظر لگا
مانوسیت کی رو سے گراں بار ہے فضا
آکر مرے مکاں میں نئے بام و در لگا
میں ساتھ دے نہ پاؤں گا رفتار کا تری
اے عصرِ تیز گام مرے بال و پر لگا
لوٹا میں تیرے گھر سے تو عالم ہی اور تھا
اک اجنبی جہان مجھے اپنا گھر لگا
پھر کاٹنا ہے کوہِ گراں شب کا جاگ کر
دن بھر اس ایک خوابِ پریشاں سے ڈر لگا
بے حس سماعتوں کا گلہ کس سے کیجئے
نغمہ تھا دل گداز مگر بے اثر لگا
کیفی جھلستی راہ میں سایہ کہیں نہیں
چل کر مسافروں کے لئے کچھ شجر لگا

(ڈاکٹر) اظہار مسرت
بھرتیا اسپتال، فتحپور شیخاواٹی
۳۳۲۳۰۱

صلہ ملا ہمیں شاعر مزاج ہونے کا
تمام عمر کیا کام بوجھ ڈھونے کا
زمین کھیت کی بنجر تھی کیا کریں ورنہ
ہمیں تو خوب سلیقہ تھا بیج بونے کا
ہر اک کتاب میں دانشوری کے قصے ہیں
جڑا ہے بچوں سے رشتہ ہر اک کھلونے کا
مرے وجود سے سوکھا نکل گیا "سوکھا"
ملا ہے "باڑھ" کو ذمہ مجھے ڈبونے کا
زمیں کی سختی ہو یا آسماں کی دوری ہو
ہے اہتمام مرے اوڑھنے بچھونے کا
بلندیوں سے گزرنا مری حقیقت ہے
سمجھ رہے ہیں مگر لوگ "خواب بونے" کا
کسی کے ترکِ تعلق کے فیصلے ہیں
ہرا ملال فقط اعتماد کھونے کا
وہ جن کی باتوں میں نرمی تھی پھول جھڑتے تھے
انھیں کو کام ملا خار بھی چبھونے کا
ہمارا جذبِ مسرت ہے رائی کا دانہ
تمھارا غم کہ ہو جیسے پہاڑ سونے کا

مرزا حامد بیگ
راولپنڈی، پاکستان

آوازیں

نئی نسلیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنتی آئی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔
کب ہوتا ہے؟ کیوں کر ہوتا ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ بس ہوتا ہے۔
کوئی پکارتا ہے۔
اور صدیوں کے پھیلاؤ میں، یوں ہی لمحہ بھر کے لئے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس۔ ہم آواز کے رُخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔
اس روز بھی یہی کچھ ہوا۔
جب میں ڈیوٹی پر پہنچنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تھا اور میرے قدم، ہسپتال کی بجائے ریس کورس کی جانب نکل جانے والے رستے پر اٹھ گئے تھے۔ یہ میرا اس شہر میں پہلا دن تھا اور میں چہل قدمی کرتا ہوا، بے خیالی میں بھٹک گیا تھا۔
میرے لئے وہ راستہ نیا تھا پر جیسے کوئی کھینچے لئے جاتا ہے۔ اس روز آسمان صاف تھا۔ اور میں شہر کے ہنگامے سے دور آوارہ خرامی کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔
ریس کورس کی جانب سے پسینے میں تر، تھکے ہارے گھوڑوں پر چاق و چوبند جوکی، لانگ بوٹ اور ترچھے والی ٹوپیاں پہنے قطار در قطار واپس لوٹ رہے تھے اور میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا، ایک اجاڑ بنگلے کے پچھواڑے اکیلا رہ گیا تھا۔
میں وہاں کتنی دیر رکا ہوں گا، کچھ پتہ نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا اور قدیم طرز کی عمارت ٹھنڈے گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں واپس مڑنے والا تھا کہ پیچھے سے دوڑ کر آتے ہوئے ایک بوکھلائے ہوئے بچے نے میرا راستہ روک لیا:
"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟ ذرا میرے ساتھ آئیں۔"
میں انکار نہیں کر سکا اور اس تیز قدم اٹھاتے اور ہوا میں تیرتے ہوئے بچے کے پیچھے

نشتم پشتم گھسٹتا چلا گیا۔ اس اجاڑ بنگلے کی حد بندی گزار کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ طویل راہ داریوں پر وہ میری راہنمائی کرتا، ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ پھر وہ مجھے اس عمارت کے طویل نیم تاریک برآمدے سے گزار کر ایک ہال نما کمرے تک لے گیا، جہاں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل میں لپٹی لپٹائی ایک خاتون جاں کنی کے عالم میں پڑی تھی۔

وہ تیس سال سے یقیناً زیادہ کی نہیں رہی ہوگی، لیکن اس وقت تو وہ ایک ہڈیوں کا پنجر تھی اور اس کا سانس اکھڑ چلا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ کی۔ اس کی تیمارداری کو وہاں کوئی نہیں تھا، البتہ وہ ہوا کے دوش پر سوار لڑکا ——

مجھے مریضہ میں زندگی کی کوئی رمق باقی نظر نہیں آئی، اور یہ کہ اس وقت میرے پاس سوائے اسٹیتھو سکوپ کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس لڑکے کو چند ضروری ہدایات دیں اور ادویات کی پرچی لکھ کر تپائی پر رکھتے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ہسپتال کے ہنگامے میں مجھے وہ مریضہ نہیں بھولی، لیکن میں وہاں نیا نیا تھا اور میری وہاں آمد سے متعلق لکھت پڑھت اکتا دینے والی تھی۔ نئے ساتھیوں سے تعارف کا سلسلہ طول پکڑ گیا اور میں خواہش کے باوجود اس طرف، دوبارہ خبر گیری کے لئے نہیں جا سکا۔

اس واقعے کو کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور میں بھول بھلا گیا تھا۔

آخر کیا کچھ یاد رکھا جائے۔ ہم لوگوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن سنتے ہیں کہ صدیوں کے پھیلاؤ میں کبھی، یوں ہی لمحہ بھر کے لئے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس۔

کوئی پکارتا ہے، اور ہم آواز کے رُخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

آج بھی یہی کچھ ہوا۔

میں حسبِ معمول ہسپتال سے پہلی شفٹ بھگتا کر، تھکا ٹوٹا ہوا گھر لوٹا تھا کہ یکایک احساس ہوا جیسے کچھ بھول رہا ہوں۔ کوئی بات، جو بہت ضروری تھی۔ کوئی کام، جو رہ گیا، یا جیسے کسی سے ملنا تھا اور نہیں مل پاتا تھا۔

یوں ہی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا، لیکن ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی جو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی۔ سامنے میز پر اسٹیتھو سکوپ چمک رہا تھا اور آپس میں باہم الجھے ہوئے گرم دستانے اس کے ساتھ دھرے تھے۔ سفید اپیرن البتہ اتار کر رکھنا یاد نہیں رہا، سو وہ پہنے ہوئے تھا۔

ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی۔ ہسپتال سے نکلتے وقت بھی میں بہت جلدی میں تھا اور دس منٹ پہلے ہی اٹھ آیا تھا۔ جیسے گھر پر کوئی ضروری کام ہو۔ لیکن گھر پہنچ کر پھر وہی بے چینی، جیسے کوئی بات تھی، کوئی کام تھا، جو ہونے سے رہ گیا، یا جیسے کسی سے ملنا تھا۔ پر کسی سے ملنا تھا؟ کوئی بھی تو نہیں تھا۔

میں نے کہا ناکہ وہاں میری جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھی۔ آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا، جس سے میل ملاقات رہی ہو۔ ہسپتال کے سارے عملے سے کچھ ہی دن پہلے، اور زندگی میں پہلی بار ملا تھا۔ لیکن ان صدیوں کے پھیلاؤ میں کہیں انجانے میں کیا ہوا ایک وعدہ تھا، جو رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ وہ بات، جو کسی سے کہنا تھی اور کہہ نہیں سکا تھا یا کوئی کام جو تکمیل چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ بھی تو یاد نہیں آرہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میز کی ساری درازیں کھول کر ایک ایک کاغذ کا پرزہ پڑھ ڈالا۔ کتابیں الٹ پلٹ دیں ـــــ پہنے ہوئے کپڑے سمیت الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں کے چھوٹے بڑے جیب دیکھ ڈالے۔ کچن میں، جہاں میں نے آج تک آگ نہیں جلائی تھی، ہو آیا۔ باتھ روم میں ٹوتھ پیسٹ اور برش کے ساتھ تازہ کھولی ہوئی صابن کی ٹکیہ اور بالٹی پر ٹنگے ہوئے مگ کے علاوہ صرف ایک بلب روشن تھا، جو کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود روشن کیا تھا۔ بالکنی کی ریلنگ خالی تھی اور ہنگر پر میری نیم خشک قمیص جھول رہی تھی۔ سب کچھ اسی طرح پڑا رہنے دیا اور میز پر سے سٹیتھو سکوپ اور دستانے اٹھا کر ایپرن میں ہی باہر نکل آیا۔

میں ہسپتال کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا، تاکہ وہاں بھی جا کر اطمینان کر سکوں۔ لیکن میرے قدم ریس کورس کی جانب نکل جانے والے راستے پر اٹھ گئے۔ میں نے بہت چاہا کہ اس ویران سڑک کی طرف نہ جاؤں، لیکن قدم تھے کہ رکے نہیں رکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہوگا، پر میں چلتا گیا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک کے دونوں اطراف میں سفیدے کے ستواں درخت چھتری بنے کھڑے تھے۔ میں دائیں ہاتھ کی خاردار تاروں کی باڑ اور بائیں طرف کے خاموش مگر آباد گھروں کی قطار کو گزار کر اس اجاڑ بنگلے کی حد بندی تک پہنچ گیا۔ میں شاید ریس کورس کی طرف دور کھلے میں نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاؤں بوجھل ہوتے گئے اور میں ایک بار پھر اس ویران بنگلے کے گیٹ پر رک گیا

چلا گیا۔

اس وقت خاصی روشنی تھی اور عصر کی اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں۔ میں جانے کتنی دیر وہیں ٹھہرا رہا۔ پھر میں نے ریس کورس کی طرف نکل جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور زنگ آلود آہنی گیٹ کو اندر کی جانب دھکیل کر اس پختہ راہ داری پر چل نکلا جس کی سرخ اینٹیں رات کی بارش نے دھو ڈالی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ آپس میں الجھتی اور ہر طرف پھیلتی ہوئی گھاس کی کٹائی کو ایک عرصہ ہو چلا ہے اور زردی مائل نم گھاس پر گیلے سوکھے پتوں کے انبار لگے ہیں پختہ راہ داری کی دونوں جانب انجیر اور چنار کی دو رویہ قطاروں میں کسی اکیلی فاز کی چیخ میرے لئے راستہ بناتی چلی جا رہی تھی۔ شام کی بہتی ہوئی ہواؤں میں ابھی ہلکی ہلکی خنکی کا احساس باقی تھا اور میں اپنی دھن میں نیم تاریک برآمدے کی سیڑھیوں تک جا نکلا تھا۔

یکایک کھانستا کھنکارتا ہوا ایک سایہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔

"صاحب ـــــ کس طرف جانا ہے آپ کو؟" سن رسیدہ چوکیدار نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں ایک مریضہ کو دیکھنے آیا تھا، میں ـــــ بہت دن ہو گئے، پھر آنا ہی نہیں ہوا اس طرف ـــــ" میں نے جواب میں کہا، اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"جی ـــــ کب کی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہاں تو کوئی نہیں رہتا۔ مجھے یہاں چوبیس برس ہو گئے، چوکیداری کرتے ـــــ ہاں مجھ سے پہلے شاید ـــــ"

"اچھا، لیکن میں تو یہی کوئی ہفتہ پندرہ دن ہوئے آیا تھا۔ یہاں ـــــ" میں وہیں ٹھہر گیا تھا۔

"صاحب ـــــ بھول رہے ہیں آپ۔ میں تو رات دن یہیں ہوں۔ البتہ کبھی بازار تک ہو آتا ہوں اور بس ـــــ"

میں اس سے کیا بحث کرتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور میں وہاں سے چل دیا تھا، لیکن میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اتنے میں اس نے مجھے سنبھالا دیا اور دو گھڑی وہیں رک جانے کو کہا۔ وہ اور جانے کیا کچھ کہتا رہا، لیکن میں کچھ بھی تو نہیں سن پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد، میں اس کے پیچھے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اندر کا نیم تاریک راستہ میرا دیکھا بھالا، اور وہ مجھے برآمدے سے گزار کر ڈرائنگ روم کی طرف لے جانا چاہتا تھا، لیکن میری نظریں ہال نما کمرے کی متلاشی تھیں۔ پھر میں چلتے چلتے ٹھٹک کر ایک پتیل جڑے دیو ہیکل دروازے کے سامنے ٹھہر گیا تھا۔ اس نے میرے اصرار پر دروازہ کھول دیا۔

میں نے دیکھا کہ خالی کمرے میں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل تہ کیا رکھا ہے۔ اور بس۔ میں نے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ کر تپائی پر سے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ اٹھا لیا۔ اس پر چند ہی روز پہلے کی تاریخ درج تھی۔

میں چوکیدار سے کیا بحث کرتا۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

جب باہر نکلا ہوں تو یاد آیا کہ چوکیدار سے اس ہوا کے دوش پر سوار لڑکے کے بارے میں پوچھنا تو میں بھول ہی گیا۔ باہر کی خاموشی سرد راہ داری پر سے گزرتے ہوئے میں نے اوپر نگاہ کی، جہاں انجیر اور چنار کے درختوں پر انگنت ستارے جھک آئے تھے اور شفاف سیاہ آسمان پر ٹھہرے ہوئے چاند کا رنگ زرد تھا۔ ☐

اسعد بدایونی
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انیس انور
نذیر حسن بلڈنگ، محمد علی روڈ
اکولہ ۴۴۴۰۰۱

غزلیں

اتنے چہروں میں کوئی شکل تو پیاری نکلے
دیکھ کر جس کو دعا جاں سے ہماری نکلے

رنگِ مقتل کو سجایا ترے دیوانوں نے
وار سارے ترے تلوار کے کاری نکلے

ہم تو اس ساعتِ سفاک کو روتے ہیں میاں
جب افق پار نہ رنگوں کی سواری نکلے

میں بھی دنیا کی طرح بچ کے گزرنا چاہوں
کوئی پتھر جو مری راہ کا بھاری نکلے

پھر کسی جنگ کے امکان نہ تازہ ہو جائیں
پھر غنیموں سے عزیزوں کی نہ یاری نکلے

مجھ کو دنیا میں کوئی اپنے برابر نہ ملا
جتنے منصب تھے سبھی پنج ہزاری نکلے

ظلمت کدے میں خواب کا لشکر نہاں نہاں
تعبیر کی تلاش میں دوڑے کہاں کہاں

آئینہ لے کے جسم رہا ہے تلاش میں
سایہ نظر نہ آیا چھپا تھا جہاں جہاں

یہ ساعتوں کی فصل تو بے فیض ہی رہی
لمحوں کا کرب ذات پہ گذرا گراں گراں

نقشِ قدم کے ساتھ لہو تھا حنا نہ تھی
دشت ہوس میں کار سفر تھا زیاں زیاں

کیسا ہے آنکھ آنکھ کا منظر دھواں دھواں
آئی صدائے مرگ تو لبیک کہہ دیا

جامِ فنا کی پیاس نے کھینچا کشاں کشاں
شہرت کے خارزار سے بچ کر گذر گئے

کہتے تھے ورنہ لوگ کوئی تھا فلاں فلاں

احمد جاوید

لیکچرر شعبہ اردو فیڈرل گورنمنٹ کالج ایچ ۹
اسلام آباد (پاکستان)

کانچ کا شہر

شیشے کا مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔ پانی سے بھرا ہوا جس میں پھولوں کی پتیاں ہر وقت مہکتی رہتیں۔ ہم ایک چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں رہتے تھے۔ وہ میرا بچپن تھا۔ جب میں کوئی خواہش کرتا تو میرا باپ کڑھنے لگتا مگر میری ماں مسکراتی اور مجھے کہتی جب تم کوئی خواہش کرو اور جب تم کوئی خواب دیکھو، کوئی پھول کہیں سے توڑ کے لاؤ اور اس مرتبان میں ڈال دو پھر اس کے شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھو اندر ایک ایسا شہر سا بنتا دکھائی دے گا جیسا تم نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا، بالکل ان کھلونوں جیسا کہ جن کی تم خواہش کرتے ہو۔ ہم نے عمر بھر یہی کیا ـــــ نسل در نسل اس کی حفاظت کی یہ پھول صدیوں سے ہمارے پاس محفوظ ہیں کچھ تم بھی ڈالو۔

نسل در نسل پھول مہکتے کیسے رہتے ہیں۔ تعفن کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اب سوچتا ہوں۔ تب اندر ایک شہر دیکھتا تھا بالکل اپنی ماں کے خوابوں جیسا ـــ!

صبح ہوتی اور جب سارے لوگ کام کاج کو نکل جاتے، تب میری ماں اپنی گود میں کچھ تازہ پھول بھرتی اور رات کا دیکھا خواب بیان کرتی ـــــ وہ روز ایک ہی خواب دیکھا کرتی تھی ـــــ ایک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے، لوگ پھولوں کی مانند کہ مہکتے تھے، دریاؤں میں شہد اور دودھ بہتا تھا بادل روئی کے گالے ـــــ بس کچھ ایسا ہی تھا، ایسا ہی رہا ہوگا ـــــ اب پورا کسے یاد ـــــ!

وہ پھول تھے کہ خواب ـــــ خواب تھے کہ خواہشیں ـــــ اک شہر نگاہوں میں رہتا مگر ان دنوں وہ میرے خوابوں میں نہیں جاگتا تھا۔ اور رات بیت جاتی، اس کے سوا معلوم نہیں اور کیا کیا آنکھوں کے پیچھے پرچھائیں کی طرح گزر جاتا، عمر ہی ایسی تھی ـــــ البتہ دن میں اس مرتبان کے پھول وہی ایک خواب بن کر مہکتے رہتے ـــــ پھر یوں ہوا کہ صرف مہک رہ گئی ـــــ مہک بھی کیا مرجھائے ہوئے پھولوں کی باس کہ میری عمر آگے کو سفر کرتی تھی اور میری ماں کی پیچھے کی

طرف ـــــ

برس بیت گئے اب نہ وہ گھر رہا، نہ وہ افراد، سب تتر بتر ہو گیا۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لفظ چنتا، چہرے دیکھتا بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے اندر باہر مختلف صورتیں دھارتا ادھر سے ادھر ہو گیا ـــــ کہ درمیان میں ایسی عمر پڑی کہ جب راتیں اور دن آپس میں گڈمڈ ہو جایا کرتے ہیں۔ خواب اور حقیقت میں فرق نہیں رہتا۔ کبھی خواب حقیقت لگتا ہے اور کبھی حقیقت خواب ـــــ عمر کی اس راہ داری میں اپنی آواز کی بازگشت میں بھی بڑی گونج اور دبدبہ ہوتا ہے۔ یہ لڑکپن کے دن ہوتے ہیں ـــــ میں جوانی کی دہلیز پہ تھا۔

جوانی کی دہلیز پہ جب کبھی کبھار گئے دنوں کے نقوش سے گرد اڑتی تو خیال پیدا ہوتا کہ شاید مجھے کسی شہر کی طرف سفر کرنا تھا ـــــ مگر کدھر؟ کس سمت! اور ان ہی دنوں میں نے ایک روز گلیوں اور سڑکوں پہ ہجوم دیکھے کہ جو اسی حیرت میں تھے ـــــ

اس رات میں نے ایک خواب دیکھا ـــــ اک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے تھے ـــــ اور اک خوف کہ سب کچھ کرچی کرچی نہ ہو جائے ـــــ

اگلے روز میں نے وہ خواب جس سے بیان کیا وہ پریشاں ہوا اور اپنی راہ لی ـــــ اس دن مجھے گئے دن یاد آئے اور میں نے گھر میں اس شیشے کے مرتبان کو تلاش کیا کہ جس میں کائی جمی تھی اور وہ متعفن ہو رہا تھا ـــــ میں نے اسے صاف کیا اندر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھیریں اور اسے پانی سے بھر دیا۔ اب سوچتا ہوں ایسا کیوں کیا اس کی خواہشیں خواب تھیں سو وہ پھول ڈالتی تھی اور پانی بھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور مہکتے رہیں ـــــ میرے خدشے خواب ہیں ـــــ مجھے خواہشوں کے خواب کیوں نہیں آتے میں ہر رات تمنا سے سوتا ہوں مگر وہی ایک خواب وہی ایک خدشہ ـــــ

پھر ایک رات دیکھا ـــــ

وہی ایک شہر کہ زمین و آسمان جس کے کانچ ایسے، پھر دیکھا کہ کچھ نوعمر ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے آسمان کو نشانہ کرتے ہیں۔ پتھر زناٹے بھرتے جاتے ہیں چھناکے کی آواز آتی ہے۔ جیسے کرچی کرچی ـــــ پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہاتھوں میں بڑے بڑے ستون اٹھائے بھاگے آتے ہیں اور انھیں آسمان کے نیچے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے بچا رہے ـــــ میں اپنی بیوی سے اپنا خواب بیان کرتا ہوں ـــــ وہ اپنی خواہش مجھ سے کہتی ہے۔

میں اپنے بیٹے کی انگلی تھامے گلی میں آتا ہوں ـــــ گلی میں ہجوم ہے ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے
میں آسمان کی سمت دیکھتا ہوں اک خوف کہ کرچی کرچی نہ ہو جائے ـــــ
وہی دن بھلے تھے جب صرف خواہشیں تھیں خدشے نہ تھے ـــــ میری بیوی کہتی ہے
"تمہارے وہ دن بھی بھلے نہ تھے، تمہارے یہ دن بھی بھلے نہیں ـــــ
میں شیشے کے مرتبان میں دیکھتا ہوں وہ شہر کہیں بھی نہیں جو میری ماں کی آنکھوں سے
آشکار تھا اور جسے اس نے نسل در نسل دیکھا۔
ہم کس شہر میں رہتے ہیں اور وہ شہر کہاں ہے ـــــ میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے
میں اس سے کہتا ہوں اک پھول لاؤ اور اس شیشے کے مرتبان میں ڈالو ـــــ مگر اسے وہاں
کوئی شہر دکھائی نہیں دیتا۔
وہ دن اچھے تھے جب میں خوابوں کی خواہش کرتا تھا اگرچہ وہ مجھ سے دور رہتے ـــــ
اب خوابوں کا تانتا بندھا ہے مگر یہ خدشے کہاں سے در آتے ہیں۔ میں اس آسیب کا کیا کروں
کہ میرا بیٹا مجھ سے مختلف ہوتا جاتا ہے۔ وہ خواہشوں کو خواب نہیں بناتا ـــــ وہ شیشے کے
مرتبان میں نہیں جھانکتا ـــــ وہ کھڑکی سے باہر کودتا ہے ـــــ کنکر پتھر اٹھا کر ـــــ
تب مجھے اپنا گھر شیشے کا لگتا ہے اور شہر اور اس کی گلیاں اور سارے گھر ـــــ
مگر جب وہ لوٹتا ہے تو مٹی دھول ہوتا پریشان اور خستہ حال۔ اب تو وہ ہجوم بھی
اسے دکھائی نہیں دیتے کہ جو اس کے ہمراہ تھے۔ کنکر پتھر اٹھائے۔
ایک صبح اس نے مجھے کہا کہ آج رات میں نے شہر کے تمام گھروں پہ تالے دیکھے ـــــ
گلیوں میں سناٹا تھا ـــــ میں نے بہت صدائیں دیں مگر کچھ بھی نہ تھا ـــــ یہ لوگ کیا ہوئے۔
میں ہنسا کہ خدشے تمہاری آنکھوں میں در آئے ـــــ میں نے بھی رات اسی
طور بسر کی ہے ـــــ
اک شہر کہ کانچ کے در و دیوار اور کچھ لوگ کہ بھاری قدموں سے زمین پہ دندناتے
آتے ہیں ـــــ چھناکا ہوتا ہے ـــــ زمین شق ہوتی چلی جاتی ہے ـــــ نیچے ایک دلدل
اور شہر کہ دھنستا جاتا ہے۔ نیچے بہت نیچے ـــــ لوگ ڈوبتے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر
بے سود کہ آسمان بھی کرچی کرچی ـــــ کانچ کی بارش پھر ـــــ آنکھ کھل جاتی ہے ـــــ میں
تمہیں آواز دیتا ہوں۔

(۲)

سفر پہ نکلتے ہوئے مسافر اپنے گھروں سے خواب دیکھتے ہیں۔ پھول ایسے چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہوں تو اندھیری راتوں میں آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر اندھیرا کروٹیں لیتا ہے مگر خواب کا منظر دوبارہ نہیں کھلتا میں گھر سے دور اپنے ننھے بیٹے کو یاد کرتا ہوں جو اس وقت بے سدھ سوتا ہوگا کیا معلوم میں اب اس کی یادوں میں شامل ہوں بھی یا نہیں مگر شروع کے دنوں میں وہ مچلتا ہوگا۔ سوتے سے کسی ویرانی کا احساس بھی کرتا ہوگا۔ ہم میں یارانہ بھی تو بلا کا تھا۔

شام ہوتے ہم اپنے گھر سے نکلتے، کھلے سبزہ زاروں پہ ٹہلتے، سوال و جواب کرتے، سورج چھپتے، چاند نکلنے کا اسرار جانتے، ننھی منی نظمیں لہک لہک کر گاتے اور واپسی کے راستے سڑکوں کے کنارے دکانوں پر ملتی کبھی رنگین روشنیوں کا نظارہ کرتے واپس لوٹتے اور باغوں سے چنے ہوئے پھول اس شیشے کے مرتبان میں ڈال دیتے کہ جو پانی سے بھرا ہم اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ شیشے کا یہ مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔

□

سبطین اخگر

لہو کی قیمت

یہ دوستوں نے کہا تھا مجھ سے
لہو جو مانگو!
لہو بھی دیں گے!!
کہ آج مجھ کو اسی لہو کی
بہت ضرورت ہے
میرے یارو!
مگر یہ کیا؟
کیوں؟
کوئی بتائے؟
جو کوئی میرا حریف بن کر
میرے ہی اندر یہ کہہ رہا ہے
لہو نہ مانگ اپنے دوستوں کا!
کہ بے وفا تو بھی دوست ہو جا
لہو یہ اتنا گراں ہے
اس کی ادائیگی تو نہ کر سکے گا۔!!

عجیب و غریب

کوئی تو جائے مفر ہو ایسی
کہ خود سے نکل کر
کہیں پہاڑی مسافتوں میں
میں خاک ہو کر رہوں
جو کوئی نہ ڈھونڈ پائے
اگر یہ ممکن نہیں
تو سوچوں!
میں خودکشی کا کوئی بہانہ
تو ڈر ہے مجھ کو
یہ دنیا والے
یہ لوگ پیارے
کہیں گے سارے
'یہ بزدلی ہے'
'یہ بزدلی ہے'
تو سوچتا ہوں
یہیں، کہیں پر
اسی گھٹن میں نجات بھی ہے
یہ زندگی کائنات بھی ہے
وہ موت کتنی عجیب ہوتی
یہ موت بے شک غریب ہوگی۔!!

غضنفر

ڈگڈگی

ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ........

شہر کے نکڑ پر ڈگڈگی بج رہی تھی۔ لوگ ایک ایک کرکے ڈگڈگی بجانے والے کے ارد گرد جمع ہوتے جا رہے تھے۔

ڈگڈگی بجانے والا سر سے پیر تک ایک مخصوص قسم کے لباس میں ملبوس ایک لحیم شحیم آدمی تھا اس کے سر اور داڑھی کے بال تماشائیوں کے بال سے مختلف تھے۔ رنگ برنگ کے گول گول پتھروں سے بنی ایک لمبی مالا اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ تقریباً سبھی انگلیوں میں رنگین پتھروں کے نگ والی انگوٹھیاں تھیں۔ ایک ہاتھ میں ایک پرکشش ڈگڈگی تھی جو مسلسل رقص کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک لہراتی ہوئی بانسری جس کے منہ والے سوراخ کے ذرا نیچے سرخ رنگ کے پھندنے لٹک رہے تھے

ڈگڈگی والے نے ایک جھٹکے کے ساتھ ڈگڈگی بند کر دی۔ "ہاں تو قدردان! آپ نے سانپ اور نیولے کی لڑائی کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ آج ہم آپ کو آنکھوں سے دکھائے گا کہ سانپ اور نیولے کی لڑائی کیسی ہوتی ہے؟ نیولا کس طرح سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے؟ اور پھر ان ٹکڑوں کو ایک جڑی کی مدد سے کس طرح جوڑ دیتا ہے ہم۔ قدردان یہ انوکھی لڑائی ہم آپ کو دکھائے گا اور ضرور دکھائے گا۔

لڑائی دکھانے سے پہلے ہم ہندو بھائی سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ ایک بار پریم سے بولیں۔ شنکر بھگوان کی جے۔ جے۔ اے۔ے۔ے۔ے.....

"جے" کی آواز آس پاس کے ماحول میں گونج گئی۔

"اور اپنے مسلمان بھائی سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ایک بار دل سے نعرہ لگائیں۔ نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوکر چاروں

طرف پھیل گئیں۔
لوگوں کی بھیڑ دگنی ہو گئی۔
ڈگڈگی والے نے بانسری کو منہ سے لگایا اور ڈگڈگی والے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر
آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔
ڈگ ڈگ ڈگ ـــ ڈگ ـــ ڈگ ـــ ڈگ ـــ ڈگ
اس کے ساتھ ہی بانسری بھی ڈگڈگی کی سنگت کرنے میں مصروف ہو گئی۔
ڈگڈگی والا بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری کا پھیرا لگانے لگا۔ جس میں سانپ بند تھا۔
چند پھیروں کے بعد بانسری کی آواز بند ہو گئی۔ ڈگڈگی بجتی رہی۔ پھر ڈگڈگی بھی کھنک کھنک
کر خاموش ہو گئی۔
"دیکھئے قدردان! ہوشیار ہو جائیے۔ اب ہم سانپ کو نکالے گا۔"
ڈگڈگی والا ٹوکری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ لوگوں کی بے تاب نگاہیں ٹوکری پر مرکوز ہو گئیں۔
چند لمحے بعد اس نے ٹوکری کا ڈھکن ذرا سا اوپر اٹھا دیا۔
مجمع سے کئی گردنیں آگے کو جھک گئیں۔
"ہاں، تو قدردان! یہ سانپ وہ نہیں جسے آپ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ سانپ
سائبیریا کے جنگل میں رہتا ہے۔ یہ ایک دو ہتر سانپ ہے۔ اس کے کئی منہ اور
سر ہیں۔ اس کے ایک سر پر ایک خوبصورت سا تاج بھی ہے ـــ اچھا تو لیجئے
اب ہم ڈھکن کو اٹھاتا ہے۔
اس نے ڈھکن کو ذرا اور اوپر اٹھا کر اپنی آنکھیں ٹوکری کے اندر ڈال دیں۔ لوگوں کی گردنیں اور
آگے کو جھک گئیں۔
کیا ہوا ـــ ابھی نہیں؟
قدردان! سانپ کہتا ہے کہ وہ ابھی موڈ میں نہیں ہے۔
اور اس نے ڈھکن کو گرا دیا۔
"کچھ لوگ ذرا زور سے تالی بجا دے تا کہ سانپ مست ہو کر موڈ میں آ جائے۔"
تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے آسمان دہلنے لگا۔
تالی بجانے والوں میں کچھ لوگوں کے علاوہ چھوٹے بڑے سبھی۔ لوگوں کے ہاتھ ٹھر کے

تو ڈگڈگی والے نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"نہیں، کچھ زیادہ مزا نہیں آیا۔ ذرا اور زور سے بجائیے۔

اس بار پہلے سے زیادہ زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔

بھیڑ اور بڑھ گئی۔

بانسری بجاتا ہوا ڈگڈگی والا ایک تھیلے کے پاس جا کر رک گیا۔ بانسری روک کر اس نے ڈگڈگی والے ہاتھ کو تین بار مخصوص انداز سے جھٹکا دیا۔ اور تینوں بار ایک خاص طرح کی آواز نکال کر! ڈگڈگی خاموش ہو گئی۔ اس نے ڈگڈگی زمین پر رکھ دی۔ اور تھیلے کا منھ سرکا اپنا ایک ہاتھ اس میں ڈال دیا۔

لوگوں کی نظریں تھیلے میں داخل ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ چند لمحے بعد ڈگڈگی والے کا ہاتھ تھیلے سے جب باہر آیا تو مٹھی بند تھی۔ اس نے مٹھی کو آسمان کی طرف لے جا کر کھول دیا۔ رنگین پتھروں کے کئی چوکور ٹکڑے اچھل کر زمین پر آگرے۔

زمین سے ایک پتھر اٹھا کر ڈگڈگی والے نے ہتھیلی پر رکھ لیا۔

"قدردان! آپ اسے دیکھ رہے ہیں؟ ـــــ یہ آپ کو پتھر معلوم ہو رہا ہوگا۔

لیکن قدردان! یہ پتھر نہیں یہ ایک ہومولیہ دستو ہے۔ ایک بیش بہا چیز ہے۔

اس میں ان گنت (lll) گُن چھپے ہوئے ہیں۔ اس کے بہت سارے فائدے ہیں۔

آپ جاننا چاہیں گے یہ کیا چیز ہے اور اس میں کیا کیا گُن ہیں تو قدردان! ہم آپ کو بتائے گا اور اس کا فائدہ بھی دکھائے گا۔ لیکن ابھی نہیں پہلے ہم آپ کو سرحد تلاج والے سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھائے گا۔"

اس نے ڈگڈگی کو پھر اسی مخصوص انداز سے جھٹکا دیا اور آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتا ہوا نیولے کی طرف بڑھ گیا۔

"ہاں، تو بھائی نیولے راجہ! لڑائی شروع ہو جائے۔"

ڈگڈگی والا نیولے سے مخاطب ہوا۔

کیا ـــ؟ نہیں؟ لیجیے صاحب! یہ ابھی منع کر رہے ہیں۔

کیوں؟ کیا دودھ پئیں گے؟

قدردان! یہ پہلے دودھ پینا چاہتے ہیں۔
اچھی بات ہے۔ ہم آپ کو پہلے دودھ پلائے گا۔
اس نے تھیلے کے پاس رکھی ہوئی دودھ کی پیالی کو اٹھا کر نیولے کے پاس رکھ دیا۔
"قدردان! گھبرائیے نہیں، بس چند ہی منٹ بعد ہم آپ کو لڑائی دکھائے گا۔
اس نے بانسری منہ سے لگا لیا۔
سپیرا بین بجا ـــ بین بجا ـــ ناچوں گی .... کی دھردھن بانسری سے نکلنے لگی۔
"جی ہاں! اس پتھر کے بارے میں بھی بتائے گا اور اس کا فائدہ بھی دکھائے گا۔"
مجمع میں کھڑے ایک شخص کی طرف اس نے اپنی توجہ مبذول کر دی۔
"ہاں، ہاں۔ ابھی بتائے گا۔"
اس نے ایک پتھر خلا میں اچھال کر ہتھیلی پر روک لیا۔
"قدردان! ہم نے بتایا تھا کہ یہ پتھر نہیں ہے ایک بہومولیہ وستو ہے، ایک بیش بہا چیز ہے اس میں ان گنت گنڑ چھپے ہوئے ہیں ـــ لیجئے ہم آپ کو اس کا گنڑ بتاتا ہے۔
گنڑ نمبر ایک ـــ اگر کسی کو زہریلے زہریلا سانپ نے کاٹ لیا ہو ـــ یہ پتھر تریاق کا کام کرے گا جس جگہ سانپ نے کاٹا ہو اس پتھر کو پانی میں ڈبو کر وہاں رکھ دیجئے۔ یہ چپک جائے گا۔ اور اس وقت تک چپکا رہے گا جب تک شریر میں زہر ہو گا۔ جب یہ پتھر اس جگہ کو چھوڑ دے تو سمجھنا شریر سے زہر نکل چکا ہے۔
گنڑ نمبر دو ـــ کسی آدمی کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور وہ آدمی زمین پر دھاڑے مار مار کر لوٹ رہا ہو آپ اسے پتھر پر رگڑ کر چپکا دیں، سارا زہر منٹوں میں غائب اور لوٹ پوٹ آن کے آن میں ختم ـــ
گنڑ نمبر تین ـــ
مجمع سے ایکے دکے لوگ نکل کر جانے لگے ـــ
قدردان! جائیے نہیں ـــ ابھی کھیل دکھائے گا ـــ
آپ کھیل دیکھ کر جائیے گا۔ آپ کو بہت مزا آنے لگا۔ لیجئے ہم ابھی دکھاتا ہے ـــ

ڈگڈگی بجاتا ہوا وہ نیولے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے نیولے کی رسی ڈھیلی کر دی۔ نیولا بگی کے قریب پہنچ کر چکر کاٹنے میں مصروف ہوگیا۔ ڈگڈگی والا بگی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ڈگڈگی جھٹکے کے ساتھ کھنکی اور خاموش ہوگئی۔

اس نے بگی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ لوگوں کی گردنیں ایک بار پھر آگے کی طرف جھک گئیں۔

کچھ توقف کے بعد ادھ کھلی بگی سے اس نے جب اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اس میں کتھئی رنگ کے سانپ کی بل کھاتی ہوئی ایک دُم تھی۔

قدردان! یہ سانپ بہت خطرناک ہے۔ اس کے کاٹے ہوئے آدمی کو صرف ایک چیز بچا سکتی ہے۔ اور وہ ہے۔ یہ فقیری دوا۔

اس نے پتھر کے چوکور ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

جس بھائی کو شبہ ہو اور وہ آزمانا چاہتے ہوں وہ ہمارے پاس آجائیں۔ ہم اس سانپ سے ان کو کٹوائے گا اور اس فقیری دوا کی مدد سے زہر کو منٹوں میں زائل کر دے گا۔

ہے کوئی ہمت والا، ہے کوئی جواں مرد، ہے کوئی بہادر نوجوان تو نکل کر سامنے آئے اور اس فقیری دوا کو آزما کر دیکھے۔

کوئی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی آپ کو اس کا ایک نمونہ دکھاتا ہے۔

سانپ کے دم کو چھوڑ کر وہ تھیلے کے پاس آگیا۔ اور تھیلے سے اس نے ایک سرخ رنگ کی ٹکیہ نکال لی۔

"قدردان! اس ٹکیہ کو ہم اس گلاس میں ڈالتا ہے۔ اس نے پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں ٹکیہ ڈال دی۔

قدردان! دیکھئے یہ پانی خون ہوگیا۔ اس کا رنگ خون کی طرح بالکل سرخ ہے۔

اب اس گلاس کو ہم اس بگی میں رکھے گا اور سانپ اس میں اپنا منہ ڈالے گا اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اس کا رنگ کیسا ہو جاتا ہے؟

اس نے گلاس کو بگی کے اندر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے بگی سے گلاس نکالا تو خون کا رنگ کالا ہو چکا تھا۔

قدردان! جس شخص کو یہ سانپ کاٹ لیتا ہے اسی طرح اس کا خون کالا ہو جاتا ہے
اب ہم آپ کو اس فقیری دوا کا کمال دکھاتا ہے۔
اس نے ایک پتھر کا ٹکڑا اٹھا کر گلاس میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گلاس کے پانی کا رنگ
پھر خون میں تبدیل ہو گیا۔

قدردان! دیکھا آپ نے اس فقیری دوا کا کمال۔ یہ تو اس کا صرف ایک کمال ہے
ایک گنڑ ہے۔ ایسے ایسے تو اس میں بیسیوں گنڑ چھپے ہوئے ہیں۔ اس کے
چند فائدے ہم اور آپ کو بتاتا ہے ــــ
کسی کو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ آپ اس ٹکیہ کو اس آدمی کی ناک کے پاس لے جائیں
فوراً ہوش میں آجائے گا۔ اور اگر مرگی کا مریض اسے اپنے پاس رکھے تو اسے
کبھی دورہ نہیں پڑے گا۔
اسی طرح کسی کو پرانا سے پرانا بواسیر ہو، اور لاعلاج بن چکا ہو۔ آپ اس دوا سے
صرف ایک ہفتہ سیکائی کر دیں مستہ گل کر راکھ ہو جائے گا۔
قدردان! اس کے اور بہت سے فائدے ہیں جن کا ذکر اس پمفلٹ میں تفصیل
سے چھپا ہوا ہے۔
اس نے پمفلٹ اٹھا کر ایک ایک کے ہاتھ میں تھما دیا۔
قدردان! اتنے سارے گنڑ اس فقیری دوا میں موجود ہیں۔ آپ سوچتے ہوں گے
اس کی قیمت بہت زیادہ ہوگی، لیکن نہیں ــــ قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ بالکل
مفت ہے۔ فقیر کی دی ہوئی چیز ہے اس کا دام کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں فقیر کے
نیاز کے لئے ایک معمولی سی رقم بطور چندہ ضروری لی جاتی ہے۔ اور وہ معمولی
سی رقم ہے ــــ ایک روپیہ ــــ صرف ایک روپیہ ــــ ایک روپیہ ــــ
ایک روپیہ ــــ ایک روپیہ ــــ ایک روپیہ ــــ جس کسی بھائی کو ضرورت
ہو آواز دے کر مانگ سکتے ہیں۔
"ایک ٹکیہ مجھے۔ ایک مجھے۔ دو مجھے۔ ایک.....
"ابھی دیا۔ ابھی دیتا ہے قدردان! ابھی آیا سرکار، آپ کو بھی دیا.....
کچھ دیر بعد ڈگڈگی والا روپئے گننے میں مصروف تھا۔

تقریباً آدھے سے زیادہ لوگ جا چکے تھے شاید وہ اس سے پہلے بھی ڈگڈگی کی آواز پر جمع ہو چکے تھے اور کچھ لوگ اس انتظار میں ابھی ٹھہرے ہوئے تھے کہ ڈگڈگی والا اپنا وعدہ پورا کرے گا یعنی تاج والے سانپ اور نیولے کی لڑائی ضرور دکھائے گا۔ شاید یہ لوگ ڈگڈگی کی آواز پر پہلی بار جمع ہوئے تھے۔ ☐

صبیح محسن
کراچی (پاکستان)

غالبِ نام آورم

ولیم شیکسپیئر نے تو بڑے بھولپن سے کہہ دیا تھا کہ آخر نام میں کیا دھرا ہے؟ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو، گلاب ہی رہے گا۔ موصوف یہ بات چار سو برس پہلے کہہ گئے تھے اس لئے قابلِ معافی ہیں۔ اگر آج ہوتے اور یہی بات کہتے تو اتنے ڈھیر سارے ڈرامے لکھ کر برسوں میں جو نام کمایا تھا۔ یہ شگوفہ چھوڑ کر اسے دم بھر میں گنواں دیتے۔ ویسے اُڑتی اُڑاتی ایک خبر ہم نے یہ بھی سنی ہے کہ خود یہاں شیکسپیئر کا بھی بس نام ہی نام ہے، کام تو کسی اور کا تھا۔ انگریزی ادب کے بعض محققین کا خیال ہے موصوف سے منسوب ڈرامے دراصل کسی اور ادبی شخصیت کی تصنیف ہیں جس نے مصلحتاً اپنی کارگزاری ان کے کھاتے میں ڈال دی۔ ہم بھی مصلحتاً اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ یہ معاملہ تو انگلستانی شیکسپیئر کا ہے۔ ہماری دانشوری کا بھرم کھولنے کے لئے تو مرحوم و مغفور انڈین شیکسپیئر کا ذکر ہی کافی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں نام ہی سب کچھ ہے۔ اگر گوبھی کے پھول کا نام گلاب رکھ دیا جائے تو اس کی قدر و منزلت بھی گلاب کے جیسی ہی ہونے لگتی ہے۔ یقین نہ آئے اُن نامور ادیبوں کے اخباری کالم پڑھئے جو کبھی ایک کثیر الاشاعت روزنامے میں چھپتے ہیں تو کبھی دوگنا معاوضہ لے کر اسی کے مدمقابل اخبار میں۔ اِن نیک نام بزرگوں نے پہلے نام کمایا اور اب اسی نام کے بوتے پر کام دکھائے بغیر نام کے دام وصول کر رہے ہیں۔ جہاں تک چمنستانِ ادب کے ان رشکِ گلاب ناموں کی اِن تحریروں کا تعلق ہے تو وہ حسن بیان اور بوئے معنی کے اعتبار سے گوبھی کے پھول سے بہتر نہیں۔

نام کی اہمیت کا اندازہ تو ہمیں بہت پہلے ہی ہو گیا تھا یعنی اس وقت جب کہ ہمیں ادیب بننے کا شوق نیا نیا لاحق ہوا تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ہم 'راہِ شارٹ (SHORT CUT) بلکہ قریب است' کے قائل رہے تھے اور مشکل سے مشکل امتحان میں خلاصوں اور متوقع سوالات کے جوابات ازبر کر کے بآسانی نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی راہ اختیار کی اور فکرِ سخن کا جھنجھال پالنے کے بجائے ایک نامور شاعر کی غزل اپنے نام سے ایک رسالے کو بھیج دی۔ ہمیں پیدا

یقین تھا کہ یہ غزل ضرور چھپ جائے گی۔ آخر اتنے عظیم اور باکمال شاعر سے فکر کا نتیجہ تھی۔ ہماری طرح سے کسی غافل کی تک بندی تو نہ تھی۔

لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند دنوں بعد وہ غزل بذریعۂ ڈاک ہمیں واپس مل گئی۔ اس کے ساتھ ایڈیٹر صاحب کا ایک مختصر سا رقعہ بھی تھا جس میں خیالات کے فرسودہ ہونے کی شکایت اور مصرعوں کے بحر سے خارج ہونے کی نشاندہی کے بعد ہمیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اگر شعر کہے بنا اور غزل چھپوائے بغیر کھانا ہضم نہیں ہو سکتا تو کم از کم کسی مستند شاعر سے اصلاح ہی لے لیا کریں۔

ہمیں اپنے منصوبے کی اِس ناکامی پر افسوس تو خیر ہوا لیکن یہ سوچ کر ہنسی بھی آئی کہ اگر ان شاعرِ گرامی قدر کو اپنی غزل کی اِس انداز کی پذیرائی کا علم ہو جائے تو وہ ازراہِ الفت مدیر موصوف سے چہرے کے جغرافیے میں یقیناً کچھ منہ بولتی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ کیوں کہ جہاں شعلۂ تپاں اور آتشِ سوزاں کا ذکر ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتا ہے وہاں یہ خصوصیات خود ان کی طبیعت میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اس قصے کا اور کچھ نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو، ہم پر اتنا ضرور عیاں ہو گیا کہ شاعری اچھی اور معیاری وہی ہوتی ہے جس کے ساتھ کسی نامور شاعر کا نام یا تخلص آتا ہو۔ یہاں زور 'نامور' پر ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ نام کی خاطر فیض کے اسباب از قسم پل، چاہ، تالاب وغیرہ بنوایا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں یہ کام افراد کے بس کے نہیں رہے، بلدیاتی اداروں اور حکومتوں نے ان کی ذمے داری اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ البتہ افراد کے لئے یہ ضرور ممکن ہے کہ حکومت میں یا کسی ادارے میں کوئی ایسی حیثیت حاصل کر لیں کہ دوسروں کو فیض پہنچا سکیں۔ فی زمانہ نام کمانے کے لئے اور ادب میں مقام پانے کے لئے اتنا بھی کافی ہے۔

ہمارا قصور یہ تھا کہ نام تو خیر ہمارے پاس تھا ہی نہیں، ملازمت بھی فیض رسانی والی نہیں تھی۔ ہم بھی اگر محکمۂ انکم ٹیکس یا قومی بینک میں کسی عہدۂ جلیلہ پر فائز نہ سہی، ٹیلی ویژن میں کسی منصب خفیفہ پر ہی مامور ہوتے تو ایک غزل کیا، کسی دوسرے شاعر کا پورا کا پورا دیوان بھی اپنا لیتے تو چھاپنے والے چھاپتے اور تنقید کرنے والے صدقے کا الزام تو دور رہا تو اردیا استفادے تک کی بات کئے بغیر ہمارے کلام بلاغت نظام کی تعریف و تحسین میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے۔

کچھ عرصہ ہوا ایک شاعرہ کا مجموعۂ کلام شائع ہوا۔ موصوفہ ایک تو ویسے بھی خوش شکل تھیں، اس پر سے غضب یہ کہ مدوسال کے اس مرحلے میں تھیں کہ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مرادوں

کی راتیں جوانی کے دن۔ چنانچہ ان کے اس شعری مجموعے کے خوب ہی چرچے ہوئے اور بڑی واہ واہ ہوئی۔ لیکن اسی ہنگامے کے دوران ایک صاحب نے جو مدت تک سٹل دیژن میں ایک بااختیار عہدے پر رہ کر خاصا نام کما چکے تھے اور خود کو از راہِ کسرِ نفسی فیض کے بعد دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر گردانتے تھے، یہ بیان اخبارات میں شائع کروادیا کہ موصوفہ نے ان کے بعض اشعار جوں کے توں اپنے کلام میں شامل کر لئے ہیں۔ ہم نے جب تحقیق کی تو پتہ چلا کہ واقعی وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔

ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ سرقہ تو خیر ازل سے ہوتا آیا ہے لیکن تجربہ کار اور ہنرمند لوگ عموماً کسی دو سو سال پرانے شاعر کا کلام چراتے ہیں تاکہ پتہ لگانے والوں کو بھی کچھ محنت کرنی پڑے۔ یہ کیا کہ ایک ایسے شاعر کے اشعار لے لئے جو نہ صرف یہ کہ بقیدِ حیات ہے بلکہ ابھی عمر کی اس منزل کو بھی نہیں پہنچا جہاں اسے مشاعروں میں جوش ملیح آبادی کی طرح دو آدمیوں کا سہارا لے کر آنا پڑے یا حفیظ جالندھری کی طرح اسٹیج پر پہنچتے ہی پاؤں پسار کر اور سر کے نیچے تکیہ لے کر استراحت کی ضرورت پیش آئے۔ چنانچہ ہم نے ادب کے ایک جیمس بونڈ سے رجوع کیا کہ وہی اس گتھی کو سلجھائیں۔

وہ ہماری بات سن کر مسکرائے۔ پھر بولے "بھئی اس میں حیرت کی کیا بات ہے — تمہارا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ سرقے کے لئے ہمیشہ کسی پرانے شاعر کا کلام چننا چاہئے۔ اور ان دونوں نے بھی یہی کیا ہے — چوک صرف اتنی ہوگئی ہے کہ دونوں نے ایک ہی قدیم شاعر کی ایک ہی غزل کے وہی اشعار لے لئے ہیں۔"

اچھا، تو یہ قصہ ہے۔" ہم نے معاملے کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "لیکن انہیں ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی سے تو احتراز کرنا چاہئے تھا۔ جب لوگوں کو اصل بات معلوم ہوگی تو دھبہ تو دونوں کے ناموں پر لگے گا۔"

اس پر جیمس بونڈ صاحب ایسے ہنسے جیسے ہم نے کوئی بڑی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ بولے "اگر ان دونوں نے واقعی اپنا دل لہو کر کے ایک بھی مصرعہ تر کہا ہوتا اور یوں نام کمایا ہوتا، تو نام پر دھبہ لگنے کا افسوس بھی ہوتا۔ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ موصوفہ نے اپنا چہرہ دکھا دکھا کر نام پایا، اور موصوف نے ٹی وی پر دوسروں کے چہرے دکھا کر۔"

اس کے بعد ہم اور کیا کہتے۔ چپ رہے۔

ویسے ان کی طرح کے خوش قسمت کم ہی ہوتے ہیں جو اتنی آسانی سے نام کما لیں کہ پھر اس کو

گنواتے ہوئے دل بھی نہ دکھے۔ ہم نے تو دیکھا ہے کہ شعبہ کوئی سا بھی ہو، نام پیدا کرنے کے لئے کام سے زیادہ یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ امیدوار اس شعبے کے صاحبان اختیار سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔ اور یہ عمل کم از کم ہماری جیسی بے لچک طبیعت رکھنے والوں کے لئے دل لہو کرنے سے، بلکہ کبھی کبھی تو خون کے گھونٹ پینے سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر میدان ادب کا ہے تو نام کا خواہشمند ایڈیٹروں اور تنقید نگاروں کی شان میں قصیدہ کہتا ہے، فنکاری کا ہے تو ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے پروڈیوسروں کی دربار داری کرتا ہے اور کھیل کا ہے تو سلیکشن بورڈ کے اراکین اور چیرمین کے آگے پیچھے ہوتا ہے ورنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ ٹیم میں شامل کئے جانے سے پہلے ہی ریٹائر کر دیا جائے گا۔ لیکن اس سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھئے گا کہ خدانخواستہ نام کے یہ امیدوار کسی کی خوشامد کرتے ہیں یا چاپلوسی سے کام لیتے ہیں۔ جی نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگلے وقتوں میں شاید ان کی اس قسم کی معصوم سی سرگرمیوں کو ان ہی ناموں سے پکارا جاتا رہا ہو، لیکن آج کل اِس کو پبلک ریلیشننگ کہتے ہیں۔

پرانے زمانے کے لوگ بھی عجیب تھے۔ پبلک ریلیشننگ کو خوشامد کہتے تھے تو ڈپلومیسی کو جھوٹ اور مکاری جیسے کریہہ ناموں سے پکارتے تھے۔ دراصل انھیں خوبصورت نام رکھنے کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ کسی اور چیز کا کیا ذکر، انسانوں تک کے نام تو ڈھنگ کے رکھ نہیں پاتے تھے۔ خدا بخش، اللہ دتہ غفورن، تمیزن۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوئے۔ آج کل کے نوجوان کے نام دیکھئے۔ شازلی۔ شرجیل، ایسا لگتا ہے کہ جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔ اور لڑکیوں کے نام تو سبحان اللہ۔ نذرانہ، نغانہ، شبانہ، ہم جیسے کمزور دل کے لوگوں کو تو یہ نام ہی دیوانہ مستانہ بنانے کے لئے کافی ہیں۔

دل آویز ناموں کا یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہیں۔ ہیئر ڈریسر اور گلوکار کتنے دلفریب نام ہیں۔ کچھ لوگ تو انھیں پُر فریب نام بھی کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں نہ ان پیشوں کی افادیت سے انکار ہے اور نہ ان سے متعلق افراد کی دل آزاری مقصود ہے۔ اس لئے ہم خیالِ خاطرِ احباب ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں پر ان پیشوں کے پرانے، غیر شاعرانہ اور خالی از فریب ناموں یعنی حجام اور میراثی کے تذکرے سے گریز ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمیں اپنا نام بہت پسند ہے۔ شاید دوسروں کو بھی اچھا لگتا ہو۔ یہ شبہ اس لئے پیدا ہوا کہ ایک صاحب نے اپنا بھی یہی نام رکھ لیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے ہمارے نام کو الٹ لیا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہی کیا ہے کیوں کہ جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ صرف نام ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ ہر طرح سے ہمارے الٹ ہیں۔ وہ یار باش آدمی ہیں، ہم اپنی کٹیا میں

بند رہنے والے۔ وہ کار نشین، ہم پیدل جوتیاں چٹخانے والے۔ وہ کیمرے کے استعمال میں ماہر، ہم قلم کو اناڑی پن سے ساتھ گھسنے والے۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ ان فاصلوں کے باوجود موصوف ادب کے شعبے میں نام کمانے کی ہماری کوششوں کو ایسا دھکا لگا گئے کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی ہم سنبھل نہیں پائے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب ہم نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں ماہنامہ "جھنکار" کا ادبی دنیا میں بڑا نام تھا۔ چنانچہ ہم اپنی تحریر لے کر اسی رسالے کے ایڈیٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ہماری توقعات کے خلاف وہ بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ مضمون رکھ لیا اور کہا کہ فرصت میں اطمینان کے ساتھ دیکھ کر اشاعت کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔ آخرکار جب ہم ان کے دفتر کے کئی پھیرے لگا چکے تو ایک دن سرپرستی کے انداز میں فرمایا "ٹھیک ہے۔ چھپ جائے گا مضمون۔ لیکن میاں صاحبزادے، اپنا نام کچھ اور رکھ لو۔"

ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ اسی نام نے تو ہمیں ادب کی طرف مائل کیا تھا اور یہ اسی کو بدلنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

ہم نے دل کڑا کر کے پوچھا "کیا خرابی ہے اس نام میں؟"

بولے "خرابی تو کچھ نہیں۔ لیکن ایک اور صاحب ہیں جن کا نام بھی یہی ہے۔"

"یہی تو نہیں ہے ـــــ اس سے ملتا جلتا، بلکہ اس کا الٹ ہے۔" ہم نے اس کی تصحیح کی۔

فرمایا "خیر۔ ہوگا۔ آپ کوئی اور نام رکھ لیں۔"

ہم عجیب مخمصے میں پڑ گئے۔ اگر ہمارے نام میں بھی ابن انشا کے اصل نام کی طرح کسی نوفٹا چوپائے کا ذکر ہوتا یا اے۔ ڈی۔ اظہر کے مکمل نام[2] کی طرح اللہ کی دین کا عوامی الفاظ میں اعتراف کیا گیا ہوتا تو ہم از خود اپنا نام بدل لیتے۔ لیکن اس اچھے بھلے نام سے، جس پر ہمارے مالکانہ حقوق چھٹے کے دن سے چلے آرہے تھے، دست بردار ہونا ہمیں گوارا نہ ہوا۔ ہم نے اپنا مضمون اٹھایا اور چلے آئے۔ اور پھر کبھی ادبی رسالوں کا رخ نہیں کیا۔

اس وقت ہمیں مدیر موصوف کا ہمارا نام بدلنے پر اتنا شدید اصرار کچھ عجیب سا لگا تھا کیونکہ ہمارے یہاں نہ تو کبھی ایک ہی تخلص والے شاعروں کی کمی رہی ہے اور نہ ملتے جلتے ناموں والی ادبی شخصیتوں کی۔ پھر ہم پر ہی یہ پابندی کیوں جب کہ اُن صاحب کا ادب کی دنیا سے کوئی واسطہ بھی

---

[1] شیر محمد [2] اللہ دتہ اظہر

نہ تھا۔

مگر بعد میں جب ہمیں ایک اور بات معلوم ہوئی تو پھر سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ قصہ یوں تھا کہ ہمارے ہم نام بلکہ الٹ نام ریڈیو سے وابستہ تھے۔ اس وقت تک ٹیلی ویژن نہیں آیا تھا اس لئے ریڈیو آج کی طرح بے آبرو نہیں تھا، بلکہ اس کی آن بان موجودہ دور کے ٹیلی ویژن سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ موصوف ریڈیو سے غزلوں اور گیتوں کا ایک پروگرام پیش کیا کرتے تھے جس میں وہ کبھی کبھار ازراہِ عنایت ماہنامہ پھنکار کے ایڈیٹر صاحب سے لکھے ہوئے گیت بھی شامل کر لیا کرتے تھے۔ بس یہی بات ہمیں لے ڈوبی۔ ایڈیٹر صاحب کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے مربی اس نام کے دوسرے دعویدار سے ربط و ضبط کی پاداش میں ان پر اپنی عنایتوں کا سلسلہ بند نہ کر دیں۔

تو یوں ہم نے اپنا پسندیدہ نام تو بچا لیا، مگر نام نہ پا سکے۔ ☐

نزہت صدیقی
ٹورانٹو، کینیڈا

کورچشم و کورعقل و کوردل

ہم دشتِ تمنا کے وہ گمراہ مسافر ہیں
جو سمتِ سفر کھو کے
اب بادیہ پیمائی اوہام میں گم
ہر سنگِ آوارہ کو
دانائے رموزِ عشاق سمجھ
کوچۂ لیلیٰ کا پتہ پوچھتے ہیں
جذبوں کا پگھلتا ہوا سیماب
نہ اب اشک رواں صورتِ سیلاب
کوئی خواب نہ اب خواب کی تعبیر
کہ ہم سوختہ تقدیر دیکھیں تو بھلا کیسے
نہ دل میں ہی اب ذوقِ تماشا ہے
نہ آنکھوں میں ہے بینائی کی تنویر
بولیں بھی تو کیا بولیں
اب حرف معنی سے تہی
جوہرِ گویائی سے محروم ہے تقریر
اور ہم ہیں کہ لب بستہ ہیں اور خوش ہیں
کہ گویا دہنِ زخم بھرا
ہم سا کوئی دیکھا ہے
کہ مر مر کے صبا جان کے تجھ کے بہار آئی
اور زہرِ ہلاہل کے ہر اک گھونٹ پہ اک نعرۂ مستانہ
لو ہم نے بقا پائی

انگبیں

تمھاری انگلیوں کے لمس کی سرگوشیاں
میری رگوں کے منجمد ہوتے لہو میں دائرے
تمھارے گنگناتے ہاتھ میرے جسم پر
مدھم سروں میں خواہشوں کی راگنی
دل کے سناٹے میں کیسے نغمگی کا رقص جاگا
تمھارے نم لبوں کی انگبیں میرے لبوں پر
میری زباں سے تلخیوں کے ذائقے کافور
کس طرح بے خواب آنکھیں
آرزو کے بار سے بوجھل ہوئیں
تمھارے بازوؤں کی راحتوں میں
ذہن کا الجھا ہوا ریشم اگر سلجھے تو سلجھے
یہ یقیں آیا
تشنگی کی تھاہ کیا ہے
یہ کسے معلوم
پر میں تشنہ لب، صحرا گزیدہ، آب نا دیدہ
تمھارے سایۂ ابرِ کرم میں ہوں
مجھے اس لطف کی برسات کے
اک ایک قطرے کی پذیرائی عنایت ہو

مقبل رحمید

پوسٹ بکس ۱۹۴۱۴
خیطان، کویت

محور

"کب آئے؟"

"کل ــــ"

"اور ــــ واپسی؟"

میرے شہر کے لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ یا تو گزرے ہوئے کل میں سانسیں لیتے ہیں یا پھر آنے والے کل کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور وہ جو آج ہے ــــ لمحۂ موجود ــــ اس کی طرف سے آنکھیں موندے مسلسل یکسانیت کے ساتھ اسے تلف کئے جا رہے ہیں۔ پھر جب ہوش آئے گا تو ہاتھ میں سوائے پچھتاوے کے اور بھلا کیا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں! لیکن بیتے دنوں سے رشتہ یکسر منقطع کرنا بھی نادانی ہے۔ اس طرح آدمی بے جڑ درخت جیسا تیز آندھیوں اور خوف کے طوفانی تھپیڑوں میں ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ تو پھر یوں ہو کہ ہمارے پاؤں صدیوں پرانی زمین کی سطح پر ٹکے رہیں۔ ہماری آنکھیں دور پار کناروں پر مرکوز اور ہم اس ہوا کو اپنی سانس بناتے رہیں جو ابھی ابھی چھو کر گزر رہی ہے۔ اور تم بھی میرے بھائی حد ہو۔ یہاں تو جس تیسرے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے وہ ویزے کا انتظار کر رہا ہوتا ہے اور ایک تم ہو کہ واپسی کی بات کر رہے ہو۔ کہاں گئے تمہارے وہ دلائل کہ دنیا بہت چھوٹی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ دوریوں اور نزدیکیوں کے اب وہ معنی نہیں جو کبھی تھے۔ وہ تم ہی تو تھے جو بڑے زور شور سے سفر کی تبلیغ کرتے تھے! "یہ ایک طرح کی کمزوری ہے ہم لوگوں کی کہ بس کنوئیں کے مینڈک بنے زندگی گزار دینا چاہتے ہیں، اپنے گھروندوں سے باہر قدم دھرنے کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں اور اپنے اس خوف کو جذباتی لگاؤ کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فاصلوں کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ دوریاں میلوں اور کلومیٹروں میں نہیں ناپی جاتیں۔ اب تو کچھ ایسی الٹ پلٹ ہو رہی ہے کہ مت پوچھو۔ بغل میں کھڑا ہوا دوست اور پہلو میں لیٹی نصف بہتر بھی کوسوں دور جب کہ کسی نیم تاریک گلی کے موڑ پر ادھ کھلی کھڑکی سے جھانکتی نگاہیں چراغ کی روشنی وقت اور فاصلے

کے کمرے میں لیٹی ہوئی ہونے کے باوجود کبھی اب تک ذہن کے گوشے میں جگنو بنی جھلملاتی ہے کہ زمانے اِدھر سے اُدھر ہو جائیں کیا مجال جو ذرا کی ذرا آنکھ سے اوجھل ہو یا دل سے دور —— اور پھر اسی زمین کے ایک خطے کی بات کیا، اب تو نئے آسمانوں کی کھوج میں ہیں ہم لوگ اِبھائی سب جہد للبقا کے تقاضے ہیں۔ کاوش کے ناخن سچائی کی پرتیں کھرچنے میں لگے ہوئے ہیں اور سچائی ہے کہ ہر آن ایک نیا سوانگ بھرے سامنے آتی ہے۔ بابا آدم اور ان کی پسلی سے برآمد ہوئیں ماما حوا کا قصہ، قصۂ پارینہ ہوا۔ بتدریج ارتقار کی تھیوری میں بھی پہلا سا دم خم نہیں۔ کائناتی دھماکے سے بس یوں ہی وجود میں آئی چکر کھاتی دھرتی پر بھی شبہات سر ابھار رہے ہیں۔ اب دروازہ ایک نئی سمت کو کھلا ہے۔ وہی جہد للبقا کے تقاضے والی بات۔ تو ہوا یوں کہ اَن دیکھی اَن جانی زمینوں پر بوجھ بڑھتا گیا بڑھتا گیا یہاں تک کہ ..... یا ممکن ہے انھوں نے خود اپنے اوپر یہ بوجھ لادے اپنی فضاؤں کو کثیف کیا اور اپنے پانیوں کو میلا —— اور اپنی حفاظت کو بہانہ بنا کر مہلک ہتھیاروں سے ایک دوسرے کو ہلاک کیا تو ان میں سے کچھ نے کہ آگے کی سوچ رکھتے تھے، آخری وقت کو قریب جان کر اپنی روحوں اور اپنے جسموں کے ٹکڑے نئی زمینوں کی سمت ذروں کی شکل پھونک دیئے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ساخت، کارکردگی، نسل درنسل تجربوں کی منتقلی —— یہ سارا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ کوئی اتفاقی دھماکا یا بتدریج ارتقار اس گتھی کو سلجھانے میں معاون نہیں ہوتا۔ تو بات ساری جہد للبقا کی ہے۔ خواہشوں اور تمناؤں کی رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے دوڑنے کی۔ اس ماہ کے مشہور ترین فلمی جریدے میں رجنی کا بیان پڑھا؟ سچائی کی پرتیں کھرچی ہیں یا ان پر کالک پھیری ہے، جو بھی کیا ہے خوبصورتی سے، سلیقے سے —— دراصل ساری بات رکھ رکھاؤ اور سلیقے کی ہے —— باقی تو بجھے —— جب گنگنشن چتر تھی کے پروگرام ہوتے تھے اور چوراہوں پر نصب کئے پنڈال میں جوشی بھاؤ کے تربیت یافتہ محلے کے لڑکوں کا آرکسٹرا گونجتا اور بائی اپنی سریلی تانوں میں لتا اور آشا کی تصویریں جگاتی! —— بائی کی آواز تو خیر تھی ہی قیامت کی لیکن سننے سے زیادہ بائی دیکھنے کی چیز ہوا کرتی تھی —— اسٹیج پر مائک کے سامنے اس کا سراپا، اس سر سے اس سرے تک ساری نظروں کو اپنی جانب یوں کھینچ لیتا جیسے مقناطیس لوہے کی باریک سلائیوں کو —— بائی کی مسکراہٹ بجلیاں گراتی اور بیک وقت ہزاروں دل ایک ہی سُر تال پر دھڑکتے۔

" دیکھنا رجنی تم ایک دن ٹاپ کی سنگر ہوگی۔ وہ رس ہے تمہاری آواز میں —— بس ایک آدھ پروگرام ہٹ ہو جانا چاہئے۔ اب کے پروگرام میں انڈسٹری کے کچھ خاص لوگوں کو کسی نہ کسی

طرح گھسیٹ کر شامل کرتا ہے۔ بس ایک بار، ایک ہی بار وہ تمھاری آواز سن لیں پھر تو جادو سر چڑھ کر بولے گا۔" لیکن وہ سنہرا موقع ہاتھ نہیں آیا۔ ممی اور انکل نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ جاڑے گرمیاں برساتیں، رُتیں بدلتی رہیں، موسم گزرتے رہے اور ہر گزرتے موسم نے ممی کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں چھوڑیں ــــ انکل حوصلہ بڑھاتے، امید دلاتے، لیکن دل ہی دل میں خود بھی بجھتے جا رہے تھے ــــ بڑی زبردست مناپلی سے مقابلہ ٹھہرا تھا۔ پھر بھی وہ کوششوں اور امیدوں کے دن پیارے تھے، سہانے تھے۔ وقت کتنی بے حس خاموشی سے چپ چاپ گزرتا چلا گیا۔ دھوپ چھاؤں چلتی رہی۔ رجنی نے دیکھا کہ وہ تو وہیں ہے جہاں سے چلی تھی۔ تب اس نے اپنی خواہشوں کے موسم کو ایک فصل سے دوسری فصل تک پھیلا دیا۔ اپنی کوششوں کی سمت بدل دی۔ آج وہ خود نہ سہی، اس کے اپنے جگر کا ٹکڑا، شیلو، کن آسمانی بلندیوں پر ہے۔

"پہچانا انکل کو؟"

"کیوں نہیں۔ کہاں رہے آپ اتنے دنوں؟"

چلو بھئی، جہاں تک گھما چلے ــــ کیسے کیسے کلکشنز ہوتے۔ ممی کتنا اچھا گاتی تھیں۔ کیا پیاری پیاری انڈراسٹینڈنگ تھی ان دونوں کے بیچ۔ اور ننھی شیلو، خواہشوں کے موسم میں، جلتی سانسوں کے لئے فرحت بخش گلابوں کی ٹھنڈک تھی۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے شیلو!"

"ہاں۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

"اور کیا سلسلے ہیں؟"

"بس یہی ایک دو فلمیں ہیں، وہی کر رہے ہیں۔"

"ممی نے بتایا تھا مجھے۔ آگے کیا پروگرام ہے؟"

"آگے کا پروگرام جو بھی ہوگا، تمھارے بغیر تھوڑے ہی بنے گا شیلو!"

شیلو سچ مچ کتنی بڑی ہو گئی ہے!

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ابھی پرسوں ہی وہ جو فرائڈ کی کھال ادھیڑنے پر اتر آئے تو اللہ کی پناہ۔ سیدھے بیچارے کے فرقۂ شب خوابی میں جا دھمکے۔ کہنے لگے فرائڈ کے تجزیوں والی بات میں کوئی دم نہیں۔ اس کا اپنی سالی سے چل پڑا تھا۔ اب اس عہد سے تہذیبی پس منظر میں اس کا احساس جرم وغیرہ.... تو بس اپنی ہی واردات کو دوسروں کے خواب کہہ کر الٹی سیدھی ہانکتا رہا

وہ جب بولنے پر آتے ہیں تو صرف ہونٹوں سے نہیں، ضخیم کتابوں، شائستہ محفلوں، اور دانشوروں سے اونچے پلیٹ فارموں سمیت بولتے ہیں اور اتنا زیادہ کتابوں کے بوجھ تلے آدمی دب جائے تو نظر کہاں آنکھ ہے! اب ان سے کون کہے کہ صوفی فرائیڈ نے ایک سمت تو دی ہیں۔ اب یہ سالی کو نیچ میں لاکر اس مٹکے سارے کے گھاٹ پر پانی تو نہ پھیریں۔ لیکن یہاں کون سنتا ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز مزہ تو اس روز آیا جب میں انجانے میں بے چہرہ آوازوں کے جنگل میں پھنس گیا۔ لائن کراس ہو رہی تھی اور میں منقطع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فوراً بعد شام کی پرواز ہاتھ کرنی تھی اور اپنے بزنس پارٹنر سے بات کرنا انتہائی ضروری تھا۔ دوسری طرف دوچاہت کے ماروں کی گفتگو تھی کہ چاشنی کے تار کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

"تو یوں کرو کہ اس ٹیری ٹری کا سودا تم سود صاحب پر چھوڑ دو اور رہا باقی علاقہ تو...."

"میرے دل کے علاقے پر تو بس تمہاری حکمرانی ہے جان!...."

"یہ آپ دل کی بات کیا لے بیٹھے...."

"دل کی نہیں رقم کی، رقم کی، میں کہہ رہا تھا... ہائیں کون ہے؟"

"تم تو بس کہتے رہو گے۔ کچھ کرو گے بھی۔ سنو۔ اب صبر نہیں ہوتا، تمہارے بغیر ایک پل جینا دشوار ہے...."

"...لیکن سود صاحب کتنے میں طے کرائیں گے...؟"

اس شام بمبئی سے دلی کی پرواز میں سارے راستے ان بے چہرہ آوازوں کو لکیر لکیر جوڑتا رہا اور پھر جو تصویریں بنیں تو حیران رہ گیا۔ اتنے جانے انجانے چہروں کے ہجوم سے خود میرا چہرہ بھی جھانک رہا تھا!

"اب سے کچھ ہی دیر بعد ہمارا وِمان دلی کے پالم ہوائی اڈے پر اترے گا جہاں کا تاپ مان بیالیس ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ آپ سے نویدن ہے کہ کرسی کی پیٹی باندھے رہیں اور دھوم پان نہ کریں کپتان جوگلیکر اور ساتھی کرمچاری آپ سے وداع لیتے ہوئے آشا کرتے ہیں پھر سے آپ کی سیوا کا اوسر پراپت ہوگا۔ دھنیہ واد۔"

ایسا موقع کون جانے پھر ملے نہ ملے۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں ـــــ کوئی دن جاتا ہے کہ یہ لوگ سارے کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لے کر باہر سے آئے ہوؤں کو چلتا کر دیں گے۔ یہی وقت ہے کچھ کرنے کا۔ لیکن کچھ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اتنا زیادہ تقسیم تو نہ کرو۔

یہ کیا کہ دل کہیں دماغ کہیں دست و پا کہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سمٹنے کے عمل میں آدمی تھوڑا سا بکھرتا تو ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ سوائیزرے کے اس سورج دیش میں سب کچھ کتنا غیر اصلی لگتا ہے۔ اگر یہی جنت ہے تو پھر اس کا یقین کیوں نہیں ہوتا؟ میرا ایک پاؤں باہر ہے اور دوسرا جنت کے دروازے میں۔ اور عین اسی وقت حکم ہوتا ہے کہ جاؤ جاکر روح قبض کرلو۔ بیچارے عزرائیل تو جانے کب سے یہی کر رہے ہیں لیکن بس یہی ایک موقع ہے کہ ان کی آنکھ نم ہوتی ہے۔ ایک پاؤں باہر اور ایک اندر — بڑا نازک مرحلہ ہے۔

شالو نے زلفیں ہلاکر بانہیں پھیلاکر کتنی بےباک سچائی کا مظاہرہ کیا تھا! وہ صحیح معنوں میں تیز، بےباک، دوغلی سوچوں سے دور، اپنی زندگی آپ جینے والی لڑکی ہے۔ اسے ممی کی شکایت آمیز نظروں سے خوف آتا ہے نہ ہی مسکراہٹوں پر ترس۔ جو تم اگلے نہ کرسکے، جو تم سے نہ ہوسکا اس کا حوصلہ شالو میں دیکھ کر، تعریف کے بجائے تنقید کرنا، ناراض ہونا، اس کی نظر میں ایک ایسا فعل ہے جس کا کوئی معقول جواز نہیں — کیا سوچ رہے ہو؟ اپنے دیواروں کے جال سے باہر آؤ اور کم از کم ایک سانس کی تو اپنی زندگی جی لو۔ جسے زندگی سمجھتے رہے وہ تو محض ردِ عمل تھا، مختلف حالات سے نمٹنے کا — اندر کے یا باہر کے کسی خوف کا ردِ عمل — اب تک جو کرتے آئے اب جو کچھ کر رہے ہو ذرا غور تو کرو کیا واقعی یہ سب اپنی طبیعت سے اپنے چاہنے سے ہے؟ اور جو نہیں تو پھر سمت کیوں نہیں بدلتے۔ لوٹ کیوں نہیں آتے۔ لوٹ کیوں نہیں آتے؟

اپنی دانست میں واپس لوٹتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے یہ تو آگے اور آگے کا راستہ ہے — پھر یہ سوچ کر آگے بڑھتا ہوں کہ اب تیچھے کیا پلٹنا تو معلوم ہوتا ہے میں تو اسی ڈگر پہ چلتا ہوا واپس آرہا ہوں — سچ پوچھو تو کچھ ایسی بےسمتی طاری ہوچلی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے اور وہ بھی کیا — حرکت میں ہیں بھی یا نہیں؟

دو ایک کام کریں۔ وہاں جاکر میرے لئے ویزے کا بندوبست ضرور کیجئے۔ میں یہاں بےطرح اوب رہا ہوں۔ اور وہاں آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ واپس کب جارہے ہیں؟" □

ف۔ س۔ اعجاز
کلکتہ

پانی کا تبسم

ـــــ ایک محور

اس شہرِ ملامت کی آبادی گلیوں میں یہ دل جو اکیلا ہے   ہر درد سے کھیلا ہے
نہ یاس کی انگڑائی نہ موجِ مسرت کا اب کوئی بھی ریلا ہے   جوں سانجھ کی بیلا ہے
کچھ دن سے بہت ویراں کچھ دن سے بہت حیراں پتھر کی طرح چپ ہے
بازارِ تمنا میں یکسر جو نہیں چلتا وہ کھوٹا ادھیلا ہے   اک زندہ جھمیلا ہے

اس دل سے الگ لیکن ہم کو تو یہ حسرت ہے اک یار کوئی ہوتا   دلدار کوئی ہوتا
آباد خرابے کی سنسان سی راہوں کا غمخوار کوئی ہوتا   فنکار کوئی ہوتا
ناگاہ لپکتا جو انبوہِ گریزاں سے باہوں میں جکڑ لیتا
اس ہوش کی بستی میں آوارہ محبت کا سرشار کوئی ہوتا   مے خوار کوئی ہوتا

ویراں بغیچے میں دو پل کو ٹھہر جاتے تالاب کنارے ہم   الفت کے بچارے ہم
کیا کیا نہ بچھل جاتے پھر عمرِ گذشتہ کی یادوں کے سہارے ہم   اک شوق کے مارے ہم
آلام و مصائب کے جو زخم ہوئے حاصل وہ زخم دکھا دیتے
اک روٹی کے چکر میں کیا کیا نہیں دیکھ آئے جب دن میں تارے ہم   پھانک آئے شرارے ہم

اب روٹی میسر ہے اور لوگ بھی ملتے ہیں پر دوست نہیں ملتا   جی سب سے نہیں ملتا
اس مطلبی دنیا میں معصوم فرشتوں کا ہر چاک نہیں سلتا   دل زخم نہیں گنتا
اس دورِ ترقی نے ہر حسنِ لطافت کو یوں روند کے رکھ ڈالا
ان کھردری سڑکوں پر اب ننگے قدم چلنے کو یار نہیں چلتا   چھالوں کی کسے چنتا

پھر نرگسِ رعنا کی ہر نیم نگاہی سے افسانوں کو دہراتے — ہر یاد کو چمکاتے
بدمست حسینوں کی گھنگھور سی زلفوں کے جب تنگ سے بل کھاتے — اور سینوں پہ لہراتے
اک ذوقِ تجسس سے ہم پھولوں کی چاہت میں جب ہاتھ جلا لیتے
یاد آتیں وہ راتیں بھی جب ساقیِ تمکیں کی آنکھوں میں نشہ پاتے — اور آنکھوں سے پی جاتے

پھر باتوں ہی باتوں میں ان بن کوئی ہو جاتی اس پار پرانے سے — فتنا نہ منانے سے
باز آتا نہیں ہرگز دونوں میں کوئی جھوٹے الزام لگانے سے — جھگڑے کو بڑھانے سے
دو آتشہ ہو جاتے، سہ آتشہ ہو جاتے، اک دورِ سبو چلتا
خاموش کبھی ہو جاتے، بیگانے کبھی بن جاتے، کچھ پینے پلانے سے — ہم جام لنڈھانے سے

اکتائے ہوئے غم کی ٹھہری ہوئی منزل سے پانی کو ہلا دیتے — کنکر سے جگا دیتے
تالاب کی سطح پر جو دائرے بنتے ہیں آنکھ ان پہ ٹکا دیتے — پلکوں کو بھگا دیتے
احساسِ ظرافت سے موجوں کا تموج جب ہونٹوں پہ چلا آتا
بھرپور ہنسی آتی پانی کے تبسم کی تعداد بھلا دیتے — ہر غم کو دبا دیتے

غزل

رنگ و بو کی آرزو کرتے رہو — آدمی ہو جستجو کرتے رہو
جو بھی زندہ ہے رہینِ مرگ ہے — خود کو تم وقفِ نمو کرتے رہو
اک نمازِ عشق پڑھنی ہے تمہیں — وقت ہے جب تک وضو کرتے رہو
من و سلویٰ آسماں سے آئے گا — روٹیوں کی گفتگو کرتے رہو
جب تلک جمتا نہیں ہے فرشِ زر — اور کبھی پانی لہو کرتے رہو
مشغلہ درکار ہے جینے تلک — چاک زیادہ ہیں رفو کرتے رہو

جب تلک جام و سبو ملتے نہیں
مے کدے میں ہاؤ ہو کرتے رہو

● خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ ابھی الفاظ کا پرانا افسانہ نمبر (۲) پڑھ کر رکھا ہی تھا کہ تازہ شمارہ آ گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ اس بار کاغذ سفید تھا لہٰذا طباعت اور بھی اچھی تھی۔ مجھے الفاظ کی کتابت بہت پسند ہے خصوصاً اس لئے کہ اس میں غلطیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ لکھنے والوں میں جانے پہچانے نام اور زیادہ ہوں تو کیا ہی اچھا ہو۔ آج کل میں افسانے کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ویسے میں عموماً تاریخ اور تنقید زیادہ پڑھتا ہوں۔

افتخار عارف صاحب ان دنوں الفاظ کے تازہ شمارے کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے اردو مرکز کا وسطی لندن میں ایک دارالمطالعہ ہے وہاں بھی الفاظ مستقل آتا رہے تو اچھا ہوگا۔

وقار احمد سلام عرض کر رہے ہیں، علیگ کے جملہ احباب کو میرا سلام عرض کر دیجئے گا۔

رضا علی عابدی لندن، برطانیہ

● الفاظ کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ مجنوں پر فراق کا مضمون دلچسپ اور اچھا ہے۔ مجنوں اس خراج کے مستحق ہیں اور بہت دن سے تھے جسے آپ نے ادا کر دیا۔

سردار جعفری، بمبئی

● ممنون ہوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی وساطت سے الفاظ کا ہر شمارہ مجھے مل رہا ہے۔ جب انڈیا سے کوئی ادبی پرچہ یہاں پہنچتا ہے تو میں اسے آنکھوں سے لگاتا ہوں اور آپ حضرات کو سلام کرتا ہوں کہ نامساعد حالات میں بھی یہ گھاٹے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ تازہ غزل حاضر ہے۔

قتیل شفائی، لاہور

● الفاظ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ دل کی تہوں سے آپ کا شکریہ ادا کیا۔ میرے لئے اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے آپ جیسے مخلص دوستوں کو اب بھی میری یاد کسی نہ کسی صورت باقی ہے۔

تازہ شمارے میں افسانوں کا حصہ بہت خوبصورت تھا۔ جوش صاحب والا مضمون بھی نہایت دلچسپ تھا۔ پاکستانی ادیبوں کی نگارشات بھی کافی ہیں۔ پرچہ پڑھنے کے بعد میں نے مشہور عالم اور نقاد جناب مظفر علی سید صاحب کو بھیج دیا۔ وہ آپ کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم دیجئے گا۔

منیر احمد شیخ، اسلام آباد (پاکستان)

● الفاظ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے آپ کے بھیجے ہوئے الفاظ مل جاتے رہے ہیں۔ میں آپ کے

ادارے کا اور آپ کا بڑا معترف ہوں۔ آپ اردو کے لئے جس لگن اور تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ پھر یہی نہیں آپ کی کتابیں اپنے موضوع کے علاوہ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتی ہیں۔ یہ آپ کا ذوق ہے جو کتاب کو خوبصورتی دیتا ہے۔

الفاظ ہمارے ہاں اچھے رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نے اسے جو ایک خاص مزاج دیا ہے اس نے اسے بڑی وقعت دے دی ہے۔ یہاں ہم لوگ اس کے اگلے شمارے کے منتظر رہتے ہیں اور نئے رسالے پر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ الفاظ اور بھی پھلے پھولے اور اردو ادب کی ترقی کے لئے اپنا اہم کردار احسن طریقے پر ادا کرتا رہے۔

ذوالفقار احمد تابش، لاہور، پاکستان

● الفاظ کا شمارہ بھیجنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی ادبی کاوش لائق تحسین ہے۔ آپ اور آپ کے شرکائے کار ہندوستان میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ بلاشبہ قابل قدر ہیں۔ میں اب جاپان سے چین منتقل ہو چکا ہوں۔ شاید آپ کو علم ہو کہ ریڈیو بیجنگ سے اردو اور ہندی کی باضابطہ نشریات کا سلسلہ ہے۔ مزید یہ کہ جامعۂ بیجنگ میں گزشتہ تیس برس سے اردو کا شعبہ قائم ہے۔ بیجنگ کا بیرونی زبانوں کا شعبہ گاہے بگاہے اردو کی تصنیفات شایع کرتا رہتا ہے۔ چین باتصویر جو کہ ایک مصور مجلہ ہے ہر ماہ پابندی سے اردو میں شایع ہوتا ہے۔ اپنے احباب کار کو میری طرف سے ہدیۂ تہنیت پیش کیجئے گا۔

کرامت اللہ کے۔ غوری، بیجنگ، (چائنا)

● الفاظ کا شمارہ (مجنوں گورکھپوری) ملا۔ بے حد مشکور ہوں۔ اس کا انداز اور اسلوب پسند آیا۔ خالص ادبی رسالہ ہے اور ہندوستان میں اردو کی خدمت۔ آپ کا جذبہ قابلِ صد ستائش ہے۔ احباب کی خدمت میں آداب۔

ارشد میاں، جدّہ (سعودی عربیہ)

● الفاظ کا تازہ شمارہ ملا۔ الفاظ ایک بہت خوبصورت کاوش ہے اور اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اردو ادب کی ڈوبتی ہوئی نبض میں آپ نے جو جان ڈالنے کی کوشش کی ہے اس کے لئے آپ لائق صد تحسین ہیں۔

خورشید اقبال مغل، دوحہ (قطر)

● آج ہی الفاظ کا نیا شمارہ ملا۔ اسے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آپ کا الفاظ کافی ضخیم لگا اور بلاشبہ یہ ہندوستان کا خالص ادبی پرچہ ہے۔ اس کے علاوہ طباعت اور کاغذ بھی قابل تعریف ہے۔ الفاظ جیسے ادبی پرچہ کی ترقی کے لئے میری نیک تمنائیں اور پرخلوص دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔

محمد سعید کوکب، دوبئی (م۔ع۔ا)
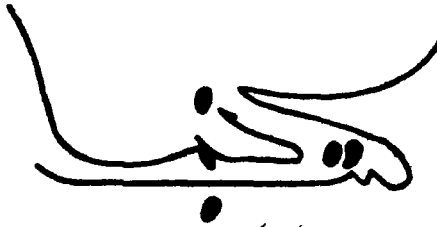
(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری
صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

۱۔ شاد کا عہد اور فن ، ۲۔ کشکول ، ۳۔ لذت لفظوں کی ، ۴۔ کھلی جو آنکھ ، ۵۔ بیسویں صدی ، ۶۔ دید و دریافت ، ۷۔ تصنیف ، ۸۔ دستک ، ۹۔ قومی آواز کا پبلشر نمبر ، ۱۰۔ آنکھیں اور پاؤں ، ۱۱۔ ہمارے پسندیدہ افسانے ، ۱۲۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے ، ۱۳۔ غالب شخص اور شاعر ، ۱۴۔ انیس شناسی ، ۱۵۔ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ، ۱۶۔ عکس تمنا ،

شاد کا عہد اور فن

○ مصنف نقی احمد ارشاد ، مرتب اسمٰعیل حسنین نقوی ○ تقسیم کار: شاد عظیم آبادی میموریل کمیٹی ، حق بلڈنگ ، پٹنہ ○ ۳۰ روپے

زیر نظر کتاب اردو کے عظیم غزل گو حضرت شاد عظیم آبادی سے متعلق ہے جو ان کے پوتے نقی احمد ارشاد نے بڑی جانفشانی سے مرتب کی ہے۔ ارشاد صاحب سرکاری مناصب سے متعلق رہے ہیں لیکن اس کے باوصف بڑی دیدہ ریزی کے علمی و ادبی و تحقیقی کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ شاد عظیم آبادی کی چودہ تصانیف کو بڑی محنت سے شایع کیا اور انھیں تلف ہونے سے بچایا بلکہ خود بھی کتابیں لکھیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعے سے شاد کے علمی، ادبی اور تہذیبی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کی جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں جس سے ہم اس زمانے میں پہنچ جاتے ہیں جس کے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں انھوں نے شاعری کی۔ شاد ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو جب بغاوت کا نام دیا گیا تو سارا ملک افراتفری کا شکار ہو گیا۔ ہر طرف تباہی اور بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاد عظیم آبادی نے اس ملبے میں سے بہت کچھ نکالا۔

شاد کی ادبی خدمات بے انتہا ہیں۔ انھوں نے مرثیے بھی لکھے اور مثنویاں بھی۔ ناول بھی لکھا لیکن ان کی ادبی شہرت کا انحصار ان کی غزلیات پر ہے۔ شاید لوگوں نے دوسری طرف توجہ نہ کی۔ حالانکہ ہر جگہ وہ صف اوّل میں رہے۔ نیاز فتحپوری نے تو ان کو نصف صدی کا سب سے بڑا غزل گو تسلیم کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اردو غزل میں ان کی نغمگی کے میں ہندی لب و لہجے

کے رس کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے اردو غزل کو ایک نئی آواز سے آشنا کیا۔

ہمیں خوشی ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد نے اپنی گوناگوں معروفیات میں سے وقت نکال کر اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور بہت سے چھپے ہوئے حقائق کو سامنے لائے۔ انھوں نے کتنے حقائق کو زمانے کی دست برد سے بچا لیا اور شاد عظیم آبادی پر کام کرنے والوں کے لئے اتنا مواد فراہم کر دیا کہ ابھی بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ایسے گوشوں کی نشاندہی کی ہے جہاں سے کتنی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف محققین کے کام آئے گی بلکہ شائقین شاد بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔

کشکول ○ کمال احمد ○ شاداب کتاب گھر ۳۴/۱د، سر سید احمد روڈ، کلکتہ ○ ۱۵/..

"کشکول" کمال احمد کے چار ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے مختلف مسائل پر لکھے گئے۔ مصنف نے "احوالِ غیر ضروری" کے عنوان سے اس کا پیش لفظ خود لکھ کر اپنا تعارف کرایا ہے جو خاصا بے تکلفانہ انداز سے لکھا گیا ہے اور جس کو پڑھ کر ہم مصنف سے قریب ہی نہیں ہوتے بلکہ بے تکلف ہو جاتے ہیں اور ہمارے پڑھنے کے شوق کو ہوا دیتے ہیں ــــ اور ہم ڈرامے کے مطالعے کے دوران میں نہ صرف ان ڈراموں کی فنی حیثیت کی جستجو کرتے ہیں بلکہ مصنف کے اشارے کے مطابق ان کو تلاش بھی کرتے رہتے ہیں۔ تاہم ڈراموں کی فضا میں وہ عدم سنجیدگی نہیں ملتی جس کی جھلک ہمیں "احوالِ غیر ضروری" میں نظر آتی ہے۔ مصنف کی شخصیت ان ڈراموں پر یقیناً اثر انداز ہے اور کرداروں کا ان سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہ ڈرامے یقیناً بے حد دلچسپ ہیں۔ اسٹیج پر پیش کرنے میں تو یقیناً دقت پیش آئے گی لیکن ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بہ آسانی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مصنف نوجوان ہیں محض ادب، ڈرامے اور اسٹیج سے ہی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ زندگی اور اس کے مسائل سے بھی دلچسپی لیتے ہیں ــــ اور جہاں کوئی مسئلہ ذہن میں آیا کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں ــــ قلم برداشتہ۔ اس لئے یہ چاروں ڈرامے "اوریجنل" ہیں، ہر اعتبار سے۔ ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے اپنے دل و دماغ کے علاوہ کسی اور کا کوئی اثر نہیں لیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے اچھی بات بھی ہے کہ مصنف کی "اپنی" اور "بجنلٹی" مجروح نہیں ہوتی اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر وہ ڈرامائی ادب کا مطالعہ کریں تو اپنی صلاحیتوں سے اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کلکتہ میں اسٹیج بھی ہے اور ڈرامے کے بڑے آرٹسٹ بھی۔ ایک شاندار فضا ہے جو اگر کسی فن کار کو سازگار ہو تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ کمال احمد کے اندر تخلیقی صلاحیت ہے جس کا پتہ ان ڈراموں سے چلتا ہے ــــ ان کے لئے حوصلہ افزائی کی کمی نہیں ــــ جی چاہتا ہے کہ کمال ان سب سے پورے طور پر فائدہ اٹھائیں ــــ کہ اردو ڈرامے میں غیر معمولی امکانات ہیں ــــ میں قارئین سے ان ڈراموں کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں۔

لذّت لفظوں کی ○ راج نراین راز ○ سمت نامہ پبلی کیشنز، ۴۸/۲ راجندر نگر نئی دہلی ○ ۱۵ روپے

پچھلی دو تین دہائیوں سے اردو شاعری بڑی پُرپیچ راہوں سے گزری ہے۔ اس عمل میں قاری اور شاعر کا رشتہ برابر ٹوٹتا اور جڑتا رہا ہے۔ ادب کے بہت سے مسائل اٹھے، کبھی سلجھائے گئے، کبھی الجھائے گئے ــــ لیکن ان کا حل نہ نقادوں کے پاس تھا اور نہ قاری کے پاس ــــ کیوں کہ نقاد مصلحت اندیش ہوتا ہے اور قاری بے بس ــــ ایسے موقع پر شعراء کے قبیلے ہی سے رہنمائی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ راز جدید شاعر ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے روایتی اصطلاحوں سے شاید کم ہی مدد ملے۔ اور اسی لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا کلام نقادوں کی مدد کے بغیر پڑھا جائے۔ ان کے یہاں تفہیم کا مسئلہ پریشان نہیں کرتا کیوں کہ علامتیں ان کے یہاں مسائل پیدا نہیں کرتیں، وہ ان کے فکری پس منظر سے ابھرتی ہیں اور ہم ان کو بڑی آسانی سے دریافت کر لیتے ہیں اور شعر چیستاں نہیں بنتا ــــ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" والی بات ہے۔ یہاں جذباتیت نہیں ہے اور اسی لئے وہ اپنا دامن سطحیت سے بچا لیتے ہیں۔ راز دلِ درد مند رکھتے ہیں۔ سارا انسانی معاشرہ ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے درد و کرب کو محسوس کرتے ہیں اور یہ درد و کرب ان کی شخصیت میں گھل مل کر شعری پیکر اختیار کرتا ہے۔ شاید اسی لئے باقر مرحوم نے انھیں "متحرک شعری احساس" کا شاعر کہا ہے۔

نظم کا فن مشکل فن ہے اور یہیں شاعر کی شعری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل شاید اسی لئے مقبول ہے۔ لیکن راز نے اپنی نظموں میں جدید ذہن کے فکری کرب کا احاطہ کیا ہے۔ بقول محمود ہاشمی "ان کے سامنے تاریخ کا شجرہ پھیلا ہوا ہے اور وہ اس طویل و بسیط میثاق پر اپنے ذہن کی مختلف کیفیتوں کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ ان کی نظموں میں 'روحِ عصر' جلوہ فگن ہے۔ یہ روح سیاست کی نہیں، انسانی شخصیت کی روح ہے۔" "سوچ" ــــ ان کی ایک سادہ سی نظم ہے۔ ملاحظہ ہو:

میرے بزرگوں نے بوئی تھی / فصل کٹیلے کے پھولوں کی / سوچ رہا ہوں / میں کیوں کاٹوں / میری نسل کی شریانوں میں / دوڑ رہا تھا خون جو کل تک / آج اس کی رنگت ہے بدلی / اس میں تھی جو پیار کی گرمی / مہر و وفا کی جو خوشبو تھی / جانے کیا کس سمت گئی وہ / کوئی نشانی اب نہیں باقی / رشتوں کی پہچان کسے ہے / فصل کٹیلے کے پھولوں کی / حدِ نظر تک لہراتی ہے / فصل بزرگوں نے بوئی تھی / سوچ رہا ہوں / میں کیوں کاٹوں /

یہ نہیں کہ راج نرائن راز غزل نہیں کہتے۔ ان کی غزلیں ان کے اپنے لب و لہجے کی غماز ہیں ــــ اور یہ بات برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ان کی غزل میں روایت سے انحراف ہے لیکن زندگی کے گہرے عرفان نے ان کے اشعار میں ایک نیا لب و لہجہ پیدا کر دیا ہے۔ چند اشعار

ملاحظہ ہوں ؎

سمٹا تو بنا پھولوں کی خوش رنگ قبا میں — بکھرا ہوں تو خوشبو کی طرح پھیل گیا ہوں
تم چھپ گئے تھے جسم کی دیوار سے پرے — اک شخص پھر رہا تھا تمہیں ڈھونڈتا ہوا
شاید ہوائے تازہ کبھی آئے اس طرف — رکھا ہے میں نے گھر کا دریچہ کھلا ہوا
کیا بات تھی کہ ساری فضا بولنے لگی — کچھ بات تھی کہ دیر تلک سوچتے رہے
مجھے تلاش کریں گے نئی رتوں میں لوگ — میں گہری دھند میں لپٹا ہوا جزیرا ہوں

ہر چند مجموعہ کلام مختصر ہے لیکن اس میں بھرتی کا ایک شعر بھی نہیں۔ رازؔ کم کہتے ہیں لیکن غور و فکر کے بعد کہتے ہیں۔ علامتوں کے دھند لکے میں قاری کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتے۔ بلاشبہ رازؔ کی شاعری صاف ستھری شاعری ہے اور ہمارے شعری ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے قارئین کو چاہئے کہ وہ جدید شاعری کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے راج نرائن رازؔ کا مجموعہ کلام ضرور پڑھ لیں اور تب صحیح معنوں میں وہ جدید شاعری کے امکانات کا بھی اندازہ کر سکیں گے۔

کھلی جو آنکھ (افسانے) ○ شفیع جاوید ○ طارق احمد، ۱۷۶/۸ ہیوپلز کوآپریٹو کالونی۔ کنکر باغ، پٹنہ ○ ۳۰ روپے

زیر نظر مجموعہ میں شفیع جاوید کے ۱۶ مختصر افسانے ہیں۔ شفیع جاوید چند برسوں سے لکھ رہے ہیں اور اب اردو افسانوی ادب میں ان کا اپنا مقام ہے۔ یہ مقام شاید اس لئے بھی ہے کہ جدید افسانہ نگاروں میں چند ایسے ہیں جن کا اپنا اسلوب ہے یعنی وہ اپنی بات اپنے انداز سے کہنا جان گئے ہیں۔ ان کے یہاں جدت برائے جدت نہیں ہے بلکہ ان افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کا قلم ان کو پہچانتا ہے اور ان کے اشارے پر چلتا ہے۔ شفیع جاوید نے ماضی کی یادوں کو کریدا ہے اور حال کی زندگی کے کرب کو بھی محسوس کیا ہے۔ ماضی کی یادوں کو کریدنا فیشن بن گیا ہے۔ تاریخ فلسفہ اور فنون لطیفہ کی کتابوں کی مدد سے اپنے افسانوں کا تار و پود تیار کرنا بعض افسانہ نگاروں کا فن ہے۔ شفیع جاوید اس معاملے میں ان سے مختلف ہیں۔ وہ اپنی کہانی کہتے ہیں اور کہتے کہتے ایک "ناسٹلجیا" میں کھو جاتے ہیں۔ اس عمل میں ان کے پڑھنے والے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ وہ بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس لئے کہ غالب نے تقریر کی لذت کے بارے میں جو کہا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ بھی ہمارے دل کی بات ہے۔ اس کے اس ناسٹلجیا کے پیچھے ہمارے اپنے پورے عہد کی روح کا نچوڑ نظر آتا ہے۔ اور اس کے پیچھے ان کا سماجی شعور۔ وہ افسانہ لکھتے لکھتے اس کی باگ ڈور چھوڑ نہیں دیتے اور ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے ہاتھوں کی گرفت کتنی مضبوط ہے — شکست۔ غزالاں تم تو واقف ہو، سچ یہ ہے، مورکھ من جنم گنوائیو، آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی کے ایسے ہیں جہاں انسان

روپیوں کے پیچھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ رہا ہے اور جب واپس آتا ہے تو جیسے کوئی گم شدہ شے کو تلاش کر رہا ہو۔ پیسوں کے پہیے اس کے پاؤں میں لگے ہیں اور وہ سارے گلوب پر اسکیٹنگ میں مصروف ہے۔"

شفیع جاوید کے یہ افسانے ایک بڑے فن کار کے مستقبل کا اشاریہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے تو تاریخ کے صفحات ان کے لئے اپنا دامن واکریں گے۔ افسانوی ادب کو پچھلے دنوں جو جھٹکے لگے اس کو شفیع جاوید یقیناً سنبھال سکتے ہیں۔ یہ کتاب قاری اور نقادوں کی توجہ کی مستحق ہے۔

بیسویں صلیب

(شعری مجموعہ) ○ شان بھارتی ○ مکتبہ کنول، سجوا، دھنباد ○ ۱۲ روپے

شان بھارتی نے بڑے انکسار اور عاجزی کے ساتھ اپنا پہلا مجموعہ کلام پیش کیا ہے۔ ۹۶ صفحے کے اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں ـــ اس زمانے میں شعر و شاعری کا چرچا پھر بڑھ گیا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو ہوتا آیا ہے۔ جہاں شعر وادب نے کروٹ لی، سب نے اپنے رخ اسی طرف موڑ لئے آج اکثر شعرا کے کلام کا عالم یہ ہے کہ اگر ہم ایک پر دوسرے کا نام لکھ دیں تو محسوس نہ ہو۔ مشاعرے میں لگتا ہے کہ کوئی ایک شخص مختلف لوگوں کو غزلیں بانٹ رہا ہے۔ تاہم مستثنیات بھی ہیں۔ شان بھارتی کا کلام اس راستے سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں تازگی اور نیا پن ہے۔ البتہ نظموں میں وہ بات نہیں۔ تاہم وہ نوجوان ہیں اور شعر کہہ رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ وہ اساتذہ کی گرفت سے آزاد ہو کر شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہوں تو کیا کہ مجھے بھاگیا اندھیرا بھی — دیا جلا کے بس آفتاب کیا کرتا

تاریکی کو اوڑھ کے سوئے — دھوپ ملی تو جھانک رہے ہیں

کسے خبر تھی کہ ایسا بھی ذائقہ ہوگا — مرے لہو کا مرے لب پہ ذائقہ ہوگا

یہ کون سا انداز ہے چاہت کا بتادو — جی اپنا لرز جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

شان بھارتی کے یہاں ایسے کتنے اشعار ہیں، لیکن ان کا مطالعہ کرنے کے لئے "بیسویں صلیب" مطالعہ کرنا ہوگا۔ کتاب صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔

دید و دریافت

(حصہ اول) (بدایوں کے چند شعرا پر تحقیقی و تنقیدی مضامین ○ شمس بدایونی ○ روش پبلی کیشنز ○ ۱۲ روپے

شمس بدایونی کے ۱۴ مضامین کا یہ مختصر مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دائرہ محدود ہے اس لئے مضامین کا رینج بھی زیادہ نہیں۔ "بدایوں ـــ ایک تعارف" ہر چند بدایوں کی ایک اجمالی

تاریخ ہے لیکن اس کے اندر معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ شمس صاحب بنیادی طور پر محقق ہیں اور بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ معلومات فراہم کرتے ہیں اور بغیر حوالے کے کوئی بات نہیں کرتے۔ موصوف نے بیخود بدایونی، فانی، شمیم، لوٓلا، علی عالم، فوق سبزواری پر بڑی دیدہ ریزی سے مضامین لکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مضامین محققین کے لئے خاصا اہم مواد فراہم کریں گے اور تحقیق کے نئے دریچے کھولیں گے۔

تصنیف (مجموعۂ کلام) ○ راہی فدائی ○ ادارۂ صغیر، باقیات صالحات، ویلور (ٹمل ناڈو)

راہی فدائی کا یہ مجموعہ کلام ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ راہی کی غزلیں مختصر اور نامانوس بحروں میں ہیں اس لئے ذہن میں اکدم سے دھکا لگتا ہے لیکن جب ہم غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو بہت جلد ان سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ صرف یہ کہ خیال میں تازگی ہے بلکہ ان کا اسلوب بھی ذرا ہٹا ہوا ہے۔ انھوں نے غزل کی فطری صلاحیت سے بڑا کام لیا ہے اور بقول فاروقی "سنجیدہ قاری کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا"۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ بڑے شوق سے پڑھا جائے گا کہ یہ ایک اچھے شاعر کی بشارت دے رہا ہے۔
ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

روک دے گردش ایام کو بڑھ کر کوئی — لمحہ سخت کوئی سوال رواں پر رکھے
جوہر نا تمام کو نہ تراش — اپنی ہی انگلیوں پہ ہوگی خراش
روشنائی اسی پہ پھیل گئی — جس پہ میں صاد کرنے والا تھا

مجھے راہی کی اگلی تصنیف کا انتظار ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا فن مزید پختہ ہوگا۔

دستک (ماہنامہ) ○ ادارہ: امجد انصاری، مسعود ابدالی ○ حنا پبلیکیشنز

ADDRESS: 7339 MAR VISTA DR. HOUSTON, TX 77083, (713), 933-8629.
U.S.A.

"دستک" سرزمین ہندو پاک سے بہت دور امریکہ سے کچھ نوجوانوں نے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ ایک رسالہ نکالنا اردو کے اپنے علاقوں میں کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ پھر غیر ممالک میں یہ کام کرنا گویا بال ہٹ کا ثبوت دینا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ اردو کے خادم ہیں جو اپنی یافت کو جمع کرنے کے بجائے ایک پودے کی آبیاری میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے حوصلے اپنی جگہ پر لیکن ہماری دعا یہ ہے کہ حالات بھی ان کے لئے سازگار ہو جائیں۔
"دستک" نکالنا ایک اہم قدم ہے لیکن اتنا خوبصورت کہ اگر ہم یہ کہیں کہ طباعت اور

کاغذ کا معیار تو ہم کو بھی نصیب نہیں۔ مضامین، نظم و نثر کی دلچسپی کے پیش نظر ہم نے شوق سے پڑھا اور رشک سے دیکھا۔ ہندوستان و پاکستان کے جانے پہچانے ادیب و شاعران صفحات میں نظر آتے ہیں نئے اور پرانے سب ہی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ پابندی سے شایع ہوتا رہے گا کیونکہ کارکنوں کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ ہم اردو کے ادیبوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات ادارۂ "دستک" کو براہ راست ارسال کریں ــ ہم لوگ ان کے لئے دعاؤں کے علاوہ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔

روزنامہ قومی آواز نئی دہلی کا اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی، مرتب: اطہر عزیز قیمت: ۲۰/۰۰ سائز ۱۸×۲۲/۴، ضخامت ۴۴۴ صفحات

روزنامہ قومی آواز نئی دہلی نے اپنی اشاعت کے چند روز کے اندر شمالی ہند کی صحافت میں ایک مقام حاصل کرلیا۔ یوں تو یہ روزنامہ برسوں سے لکھنؤ سے شایع ہو رہا ہے لیکن دہلی کی اشاعت نے ہر اعتبار سے پڑھنے والوں کا دل موہ لیا۔ چنانچہ جب اس نے اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر کا اعلان کیا تو ہر ایک متوجہ ہوگیا۔ حالانکہ زیر نظر شمارہ اپنے اعلان کے پونے دو سال بعد نکلا، لیکن جب نکلا تو سارے گلے جاتے رہے۔ یہ شمارہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے کہ اس نے پہلی بار اردو بک سیلرز اور پبلشرز کی طرف دھیان دیا اور اردو کی اشاعتی سرگرمیوں کا علاقائی طور پر جائزہ لیا۔ اشتہارات کی شکل میں تقریباً تین ہزار اردو کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ اس شمارے میں اردو اشاعتی اداروں کا جائزہ، ان کے مسائل اور ان کی اشاعتی سرگرمیوں کا حال ہے۔ اس کے علاوہ پبلشرز، کتب فروش، مصنفین اور اردو رسائل و اخبارات کے پتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شارب ردولوی، نسیم انہونوی، ایس۔ اے۔ رحمٰن اور اسد یار خاں، خواجہ ذکی احمد کے مضامین خاص طور پر توجہ طلب ہیں کہ انھوں نے بعض بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اس خاص نمبر کی ایک کمزوری یہ ہے کہ اطہر عزیز صاحب نے اس میں شعر و ادب کا ایک انتخاب بھی دیا ہے جو اس نمبر سے غیر متعلق ہے لیکن شاید یہ اس لئے ہے کہ اطہر عزیز صاحب کو عام پڑھنے والے کی دلچسپی کا بھی خیال ہے ورنہ اس نمبر کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح اسد یار خاں (پروپرائٹر ایجوکیشنل بک ہاؤس "الفاظ") نے لکھا ہے اگر ہم کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دارالمصنفین، ترقی اردو بورڈ اور دوسرے ناشرین کے خیالات بھی پڑھنے کو ملتے تو صحیح اندازہ ہوتا نیز اردو کی مختلف ریاستی اکیڈمیاں اگر قومی آواز کے ادارہ کے ساتھ تعاون کرتیں تو اس شمارے کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ تاہم عام پڑھنے والے کے لئے ایک بہت اچھا ادبی انتخاب بھی شامل اشاعت ہے جس میں اردو کے صف اول کے نقاد، افسانہ نگار اور شعرا میں سے بیشتر شامل ہیں۔ اور اس کی ادبی حیثیت کو اور زیادہ قابل وقعت بناتے ہیں۔ ان فن کاروں میں ہمارے جانے پہچانے تمام لوگ نظر آتے ہیں ــ ان کی تخلیقات کا قابل قدر انتخاب ہے۔ یہ شمارہ اس لائق ہے کہ ہر

لائبریری میں محفوظ کیا جائے۔ اطہر عزیز صاحب نے بڑی جانفشانی سے بعض اہم مسائل کو اکٹھا کردیا اور یہ شمارہ ایک اہم دستاویز ہے۔ اگر حکومت کے ذمہ داران اس کا غور سے مطالعہ کریں تو اس سے اردو زبان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اتنے ضخیم نمبر کی قیمت صرف بیس روپے ہے۔ اسکے لئے یشپال کپور صاحب اور اطہر عزیز صاحب یقیناً ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ شمارہ قبول خاص و عام ہوگا۔

— اطہر پرویز

آنکھیں اور پاؤں ○ بلراج کومل ○ اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ○ قیمت: ۲۰/..

بلراج کومل شاعر بلکہ اچھے شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں، لیکن منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی وہ افسانے بھی لکھتے رہے ہیں۔ پھر اچانک ان افسانوں سے ان سے اپنی اہمیت منوالی اور انھوں نے انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا۔ اس مجموعہ کا دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے جو کومل کے تمام افسانوں کا بڑا اچھا تجزیاتی مطالعہ ہے "آنکھیں اور پاؤں" میں کومل کے چودہ افسانے شامل ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہم انھیں نظرانداز نہیں کر سکتے۔ تمام افسانے یا تو بیانیہ ہیں یا بیانیہ سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ان کا مرکزی خیال جدید بحرانی معاشرہ کے انتہائی واضح مسائل سے اخذ کیا گیا ہے۔ کومل عبارت آرائی یا جذباتی لہجہ سے احتراز کرتے ہیں۔ صاف اور سادہ عبارت کے ذریعہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو کہانی پن عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے بہت سے کردار صرف استعارہ یا امثال (ANALOGUE) نہیں ہیں، ان میں خاصی ایمائی و علامتی جہتیں پائی جاتی ہیں۔ بلراج کومل نے بہت کم افسانے لکھ کر بھی اپنی اہمیت منوالی ہے، ہمیں اس بات کی خوشی ہے۔

— ابن فرید

ہمارے پسندیدہ افسانے ○ مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۱۵/..

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر اطہر پرویز نے اردو افسانوں کا ایک انتخاب "اردو کے تیرہ افسانے" کے نام سے پیش کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اب ڈاکٹر پرویز نے "ہمارے پسندیدہ افسانے" پیش کرکے اس انتخاب کی تکمیل کر دی ہے۔ زیر تبصرہ مجموعے میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ اس طرح تیس منتخب افسانے دستیاب ہو جاتے ہیں جن کے مطالعے سے اردو افسانہ اور اس کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مختصر افسانہ اردو ادب کی سب سے کم عمر صنف ہے لیکن اسے جو قبول عام حاصل ہوا وہ

کسی اور نثری صنف کو میسر نہ آسکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سو برس سے بھی کم مدت میں اردو افسانہ نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ بے شمار نشیب و فراز دیکھے، موضوعات کے تنوع اور تکنیک کے نت نئے تجربوں سے دوچار ہوا۔ مختلف پیرایۂ اظہار سے گزرا۔ کبھی اس پر داستان کی پرچھائیں پڑی تو کبھی یہ مغربی افسانے سے متاثر ہوا۔ کبھی جذباتیت و رومانیت کا شکار ہوا تو کبھی اس نے حقیقت پسندی کو اپنا شعار بنایا۔ کبھی یہ سرمایہ داروں کا کھلونا اور اپر کلاس سوسائٹی کا آئینہ بنا تو کبھی محنت کشوں کی امنگوں کا آرگن۔ غرض اس چھوٹی سی عمر میں اردو افسانہ بڑی دھوپ چھاؤں سے گزرا۔ پچھلی دو دہائیوں میں تو اردو افسانے کی دنیا میں ایسے دھماکے ہوئے اور ایسے انقلاب برپا ہوئے کہ روایت سے یکسر رشتہ ہی منقطع ہو گیا گو آگے چل کر اعتدال و توازن کی شکل بھی رونما ہوئی۔

نتیجہ یہ کہ ہمارے قدیم افسانوی ادب کا بیشتر حصہ محض تاریخی اہمیت کا حامل رہ گیا لیکن بقول ڈاکٹر پرویز کبھی کبھی پیچھے مڑکر دیکھ لینا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "چاہے ۱۹۳۶ء کے افسانے قصۂ پارینہ معلوم ہوں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ گاہے گاہے ان کو پڑھنا چاہیے کہ یہ افسانے نہ صرف ایک تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں بلکہ ان کے اندر ماضی کی روح کے ساتھ ساتھ ہمارے عہد کے دل کی دھڑکن بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

اس مجموعے میں ڈاکٹر پرویز نے عہد پریم چند سے لے کر قرۃ العین کے عہد تک کے منتخب افسانے جمع کر دیئے ہیں۔ اردو افسانہ کے مطالعے کے سلسلے میں ڈاکٹر پرویز کے مرتب کئے ہوئے ان دونوں مجموعوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے ○ مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۲۰/۰۰

راجندر سنگھ بیدی جدید اردو افسانے کے چند اہم ستونوں میں سے ایک ہیں بلکہ بعض اعتبار سے منفرد اور اپنے سب ہم عصروں سے ممتاز! جب اردو افسانے پر رومانیت اور جذباتیت کا غلبہ تھا تو بیدی نے اسے حقیقت پسندی کا راستہ دکھایا، نفسیاتی تجزیے سے کام لیا اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو افسانے کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بعض تحریکوں کی ہمنوائی کی لیکن کبھی ان میں ضم ہو کر نہیں رہ گئے۔ اردو افسانہ جن دنوں نعرہ بازی کا شکار تھا اس زمانہ میں انھوں نے اردو کو بعض لازوال کہانیاں عطا کیں اور یہ ثابت کر دیا کہ زندگی کی بنیادی حقیقتیں زیادہ اہم اور فنکار کی توجہ کی زیادہ مستحق ہیں۔ بیدی ہمارے بہت باشعور فنکار ہیں۔ بیدی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ منٹو نے ایک بار شکایت کی کہ تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم لکھنے سے پہلے بھی سوچتے ہو لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو" تو بیدی نے دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ادھر سے ادھر رونما ہوتا رہا۔ بیدی کے اسی ریاض اور اسی خون جگر نے ان کے

فن کو مزید بلندی عطا کی اور وہ اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں گنے گئے۔ یہ ان کی مقبولیت ہی کی دلیل ہے کہ ان کے جتنے مجموعے شائع ہوئے وہ دیکھتے ہی دیکھتے نایاب ہو گئے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے بیدی کے منتخب افسانوں کا یہ مجموعہ شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ایک بڑے پروگرام کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر پرویز اردو کے تمام اہم افسانوں کے انتخابات کا ایک مکمل سلسلہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کا یہ منصوبہ جلد تکمیل کو پہنچے گا۔

اس مجموعے میں بیدی کے گیارہ افسانے شامل ہیں۔ بیدی کے فکر و فن پر چھ مضامین بھی شامل کتاب کئے گئے ہیں جن سے ان کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب۔ بیدی اور ان کے فن کو سمجھنے میں معاون ہو گی۔

غالب — شخص اور شاعر ○ مجنوں گورکھپوری ○ تقسیم کار: ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۱۵/..

"غالب — شخص اور شاعر" جناب مجنوں گورکھپوری کی پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اور کچھ عرصہ پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اب ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ نے اسے دوبارہ نفیس کاغذ پر بہت اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔

جن خوش نصیبوں کو مجنوں صاحب سے ملاقات کا موقع ملا ہے وہ مجنوں صاحب کے عمیق مطالعے اور وسیع معلومات کے معترف ہیں۔ مجنوں صاحب کو غالب سے ہمیشہ گہرا شغف رہا ہے وہ غالب پر گھنٹوں بے تکان گفتگو کیا کرتے تھے جس سے ان کی غالب فہمی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اپنے قیام علی گڑھ کے زمانے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ غالب پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان کے کراچی پہنچنے کے بعد اس ارادے نے عملی صورت اختیار کی اور وہاں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ان سے غالب پر ایک سلسلۂ تقاریر کی فرمائش کی گئی۔ یوں یہ تقریریں وجود میں آئے اور پہلی بار ادارۂ ارباب قلم کے اہتمام سے شائع ہوئے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اس کتاب کو ہندوستان میں شائع کر کے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔

انیس شناسی ○ پروفیسر گوپی چند نارنگ (مرتب) ○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ○ قیمت: ۵۰/..

اگر اردو کے چار بڑے شاعروں کا نام لیا جائے تو میر، غالب و اقبال کے ساتھ چوتھا نام یقیناً میر انیس کا ہو گا۔ انھوں نے مرثیے کے کینوس کو اتنی وسعت دی کہ اردو شاعری کا دامن ہر

انیس اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ جتنا ذخیرۂ الفاظ یہاں موجود ہے وہ شاید نظیر کے ہاں بھی نہ ہوگا۔
لیکن حیرت وافسوس کا مقام ہے کہ ابھی تک نہ صنف مرثیہ کے ساتھ انصاف ہوا اور نہ انیس کے ساتھ۔ یہ نہیں کہ مرثیے کی طرف توجہ نہ ہوئی ہو لیکن اسے صنف ادب کی حیثیت سے کم پرکھا گیا سرمایۂ نجات و توشۂ آخرت کے طور پر زیادہ برتا گیا۔ بارے ۱۹۷۴ء میں یہ موقع فراہم ہوا کہ انیس کی طرف خاطر خواہ توجہ کی جائے۔ سو سال پہلے دسمبر ۱۸۷۴ء میں انیس نے وفات پائی تھی چنانچہ اس سال کو انیس صدی کے طور پر منایا گیا۔ مرکزی انیس کمیٹی کے سکریٹری پروفیسر گوپی چند نارنگ کے زیر اہتمام اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ دہلی کے تعاون سے دو اہم ادبی اجتماع ہوئے۔ ان میں جو مقالات پڑھے گئے پروفیسر نارنگ نے انھیں مرتب کرکے "انیس شناسی" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے ہند پاک سمپوزیم میں ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب انتظار حسین کی شرکت متوقع تھی۔ یہ حضرات کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے لیکن انھوں نے اپنے مقالات بھیج دیے جو سمپوزیم میں پڑھے گئے اور اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جو مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ ہیں: انیس کی شاعرانہ عظمت (پروفیسر آل احمد سرور) انیس کا نظریۂ فن (جناب علی جواد زیدی) اسلوبیاتِ انیس (پروفیسر گوپی چند نارنگ) انیس کی خوشہ چینی اور ان کے خوشہ چین (پروفیسر شبیہ الحسن) انیس کی سیرت نگاری (پروفیسر وحید اختر)۔

پروفیسر سرور نے انیس کی مرثیہ نگاری کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رومی ہوں یا انیس، اقبال ہوں یا کالی داس اور تلسی داس یا دانتے ملٹن اور ایلیٹ۔ ان میں سے کسی کی شاعری صرف اس وجہ سے بڑی نہیں کہ ان کا سرچشمہ ادب ہے اور نہ اس وجہ سے ناقابل توجہ ٹھہرتی ہے کہ وہ مذہب سے اپنی غذا لیتی ہے۔ جناب علی جواد زیدی نے انیس کے نظریۂ فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انیس جس زمانے میں تخلیق شعر کر رہے تھے وہ اردو کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اس وقت اردو کو اگر انیس کا فنی شعور نہ مل گیا ہوتا تو اس موڑ پر ہمارے ادب کے ارتقا کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو آج ہے، کچھ اور ہوتی۔ پروفیسر نارنگ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ انیس جس وضاحت کا دعویٰ کرتے ہیں یا شبلی اور ان کے بعد آنے والے نقاد انیس کی جس فصاحت کی داد دیتے ہیں اس کا گہرا تعلق مسدس کے فارم کو انتہائی فنکاری کے ساتھ برتنے سے بھی ہے اور غزل اور قصیدے کی شعری روح کو جذب کرکے اس کی تقلیب کرنے سے بھی۔
"انیس شناسی" کی اشاعت سے ایک کمی کا بڑی حد تک ازالہ ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو دنیا اس کام کو بہ نظر استحسان دیکھے گی۔

مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ○ ایس۔اے۔ صدیقی ○ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، دہلی ○ قیمت ۔۔۔/۱۲

"مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری" جناب شبیر احمد صدیقی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹوریٹ کی ڈگری عطا ہوئی۔ شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر اردو ادب میں مقابلہ و موازنہ کی بنیاد ڈالی۔ محمد حسین آزاد اس سے پہلے یہ کام کر چکے تھے لیکن اسے واضح شکل شبلی نے ہی دی۔ شبلی کی تصنیف کے بعد تائید و تردید کا سلسلہ چل نکلا۔ اس سلسلے میں مرتضیٰ حسین کی "گستاخی معاف"، محمد تقی فیض کی "تحکیت شائستہ"، نظیر الحسن ذوقی کی "المیزان" افضل حسین ضد کی "ردالموازنہ" حسن رضا کی "تردید موازنہ" اور افضل حسین ثابت کی "حیات دبیر" قابل ذکر ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر مصنفوں نے جانب داری سے کام لیا۔ انھوں نے یا تو موازنے کی مخالفت میں زور قلم صرف کیا یا ان کی تائید میں دبیر کو انیس سے کم تر شاعر قرار دیا۔ بعض کو دونوں کی شاعری میں ایسا نمایاں فرق نظر آیا کہ ان کے نزدیک موازنہ ہی بے معنی تھا۔ "المیزان" اور "حیات دبیر" میں نسبتاً توازن سے کام لیا گیا ہے لیکن طرف داری کا جذبہ کسی نہ کسی حد تک یہاں بھی کارفرما ہے۔ صدیقی صاحب نے موازنے سے دامن بچاتے ہوئے اردو مرثیے میں دبیر کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقین ہے اس قابل قدر کام سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا۔

عکسِ تمنّا ○ کمال جعفری ○ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ ○ قیمت: ۱۵/۰۰

"عکس تمنا" ایک جوان سال شاعر کمال جعفری کا مختصر مجموعہ کلام ہے جس میں غزلوں کے علاوہ کچھ آزاد اور پابند نظمیں بھی شامل ہیں۔ نظموں میں فریب کار شہر، کل اور آج، ایک مشورہ خاص طور پر پرکشش ہیں۔ کئی نظمیں ان کی نجی زندگی اور افراد خاندان سے متعلق ہیں جو ظاہر ہے ہر قاری کے لئے زیادہ قابل توجہ نہیں ہو سکتیں۔ لیکن عکس تمنا کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے۔ جعفری کی شعر گوئی کی عمر صرف سترہ اٹھارہ برس ہے لیکن ان کے کلام سے فنی پختگی کے آثار نمایاں ہیں اور یہ ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

— نورالحسن نقوی

Regd. No. L. ALG/270 May, June, July, Aug. 1983

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/76

جلد ۸	ستمبر، اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء	شمارہ ۵

زر سالانہ ---- ۱۶ روپے
قیمت ----- ۳ روپے

پرنٹر و پبلشر ---- اسد یار خاں
مطبوعہ --- جواہر آفسیٹ پریس نئی دہلی
کتابت ---- ز۔ رشید، الٰہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مجلسِ ادارت

نور الحسن نقوی   اطہر پرویز

اسد یار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

سرورق پر: افتخار عارف

پتہ: دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۸۶۸

آئینہ

گوشۂ افتخار عارف

افسانے

غزلیں اور نظمیں

ایک طنزیہ

اور ایک مقالہ

اور

فیض احمد فیض

افتخار عارف کی شاعری
("مہر دو نیم" کے مطالعہ کی روشنی میں)

آج کل ادبی حلقوں میں دو چار سوال اکثر سننے میں آتے ہیں:
کیا ہمارے شعر و ادب پر جمود طاری ہے؟
کیا وہ شاعری، جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے، نثری نظم، آزاد نظم، تغزل سے عاری غزل وغیرہ وغیرہ ـــــ اس جمود کا توڑ نہیں ہے؟
کیا نئے لکھنے والوں میں کوئی ہونہار بروا ایسا نہیں ہے جس کے چکنے پات سے کچھ امید وابستہ کی جا سکے؟

افتخار عارف کا پہلا دیوان دو بار پڑھنے کے بعد مجھے یہی محسوس ہوا کہ اس کے اوراق میں کلی طور سے نہیں تو جزوی طور سے ان سوالات کا جواب موجود ہے۔ اور یہ غالب کی طرفداری اس لئے نہیں ہے کہ افتخار عارف سے یوں تو بہت دنوں سے یاد اللہ ہے لیکن اب تک ہم صرف ان کے ٹی وی کمالات سے واقف تھے، ان کے کلام سے محظوظ ہونے کا پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔

تو پہلے جمود اور حرکت کے مسئلے پر غور فرمایئے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ محض روایت کی لکیر پیٹتے رہنے سے شعر و ادب کی گاڑی آگے نہیں چلتی۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر باکمال فن ور اس سے ذرا ہٹ کر کسی پرانے ڈیزائن پر نئے نئے بیل بوٹے بناتے رہیں یا کسی ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھتے رہیں تو ان کاوشوں سے اچھا ادب ضرور تخلیق ہو سکتا ہے لیکن آنے والوں کے لئے کوئی نیا رستہ نہیں کھلتا۔ اس کے برعکس یوں بھی ہے کہ جیسے ڈیڑھ اینٹ سے کوئی مسجد نہیں بنتی، اس طرح کسی ایسے ڈیڑھ ادیب سے کوئی تحریک بھی نہیں چلتی جن کا کلام وہ خود یا ان کے دو چار احباب

سمجھیں، جو ادب کے عام شائقین سے خطاب کرنے کے بجائے اپنی اپنی ٹولی میں "من ترا حاجی بگویم" کی گردان کرتے رہیں۔ جنگل میں کتنے ہی مور ناچا کریں، تماشائیوں کو اس سے کیا مطلب۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی ایک ہی مضمون کو مکھی پر مکھی مارنے کو مضمون آفرینی نہیں کہتے، اسی طرح بھینس کے انڈے سے روغن گل نکالنا بھی کسی ندرت یا جدت کا ثبوت نہیں ہے۔ اس نوع کی جدت اور فنی یا تخلیقی ایجاد و اختراع میں وہی فرق ہے جو موسیقی کی اصطلاح میں اپشا اور بے سرے پن میں فرق ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ قانونی قاعدہ ہے کہ صحیح انصاف کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف منصفانہ ہو بلکہ منصفانہ نظر بھی آئے۔ اسی طور سے کسی بھی شاعرانہ تجربے کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ ہو بلکہ اس کی شعریت اجاگر بھی دکھائی دے۔

اور آخر بات یہ ہے کہ اپنے من میں ڈوب کر موتی کو تو شاید زندگی کا سراغ مل سکے لیکن ادیب یا شاعر کو یہ سراغ لگانے کے لئے اپنے من ہی میں نہیں، اپنی ہم عصر انسانی برادری کے من میں بھی ڈوبنا پڑتا ہے۔ اسے یہ جوہر ودیعت ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ کم نگہ اس کی آنکھوں سے نیک و بد کو پہچان سکیں، اور کج زبان اس کی زبان سے اپنے درد و کرب، غیظ و غضب، یا امید و طرب کا اظہار کر سکیں۔ ان بیان کردہ نکات میں آپ کسی کو بھی کسوٹی ٹھہرالیں، افتخار عارف کی بہت سی تحریریں اس پر پوری اتریں گی۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت اپنے الفاظ میں یوں ہے کہ ایک پرندے کے چہچہانے سے آمدِ بہار کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اپنی جگہ، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ گلزار سخن کو کوئی خوش نوا کسی نئے دبستان کے کھل جانے کا امکان بھی بہم پہنچا دیتا ہے۔ اور پہچان اس کی یہی ہے کہ اس کے نطق و قلم نے شعر کے اجزائے ترکیبی یعنی لے اور آہنگ، لغت (DICTION) اور محاورہ (IDIOM) مضامین و مطالب میں کوئی ایسی بات پیدا کی ہے یا نہیں جو اس کے معاصرین کو متاثر اور مشتعل کر سکے ——— کوئی ایسی طرز فغاں، جسے چمن والے مل کر لوٹ سکیں۔ اپنی رائے یہ ہے کہ افتخار عارف کے کلام میں یہ بھی سبھی جھلکیاں موجود ہیں۔

جب یہ کہا گیا تھا کہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے تو بعض نثری نظم کہنے والے اس کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے۔ مراد یہ نہیں تھی کہ نثر کو نظم بنانے کے لئے کسی لے، کسی آہنگ، کسی وزن کی حاجت ہی نہیں ہے۔ مراد یہ تھی کہ فریاد یا شعر کی کوئی ایک لے نہیں ہے بلکہ رسومات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔

یعنی موزوں شعر کے لئے مروجہ عروض ہی وزن کا ایک پیمانہ نہیں ہے، وزن برقرار رکھنے کی اور صورتیں بھی ہیں۔ اس کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ اگرچہ ہم نے وزن کا پیمانہ تو وہی ٹھہرا رکھا ہے۔ جو عربی عروض کا ہے لیکن نہ تو عربی زبان کی بہت سی بحور کو موزوں طریقے سے ادا کر سکتے ہیں نہ ہماری بعض مروجہ بحروں کا عربی عروض میں کہیں وجود ہے۔ ہوا یہ ہے کہ پہلے فارسی والوں نے اپنے مزاج کے مطابق عربی بحور میں کتر بیونت کر کے ان ترامیم کو زحافات کا نام دے کر سند بنا لیا۔ اور پھر قلی قطب شاہ سے لے کر میر صاحب اور نظیر اکبر آبادی تک ہمارے ہاں بھی ان میں کچھ ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ بزرگ ترکی شاعر ناظم حکمت نے ایک گفتگو میں ہم سے کہا تھا کہ روزمرہ بول چال میں بھی ایک آہنگ یا ۱۱۱۱ R۷۳ ہوتا ہے لیکن اسے دریافت کرنے اور تحریر میں لانے کے لئے بہت حساس کان چاہئیں۔

بہرصورت یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ لے یا تال یا آہنگ کا رشتہ بنیادی طور سے حروف کے ساتھ نہیں، اصوات سے ہے۔ اس لئے اگر کوئی منظوم، کان کو الفاظ کی صوتی ترتیب اور تکرار و تنوع کے سبب موزوں اور مترنم لگے تو اسے تقطیع کے ڈھانچوں میں فٹ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ افتخار عارف نے یوں تو سبھی نسخے استعمال کئے ہیں، کہیں عروض کی پوری پابندی کی ہے — جیسے میلہ، بارہواں کھلاڑی وغیرہ میں، کہیں اس سے ہٹ کر لکھا ہے:

گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں

یا

پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا
اور کس کی ڈور ہلکی تھی

لیکن کہیں بھی لے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ ان کی کسی بھی نظم پر نثری نظم کا دھوکا نہیں ہوتا کہ نظم شعر کی سطح مرتفع سے اتر کر نثر کے سپاٹ میدان میں آ گئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض مختصر نظموں میں اگر مضمون ہلکا ہے تو یہ سطح کچھ زیادہ اوپر نہیں اٹھ سکی۔

افتخار عارف کے کلام میں میر و غالب سے لے کر فراق و راشد تک سبھی کی جھلکیاں موجود ہیں لیکن آپ نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہے، کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی بلکہ لے اور آہنگ کی طرح

ایسا ہی اجتہاد لغت اور محاورے میں بھی کیا ہے ۔ موضوع کی رعایت سے کہیں کلاسیکی اور ادبی زبان
نکوہ سے کام لیا ہے تو کہیں روزمرہ کی بولی ٹھولی کو شعریت سے پیوند کیا ہے، حتیٰ کہ غزل جیسی کافر
مت میں بھی کچھ انفرادی بڑھت کی ہے ۔ آج کل غزل سے جو دراز دستیاں کی جا رہی ہیں، لیکن نہ چلتی ہوئی
ں کا سہارا لیا ہے، نہ روندی ہوئی زمینوں پر انحصار کیا ہے، نہ لفظی چٹخاروں سے داد وصول کرنے
شش کی ہے ۔ اس کے بدل میں کم مستعمل بحریں استعمال کی ہیں اور نفسِ مطالب کو قافیہ بند کرنے
بجائے غیر متوقع اور برمحل سلیقے سے شعر کو جگمگا دیا ہے:

یار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا — اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
آئے سرِ قریہ زرِ جوہرِ پندار — جو دام لے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے — وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

ماشب ہو تو آجائے بھی تیرے شہر سے آئیں — خواب دیکھوں تو حوالے بھی تیرے شہر سے آئیں
ے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے — خوں بہا مانگنے والے بھی تیرے شہر سے آئیں
تو جب ہے کہ اے گریہ کن حرمتِ حرف — مدحِ قاتل میں مقالے بھی تیرے شہر سے آئیں

پھر جدید مضامین اور مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسبِ فیض کیا
کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لئے رمز و کنایہ
کا سامان پیدا کیا ہے ۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعدی کا
ن صرف منصور و قیس اور فرہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دار و رسن کی بات
تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آ گئے لیکن المیۂ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام
مرثیے تک محدود رہا ۔ صرف علامہ اقبال کی نگہ وہاں تک پہنچی:

خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ شام خویش را،
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں

افتخار عارف نے گزارشِ احوالِ واقعی کے لئے اس ماخذ سے بہت اثر آفرینی اور خیال
ز کام لیا ہے ۔

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

وہی پیاس ہے، وہی دہشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑتا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

میں جانتا تھا میرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے۔
میں جانتا تھا میرا قبیلہ بریدہ و بے ردا سروں کی گواہیاں لے کے آئے گا
پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
گزارشِ احوالِ واقعی کے سلسلے میں ظلم و تعدّی، جبر و زبان بندی کی شرح یوں کی ہے:
مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازو سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے

خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولتِ غنیم بانٹ دی گئی
طنابِ خیمۂ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے

شاخِ زیتون پہ کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پہ
بین کرتی رہیں اور ہوا چپ رہی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

کھلا جو روزنِ زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی

دوسرا مضمون تنہا فرد کی بے کسی اور بے بسی کا بھی ہے اور حریف سے نبرد آزما ہونے کی طلب اور تمنا کا بھی:

چھوٹے چھوٹے فرعون کا اک لشکر
اور ایک اکیلا میں، میرے ہاتھ عصا سے خالی

میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں
میں تنہا آدمی کیسے لڑوں

میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اس پہ جان دے دی ......
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو ندر سرے کے آگیا ہوں

اور میں پا برہنہ سر کو بہ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی

دیکھتا رہ گیا، سوچتا رہ گیا

جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں

تیسرا مضمون رزق کی مصلحت کے اسیروں کی محتاجی اور تن آسانی کا بھی ہے اور اس تذلیل سے سرکشی کا بھی:

ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر کاسۂ طلب نکلا

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
اور آخر میں بظاہر غیر مختتم انتظار نجات!
ہم اہلِ انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

غمِ جہاں کو شرمسار کرنے والے کیا ہوئے
وہ ساری عمر انتظار کرنے والے کیا ہوئے
کہاں ہیں وہ جو دشتِ آرزو میں خاک ہو گئے
وہ لمحۂ ابد شکار کرنے والے کیا ہوئے

یہاں اس شرحِ احوال کا سیاسی تجزیہ مقصود نہیں۔ اس نظر سے دیکھیں تو اختلاف کی بہت کچھ گنجائش بھی نکل سکتی ہے۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقتِ حال کی تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اس میں اعترافِ شکست زیادہ ہے، دعوتِ ھل من مبارز کم۔ انفعال زیادہ ہے، اشتعال کم، حزن و یاس کی پرچھائیاں زیادہ ہیں، امید و رجا کی جھلکیاں کم ہیں۔ دکھوں کی نشاندہی کی ہے،

چارہ گری کا نسخہ نہیں تبلایا۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ تصویر کا یہ رخ بھی حقیقت حال
ایک رخ ہے اور اس کا بیان بجائے خود احتجاج کا لہجہ ہے۔

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد غالباً آخری سوال کا جواب ضروری نہیں ہے جو مستقبل
بارے میں اٹھایا گیا تھا۔" ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مصنف کا مقام یا اس کی تصنیف کی قدر و قیم
مستقبل سے قطع نظر، اسی وقت متعین ہو جانی چاہئے جب وہ ظہور میں آئے، چنانچہ افتخار
بڑے ہو کر، کیا کریں گے یا نہیں کریں گے یہ موسیقی کی اصطلاح میں ان کے ریاض پر۔

افتخار عارف

غزلیں

○

سمندر اس قدر شوریدہ سر کیوں لگ رہا ہے
کنارے پر بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے
وہ جس کی جرأتِ پرواز کے چرچے بہت تھے
وہی طائر ہمیں بے بال و پر کیوں لگ رہا ہے
وہ جس کے نام سے روشن تھے مستقبل کے خواب
وہی چہرہ ہمیں نامعتبر کیوں لگ رہا ہے
بہاریں جس کی شاخوں سے گواہی مانگتی تھیں
وہی موسم ہمیں اب بے ثمر کیوں لگ رہا ہے
در و دیوار اتنے اجنبی کیوں لگ رہے ہیں
خود اپنے گھر میں آخر اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

○

ایک اور تازیانہ منظر لگا ہمیں
آ اے ہوائے تازہ! نئے پر لگا ہمیں
ندی چڑھی ہوئی تھی تو ہم بھی تھے موج میں
پانی اتر گیا تو بہت ڈر لگا ہمیں
دل پر یقیں نہیں تھا سراب کے محاذ پر
دشمن کا اک سوار بھی لشکر لگا ہمیں
گڑیوں سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں
آنسو بھی آ گیا تو سمندر لگا ہمیں
بیٹا گرا جو چھت سے پتنگوں کے پھیر میں
کل آسماں پتنگ برابر لگا ہمیں

○

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے
کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آ گئے ہیں
دعائیں تھی سراب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے
ابھی تو ہم طائرانِ کم حوصلہ نہ پرواز کر سکیں گے
ابھی شکستہ پروں میں اندوہِ بال و پر بھی نیا نیا ہے
یقیں پہ شب خون پڑ چکے پھر بھی لوگ مطمئن نہیں ہیں
نہال اندیشہ و گماں! تیرا یہ ثمر بھی نیا نیا ہے
نفاق و نفرت کی آندھیاں پھر اجاڑ دیں گی تو کیا کریں گے
نئی زمینوں پہ بسنے والوں میں اک یہ ڈر بھی نیا نیا ہے
فروغِ خورشید کی بشارت پہ ظلمتیں رقص کر رہی ہیں
سوادِ شب میں طلسم آوازۂ سحر بھی نیا نیا ہے
بصیر ذہنوں کو برسرِ عام آگہی کی سزا ملے گی
دیارِ درویش میں یہ فرمانِ آب زر بھی نیا نیا ہے

○

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں فریق
کوئی چراغ نہ اب رہ گذر میں رکھا جائے

اُسی کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

نہ جانے کون سے ترکش کے تیر کب چل جائیں
نشانِ مہر کمانِ سپر میں رکھا جائے

وفا گماں ہی ٹھہری تو کیا ضرور کہ اب
لحاظِ ہمسفری بھی سفر میں رکھا جائے

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذابِ دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

ہمیں بھی عافیتِ جاں کا ہے خیال بہت
ہمیں بھی حلقۂ نامعتبر میں رکھا جائے

○

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامہ دہر
دل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

ایک جزیرہ اس کے آگے پیچھے سات سمندر
سات سمندر پار سنا ہے ایک خزانہ ہے

○

ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہونے خواب
پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیئے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

ہم نے چپ رہنے کا عہد کیا ہے اور کم ظرف
ہم سے سخن آراؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

○

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے
قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کر دے
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

○

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے
ایک کے بعد ایک مہرہ پٹتا جاتا ہے وقت
پھر بساطِ اعتبارِ دہر سناٹے میں ہے
ایک اک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جاگتی راتوں کا پچھلا پہر سناٹے میں ہے
بادبانوں سے ہوا الجھی تو ساحل چپ رہا
ناؤ ڈوبی ہے تو اب ہر لہر سناٹے میں ہے
رو رہا ہوں میں کہ خاموشی مقدر ہو گئی
لوگ ہنستے ہیں کہ میرا شہر سناٹے میں ہے
پھر فضاؤں میں وہی مسموم آوازوں کی گونج
کیا بتائیں کیسا کاری زہر سناٹے میں ہے
دیدنی ہے وحشتِ اولادِ آدم ان دنوں!
آسمانوں پر خدا کا قہر سناٹے میں ہے

○

جنوں کا رنگ بھی شعلہ نمو کا بھی ہو
سکوتِ شب میں اک انداز گفتگو کا بھی ہو
میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو
وہ جس کے چاکِ گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو
وہ جس کے ڈوبتے ہی ناؤ ڈگمگانے لگی
کسے خبر وہی تارہ ستارہ جو کا بھی ہو
ثبوتِ محکمیِ جاں ہے جس کی برشِ ناز
اسی کی تیغ سے رشتہ رگِ گلو کا بھی ہو
وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

○

کہیں سے کوئی حرفِ معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے
قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے
کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے
جہاں راتوں کو پڑ رہتے ہیں آنکھیں موند کر لوگ
وہاں مہتاب میں چہرہ نظر شاید نہ آئے
کبھی ایسا بھی دن نکلے کہ جب سورج کے ہمراہ
کوئی صاحب نظر آئے مگر شاید نہ آئے
سبھی کو سہل انگاری ہنر لگنے لگی ہے
سروں پر اب غبارِ رہ گزر شاید نہ آئے

گوپی چند نارنگ

صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"شہر مثال" کا دردمند شاعر

زندگی کے نہاں خانوں میں اتر کر دیکھئے تو بے زمینیوں کے کئی سلسلے صدیوں کے الٹ پھیر میں اپنے سینوں کے راز کھولتے ہوئے ملیں گے۔ کئی کے آغاز و انجام وقت کے دھندلکوں میں کھو گئے اور کئی خاتم انسانیت کا نگینہ بن کر تاریخ کے اوراق کو جگمگا گئے۔ جلاوطنیاں صرف زمینوں، زمانوں، آبادیوں اور بستیوں سے نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات سے بھی ہوتی ہیں۔ پاؤں صرف چلنے کے لئے ہیں، قدموں سے ہم محض مکان ناپتے ہیں، مکان چلتے ہیں، لیکن ذہن جست لگاتا ہے تو آنِ واحد میں وجود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ساری زمینیں اور زمانے اپنی بساط تہہ کر لیتے ہیں، کائنات سمٹ کر نقطہ بن جاتی ہے اور پھر کراں تا کراں پھیلا ہوا ایک لامختتم بعید، فن معلوم اور نامعلوم کے ایسے مقامات پر جنم لیتا ہے جو ذات اور کائنات میں بھی ہیں اور ذات اور کائنات سے باہر بھی۔ فن کا سفر موجود سے لاموجود اور لاموجود سے موجود کا سفر ہے جس میں مانوس چہروں، تجربوں، مقاموں، زمانوں کی تقلیب ہوتی ہے اور اس کا برعکس بھی صحیح ہے یعنی ذہنی جزیروں کی نامانوس تخلیق، نامانوس قالب اختیار کرنے میں سرگرم سفر رہتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہنی اور زمینی جلاوطنیوں کے رشتے مل جاتے ہیں اور ان سے نئی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شخصیت اور سوانح اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن بنیادی چیز وہ اظہاری قوت ہے جس کے تحت یہ اور دوسرے تمام عوامل فن میں بروئے کار آتے ہیں اور شعر و ادب کی تفہیم و تحسین میں اصولاً سارے حوالے اسی سے نکلتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو افتخار عارف کے یہاں کئی کیفیتیں دوسروں سے الگ ملیں گی۔ اول تو ایک مخلص فنکار کا کرب جو انسان سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے، جو زندگی کا متوالا ہے، اور درد کے رشتوں کو سمجھنا چاہتا ہے، جو زندگی، سماج، معاشرے میں شریک بھی ہے اور ان سے باہر بھی کیوں کہ سنگ دل بے تعلق یا جلاوطن کے بغیر درد کا عرفان ممکن نہیں۔ دوسرے بے مکانی یا بے گھری کا دکھ جو روزِ آفرینش سے اولادِ آدم کی میراث ہے، جس کے تحت اسے جنتوں سے نکالا گیا اور اس نے آسمانوں اور زمینوں

کا سفر کیا اور جس کی وجہ سے انسان کی روح کو آج تک قرار نصیب نہیں اور وہ تحرک اور تجسس کی راہوں میں سرگرم سفر ہے۔ یہ بے مکانی یا بے گھری سب لذتوں کی لذت اور سب دکھوں کا دکھ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ احساس کے ان دونوں منطقوں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا جبر کا رشتہ مشترک ہے۔ دکھ درد کا وجود جبر ہی سے ہے۔ جہاں جبر ہے کسی نہ کسی درد کا رشتہ ضرور ہوگا اور جہاں درد ہے وہاں کوئی نہ کوئی جبر ضرور کار فرما ہوگا، خارجی یا باطنی۔ خواہ وہ وجود کا ناگزیر جبر ہو یا سیاسی، فکری نظام، مسلک یا طریق کا خارج سے مسلط کیا ہوا جبر۔ جبر زندگی کی نفی ہے، جبر آزادی کی ضد ہے، جبر کی فضا میں جن چیزوں کی پرورش ہوتی ہے وہ سب کی سب زندگی، خوبصورتی اور سچائی سے تناؤ کا رشتہ رکھتی ہیں مثلاً ظلم و استبداد، قتل و خوں ریزی، کذب و افترا، حرص و ریاکاری، کمینگی اور خباثت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام قوتیں آزادی کے لئے چیلنج ہیں اور آزادی کے عدم اور وجود کا یہی چیلنج فنون لطیفہ کی جان ہے۔ سچا فن جبر کی دہشت سے بھی پیدا ہوتا ہے، اس کے عرفان سے بھی اور اس کے خلاف احتجاج سے بھی۔ افتخار عارف کے یہاں احتجاج کا لہجہ نمایاں ہے۔ ہر احتجاج میں بغاوت کا عنصر ہوتا ہے، دبا ہوا یا پر جوش۔ افتخار عارف کا احتجاج متشددانہ، آتش بار یا غضبناک نہیں، یہ ایک محبت کرنے والے کا احتجاج ہے، درد آمیز، ہمدردانہ اور مخلصانہ، جس میں زندگی کے کرب اور بے زمینی کے احساس دونوں نے مل کر ایک نئی تڑپ اور نئی تاثیر پیدا کر دی ہے۔

کسی بھی ابھرتے ہوئے شاعر کو سب سے بڑا خطرہ اپنے عہد کی مانوس آوازوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے عہد کی آوازوں میں میراجی، راشد، جوش، یگانہ، فراق اور فیض کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ یگانہ کا اثر محدود ہے اور جوش کا اثر ان کی زندگی ہی میں فنا ہو گیا البتہ دوسروں کے فیوض و برکات جاری ہیں۔ افتخار عارف اپنے رومانی مزاج اور احتجاجی حوالے سے فیض کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لگتا ہے انھیں اس کا احساس بھی ہے کہ ان کی طرز گفتار کو سب سے بڑا خطرہ فیض سے لاحق ہے کیوں کہ فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری نے اس نوعیت کے اسلوب کے امکانات کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اب جو بھی آئے گا یا تو وادیٔ تقلید میں گلگشت فرمائے گا یا بہت عزت ملی تو بے مزہ شاعری کے دربار عام سے خلعت فاخرہ پائے گا۔ حسن و محبت اور انقلاب و انحراف ابدی موضوعات ہیں لیکن شعری اختصاص و امتیاز کی راہیں فکر و امتیاز کے تازہ کارانہ پیرایوں ہی سے نکل سکتی ہیں۔ افتخار عارف کو اس کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایت سے خوش سلیقگی کی روشنی

ا ہے اور اسے غیر رسمی بے تکلف تازہ لہجے سے پیوند کیا ہے۔ اس میں کچھ ہاتھ اودھی کے تخلیقی
بط کا بھی ہے جو ابتدائی عمر کی دین ہو سکتا ہے۔ ان کی آواز میں نرمی، رس اور لوچ ہے جو
ودھی کی گھلاوٹ اور زمینی پن کی راہ سے آیا ہے۔ کہیں کہیں طویل بحروں میں ارکان کی تعداد
ِ معادی ہے۔ بعض جگہ آوازوں کو بڑھایا گھٹایا ہے جس سے لہجہ ہندی آہنگ کی داخلی موسیقی
سے قریب تر آ گیا ہے۔ انسان سے ان کا لگاؤ اور محرومیوں سے پیدا ہونے والا دردِ محبت احتجاجی
لے میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ایک کیفیت سے کئی کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ افتخار عارف
غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتے ہیں۔ دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے لیکن غزل کے اشعار
میں شدت احساس کہیں زیادہ ہے۔ ایسا شاید ان کے مخصوص تخلیقی مزاج کی وجہ سے ہے یا ان
موز و علائم کی وجہ سے جنھیں ان کی شناخت قرار دیا جا سکتا ہے:

یہ قرض کج کلہی کب تلک ادا ہو گا — تباہ تو ہو گئے ہیں اب اور کیا ہو گا
صدا لگائی تو پرسان حال کوئی نہ تھا — گمان تھا کہ ہر اک شخص ہم نوا ہو گا
غبارِ کوچۂ وعدہ بکھرتا جاتا ہے — اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہو گا
ہوا ہے یوں بھی کہ اک عمر اپنے گھر نہ گئے — یہ جانتے تھے کوئی راہ دیکھتا ہو گا

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے
آج کی رات ننھی سی لو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت
اے چراغ سرِ کوچۂ بادہ اب کے ہوا مختلف ہے
اب کے بالکل نئے رنگ سے لکھ رہے ہیں سخن ور قصیدے
حرف تو سب کے سب ہیں رجز کے مگر مدعا مختلف ہے
خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے
اب کے میں نے کتابِ مساوات ایک اک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

ذاب وحشت جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی — نئے سفر کے لئے راستہ نہ مانگے کوئی
ند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں — عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی
ام شہر کرم بس ایک مجرم میں — سو میرے بعد مرا خوں بہانہ مانگے کوئی
ھلا جو روزنِ زنداں تو تیر آنے لگے — اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی
.ئی تو شہر تذبذب کے ساکنوں سے کہے — نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی
عذاب گرد خزاں بھی نہ ہو بہار بھی آئے — اس احتیاط سے اجر وفا نہ مانگے کوئی

دکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی — اور دامن قاتل کی ہوا اور طرح کی
دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے کچھ اور — دیتی ہے خبر خلق خدا اور طرح کی
کس دام اٹھائیں گے خریدار کہ اس بار — بازار میں ہے جنس وفا اور طرح کی
بس اور کوئی دن کہ ذرا وقت ٹھہر جائے — صحراؤں سے آئے گی صدا اور طرح کی
ہم کوئے ملامت سے نکل آئے تو ہم کو — راس آئی نہ پھر آب و ہوا اور طرح کی
ملنے سے بچھڑنے سے بھلا عشق کو کیا کام — ہے اہل محبت کی جزا اور طرح کی
تعظیم کرانے جان معانی کہ ترے پاس — ہم لائے ہیں سوغات ذرا اور طرح کی

یوں دیکھئے تو "قرض رہ کج کلہی"، "غبار کوچہ وعدہ" "چراغ سر کوچۂ یار" "کاروبارِ جنوں" وغیرہ ترکیبیں اب سے کچھ پہلے کی شاعری کی یاد دلاتی ہیں، لیکن ذرا سے تامل سے معلوم ہوگا کہ سکہ بند تصورات کی نارسولا شاعری نہیں۔ شاعر کی آواز آج کی آواز ہے۔ زندگی آج جن آلام کے نرغے میں ہے اور معاشرہ جن حالات و حوادث کی زد میں ہے، یہ آواز اس کے درد وکرب سے پیدا ہوئی ہے۔ شاعر مثالیت یا عینیت کا سہارا نہیں لے رہا، ورنہ رجائی شاعری کی آسان راہ پر چل سکتا تھا۔ وہ حقیقت کی سنگینی کو پوری سچائی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پہلے کا شاعر ہر شخص کو ہم نوا پاتا تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ صدا لگائی تو پرسانِ حال کوئی نہ تھا۔ قرض کج کلہی کا ادا کرنا باعث فخر سہی لیکن تباہی کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد اب بچا ہی کیا ہے کہ ادائیگی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ان غزلوں میں ایک نئی آواز اور نئی معنویت ملتی ہے۔ ان میں جو سماجی، سیاسی مفہوم ہے یا جبر کے خلاف جو احتجاج ہے وہ جذباتیت کی دین نہیں بلکہ وہ موجودہ صورت حال کی بے جہر آگہی سے پیدا ہوا ہے۔ ذرا ان غزلوں کے قافیے

ردیفیں ہی دیکھئے سلسلہ مختلف ہے، ہوا مختلف ہے، راستہ نہ مانگے کوئی، دعا نہ مانگے کوئی، وفا اور طرح کی ہے صدا اور طرح کی لفظوں کا یہ نظام کچھ اور ہے معنیاتی فضا پیدا کر رہا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ، ہم جہاں ہیں وہاں ان دونوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے خوف یہ ہے کہ چراغ مراد کی ننھی سی لو بھی زندہ بچتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ پورا معاشرہ ریاکاری کے ایسے رنگ میں رنگ گیا ہے کہ ہر شے کے معنی بدل گئے ہیں۔ لفظ تو سب کے سب رجز کے برتے جاتے ہیں مگر مدعا مختلف ہے۔ کتاب مساوات کا متن تو سلامت ہے لیکن اس پر جو حاشیہ چڑھایا جا رہا ہے، اس سے متن کا مفہوم بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ اب دکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی / اور دامن قاتل کی ہوا اور طرح کی / یہ انداز ترغیب اور تلقین کی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ یہ صورت حال کے درد کی شاعری ہے اور اس درد کا احساس بھی بالواسطہ کرایا گیا ہے یعنی، عذاب وحشت جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی / نئے سفر کے لئے راستہ نہ مانگے کوئی ان غزلوں میں اظہار کا جو پیرایہ ہے، جو علائم اور استعارے ہیں، ان کا رشتہ ایسے مفاہیم سے ہے جو تلوار کی دھار کی سی تیزی رکھتے ہیں ان اشعار میں بین المصرعین بہت کچھ ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

اب ایک اور پہلو کو لیجئے۔ صاحبان ذوق نے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے، خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقت شہر، تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں / یا کوئی تو شہر تذبذب کے ساکنوں سے کہے / غور کیا ہوگا کہ ان میں شہر کا پیکر بار بار ابھرتا ہے۔ یہ کیسا شہر ہے؟ اس کی خلقت کیسی خلقت ہے؟ یہ کس عذاب میں گرفتار ہے اور کیوں گرفتار ہے؟ یہ شہر مکرم بھی ہے اور مذبذب بھی، کیوں؟ افتخار عارف بار بار جس شہر کا حوالہ لاتے ہیں وہ اردو کی تخلیقی اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا ظلم و استبداد کا کوئی قدیمی نشان تو نہیں؟ یا یہ آج کا کوئی نیا شہر ہے یا نئی بستی؟ یا ایسا معاشرہ جو سیلاب بلا میں گھر گیا ہے اور بے پناہ عذاب میں گرفتار ہے؟ شاید ان میں سے بعض سوالوں کا جواب ذیل کے اشعار سے مل جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاعر لمحۂ موجود کی دردناک صورت حال کو ایک وسیع تر تاریخی اور انسانی تناظر میں دیکھ رہا ہو:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے	مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن	راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے
سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامۂ دہر
دل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

بستی میں سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خواب پریشاں بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے
جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سر و ساماں بھی مرا ہے
ویرانۂ مقتل میں حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے
وارفتگی صبح بشارت کو خبر کیا
اندیشۂ صد شام غریباں بھی مرا ہے

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو
وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو
ثبوت محکمی جاں ہے جس کی برش ناز
اسی کی تیغ سے رشتہ رگ گلو کا بھی ہو
وفا کے باب میں کار سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

حریم لفظ میں کس درجہ بے ادب نکلا
جسے نجیب سمجھتے تھے کم نسب نکلا
ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دست کرم
کہ سارا شہر لئے کاسۂ طلب نکلا
فضاؤں میں نہ پتنگیں نہ تتلیاں نہ دھنک
یہ شہر رنگ سے کس درجہ مجتنب نکلا

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
اپنے ہی خیموں پر جو شب خوں نا مارے
ایسا کوئی لشکر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
شاخ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
خاک اڑانے والے لوگوں کی بستی میں!
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہ   بابا ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

واقعۂ کربلا اس کے تعلیقات کا انقلابی، سیاسی مفاہیم میں استعمال اردو کی باغیانہ، مجاہدانہ شاعری میں نیا نہیں۔ ماضی میں اس کا سراغ مولانا محمد علی جوہر کی غزلیہ شاعری تک آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاگردی انھوں نے داغ کی کی تھی لیکن کلاسیکی علامتوں کے پیرائے میں احتجاجی شاعری کا فیضان انھیں حسرت موہانی کی ان غزلوں سے پہنچا تھا جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں قید فرنگ میں کہی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ علامتیں بار بار ابھرتی رہی ہیں اور طرح طرح کے مجاہدانہ ابعاد اختیار کرتی رہی ہیں۔ افتخار عارف کے یہاں موجودہ صورت حال کی سفاکی کے بیان میں ان سے نئی معنیاتی جہت سامنے آتی ہے۔ پیاس، دشت، گھرانا، رن پڑنا، ایک کتاب اور ایک امید دریا، ڈھالیں، شام، مسافر، چاک گریباں، قافلہ بے سروساماں، صبح بشارت، شام غریباں، قاتل، خنجر، خیمہ، لشکر، شاخ بریدہ، شکستہ پر، نوک سناں، سیاہ شام، نیزے پہ آفتاب کا سر، کاسۂ طلب، شہر رنگ سے مجتنب، یہ سب سانحے کے تعلیقے ہیں۔ یہ درد و کرب بنی نوع انسان کا بھی ہو سکتا ہے اور ایک بستی یا پورے سماج کا بھی۔ بات صرف شعر یا مصرع کی نہیں، افتخار عارف کے یہاں پوری کی پوری غزلیں اس کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں اور اس میں حق طلبی اور دردمندی کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں کہیں بھی امر واقعہ کا بیان نہیں بلکہ آج کے عذابوں کا ذکر ہے جن کو صدیوں کے تناظر میں دیکھا گیا ہے، وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے/ مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے، دوسری غزل کے اختتامی الفاظ ہے، بیاباں بھی مرا ہے، گریباں بھی مرا ہے، درد کے طویل سلسلوں اور توقع کا اندازہ ہوتا ہے۔ تیسری غزل میں عدو، چاک گریباں، تیغ، رشتۂ گلو، معرکہ لہو، پوری غزل کو خاص معنیاتی رنگ میں رنگے دے رہے ہیں۔ دوسری غزلوں سے جو اشعار پیش کیے گئے ان میں بھی یہی کیفیت ہے۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے یعنی شہر، بستی، خلقت، اور لشکر کا گہرا تعلق گھر سے ہے۔ ذرا یہ آخری مصرع دیکھیے:

بابا ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

یہاں گھر سے مراد کیا ہے؟ گھر گھر بھی ہے محدود معنی میں، اور پوری دنیا بھی جس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ عذابوں میں گھری ہوئی بستی بھی ہو سکتا ہے اور شہر مذبذب بھی، جس کی طرف شاعر بار بار اشارہ کرتا ہے۔ یہ شاعر کا معاشرہ بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ گہرے طور پر وابستہ ہے۔ ایسی

غزلوں میں گھر کا استعارہ بار بار ابھرتا ہے۔ اور طرح طرح کی معنوی کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ شاعر اپنی زمین کو اپنا آخری حوالہ کہتا ہے اور مٹی کی دربدری کی دھائی بھی دیتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ ایک عمر گنوانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جس میں رہ رہا تھا وہی گھر اس کا نہ تھا۔ ان اشعار کے علامتی مفاہیم سے کوئی بھی سنجیدہ قاری سرسری نہیں گزر سکتا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے — میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن — جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت — جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا — اجاڑ دے مری مٹی کو دربدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے — سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا — کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
اس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں — وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا
حریم لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں — مگر سلیقۂ عرض ہنر نہیں آیا

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے — ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں — شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا — میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا
میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا — مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا
موج ہوائے شہر مقدر جواب دے — دریا مرے نہ تھے کہ سمندر مرا نہ تھا
پھر بھی تو سنگسار کیا جا رہا ہوں میں — کہتے ہیں نام تک سر محضر مرا نہ تھا
نا معتبر ہوئے یہ ابھی کل کی بات ہے — شہر شمال میں کوئی ہم سر مرا نہ تھا
سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے — اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

کہیں سے کوئی حرف معتبر شاید نہ آئے — مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے | اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے
کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دن آئیں | قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

ان اشعار میں گھر کی مرکزیت ظاہر ہے۔ گھر کے ساتھ مٹی، زمین اور دربدری کے انسلاکات بھی ہیں جو وطن کا صیغۂ اظہار ہیں۔ شاعر نے انھیں آج کے تناظر میں رکھ کے نئی معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا۔ غزل کی رمزیت کا جواز یہی ہے کہ ایسے اشعار خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اور بعض اوقات بیک وقت دونوں سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ گھر کو نجی ذاتی معنی میں لیجئے تو بھی خالی از لطف نہیں اور علامتی معنی میں لیجئے تو معنی کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں۔ افتخار عارف کی شاعری کے بارے میں اوپر جو کچھ کہا گیا اس سے آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گہرا سیاسی احساس رکھتے ہیں اور طرح طرح جبر کے تئیں ان کا شعری ردِ عمل طرح طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے اظہاری پیرایوں میں انھوں نے اردو کی شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے اور انفرادی علائم کو بھی برتا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنا ایک انفرادی لہجہ پیدا کیا ہے جو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ زمینی اور ذہنی جلا وطنیوں کے حوالے، معرکۂ لہو، دشت، پیاس، نوک سناں لشکر، شہر، بستی، گھر، گھرانا، مٹی، زمین، دربدری وہ کلیدی علائم ہیں جن سے افتخار عارف کی شعریات کا شناخت نامہ مرتب ہوتا ہے۔ اس سے افتخار عارف نے ایک نئی معنوی فضا خلق کی ہے جس میں جبر کے پنجے میں انسانیت کی کراہ سنائی دیتی ہے، یہ سیاسی نوعیت کی شاعری ہے لیکن وسیع تر انسانی دردمندی کے احساس کے ساتھ، یہ اس طرح کی سیاسی شاعری نہیں جو لیک پر چلنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس بات کے ثبوت میں افتخار عارف کا پورا دیوان پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے اشعار اوپر درج کئے گئے۔ میں اقتباسات کو کم سے کم رکھنا چاہتا ہوں لیکن بعض اشعار گرفت میں لے لیتے ہیں اور ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ سرسری گزرنے والوں سے شکایت نہیں، لیکن جو شعر کا مطالعہ سنجیدگی سے کرتے ہیں، انھیں اتفاق ہوگا کہ اوپر جو مقدمہ پیش کیا گیا اس کی توثیق کے لئے ان اشعار کو نظر میں رکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بھی ضروری ہے ۔

اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے | دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ | رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
اجرتِ عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور | کچھ بھی کرلیں گے یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے
ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش | صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے
شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے
سبک ظرفوں کے قابو میں نہیں لفظ
مگر شوقِ گل افشانی بہت ہے
ہے بازاروں میں پانی سر سے اونچا
مرے گھر میں بھی طغیانی بہت ہے

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
اللہ سائیں ڈار سے بچھڑی کونج ٹھکانہ بھولے ناں
جب کبھی اجلے اجلے دن پر ٹوٹ کے برسی کالی رات
ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلانا بھولے ناں
باغ بغیچے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
دنیا تو سمجھتی تھی کہ ہیں کس کے گرفتار
کہنے کو تو ہم سب کسی جانب بھی نہیں تھے

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے
کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آ گئے ہیں
دعا کی تھی سو اب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے
ابھی تو ہم طائرانِ کم حوصلہ نہ پرواز کر سکیں گے
ابھی شکستہ پروں میں اندوہ بال و پر بھی نیا نیا ہے
یقیں پہ شب خون پڑ چکے ہیں پھر بھی لوگ نامطمئن نہیں ہیں
نہالِ اندیشہ و گماں پر اترا یہ ثمر بھی نیا نیا ہے
فروغِ خورشید کی بشارت پہ ظلمتیں رقص کر رہی ہیں
سوادِ شب میں طلسمِ آوازۂ سحر بھی نیا نیا ہے

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے
ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں فریق
کوئی چراغ نہ اب رہ گزر میں رکھا جائے
اس کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے
نہ جانے کون سے ترکش کے تیر کب چل جائیں
نشانِ مہر کمان سپر رکھا جائے
وفا گمان ہی ٹھہری تو کیا ضرور کہ اب
لحاظِ ہمسفری بھی سفر میں رکھا جائے

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذاب دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

ہمیں بھی عافیت جاں کا ہے خیال بہت
ہمیں بھی حلقۂ نامعتبر میں رکھا جائے

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے

ایک اک کرکے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جاگتی راتوں کا پچھلا پہر سناٹے میں ہے

رو رہا ہوں میں کہ خاموشی مقدر ہو گئی
لوگ ہنستے ہیں کہ میرا شہر سناٹے میں ہے

پھر فضاؤں میں وہی مسموم آوازوں کی گونج
کیا بتائیں کیسا کاری زہر سناٹے میں ہے

دیدنی ہے وحشت اولاد آدم ان دنوں!
آسمانوں پر خدا کا قہر سناٹے میں ہے

افتخار عارف کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار بالذات طور پر بھی ہوا ہے۔ عشقیہ جذبات سے مراد محض سن بلوغ کے جذبات کا اظہار نہیں، اگرچہ محبت کے معصوم جذبات کی حامل کچھ غزلیں اور نظمیں ان کے مجموعے میں مل جائیں گی لیکن یہ غالب رجحان نہیں۔ عام کیفیت اس محبت کی ہے جو گرم و سرد زمانہ کو دیکھ چکی ہے اور جس پر کئی جاڑے اور کئی برساتیں گزر چکی ہیں۔ ایسے اشعار میں محبت سے زیادہ محبت کی خلش کا احساس ہے۔ ان میں ایسے بادل کی کیفیت ہے جو ویران کھیتوں پر برسنے کے بعد ہوا کے دوش پر اڑا جا رہا ہو۔ کہیں کہیں توفیق گناہ کی خواہش بھی ہے جو تہذیب باطن کی راہ سے تصدیق الہ چاہتی ہے۔ ایک نظم "تکمیل" میں شاعر نے گناہ کو منتہائے سرشت آدم کہا ہے۔ کیوں کہ گناہ تخلیق کا ثمر ہے اور ایسا پیڑ ہے جس کے سائے میں مطمئن نفس اپنے پیکر کو از سر نو تراشتا ہے۔ زیادہ تر نظموں میں خوف کے موسم کی کیفیت ہے، جبر کی دہشت ہے جس نے روح کو جکڑ لیا ہے، عذاب دربدری، بے گھری اور بے زمینی کے پیکر نظموں میں بھی بار بار ابھرتے ہیں۔ شاعر جھوٹی بشارتوں کی ضمانت نہیں دیتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ آرزومند آنکھیں، بشارت طلب دل اور دعاؤں کو اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ جب کبھی رنگوں، خوشبوؤں، اڑانوں، آوازوں اور خوابوں کی توہین کی جائے گی، عذاب زمینوں پر آتے رہیں گے۔ اسے دکھ ہے کہ اہل اعتبار کتنے بدنصیب ہو گئے کیوں کہ ان سے تو قرض آبرو بھی ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاعر قرآن مجید کا یہ فرمان دہرانے پر مجبور ہے:

اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن

بڑھا تو یہ تھا زمین عنبر پہ کشت خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے

سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعت خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
مگر ہوا یوں کہ نیزۂ شام پر سر آفتاب آیا
امانت نور جس کے ہاتھوں میں تھی اس پر عذاب آیا
اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں
ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟
خیام تسلیم و سائبان رضا کی ویرانیاں بنائیں
جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں اب ایسی مائیں کہاں سے لائیں

ایک اور نظم میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے:

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
مقتل سے دریا تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

(ایک رخ)

اس پیرائے میں افتخار عارف کی کئی نظمیں ہیں جو تاثر کے اعتبار سے جھنجھوڑتی ہیں۔ "آخری آدمی کا رجز"، "قصہ ایک بسنت کا"، "جہان گم شدہ"، "شکست اعتبار کا دن"۔

اداس شام کے نام"، "پتہ نہیں کیوں"، "التجا"، "دعا"، "اعلان نامہ" قابل ذکر ہیں۔ "ابوالہول کے بیٹے" میں اس عہد کا فرد محسوس کرتا ہے کہ فرعون کا ایک لشکر ہے اور فرد اکیلا ہے اور اس کے ہاتھ عصا سے خالی ہیں۔ ایسے میں ہستی دو بھر ہو جاتی ہے اور موت مقدر ہو جاتی ہے۔ التجا اور دعا کا پیرایہ کہیں جگہ ملتا ہے۔ کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں/ عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں/ اگرچہ شاعر چاہتا ہے کوئی معجزہ رونما ہو اور زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں لیکن اسے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کیوں کہ انسان پابرہنہ سر کو بجۂ احتیاج رزق کی مصلحت کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے آبا و اجداد نے حرمت آدمی کے لئے اور کلمۂ حق کے لئے صلیبوں پر جو خون بہایا تھا وہ لہو اب نہیں بولتا ہے۔ آج کے انسان کو تاریخ کے شہسواروں کا خون آواز نہیں دیتا۔ اس کے سامنے اس کے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جاتی ہیں لیکن وہ تماشائی بنا رہتا ہے۔ شاعر نے ان لوگوں کی بیلنس شیٹ بھی مرتب کی ہے جنھوں نے رشتۂ شہرت عام کو توڑنے کی ہمت دکھائی اور شہر غور و نام کو تج دینے کا حوصلہ بھی کیا۔ لیکن اندر کا کمزور آدمی صبح و شام ڈرانے آجاتا ہے اور نئے سفر میں/ کیا کھویا ہے کیا پایا ہے یہ سمجھانے آجاتا ہے/ (بیلنس شیٹ) افتخار عارف کی نظم "بارہواں کھلاڑی" خاصی مشہور ہے۔ اس نظم کو/ جبر/ پا مردی، احتجاج/ اور/ خوف، بزدلی، مفاہمت/ کے ان تضادات کے تناظر میں پڑھئے جو افتخار عارف کی شاعری ابھارتی ہے تو اس نظم کی معنویت اجاگر ہوتی ہے:

خوشگوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارہواں کھلاڑی بھی

کیا عجب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہو جائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہو جائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وسل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے

تم بھی انتشار عارف
بارہویں کھلاڑی ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے

تم بھی انتشار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

(بارہواں کھلاڑی)

ہم سب زندگی کے کھیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی باری کے منتظر ہیں۔ کون میدان میں ہے اور کون میدان کے باہر، کسی کو خبر نہیں۔ جو میدان میں ہیں اور احساس کی دولت سے بہرہ مند ہیں وہ جانتے ہیں کہ جو میدان میں ہیں وہ بھی میدان سے باہر ہیں۔ یہ کیفیت اس بے زمینی اور بے گھری سے الگ نہیں ہے جس کا ذکر شروع میں کیا گیا تھا۔ ایک زمین ہمارے وجود سے باہر ہے، ایک ہمارے دل کے اندر ہے۔ زندگی کرنے اور زندگی کی دہشت اور اس کے جبر سے مقابلہ کرنے کے لئے یا سیاسی ظلم و استبداد کے خلاف نبرد آزما رہنے کے لئے بار بار دل کی زمین کی طرف لوٹنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان جتنا نہاں خانۂ باطن میں جھانکتا ہے، اتنا نیا ہوتا ہے۔ اس کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور زندگی کے دکھ درد اور ظلم و جور سے پنجہ لڑانے کی تاب مقاومت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مکالمہ سننے سے تعلق رکھتا ہے:

"ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
جو خلعت انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
حجاب کو رمز نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا"

"کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے

یہ خوش یقینیوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں

اس کو اندر سے مار دیتے ہیں

کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے"

"تو کون ہے جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اچھالتا ہے

جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کا امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کا سامان رکھنے والا

کوئی تو ہوگا"

نہیں، کوئی نہیں

کہیں کوئی ہے!!

(مکالمہ).

ان چند صفحات میں یہ کوشش کی گئی کہ افتخار عارف نے اپنے تخلیقی سفر میں جس ملکِ سخن کو دریافت کیا ہے، اس کے خاص خاص منطقوں کی کچھ آگہی حاصل ہو جائے۔ ان کی قلمروِ شعر میں وادیاں بھی ہیں اور چوٹیاں بھی، درد کے گھنے جنگل بھی ہیں اور روح کی گہرائیوں میں بہنے والی سبک ندیاں بھی۔ کہیں انسانی رشتوں کی چاندنی ہے اور کہیں ظلم کے طوفانوں نے عافیت کے خیموں کی طنابیں کاٹ دی ہیں۔ دشتِ بلا میں سموم اور صرصر کی آندھیاں چل رہی ہیں اور پیاسی ریت میں انسان لہو قطرہ قطرہ جذب ہو رہا ہے۔ اس منظرنامے کا پورا تعارف نہ تو مقصود تھا، نہ ممکن ہے کیوں کہ کوئی بیان شاعری کا بدل نہیں۔ افتخار نے جس درد کی صلیب اٹھائی ہے وہ ہمارا اور ہمارے عہد کا درد ہے، سب کا درد ہے لیکن اس میں انفرادی کیفیت انھوں نے اس طرح پیدا کی ہے کہ اُس درد کو انھوں نے بے زمینی کے احساس کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس میں بستیوں، شہروں ا... مٹیوں کی عظمت کے ساتھ ساتھ گھر دہلیز کی حرمتوں کا دکھ درد بھی فنی خلوص کے ساتھ شامل کر د...

ہے۔ وہ آج کے انسان کا المیہ بیان کرتے ہیں لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نہ نوحہ گری
کی ہے نہ رجز خوانی، بس درد دل رقم کر دیا ہے۔ یہ درد ایسی قوت ہے جو باطن کا نور بن کر وجود
کو منور کر دیتی ہے۔ افتخار کا پیرایہ بالعموم رمزیہ اور علامتی ہے لیکن لہجہ نامانوس نہیں۔ اس میں ایسی
شعلگی اور دلآویزی ہے جو ان کی اپنی ہے۔ افتخار عارف کا شیوۂ گفتار، کلاسیکی رچاؤ شائستگی
اظہار، دردمندی اور شدت احساس سے عبارت ہے۔ اس میں جو قوت نمو ہے اور انفس و آفاق
سے اسے جو نسبت ہے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس آواز کا نغمہ تازہ و شیریں رہے گا۔

افتخار عارف

نظمیں

اعلان نامہ

میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اسی قبیلے کا آدمی ہوں
کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اس پہ جان دے دی
میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں
گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا مرا قبیلہ بریدہ اور بے رداسروں کی
گواہیاں
لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے
رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آ گیا ہوں
تباہ ہونے کو ایک گھر لے کے آ گیا ہوں
میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اسی قبیلے کا آدمی ہوں۔

ایک سوال

میرے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لئے
تا ابد روشنی کے لئے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو اُن
کے ہونے کا اعلان کرتا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پابرہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا
کیوں نہیں!

اور ہوا چپ رہی

شاخِ زیتون پہ کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزومند آنکھیں، بشارت طلب دل دعاؤں کو اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور منادی کرادی گئی
جب کبھی رنگ کی خوشبوؤں کی اڑانوں کی آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے۔

قصہ ایک بسنت کا

پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا اور کس کی
ڈور ہلکی تھی
انھیں اس سے غرض کیا پینچ پڑتے وقت کن ہاتھوں میں لرزہ آگیا تھا
اور کس کی کھینچ اچھی تھی ؟
ہوا کس کی طرف تھی اور کس پالی کی بیری تھی ؟
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم ؟
انھیں تو بس بسنت آتے ہی اپنی اپنی ڈانگیں لے کے میدانوں میں آنا ہے
گلی کوچوں میں کانٹی مارنا ہے پتنگیں لوٹنا ہے لوٹ کے جوہر دکھانا ہے
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا
اور کس کی ڈور ہلکی تھی ؟

مکالمہ

"ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
جو خلعت انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
حجاب کو رمز نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا"
"کوئی نہیں ہے
کہیں نہیں ہے
یہ خوش یقینیوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں
جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں
اس کو اندر سے مار دیتے ہیں
کوئی نہیں ہے
کہیں نہیں ہے"
"تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت
کرتا ہے اور بادل اچھالتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف
میں خورشید ڈھالتا ہے
وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کا
امکان رکھنے والا
وہ خاک میں صورت، صورت میں حرف، حرف میں
زندگی کا سامان رکھنے والا
کہیں کوئی ہے!!
کہیں کوئی ہے!!
کوئی تو ہوگا!!

ایک رخ

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
مقتل سے دریا تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں۔

محفل لندن

سید معین الدین شاہ — لندن

"مہر دونیم" کی تقریب اجرا

افتخار عارف، اردو کے ممتاز اور منفرد لہجے کے شاعر، "اپنی نسل کے سب سے زیادہ سنجیدہ شاعر" اور "جدید شاعری کی ایک بہت زندہ اور توانا آواز" (سلیم احمد) کے شعری مجموعے "مہر دونیم" کی تقریب اجرا لندن کی مختلف اردو انجمنوں کے زیر اہتمام لندن یونیورسٹی میں منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت فیض احمد فیض نے کی۔

انجمن سمن زار کی معتمد عمومی شاہدہ احمد نے اکیڈمی آف اردو اسٹڈیز، اردو مجلس، کل برطانیہ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادب، حلقہ اہل سخن، انجمن عرفان اردو، حیدر آباد ایسوسی ایشن، لٹریری سوسائٹی آف ملٹی لینگویجز، علمی مجلس، شعبہ اردو لندن یونیورسٹی اور انجمن سمن زار کی جانب سے مہمان خصوصی اور معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ آپ نے سید منیر احمد منیر، سلطان الحسن فاروقی اور عزیزہ احمد کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس محفل کو کامیاب بنانے میں مدد کی۔

پاکستان کے مشہور موسیقار سلامت علی نے ترنم سے افتخار عارف کے یہ دو اشعار پیش کئے۔

میرا شرف کہ تو مجھے جواز افتخار دے — فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظ گھڑ کے آگیا — کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے

کام بگاڑنے اور سنوارنے کا اشارہ شاعر نے خدا معلوم کس کی طرف کیا تھا، لیکن ہم نے تو یہ دیکھا کہ بی بی سی کی بیرونی نشریات میں اردو کے پروڈیوسر، سید رضا علی عابدی نے جب محفل کی نظامت فرمائی تو محفل کو ایسا سنوارا، ایسی تزئین و آرائش کی کہ لوگ عش عش کر اٹھے اور اپنے برجستہ اور زوردار فقروں سے محفل کو موہ لیا۔ ان کے حسین اور نپے تلے جملے سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر کوئی بگڑا کام بھی ہوتا تو وہ عابدی کے ہاتھوں سنور جاتا۔

سید رضا علی عابدی نے فرمایا :

" آج کی شام ہمارے لئے یوں بھی باعث افتخار ہے کہ افتخار عارف اب صحیح معنوں میں اہل کتاب ہو گئے ۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے میں حیدرآباد دکن میں تھا ، اسی دوران وہاں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے مجھے یہ شرف بخشا کہ اس مشاعرہ کا مہمان خصوصی بنایا ۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا ۔ اس کے بعد انھوں نے اصرار کیا کہ میں شروع میں ایک تقریر بھی کروں ، معاملہ ذرا مشکل ہو گیا ، میں نے چھوٹی سی تقریر کی اور کہا کہ میں شاعر نہیں ہوں ورنہ غزل آپ کو سناتا ، البتہ پردیس سے آیا ہوں ، اور پردیس سے آنے والے اپنے ساتھ سوغات لایا کرتے ہیں ۔ میں آپ کے لئے ایک شعر کی سوغات لایا ہوں جو ہمارے دوست افتخار عارف کا شعر ہے ، پھر میں نے یہ شعر پڑھا کہ

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے

میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

اس ساری تمہید کا مقصد دراصل مجھے یہ کہنا ہے کہ کتاب کی اشاعت مصنف کو اعتبار عطا کیا کرتی ہے ۔ افتخار عارف کی کتاب چھپ گئی ہے اور اس طرح خدا نے اب انھیں اتنا معتبر کر دیا ہے کہ انھوں نے ہمارے دلوں میں جو مکان بنایا تھا آج سے وہ اسے اپنا گھر سمجھیں ۔ افتخار عارف کی کتاب کی اشاعت سے یہ بھی ہوا ہے کہ وہ معتبر ہو گئے ہیں اب وہ مصنفوں کی ورلڈ الیون میں شامل ہو گئے ہیں اور آج سے وہ "بارہویں کھلاڑی" نہیں رہے ۔

لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ڈیوڈ متھیوز نے اپنے تاثرات پیش کئے ۔ محفل میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے ڈاکٹر متھیوز کو نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی ان کی اردو تقریر سنی تھی ۔ ڈاکٹر ڈیوڈ متھیوز کی شگفتہ اردو اور ان کے مزاح سے لوگ بہت خوش نظر آ رہے تھے ۔

سید رضا علی عابدی نے پاکستان کے ممتاز نقاد محمد علی صدیقی کے بارے میں فرمایا کہ "محمد علی صدیقی اردو ادب کے بھیدی ہیں ۔ صحیح معنوں میں اردو نظم و نثر کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں ہے ، ہر اہل قلم کی خوبیوں اور خامیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور بھیدی ہونے کے باوجود ان کی خوبی یہ ہے کہ لنکا کبھی نہیں ڈھاتے ۔ یہ افتخار عارف کی شاعری کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں ، آئیے اب انھیں کی زبانی سنیں ۔"

محمد علی صدیقی نے افتخار عارف کی شاعری کو ایک معتبر اور مستند نقاد کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے فرمایا کہ :

" افتخار عارف کی ذات میں جدید اردو شاعری کو ایک ایسا شاعر میسر آیا ہے جسے اپنی شعری روایات پر اعتماد ہے، لیکن یہ اعتماد کچھ مختلف انداز لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے عہد کی سفاک سچائیوں سے منہ نہیں چھپاتا۔ شکست خواب اور ذات کا مسئلہ افتخار عارف کی شاعری کا محدود ضرور ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اس کیفیت کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہو۔ وہ شکستِ ذات کے عالم میں بھی وصل کی سرشاریوں کی بات کرتا ہے۔ زندگی شاید اسی لئے امر ہے کہ اس کی رفتار میں وصل اور فصل، شکست و تعمیر اور ہار جیت کے نئے امکانات نکلتے رہتے ہیں۔"

محمد علی صدیقی نے افتخار عارف کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مثالوں کے طور ان کے اشعار پیش کئے اور کہا کہ:

" افتخار عارف کی شاعری میں بھی دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں بھرپور انانیت کے لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس قدر بھرپور کہ یہ شبہ گزرتا ہے شاید وہ اندر سے کچھ زیادہ ہی ٹوٹے پھوٹے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات شاعری شاعر کی ذات پر غلاف ڈال دیتی ہے کافی دبیز غلاف، لیکن افتخار عارف کی شاعری میں ان لمحات کی بہتات ہے جہاں خود کو ہم پر منکشف کرنے کی لذت سے ہم کنار ہوتے رہتے ہیں اور ہم اس لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پریشان بھی۔ افتخار عارف زبان و بیان کے حوالے سے کلاسیکی بلکہ نیم کلاسیکی اسلوب کی شاعری کے دلدادہ نظر آتے ہیں لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ وہ ہمارا ہم عصر ہے اور ہم عصری حسیت کے اظہار کے لئے کلاسیکی لب و لہجہ کا استعمال آسان کام نہیں ہے۔"

افتخار عارف کو جو چیز ایک منفرد شاعر کا درجہ عطا کرتی ہے وہ ان کا لہجہ ہے، ان کی زبان۔ روایت کا پاس اور اس کی استواری اور ان کا جز شاعری ہے۔ اس چیز کا اظہار کرتے ہوئے محمد علی صاحب نے فرمایا کہ:

" یہ سچ ہے کہ افتخار عارف نے اپنے منفرد لہجے کے لئے نئی زبان وضع کرنے کے لئے کوشش نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنے شعری روایت کے خزینے سے اس قدر بھرپور انداز میں استفادہ کیا ہے کہ وہ اسی بنیاد پر ایک قابل قدر اور ممتاز شاعر تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔"

افتخار عارف کی شعری دنیا کے چند رخ پیش کرنے کے بعد محمد علی صدیقی نے کہا کہ

" افتخار عارف کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند شاعر ہے۔ عاشق بھی ہے جس قدر مقدور بھر ممکن ہے، سیاسی طور پر متنفر بھی اسی قدر ہے جس قدر ممکن۔

وہ چکی کی مشقت سے گھبراتا ہے، گھبراتے تو ہم میں سے اکثر لوگ ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ افتخار عارف خود پر ہنستا ہے اور اس طرح ہمیں خود آگاہ کرتا ہے اور خود نئی حسرتوں کے تعاقب میں آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن میں افتخار عارف کو مختلف ترقی پسند شعرا کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند شاعر گردانتا ہوں .... وہ گزشتہ دس بارہ برسوں میں ابھرنے والی شعری آوازوں میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی آواز ہیں اور وہ اس لئے کہ وہ شاعری ہی کو اپنی زندگی اور نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانیت کے جذبہ سے اس درجہ سرشار ہیں کہ ان کے لئے انسان اور فطرت کے درمیان دوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

محمد علی صدیقی کی تحقیق و تنقید کے تناظر میں:

"افتخار عارف کی شاعری دل، ہوا اور گھر کے مثلث سے عبارت ہے۔ دل وہ دل کہ جو عقل کا جواب ہو، ہوا وہ ہوا کہ جو زندگی بیزار اور زندگی ریز ہو اور ہمارا ضمیر بھی، اور گھر وہ وطن جو جنت نشان ہو۔

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

افتخار عارف کے شعری مثلث میں زندگی کی بنیادی سچائیوں سے اٹھنے والے وہ سارے حوالات موجود ہیں جن میں بلا کی آفاقیت ہے۔"

اور محمد علی صدیقی کی عمیق نظر اور نگاہ دور بیں نے پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"مجھے امید ہے کہ افتخار عارف نے اردو شاعری میں اپنے لئے جتنی جلدی جگہ بنالی ہے وہ اسے بہت دیر تک باقی بھی رکھ پائیں گے، کیوں کہ ان کے بعض شعرا ایسے بھی ہیں جو ہر دور میں زندہ رہنے پر اصرار کرتے رہیں گے۔"

ادھر محمد علی صدیقی کی آواز کی گونج ابھی باقی ہی تھی کہ سید رضا علی عابدی کی آواز ابھری:

"یہ تھی ایک نقاد کی آواز، محمد علی صدیقی ــــ ایک اور آواز جس کے بارے میں شاید میرا علم درست نہ ہو .... لیکن ۱۹۷۶ء میں عظیم الشان مشاعرہ ہوا، اس وقت ایک آواز اٹھی تھی اور صاحب کمال ہے کہ وہ آواز آج تک گرماتی ہے، دلوں کو، روح کو، ذہن کو، محترمہ زہرہ نگاہ نے کیسا اچھا شعر کہا ہے کہ:

کوئی کرتا ہے اگر پیار بھری بات تو ہم
شہر کے شہر ستاروں سے سجا دیتے ہیں

آئیے آپ اپنی بات کیجئے، شہر کو سجانا ہماری ذمہ داری ہے۔"

زہرہ نگاہ نے شاعروں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "جہاں کوئی اچھی بحر، اچھا قافیہ اور ہموار زمین نظر آئی غزل کہہ لی" لیکن افتخار عارف کی "یہی شرافت ہے کہ وہ رات دن شعر نہیں کہتے، کبھی کبھی کہتے ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں۔"

زہرہ نگاہ نے اپنی گفتگو کے آخر میں افتخار عارف کو ایک مشفقانہ اور بزرگانہ مشورہ یا نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہجرت کا غم، تکالیف، بے اعتباری کے زخم، وفا کا گماں، ان ساری باتوں کی شاعری کی کتاب میں اتنی اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ غم تو ہم لوگوں کے لئے ٹھیک تھے، اس لئے کہ ہمیں ورثہ میں ملے تھے لیکن افتخار جس نسل کے نمائندے ہیں ان کی شاعری کے موضوع ہونا چاہئیں عشق، جرأت، حزم اور حوصلہ، وہ نڈر پن جو ادب کے ذریعے جو نئی نسل کو تہذیب و تمیز بھی سکھاتا ہے اور برائی سے لڑنا بھی، کیوں کہ ان کے مزاج اور ان کی عمر کے لئے یہی زیب دیتا ہے۔"

زہرہ نگاہ کے بعد پاکستان کے مشہور ناول نگار عبداللہ حسین نے اپنے تاثرات پیش کئے۔ پھر شہرت بخاری اظہارِ خیال کے لئے تشریف لائے اور "سرگذشت شہرت" شروع فرمائی۔ یہ سفر تھا اپنی ذات کا جو پیدائش سے شروع ہوا، اور جب جوانی تک آئے تو کبھی "آبِ حیات" پلا پلا کر سامعین کو زندہ کرنے اور کبھی اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا شمامۃ العنبر اور للنے سنگھا سنگھا کر سامعین کو مدہوش کیا اور شمامۃ العنبر سے محفل معطر ہوگئی تو گویا لکھنؤ کا دبستان شاعری کھل گیا اور پھر ؎

ذکر جب چھڑ گیا دبستاں کا

تو بات افتخار عارف کی شاعری تک پہنچی۔ صاحب موصوف پچاس منٹ تک پڑھتے رہے، لوگ سنتے رہے، سر دھنتے رہے، ایسا صبر و تحمل تو ہم نے کسی بھی محفل میں نہیں دیکھا۔ افسوس یہ کہ صرف ایک تہائی مضمون پڑھا گیا تھا کہ ؎

روئے گل سیر نہ کردم کہ بہار آخر شد

"سرگذشت شہرت" پوری نہ سننے کا صدمہ ہے۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ   ہمی چل دیئے داستاں کہتے کہتے

خیر پھر کبھی سہی ع

شہرت زندہ، محفل باقی

سید رضا علی عابدی بھی کسی بڑے بھیدی سے کم نہیں ہیں۔ آخر انھوں نے ع

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی

اور بھانڈا پھوڑ ہی دیا کہ :

" جب ہم نے مشتاق احمد یوسفی سے "مہر دو نیم" کی اجرا کی اس تقریب میں تقریر کرنے کے لئے گذارش کی تو کہنے لگے " مجھے آپ رہنے ہی دیں۔ جس مصنف کی کتاب کی تقریب میں تقریر کرتا ہوں اس سے مصنف خفا سا ہو جاتا ہے اور یہ رسم سی بن گئی ہے "

اس محفل میں عابدی صاحب نے صرف یہ راز فاش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مشتاق احمد یوسفی سے درخواست کرتے ہوئے کہا کہ " وہ تقریر کریں اور افتخار عارف سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس رسم کو توڑیں "

مشتاق احمد یوسفی تشریف لائے اور کہا :

" کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور کون سی بری اس کی وضاحت خود شاعر مقدمہ میں کر دیتے ہیں اور بعض اپنے اشعار سے فرق ذہن نشین کرا دیتے ہیں "

افتخار عارف نے نہ مقدمہ لکھا اور نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا۔ ان کے شعری مجموعہ کی ابتدا دو معرکۃ الآرا مقدموں سے ہوتی ہے۔ جناب فیض نے اپنے مقدمہ میں ان کے آہنگ و عروض لغت اور محاورہ میں اجتہاد، ظلم و تعدی، ضبط زبان بندی کے خلاف احتجاج اور تشبیب پر بڑے جامع اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بھاری بھر کم مضمون کی بہ حیثیت مقدمہ ثانی کے چنداں ضرورت نہ تھی۔

مشتاق احمد یوسفی شعر نہیں کہتے لیکن شعرا کے اشعار میں تصرف فرما کر ایک نیا زاویہ فکر عطا کرتے ہیں۔ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

" حضرات ! میں نے کبھی شعر نہیں کہا اور بسکہ میرے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں۔ اس لئے آئندہ شعر کہنے کا کوئی احتمال نہیں۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کر سکتا۔ غالباً کیا یقیناً انھیں خصوصیات کی بنا پر منتظمین نے مجھے اظہار رائے کی اجازت دی ہے۔ دراصل مجھ جیسے نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کھلا

میں جاکر شیر کو ڈیمیٹیویزم کے فوائد اور فضائل پر لکچر دے۔"

افتخار عارف کی شعری صلاحیت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے کہا کہ،

"وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر کی پرکھ بھی رکھتے ہیں۔ افتخار عارف خراب شعر صحیح ساز کی قمیض اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کر سکتے۔ باسی کباب کے قدرداں تو خیر لندن میں بہت ہیں لیکن خراب شعر اور نثری نظم کہنے والوں کے بارے میں افتخار عارف کا عقیدہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے۔"

مشتاق احمد یوسفی نے افتخار عارف کی عادات اور خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ:

"اس "اخراج عقیدت" کے بعد لگاتار خراب شعر سننے پڑیں تو وہ سر پیٹنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے بار بار اپنا پیٹ پیٹتے ہیں۔ اگر شعر بہت ہی خراب ہو تو اپنے مخصوص لکھنوی انداز میں شاعر کے گھٹنے پکڑ لیتے ہیں۔ اس کی بظاہر تو ہمیں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کہیں شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور یہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں۔"

اگر افتخار عارف یہ سب کچھ نہیں تو پھر کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے فرمایا:

"اظہار کے پیمانے کچھ بھی ہوں اور قدردانی اور قامت پیمائی کے پیمانے خواہ نئے ہوں یا پرانے، افتخار عارف کو اپنا قد پہچنوانے میں دیر نہیں لگی۔ "مہر دو نیم" کی جو پذیرائی ہو رہی ہے کم کتابوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی شاعری کی عمر صرف دس سال بنتی ہے۔ مگر ان دس برسوں میں انھوں نے وہ مسافتیں طے کر ڈالیں جس سے اچھے اچھوں کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ اس دس سالہ شاعری میں تین ادوار صاف پہچانے جاتے ہیں جن سے ان کے قابل رشک تیز ذہنی اور شعری ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔"

پھر مشتاق احمد یوسفی نے افتخار عارف کی شاعری سے مثالیں پیش کرتے ہوئے ان میں ادوار کی نشاندہی کی اور پھر فرمایا:

"اس بات پر خوشی بھی ہوتی ہے اور تعجب بھی کہ غزل میں بہت جلد مقام بنا لینے کے باوجود انھوں نے نظم پر برابر توجہ دی۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ نظم بہتر کہتے ہیں یا غزل۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ امتیاز کسی بھی شاعر کے لئے باعث رشک و افتخار ہوتا۔ حیرت اس لئے کہ غزل ایسی ظالم صنف ہے۔ یہ اپنے چاہنے والے کو کہیں اور کا نہیں رکھتی ساری ذہانت ٹھگ لیتی ہے۔

غزل کہاگئی نوجواں کیسے کیسے"

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے یوسفی نے کہا:

" افتخار عارف کو اپنے موقف، لہجہ اور آہنگ پر پورا اعتماد ہے اور وہ اپنی بات جم کر کہتے ہیں، اور پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں۔"

افتخار عارف کی شاعری پر کن کن بڑے شعرا کا اثر ہے یا وہ کن کن شاعروں سے اثر انداز ہوتے ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یوسفی نے فرمایا:

" مزاجاً ان کا ادبی رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ میر کے قبیلے کے آدمی نہیں ہیں تاہم انھیں اعتراف ہے کہ ؎

ہم میر تو کیا ہوتے غالب بھی نہیں تھے

ان کا غمزہ اپنی جگہ مگر وہ وفور انکسار میں غالب پر ہاتھ صاف کر گئے۔ غالب میں ہمیں تو کسی کمزوری کے آثار نظر نہیں آتے بجز اس کے کہ اس نے کچھ اشعار افتخار عارف کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی تھی۔"

مشتاق احمد یوسفی نے افتخار عارف کی شاعری کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

" انھیں اپنی ذات اور بات کی سچائی پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ اپنے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ ہی کا شکوہ نہیں لہجہ کا شکوہ بھی ہے۔ لہجہ لفظ کی بہت ہے۔ یہ لفظ کو نئے معنی دیتا ہے، نئی توانائی اور رنگ بخشتا ہے، لہجہ لفظ کا اعتبار ہے، لہجہ لفظ کا سپورٹن ٹھاٹھ ہے، لہجہ زیور نہیں حرف کی حرمت ہے، لہجہ محرم راز نہاں خانۂ دل ہے، لہجہ نیتوں کا امین ہے، لہجہ آدمی کی پہچان ہے، لہجہ خود آدمی ہے، لہجہ نہ ہو تو لفظ کھوکھلے، بے رس، بے تاثیر، فقط پُرشور آوازیں، نہ کوئی جوش نہ کوئی جھنکار، نری آوازیں۔"

اور مشتاق احمد یوسفی نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا کہ:

" عصری عالمی شاعری اور اس کے تجرباتی اسالیب اور رجحانات سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا ڈکشن ٹھیک کلاسیکی رکھا ہے اور اس کے پورے لوچ اور رچاؤ کے ساتھ مشتاق احمد یوسفی نے افتخار عارف کی امیجری کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد کہا کہ:

" افتخار عارف ذہنی سرشاری اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاج کا ہے۔"

سید رضا علی عابدی نے یوں لب کشائی فرمائی۔

یہ معجزہ بھی کسی کی دعا مانگتا ہے　　یہ شہر اب بھی اسی بے وفا کا لگتا ہے
یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی　　وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

"مہر دو نیم" کھولتے ہی ایک سچے شخص کا قول نظر آیا ہے کہ "کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ" بھائی افتخار آؤ اور کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔"

اور بھائی افتخار عارف آئے اور کلام کیا۔ شروع میں تمام حضرات کا اپنی حوصلہ افزائی کرنے پر، تمام انجمنوں کا جنھوں نے ان کی پذیرائی کی اور سامعین کا جنھوں نے تقریب میں شرکت فرمائی، ان سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے کلام کی ابتدا ایک نظم "آخری آدمی کا رجز" سے کی اور پھر اپنا کلام پیش کیا تا کہ پہچانے جائیں۔ افتخار عارف کے کلام کے بعد صدر محفل فیض احمد فیض نے کہا کہ جو افتخار عارف کی شاعری میں انھیں کہنا تھا وہ کتاب کے دیباچہ میں کہہ چکے ہیں۔ فیض نے کتاب کے اجرا پر افتخار عارف، خواجہ شاہد حسین اور یاسمین حسین کو مبارکباد دی۔

بر تو این محفلِ شاہانہ مبارک باشد

ایک وقفہ کے بعد کلام شاعر بہ زبانِ موسیقار شروع ہوا۔ اس محفل میں موسیقاروں نے افتخار عارف کی غزلیات پیش کیں۔

"مہر دو نیم" سے کچھ اشعار مشتے نمونہ از خروارے کچھ یہاں پیش خدمت ہیں۔ باقی کتاب کے پردۂ سیمیں پر ملاحظہ فرمائیے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے　　وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
ہوا ہے یوں بھی کہ اک عمر اپنے گھر نہ گئے　　یہ جانتے تھے کوئی راہ دیکھتا ہوگا
ہم کوئے ملامت سے نکل آئے تو ہم کو　　راس آئی نہ پھر آب ہوا اور طرح کی
عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی　　نئے سفر کے لئے راستہ نہ مانگے کوئی
ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم　　کہ سارا شہر لئے کاسۂ طلب نکلا
خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے　　ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ　　رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے　　جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی میرا ہے
ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش　　عذاب دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے
میں نے تمھاری قربت کی سرشاری میں　　کیسے اچھے شعر لکھے ہیں دیکھو تو ☐

پرویز ید اللہ مہدی
۲۱۹۔ بہرام ، باندرہ (ایسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۱

(طنز و مزاح)

اسپتال سے اسپتال تک

آج کے مہذب انسان اور اسپتال میں بڑا اٹوٹ رشتہ ہے جس پر برسوں پہلے اکبر الہ آبادی کچھ یوں روشنی ڈال گئے ہیں

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

اکبر مرحوم نے اس شعر میں دراصل تصویر کا وہ رخ دکھایا ہے جب انسان یہ کہتے ہوئے اسپتال اور اس جہان فانی دونوں جگہ سے رخصت ہوتا ہے

ڈاکٹروں ، نرسوں پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو "اہل پلنگ" ہم تو سفر کرتے ہیں

جب کہ ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ اس بھیانک انجام کا آغاز اکثر اسپتال ہی میں ہوتا ہے ۔گویا زندگی کی فلم کے پہلے "سین" کا مہورت ،اسپتال کے زچگی وارڈ میں ہوتا ہے یعنی انسان کا بچہ اسپتال ہی کی کسی کھاٹ پر آنکھیں کھولتا ہے ، پھر اپنی گنہ گار آنکھوں سے دنیا اور دنیا کے تماشے دیکھتا ہے ، خود تماشا بنتا ہے اور پھر انجام کار اسپتال ہی کی کسی کھاٹ پر ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے ، بالفاظ دیگر جو سفر ایک روز اسپتال کی کھاٹ سے شروع ہوا تھا وہ اسپتال ہی کی کھاٹ پر ختم ہو جاتا ہے ۔بقول شاعر ؎

بس کھاٹ پڑی رہ جائے گی اور لاد چلے گا بنجارہ ..!!

سچ پوچھئے تو اسپتالوں کا بنیادی مقصد انسانی زندگی کے آغاز و انجام کی دو مختلف تصویریں پیش کرنا ہوتا ہے ۔تاہم ان دو نقطہ ہائے آغاز و انجام کے علاوہ اسپتالوں میں خانہ پری کی غرض سے مختلف النوع امراض کی تشخیص ، تشویش ، تجویزات تجربات اور حادثات بھی بخوبی سر کئے جاتے ہیں اور ان تمام مراحل کی تکمیل اک ترے جانے سے پہلے ، اک ترے آنے کے بعد والے درمیانی

دقیقے پر محیط ہوتی ہے۔

اسپتالوں میں بھی تھری اسٹار، فائیو اسٹار ہوٹلوں کی طرح گریڈ ہوتے ہیں جو اسپتال کے محل وقوع جغرافیہ، بستروں کی گنجائش اور اس کے عملے کی تعداد و قابلیت کی مناسبت سے دیئے جاتے ہیں۔ اسپتال خیراتی بھی ہوتے ہیں، سرکاری بھی اور خانگی بھی —— خیراتی اسپتال جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خیرات پر چلتے ہیں اس لئے یہاں مریضوں میں دوا بھی اسی طرح بٹتی ہے جیسے جوتیوں میں دال بٹتی ہے، بلکہ ہمارا خیال ہے اگر ان اسپتالوں میں دوا کی جگہ سچ مچ دال روٹی بٹنے لگے تو مریضوں کو شرطیہ شفا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خیراتی اسپتالوں کے چکر کاٹنے والے مریضوں کی اکثریت عموماً "فاقے" کے مرض میں مبتلا ہوتی ہے —— !

سرکاری اسپتال ہر اعتبار سے سرکاری ہوتے ہیں یعنی یہاں مرض کا علاج دیگر سرکاری دفتروں و اداروں کی طرح "تھرو پراپر چینل" (THROUGH PROPER CHANNEL) کیا جاتا ہے اور سرکاری اسپتالوں کا ہر "پراپر چینل" برٹش چینل (BRITISH CHANNEL) کا کبھی باپ ہوتا ہے لہذا مریضوں کی بڑی تعداد علاج کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی "چینل" میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے پار لگ جاتی ہے۔

خانگی اسپتال، اول الذکر دونوں اسپتالوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں، لفظ اسپتال چونکہ نفسیاتی طور پر مریض کی آدھی جان نکال لیتا ہے اس لئے خانگی اسپتال "پرائیویٹ نرسنگ ہوم" کہلاتے ہیں لیکن ان "نرسنگ ہومس" میں بنیادی خامی یہ ہوتی ہے کہ جو مریض علاج سے پوری طرح شفایاب ہو جاتا ہے۔ وہ علاج معالجے کا "تگڑا بل" دیکھ کر نہ صرف پھر سے بیمار ہو جاتا ہے بلکہ نت نئے امراض میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب فیملی کے زمرے میں صرف عزیز و اقارب ہی شمار ہوا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ضرورتوں کے ساتھ فیملی نے بھی وسعت اختیار کی اور فیملی ممبروں میں حجاموں اور دھوبیوں نے اپنی جگہ بنائی۔ پھر ڈاکٹروں کو فیملی ممبر کا درجہ عطا کیا گیا۔ بعد ازاں سائنسی ایجادات نے جیسے جیسے نت نئی بیماریوں کو راہ دکھائی، فیملی ڈاکٹروں کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اور ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچ گئی کہ سماج میں کسی اعلیٰ و ارفع مقام عطا کرنے کے لئے، اس کی معاشی حیثیت جائیداد املاک اور بینک بیلنس" کی جگہ اس کے فیملی ڈاکٹروں کی تعداد پیمانہ بن گئی۔ چنانچہ اب بڑا آدمی وہی کہلاتا ہے جو اپنے اطراف و تعداد فیملی ڈاکٹروں کی فوج رکھتا ہے یعنی امراض قلب کا فیملی ڈاکٹر الگ، کینسر

کا فیملی ڈاکٹر الگ، ناک کان اور حلق کا فیملی ڈاکٹر الگ، سر دی زکام کھانسی بخار کا فیملی ڈاکٹر الگ، بڑے لوگوں کی نجی زندگی میں فیملی ڈاکٹروں کے عمل دخل کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب متمول لوگ اپنے فیملی اسپتال بھی رکھنے لگیں گے ـــــ خیر آدمی چاہے لکھ پتی ہو، کروڑ پتی یا صرف ایک عدد پتنی کا پتی، زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ڈاکٹروں، حکیموں، نیم حکیموں، ویدوں، ڈسپنسریوں اور اسپتالوں کی زد میں آکر رہتا ہے اور یوں اس کی اچھی خاصی زندگی کی "شام" ہو جاتی ہے۔!

خوش قسمتی سے ہم اس وقت عمر کے جس پیٹے میں ہیں، اس میں مہربان راوی نہ صرف چین ہی چین لکھتا ہے۔ بلکہ تندرستی کی نعمت سے بھی سرفراز فرماتا ہے، اس لئے آج تک نہ تو ہمارا پالا دانت کے اس ڈاکٹر سے پڑا ہے جو ناکارہ دانت نکالنے سے پہلے بطور سود کے دو عدد اچھے خاصے کارآمد دانت بھی نکال دیتا ہے، اور نہ ہی کسی اسپتال کے "آپریشن ٹیبل" پر لیٹنے کی نوبت آئی جس پر کوئی ماہر مگر غائب دماغ سرجن آپریشن کے دوران اپنا کوئی 'اوزار' مریض کے پیٹ میں رکھ کر بھول بھال جاتا ہے علاوہ ازیں کبھی ان ماہر چشم سرجنوں کے ہتھے بھی نہیں پڑے جو اپنے 'زیدہ بینا' کے زعم میں، مریض کی ناقص آنکھ کی جگہ اچھی خاصی آنکھ نکال کر اسے بینائی سے محروم کر دیتے ہیں اور جب اس مجرمانہ غفلت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو بجائے نادم ہونے کے یہ ماہر چشم، طوطا چشمی پر اتر آتے ہیں ـــــ!!

دراصل ہمیں ڈاکٹروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا کہ حکیموں اور ہڈی جوڑنے والے معالجوں سے پڑا ہے اور یہ بھی اس زمانے کی بات ہے جب آتش ابھی جوان نہیں ہوا تھا، یعنی ابھی کھانے کھیلنے کی عمر تھی بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ ہم کھاتے تو برائے نام تھے لیکن کھیلتے بہت تھے ـــــ ویسے یہ خواہ مخواہ کی وضاحت اس لئے کرنی پڑی کہ حکیموں کے ذکر پر آپ ہمیں خدانخواستہ کسی صیغۂ راز والی پوشیدہ، بیماری میں مبتلا نہ سمجھ بیٹھیں کیونکہ حکیموں کے ساتھ ان دنوں "صیغۂ راز" اس قدر نتھی ہو گیا ہے کہ کسی نوجوان کو کسی حکیم کے مطب کے سامنے سے صرف گزرتا دیکھ کر لوگ اس نوجوان کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بھی پھیلا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چارہ اگر کنوارا ہو تو زندگی بھر کنوارا رہ جاتا ہے اور اگر شادی شدہ ہو تو اس کے سسرالی رشتہ دار اپنی بیٹی کے "پھوٹے بھاگ" کا مرثیہ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں ـــــ خیر بات ان حکیموں اور معالجوں کی چل رہی تھی جن کی حکمت اور علاج نے بچپن میں ہمیں اپنا شکار بنایا تھا؛ بچپن میں ہمیں سوکھی کھانسی کی شکایت اکثر رہا کرتی تھی جس کے علاج کے سلسلے میں ہمارے بزرگ ہمیں جبراً

ایک سوکھے سا کھے حکیم صاحب کے مطب میں لے جاکر ان کے آگے زبردستی ہمارے "زنانے مرض" تہہ کرواتے تھے۔ حکیم صاحب قبلہ ہر قسم کی کھانسی کے علاج پر "اتھارٹی" سمجھے جاتے تھے اور خود اس اسپیڈ سے کھانستے تھے جیسے کھانسی کا علاج ہی نہیں بلکہ کھانسی بھی ان پر ختم ہوگئی ہو۔ کچی عمر کے باوجود ہمیں اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ حکیم صاحب ہماری کھانسی کا علاج کس طرح کریں گے جبکہ خود اپنی کھانسی کا علاج آج تک نہیں کر سکے ـــــ ہمیں اچھی طرح یاد ہے موصوف کے مستقل مریضوں میں یا تو مکھیاں ہوا کرتی تھیں یا پھر ہم ـــــ اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی کوئی بھولا بھٹکا غافل مریض حکیم صاحب کے ہتھے چڑھ جاتا اسے مستقل اپنی حکمت کی سولی پر لٹکائے رکھنے کی غرض سے ایسی دوائیں دیتے کہ بے چارا ایک مرض سے چھٹکارا پاتے ہی دوسرے مرض میں مبتلا ہو جاتا، گویا حکیم صاحب سے زیادہ ان کی "حکمت عملی" چلتی تھی۔

اس زمانے میں حکمت عملی والے حکیم صاحب کے علاوہ ہمارا پالا ایک عدد "ہڈی توڑ جوڑ" معالج سے بھی پڑا۔ جن کے مطب کے باہر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں ہوا کرتا تھا جس پر اپنے وقت کے ایک مشہور فلمی ہیرو کو پٹیوں میں جکڑا ہوا دکھایا گیا تھا اور نیچے جلی حرفوں میں لکھا تھا ـــــ "معالج دست و پا شکستہ" ـــــ ایک مرتبہ کبڈی کھیلتے ہوئے ہمارے ہاتھ کی ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی جس کی پاداش میں ہمیں "معالج دست و پا شکستہ" کے مطب میں پہنچا دیا گیا جو مطب کم اور "اکھاڑہ" زیادہ تھا۔ معالج صاحب اس قدر دھان پان تھے کہ جیسے ہی انھوں نے ہماری سرکی ہوئی ہڈی کو چھوا ہم نے درد سے بلبلا کر دوسرے تندرست ہاتھ سے انھیں ایک ایسی زوردار "ہٹ" لگائی کہ بے چارے 'معالج دست و پا شکستہ' ایک دم بے دست و پا ہو کر دو گز دور جا گرے گرتے گرتے موصوف نے ایک زوردار ہانک لگائی ـــــ "خدا بخش ـــــ" اگلے ہی لمحے اس ہانک کے جواب میں جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے موصوف نے گرتے گرتے ہانک نہیں لگائی تھی بلکہ "جادوئی چراغ" رگڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں ایک عدد "دیو قامت جن" کیا حکم ہے میرے آقا کا راگ الاپتے ہوئے نمودار ہو گیا۔ خدا بخش کو دیکھتے ہی ہماری ننھی سی روح فنا ہو گئی۔ اس نے کمرے میں قدم ـــــ فرماتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ پہلے جھٹکے میں فرش پر لیٹے ہوئے معالج صاحب کو اٹھایا، اور دوسرے جھٹکے میں ہمیں بُری طرح دبوچ کر بیٹھ گیا۔ ہم اس جھٹکے کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہونے سے پہلے بری طرح گڑگڑائے ـــــ "خدا بخش مجھے بخش دے، خدا کے واسطے بخش دے ـــــ" لیکن کمبخت جنات کی اولاد نے ہمیں بالکل نہیں بخشا بلکہ مزید ایک اور جھٹکا دیا جس

سے نتیجے میں ہماری سرکی ہوئی ہڈی تو واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی مگر فرش پر لیٹ کر چوں بول گئے۔
خدابخش پہلوان کی پکڑ میں یہ خوبی تھی کہ متاثرہ شخص کی ٹوٹی ہوئی ہڈی، موچ کھائے ہوئے رگ
پٹھے تو اپنی اصل جگہ واپس پہنچ جاتے تھے لیکن جسم کے دوسرے اچھے بھلے اعضا اپنی جگہ چھوڑ
دیتے تھے ۔۔۔!!

بچپن کی ان یادوں کے علاوہ ہماری یادداشت کے کھاتے میں جدید طریقۂ علاج اور اسپتالوں
کا کوئی خاص ریکارڈ نہیں ہے، البتہ حالیہ عرصے میں ایک مرتبہ اسپتال کے بستر پر کچھ دیر کے
لئے لیٹنے کی سعادت ضرور حاصل ہو چکی ہے لیکن کسی بیماری کی پاداش میں نہیں بلکہ اپنی شاندار
صحت کے کارن یہ سزا بھگتنی پڑی ۔۔۔ قصہ یوں ہے کہ چند ماہ پیشتر شہر میں "ہفتہ عطیۂ خون"
بڑے زور شور سے منایا گیا تھا، دفتر کے ساتھیوں کے ہمراہ ہمیں بھی زبردستی "عطیۂ دہندگان"
کی ٹیم میں شامل کر دیا گیا۔ جب متعلقہ ڈاکٹر، انجکشن کے ذریعے ہمارا خون کھینچنے بلکہ چوسنے، ہمارے
پاس تشریف لائے تب ایک لطیفہ ہوا۔ کافی تلاش اور جستجو کے باوجود ہمارے ہاتھ کی کوئی رگ
ڈاکٹر موصوف کے ہاتھ نہیں لگ سکی تو وہ حیرت سے بولے ۔۔۔ "تعجب ہے آپ کے ہاتھ کوئی رگ
پکڑ میں نہیں آ رہی ہے ۔۔۔؟" ہم نے بڑے فخر سے کہا "ڈاکٹر صاحب میری رگیں بڑی وفادار
ہیں، آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں لگتیں ۔۔۔!" ڈاکٹر نے دوستانہ لہجے میں پوچھا ۔۔۔ "آپ کرتے
کیا ہیں ۔۔۔!" ہم نے انھیں آگاہ کیا ۔۔۔ "میں ایک اردو ادیب ہوں طنز و مزاح لکھتا ہوں"۔
ڈاکٹر نے فوراً اعتراف کیا ۔۔۔ "تب تو میرے فرشتے بھی آپ کی رگ نہیں پکڑ سکتے کیوں کہ دنیا
کے بڑے بڑے نقادوں کا کہنا ہے کہ "ہومر" لکھنے والے پہلے خود اپنی ایک ایک رگ پر ہاتھ صاف
کرتے ہیں پھر دوسروں کی دکھتی رگ، پر انگلی رکھتے ہیں، پلیز اپنی کسی رگ کو پکڑنے میں آپ ہی
میری کچھ مدد کیجئے ۔۔۔" اردو زبان اور اس کے طنز و مزاح کی تعریف پر ہم فوراً پگھل جاتے ہیں
چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی درخواست فوراً منظور کر لی اور یوں ہمارے ہی تعاون سے موصوف ہمارا
اپنا خون مطلوبہ مقدار میں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ۔۔۔!

اس واقعہ کے علاوہ یاد نہیں پڑتا کہ پھر کبھی ہمیں اسپتال کے بستر پر لیٹنے کا اتفاق ہوا ہو۔ البتہ
اسپتالوں کے بے شمار چکر ضرور لگائے ہیں مگر محض ان شناساؤں دوستوں اور رشتہ داروں کی مزاج
پرسی کی غرض سے جو کسی نہ کسی موقع پر کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو کر داخل اسپتال ہوتے آئے ہیں۔
اور یوں ہماری اسپتالی معلومات میں کافی اضافہ ہوا ہے ۔۔۔ اگرچہ کہ اسپتال کے ہر شعبے میں جادو درس

کی آزمائش کا خصوصی انتظام و اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن دو مقامات "آہ و فغاں" جو عرف عام میں آپریشن تھیٹر، اور "شعبۂ پوسٹ مارٹم" کہلاتے ہیں ان سے کسی مریض اور مردے کی 'باقیات الصالحات' کا صحیح سلامت بچ کر گزرنا نہ تو مریض کے ہاتھ میں ہوتا ہے نہ متعلقہ ڈاکٹروں کے بلکہ کاتب تقدیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ دیگر شعبہ ہائے اسپتال میں اگر زندگی اور موت کی کشمکش کا کوارٹر فائینل، اور سیمی فائینل ہوتا ہے تو آپریشن تھیٹر اور شعبۂ پوسٹ مارٹم میں اس کھیل کا فائینل ہوتا ہے جس میں عموماً ملک الموت کی جیت ہوتی ہے کیونکہ انھیں ڈاکٹروں اور اسپتال کے دیگر عملے کا مکمل تعاون حاصل ہوتا ہے۔

ہمیں اس بات نے ہمیشہ حیرت سے دوچار کیا کہ جس جگہ بے چارا مریض آپریشن کے بہانے موت و ذلت کی کشمکش سے گزرتا ہے اسے "آپریشن تھیٹر" کیوں کہا جاتا ہے، حالانکہ تھیٹر کی اصطلاح عموماً ان مقامات کے لئے استعمال کی جاتی ہے جہاں سنیما، ناٹک، ڈرامے، تماشے وغیرہ پیش کئے جاتے ہیں، جب جب بھی ہم نے اس نکتہ پر غور کیا۔ اس مماثلت کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ چاہے آپریشن تھیٹر ہو یا خالص ہندوستانی تھیٹر ہر دو جگہ جھوٹ موٹ کے سوانگ رچا کر عوام کو اتو بنا کر اپنا الو سیدھا کیا جاتا ہے البتہ خالص تھیٹر میں تماشہ بننے والے اور تماشہ دیکھنے والے دونوں ہی ہوش میں ہوتے ہیں جب کہ آپریشن تھیٹر میں تماشا بننے والا غریب تو بے ہوش ہوتا ہے لیکن اسے تماشا بنانے والے پوری طرح ہوش میں ہوتے ہیں تاہم مریض کو پوری طرح بے ہوش کر دینے کے باوجود سرجن حضرات اپنے چہروں کو نقاب کی مدد سے چھپانے کا اہتمام بطور خاص کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کسی بینک کو لوٹتے وقت لیٹرے حضرات اپنے چہروں پر نقاب چڑھا لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک سخت جان مریض نے بے ہوش ہونے سے پہلے سرجنوں کی اس 'نقاب پوشی' پر یوں طنز کیا ـــ "آپ لوگ بھلے ہی اپنے چہرے چھپا لیجئے لیکن میں آپ لوگوں کو آواز سے پہچان لوں گا ـــ" یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا، تاہم سرجنوں کی اس 'پردۂ زنگاری' والی معشوقانہ حرکت کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، یہ حضرات محض اس لئے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حشر کے دن کہیں مریض انھیں پہچان کر ان کے گریبان پر ہاتھ نہ ڈال دے ـــ

آپریشن تھیٹر میں زندہ مریض کی چیر پھاڑ ایک حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن شعبہ پوسٹ مارٹم میں مردے کو "سلوک" کی جن منزلوں سے گذارا جاتا ہے وہ اسے کفن پھاڑ کر دوبارہ واپس نہیں لا سکتی

پھر کن گناہوں کی پاداش میں اس سے زبردستی یہ کفارہ ادا کروایا جاتا ہے؟ یہ بھید کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا ـــــ ایک دفعہ ہمارے ایک قریبی دوست کے قریبی عزیز کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا جب ہم لوگ میت لینے اسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی لاش ورثار کے کے حوالے کی جائے گی ـــــ جب پوسٹ مارٹم میں کافی وقت لگ گیا تو ہم نے اسپتال کے ایک کارکن سے جو "وارڈ بوائے" کے منصب جلیلہ پہ فائز تھا، اس تاخیر کا سبب دریافت کیا تو بڑی بے نیازی سے بولا ـــــ "لاش کا سامان نکالنے میں تو 'ٹیم' لگے گا ہی ـــــ؟"

ہم نے حیرت سے پوچھا ـــــ "سامان سے کیا مطلب ہے تمھارا ـــــ؟"

وہ اسی بے نیازی سے بولا ـــــ "لگتا ہے تم پہلی بار اسپتال میں آیا ہے، بابو صاحب، ڈاکٹر لوگ جب تک "بوڈی" (BODY) میں سے دل گردہ، آنکھ اور دوسرا اچھا اچھا، مال نہیں نکال لیں گا بوڈی تم کو نہیں مل سکتا ـــــ!"

ہم نے اس وحشیانہ انکشاف پر غصے سے کہا ـــــ "اگر یہ سب سامان تم لوگ نکال لوگے تو پھر ہمارے حوالے کیا کروگے ـــــ؟"

وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا ـــــ "گھبراتا کاہیکو ـــــ سامان نکالنے کے بعد خالی "کھوکھا" تم کو دے دے گا ـــــ!!" کم بخت نے خالی "کھوکھا" اس طرح بے رحمی کے ساتھ کہا جیسے کسی انسان کی لاش نہیں بلکہ کوئی خالی کنستر یا خالی ڈبہ ہو ـــــ ہم نے سوچا اگر مرزا غالب اس دور میں ہوتے تو یہ شعر نہ کہتے ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بلکہ اس شعر کو کچھ اس طرح کہتے ؎

دونوں آنکھیں ایک دل اور یہ دونوں گردے بعد مرنے کے میرے جسم سے ساماں نکلا ـــــ!!

پوسٹ مارٹم کے عبرت ناک مرحلے سے گذر چکنے کے بعد جب بقول وارڈ بوائے سچ مچ خالی کھوکھا ہمارے حوالے کیا گیا تو پتہ نہیں ہمیں کیوں ہمیں مرحوم کا کھوکھا زبان خاموشی سے اسپتال سے اسپتال تک کی یہ عبرت ناک تفسیر کچھ اس طرح کرتا محسوس ہوا

اب نیلگوں ہے چہرہ یہی پہلے زرد تھا
انجام درد یہ ہے، وہ آغاز درد تھا ـــــ!!! ☐

صلاح الدین پرویز

کنفیشن

صلاح الدین،
تم نے ایک بار پھر آزادی کا یقین دلایا
اور بے گناہوں کے گھروں کو،
"مارشل لا" کے تحت
جیل خانوں میں تبدیل کر دیا
صلاح الدین،
تم اپنی بڑی بڑی مونچھیں کیوں نہیں کٹوا دیتے
جو گھڑی گھڑی ٹک ٹک کرتی رہتی ہیں
اور دوسروں کی عبادت گزار ڈاڑھیاں
چوک کے بڑے گھنٹہ گھر پر ٹانگ دیتی ہیں
اس وقت، لوگ وقت دیکھنا بھول جاتے ہیں
صرف بڑی بڑی مونچھیں دیکھتے رہتے ہیں
جو انھیں،
عبادت گذار ڈاڑھیوں پر چپکی ہوئی صاف نظر آتی ہیں
اور وہ جتاتی رہتی ہیں
اے لوگو!
اگر تم نے ایک بھی شبد ہمارے خلاف کہا،
یا اخبار میں لکھا
تو تمھاری زبان تراش دی جائے گی،

تمہارا اخبار جلا دیا جائے گا
اور تمہارے ہاتھ چھین لئے جائیں گے
یہاں تک کہ تمہاری شہادت کی انگلی بھی!
تب تم کیسے گواہی دو گے
اللہ ایک ہے
اور محمد اس کے رسول ہیں
لیکن ہم اللہ اور محمد کا نام لے کر
پاس کے شریف مسلمان ملکوں سے بھیک لاتے رہیں گے
اور اسے خود، اپنی بیوی، بچّوں اور حواریوں کی دوزخوں کے ساتھ
جنّت کی طرح کھاتے رہیں گے
کہ ہماری عوام تو دکھ میں زندہ رہنا سیکھ چکی ہے
اور ہم سکھ میں مرنا بھول گئے ہیں

صلاح الدین،
تم نے ایک بار پھر وعدے کی پری کے درشن کرائے
اور خود اسے بھوت بن کر ریپ کرلیا
غلامی میں کئی سال اور بیت گئے
اور تم ہزاروں، لاکھوں ناجائز یعنی حرامی بچّوں کے
باپ بن گئے
یہ حرامی بچّے دراصل تمہارے کالے کرتوت ہیں
جو ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گلی میں دندناتے پھر رہے ہیں
صلاح الدین،
آخر تم کون ہوتے ہو
تم ہمارے خدا بھی نہیں
جس نے ہمیں خون کی پھٹکی سے خلق کیا

تم ہمارے پیغمبر بھی نہیں،
جس نے ہمارے لئے آزادی کے دروازے کھولے
اور ہم پر نسل، رنگ، قبیلے، زبان اور ملک حرام کر دیئے
تم ہمارے باپ بھی نہیں،
جس نے اپنے سارے دن اور ساری راتیں بیچ کر
ہمیں روٹی کی خوشبو عطا کی
تم ہماری ماں بھی نہیں،
جس نے ہمیں اپنے درد سے لازوال کیا اور کہا:
"میں تجھے سچ کی قسم دیتی ہوں"

صلاح الدین، تم کون ہوتے ہو
کون ہوتے ہو تم
ہماری آزادی چھیننے والے آخر تم کون ہوتے ہو
تم کون ہوتے ہو ہماری تحریر سے شبد مٹانے والے
تم کون ہوتے ہو ہماری ماں کی کوکھ سے درد اکھاڑنے والے
تم کون ہوتے ہو ہمارے باپ کا پسینہ خریدنے والے
تم کون ہوتے ہو ہمارے خدا کی خدائی کو چیلنج کر کے
مارشل لا بنانے والے
تم کون ہوتے ہو ہمارے محمد کے علم کے گھر کو ڈھانے والے
جس کے دروازے پر دستک کی جگہ قلب دھڑکتا رہتا ہے
اور علیؑ کی آواز دھک دھک کرتی رہتی ہے
اے ظالمو!
اے فرعون کے باپ داداؤ!
اے ابلیس کے بچو!
اب بھی وقت ہے کہ تم طلوع ہو جاؤ،

اپنے سینے کے مشرق میں
اور غروب ہو جاؤ،
اپنے سینے کے مغرب میں
ورنہ یہ جھوٹ نہیں کہ تم،
روس اور امریکہ کے دماغ میں
صرف ہتھیار بن کر رہ جاؤ گے
جسے تم آپس میں خریدتے اور بیچتے رہو گے

لیکن صلاح الدین،
کیا یہ سچ ہے؟
ابھی ابھی عالمی ٹیلی ویژن سے
ایک اسپیشل بلیٹن ٹیلی کاسٹ ہوا ہے
کہ تم مر چکے ہو

I CONFESS

MY NAME IS SALAHUDDIN

AND I AM DEAD FROM BOTH THE ENDS.

BUT MY VOICE LIVES[1]

THE END

---

[1] یہاں VOICE بمعنی مارشل لا استعمال ہوا ہے۔

رشید امجد
۱۸۱۵-اے، نانک پورہ، راولپنڈی

چپ فضا میں تیز خوشبو

ریکارڈنگ ہال کی تیز روشنی میں ساری چیزیں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔
اس کا اپنا آپ وجود کی تنگنائے سے نکل کر اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔
سامنے والا کیمرہ مین ٹرالی کو آگے پیچھے کر کے زاویے درست کرتا ہے۔ دو نمبر کیمرہ نے اس کے ساتھ والے کو کور کرنا ہے، تین نمبر کیمرے نے لمبے شاٹ لئے ہیں اور ٹائیٹل کو کور COVER کر کے منظر ایک نمبر کیمرے کو منتقل کر دینا ہے، پروڈیوسر باری باری تینوں کیمروں کے فوکس سے ان کی ترتیب ٹھیک کرنے کے لئے کرسیوں کو آگے پیچھے سرکاتا، میز کو ذرا ٹیڑھا کرتا ہے پھر کہتا ہے ــــ "آپ سمجھ گئے نا، جب ایک نمبر کا کیمرہ مین انگلی سے دائرہ بنائے گا تو پروفیسر صاحب آپ گفتگو شروع کریں گے، بالکل نیچرل طریقے سے، بغیر کسی تمہید کے، ٹائیٹل کے لانگ شاٹ کے فوراً بعد دو نمبر کیمرہ آپ کا کلوز اپ لے گا، لیکن آپ نے براہ راست کیمرہ کی طرف نہیں دیکھنا" پھر بائیں طرف والی روشنی کو دیکھ کر نفی میں سر ہلاتا ہے ــــ "اسے نوے کے زاویے پر لائیں"۔
نیلی وردی والا روشنی مین لمبی سی چھڑی سے لائٹ کو آگے پیچھے کر کے زاویہ درست کرتا ہے۔
پروڈیوسر ایک نمبر کیمرے سے ان کی ترتیب چیک کرتا ہے اور اس کی طرف منہ کر کے کہتا ہے ــــ پروفیسر صاحب آپ نے کرسی کے ہتھوں کو اتنی مضبوطی سے کیوں پکڑ رکھا ہے"۔
وہ کیسے بتائے کہ اگر اس نے ہتھیاں چھوڑ دیں تو اس کا سارا جسم کرسی کی گرفت سے نکل کر فضا میں تیرنے لگے گا، لیکن کچھ کہے بغیر گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے۔ اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر زمین کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔
پروڈیوسر اطمینان سے چاروں طرف دیکھتا اور کہتا ہے ــــ "میں کنٹرول روم میں جا رہا ہوں، جب ایک کیمرہ مین انگلی سے دائرہ بنائے تو پروفیسر صاحب جناب آپ ــــ"
وہ سر ہلاتا ہے۔

پروڈیوسر کنٹرول روم میں چلا جاتا ہے۔
ایک منٹ ـــ دو منٹ
پھر تین آوازیں ایک ساتھ گونجتی ہیں۔
SILENT ـــ SILENT ـــ SILENT
ریکارڈنگ ہال میں سے زندگی رینگ رینگ کر باہر نکل جاتی ہے، اور موت دبے پاؤں اندر داخل ہوتی ہے۔
گہری گھپ خاموشی۔
وہ تھوک سے گلا تر کرتا ہے۔
لمحہ لمحہ گذرتا ہے ـــ ٹک، ٹک، ٹک۔
ایک ہاتھ کا آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے، انگلی اٹھتی ہے، دائرہ بننے لگتا ہے،
وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔
لیکن ـــ لیکن آواز نہیں نکلتی۔
پسینہ کی لہر سارے جسم کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے۔
وہ منہ کھولتا ہے ـــ جملہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیا عمدہ جملہ سوچا ہوا تھا۔
مگر ایک لفظ یاد نہیں آتا، منہ سے آواز ہی نہیں نکلتی۔
تیز روشنیاں چاروں طرف سے ٹوٹے پڑ رہی ہیں۔
لمحہ لمحہ گذر رہا ہے۔
بولنے کی کوشش ـــ آواز نہیں۔
گفتگو اس سے شروع کرنا ہے، پھر ساتھ والے سے سوال کر کے اسے شامل کرنا، اور پھر تیسرے ساتھی سے سوال ـــ لیکن بات شروع ہو تو بت نا،
بولنے کی ایک اور کوشش
تھوک سے گلا تر کر کے ٹوٹے ہوئے جملوں کو جوڑنے کی کوشش۔
لیکن آواز نہیں۔
کن آنکھیوں سے ساتھ والوں کو دیکھتا ہے، دونوں اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔
لیکن آواز؟

سارا زور لگا کر ایک بے ربط سا جملہ بولنے کی کوشش۔
لیکن ہونٹ سرسرا کر رہ جاتے ہیں۔
پروڈیوسر ابھی دوڑتا ہوا آئے گا ــــ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"
بس آتا ہی ہوگا۔

چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں، کائنات کا سلسلہ ہی عجیب ہے، چیزیں جنم لیتی ہیں، اور پھر کسی بلیک ہول میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہر روشنی کے پیچھے ایک بلیک ہول ہے، ہر سانس ہی ایک بلیک ہول ہے کہ ہر سانس کے پیچھے موت کی دستک ہے۔ چھوٹی چھوٹی دستکیں، اور پھر ایک لمبی اونچی دستک، وقت ہی ایک بلیک ہول ہے جو بالآخر ہر شے کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے لیکن آواز۔
لفظ گم ہو گئے ہیں۔

بیوی کہتی ہے ــــ "پروگرام کا چیک ادھر کروا لینا، دس بارہ روپے رہ گئے ہیں، اور ابھی تو چار پانچ دن باقی ہیں"۔

بیٹی ماں کے پہلو سے سر نکالتی ہے ــــ "ابو گڑیا چابی والی ــــ آپ نے وعدہ کیا تھا نا، اب پروگرام ملے گا تو ــــ"

بیٹا توتلی آواز میں کہتا ہے ــــ "ابا ــــ ابا"
وہ آنکھیں جھپکاتا ہے،
ریکارڈنگ روم میں موت کی سی خاموشی ہے۔

موت تو ایک خوشبو ہے جو دھیرے دھیرے ہر چیز پر نشہ طاری کر دیتی ہے اور اس نشہ کے عالم میں ہم چپکے سے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ جسم کے سارے حصے فوری طور پر نہیں مرتے۔ بعض حصے موت کے کئی دن بعد تک زندہ رہتے ہیں۔ بال اور ناخن قبر میں بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ذہن کے بعض حصے بھی موت کے کئی دن بعد تک اپنا کام کرتے رہتے ہیں، یہ بھی کیا عذاب ہے کہ آدمی مر چکا ہے لیکن اس کے ذہن کے کچھ حصے کام کر رہے ہیں اور وہ خود اپنی آخری رسوم دیکھ رہا ہے، اچانک یا حادثاتی موت کی شکل میں تو بہت سے حواس اور کبھی کبھی وجود کا سرمئی ہیولا بھی کئی کئی دن تک موجود رہتا ہے، لیکن پھر ایک چپ

گہری چپ۔
وہ چپ کے پنجوں سے نکلنے کے لئے پھڑپھڑاتا ہے، بولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آواز نہیں نکلتی۔
آغاز کے لئے کیا عمدہ جملہ سوچا ہوا تھا، وہ جملہ کیا تھا؟ تو کوئی اور جملہ، لیکن لفظ تو اس سے دور بھاگ گئے ہیں،
بولنے کی کوشش ــــ آواز؟؟
پسینے کے قطرے سارے چہرے پر بہتے جا رہے ہیں،
عینک کے اوپر سے لڑکوں کو دیکھتا ہے۔
کائنات بھی ایک جسم ہے۔ جیسے ہمارا یہ جسم جس کے اندر کئی دنیائیں آباد ہیں جراثیموں سے بھری ہوئی دنیائیں، اور ہمارا ذہن ان سب کو، پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے، کائنات بھی ایک جسم ہے اور ہم اس کے اندر کے چھوٹے چھوٹے جراثیم ہیں، اس کا بھی ایک ذہن ہے ایک ماسٹر مائنڈ۔"
گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی لڑکے کندھے جھٹک کر اس کی باتوں کو واپس اس کے منہ پر دے مارتے ہیں،
سٹاف روم میں ایک ساتھی کہتا ہے ــــ "یار ذرا حساب کر کے تو بتاؤ نئے سکیلوں سے کتنا فرق پڑے گا؟"
"نئے سکیل؟"
"آج کا اخبار نہیں دیکھا، پے کمیشن کی سفارشات۔"
"لیکن یہ تو صرف سفارشات ہیں، اصل تو خدا جانے کیا ہوگا؟"
"تو کیا ــــ دل خوش کرنے میں کیا نقصان ہے؟"
پروڈیوسر کہتا ہے ــــ "پروفیسر صاحب بات آپ شروع کریں گے، جونہی ایک نمبر انگلی سے دائرہ بنائے آپ ــــ"
وہ بولنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے، لیکن آواز نہیں نکلتی۔
معلوم نہیں آواز گم ہو گئی ہے یا لفظ ختم ہو چکے ہیں۔
آواز ایک پرندہ ہے۔

لفظ اس کی پھکار۔
سوچ ہفت رنگ فضا۔
نہیں شاید ــــ
لفظ ایک پرندہ۔
آواز چہکار۔
سوچ ــــ
نہیں نہیں ــــ شاید یوں۔
سوچ ایک پرندہ۔
لفظ اس کی چہکار۔
اور آواز ــــ ؟
آواز نہیں نکلتی، کوشش کے باوجود آواز نہیں نکلتی۔
بھاری غرارے والی خاموشی ریکارڈنگ ہال میں ٹہل رہی ہے۔
تیز روشنیاں ــــ کیمروں کے آگے پیچھے ہوتی بے آواز ٹرالیاں۔
فضا ایک انتہائی حساس ویڈیو کیمرے کی طرح ہر حرکت، ہر آواز کو ریکارڈ کر رہی ہے۔
فضا میں ازل سے اب تک کی ہر حرکت، ہر آواز محفوظ ہے اور اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔
کیا معلوم اس لمحہ کائنات کے کسی حصے میں اس کی تصویر بھی رہی کاسٹ ہو رہی ہو، اسے یہ بھی کیا معلوم کہ اس لمحہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر بیت رہا ہے وہ ری کاسٹ ہوا دراصل منظر کہیں اور ہو ــــ ہزاروں نوری سالوں کے فاصلہ پر کسی جگہ، وہ اس لمحہ یا اس سے ہزاروں سال پہلے موجود ہو اور یونہی بولنے کی کوشش میں بار بار منہ کھول رہا ہو اور آواز نہ نکلتی ہو، لفظ بے وفا ہو گئے ہوں۔
وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بے وفا ہو جاتا ہے، عمر بھی، دن بھی، یادیں بھی، بس سب کچھ پاس سے گزر جاتا ہے ــــ اور آدمی ہاتھ بڑھا بڑھا کر ہی رہ جاتا ہے ــــ لیکن پروگرام کے بعد اسے چیک ضرور ادھر کراتا ہے، کسی کے سامنے نہیں، بس کسی بہانے سے کچھ دیر کے لئے رک جاتا ہے اور جب دوسرے دونوں چلے جائیں تو ــــ
لیکن پروگرام ریکارڈ ہو تو تب نا ــــ پروڈیوسر تو ابھی کنٹرول روم سے چیخنے

ہی والا ہے ـــــ "یہ کیا ہو رہا ہے، آپ بولتے کیوں نہیں؟"
وہ پھر بولنے کے لئے، کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے۔
پہلی میں ابھی چار دن باقی ہیں بلکہ پانچ دن، تنخواہ تو دو ہی کو ملے گی نا۔
اور چیک اور پن ـــــ
لیکن بولنے کی ہر کوشش بے کار۔
آواز ساتھ چھوڑ گئی ہے ـــــ بے وفا ہو گئی ہے۔
کیا کہے؟ ـــــ کیسے کہے؟
کتنے عمدہ عمدہ جملے سوچ کے آیا تھا۔
ابھی گفتگو شروع کرنا ہے اور اختتام بھی ـــــ
پروڈیوسر نے کہا تھا ـــــ "جب آخری دو منٹ رہ جائیں گے تو نمبر ایک دوبارہ انگلی سے دائرہ بنائے گا۔ بس آپ بات نیچرل طریقے سے اچک لیں اور پانچ چھ اختتامی جملے کہہ کر ختم کر دیں"۔
لیکن ابھی تو ابتدائی جملے بھی نہیں کہے گئے، اختتام کب اور کیسے ہوگا؟ وہ ہر بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
مسلسل بولنے کی کوشش میں ہونٹ پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ ایک آخری کوشش کے طور پر وجود کا سارا زور لگا کر، ساری توانائیاں اکٹھی کر کے بولنے کے لئے منہ کھولتا ہے ـــــ لیکن آواز نہیں نکلتی، ہونٹوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ساتھ اس کا وجود سکڑنے لگتا ہے، ریکارڈنگ ہال چھوٹے سے بلیک ہول کی طرح اسے اپنے اندر گم کر رہا ہے ـــــ اسے تیزی سے اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔ وہ ہاتھ پیر مارتا ہے، خود کو اس کی کشش سے بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود، بلیک ہول اسے تیزی سے اپنی طرح کھینچے چلا جاتا ہے، ایک گھنی تاریکی تیزی سے اس کے قریب آتی جاتی ہے، تیز روشنیاں ـــــ پلک جھپکنے میں بجھ جاتی ہیں اور ریکارڈنگ ہال مختلف آوازوں سے گونجنے لگتا ہے پروڈیوسر بھاگتا ہوا اندر آتا ہے اور کہتا ہے۔
"واہ وا ـــــ کمال ہو گیا، بہت اچھی ریکارڈنگ ہوئی ہے، یہ پروگرام تو ہٹ جائے گا!"
اور وہ ہڑبڑا کر اس کا منہ دیکھے جاتا ہے! ☐

فضا ابن فیضی

مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

غزلیں

جو زمیں سے تھا عبارت، وہ مکاں غائب ہوا
اب کسے یہ ہوش، سر سے آسماں غائب ہوا

ہم مکمل ہو کے، اندر سے بہت خالی لگے
شخصیت کا وہ ادھورا پن کہاں غائب ہوا

یک کفِ خاکسترِ دل ہے، ہمارا جسم کیا
کیا ہوا تھی، بجھ گیا شعلہ، دھواں غائب ہوا

یہ سمندر کا سفر مجھ کو کہاں لے جائے گا
رہ گئی کشتی اکیلی، بادباں غائب ہوا

مدتوں پر، شہر میں اس کے ملا اذنِ قیام
چلئے، اپنی لامکانی کا نشاں غائب ہوا

بس وہیں سے ہم بنے لامنظری کا آئنہ
آنکھ سے خوابوں کا پس منظر، جہاں غائب ہوا

ہم ہیں اس دولت کے مالک، بادشاہوں کی طرح
کب فقیروں کا زرِ نقدِ زیاں غائب ہوا

اب اسی قوسِ قزح کے رنگ میں جلتے رہو
وقت پلکوں پر سجا کر تتلیاں، غائب ہوا

ہے ابھی موقع، مجھے محفوظ کر لے، ورنہ میں
آنکھ جھپکی، صورتِ خوابِ رواں غائب ہوا

ہم کو اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی نہیں
سب ہنر، عرضِ ہنر کے درمیاں غائب ہوا

رائگانی کا نشہ اترے تو پھر سوچوں فضاؔ
کس جگہ سرمایۂ عمرِ رواں غائب ہوا

نشاں کچھ تو مرا، کھُلتی شفق پر چھوڑ جانا
مجھے لکھ کر اسی جلتے ورق پر چھوڑ جانا

اٹھائی ہے بڑی شرمندگی، جینے کی خاطر
ذرا سی دھول، چہرے کے عرق پر چھوڑ جانا

ابھی اک معنیِ درماندہ ہوں، تنہا نہ مجھ کو
کتابوں کی بساطِ لق و دق پر چھوڑ جانا

یہ دیکھوں، اس میں آخر زندہ سچائی ہے کتنی
اسے میری صلیبِ حرفِ حق پر چھوڑ جانا

معانی کو بہت آساں وہ سمجھا ہے، تو اس کو
مرے شعروں کی دلگیرِ ادق پر چھوڑ جانا

ابھی ہے یاد، نا اہلی وہ استاذِ جنوں کی
ترا، مکتب کو پہلے ہی سبق پر چھوڑ جانا

یہ اچھا ہے، مرا مجموعہ پڑھنے کے بہانے
کوئی تحریر، اندر کے ورق پر چھوڑ جانا

رہے شفاف جس سے مطلعِ ابلاغِ دانش
کرن دو چار ایسی، ہر افق پر چھوڑ جانا

فضاؔ دھندلے بہت ہیں، تیرے فکر و فن کے پیکر
کبھی خود کو، کسی روشن طبق پر چھوڑ جانا

ڈاکٹر آغا سہیل
صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور

چندن بروا

جو درخت میرے بیڈ روم کی کھڑکی پر سایہ فگن ہے، اگر اس کا کوئی نام نہ بھی ہوتا تو بہر حال یہ ایک چھتنار اور گھنا درخت تو ہے اور درخت تو بہر حال درخت ہی ہوتا ہے جس کی جڑیں اس کے اندر تک بیری ہوئی ہوتی ہیں تنے میں شاخیں ہوتی ہیں اور شاخوں میں نازک نازک پتلی پتلی ٹہنیاں اور ان میں لگی ہری بھری پتیاں اور نئی نویلی کونپلیں نکلتی رہتی ہیں اور پرانی پتیاں پیلی ہو ہو کر جھڑتی رہتی ہیں، آتے جاتے موسموں اور جاتی ہوئی رتوں کے ساتھ درخت کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے ایک زمانے میں تو یہ درخت پتیوں اور نازک شاخوں سے خالی ہو کر محض ایک لنڈ منڈ ننگا منگا بیڑہ جاتا ہے، جس پر پرندے تک بسیرا نہیں لیتے، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس میں قوت نامیہ بیدار ہوتی ہے اس کی شاخوں میں ٹہنیاں کونپلیں اور پتیاں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے چند دنوں میں یہ خوب گھنا اور چھتنار سایہ دار درخت بن جاتا ہے اور صبح و شام طرح طرح کے پرندے آآ کر اس پر بسیرا لیا کرتے ہیں۔

میرے بیڈ روم کی کھڑکی پر اس کا گھنا سایہ بھی رہتا ہے اور چڑیوں کے چہچہوں اور زمزمہ سازیوں سے میری سامعہ نوازی بھی ہوتی رہتی ہے، آتی جاتی چڑیوں کے بسیرے کے علاوہ کچھ ایسی بھی چڑیاں ہیں جو اس پر گھونسلے بنا کر رہنا شروع کر دیتی ہیں انڈے دیتی اور بچے نکال کر انھیں پالتی پوستی اور انھیں چرا چگا کر پروان چڑھاتی کچھ نسلیں گزر جاتی ہیں لیکن جب میں اس چھتنار درخت کو دیکھتا ہوں، میرے ذہن کے کسی گوشے میں چندن کا ایک درخت ایک انکھوے کی صورت میں پھوٹتا ہے اور ہمارا بوڑھا مالی جس کا لانبا کمان کی طرح خمیدہ قد، سپید گھنی داڑھی، اور حسین و خوبصورت منہ کے اندر چنے ہوئے موتی جیسے چمکتے دانت اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی جگنو کے مانند چمکتی آنکھیں جن میں پیار کا امرت گھلا ہوتا اور اس کی میٹھی میٹھی نرم آواز میں ماں کی لوریوں جیسی کومتا ہوتی دھم سے حافظے کے پردے پر نمودار ہوتا اور مٹی میں سنے ہاتھوں کو فوارے کے پانی سے

دھوکر دھوتی میں پونچھتے ہوئے وہ کہتا:

"تو میاں چندن کا درخت سب سے سندر، سب سے نیارا، خوشبو دار پیارا پیارا ہو دے ہے پریاں آکر اس پر بسیرا لیوے ہیں، تو ایک بار ایسا ہوا کہ ایک دوپہریں، باغ میں کام کرتے کرتے میں جھک گیا تو چندن بردے کے سائے میں جاکر سوگیا، پتہ نہیں سوگیا کہ جاگتا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ پریوں کے جھنڈ کے جھنڈ درخت پہ اترتے چلے آرہے ہیں۔"

"پریاں"؟ میں حیرت سے پوچھتا اور پریوں کے تصور کو ذہن میں خوب اچھی طرح اجاگر کرتا، مالی کہتا،

"ہاں آں، پریاں جی، صاف صاف پریاں کوہ قاف سے اڑتی ہوئی آئیں اور اپنے تخت سے اتر کر چندن کے درخت پہ اتر جاتیں، تو میاں آپ بڑے صاحب سے کہہ کر چندن بروا لگوائیں پھر دیکھیں کہ میں کیسی سیوا کرتا ہوں ــــ"

"آگے کیا ہوا مالی ــــ"

"آگے ــــ آگے کیا ہونا تھا جی بس میری آنکھ کھل گئی۔"

"بس"

"بس جی آپ چندن بروا منگوادیں، پھر دیکھیں کہ پریاں آدیں یہ آدیں ــــ"

میں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے پردہ ہٹاتا اور چھتنار درخت پہ آتی جاتی چڑیوں کے چہچہے اور زمزمے سنتا رہتا، کبھی کبھار غنودگی میں میں آنکھیں بند کئے پڑا رہتا اور سوچتا کہ شاید یہی درخت کبھی چندن بروا بن جائے اور کوہ قاف سے آتی جاتی چڑیاں اس میں اترنا شروع ہو جاتیں۔ کبھی کبھار میں اپنے بیڈ پہ پڑے پڑے کوئی کتاب پڑھتا کوئی داستان کوئی کہانی کوئی خوبصورت نظم اور اس میں ایسا ڈوبتا کہ اپنے گرد و پیش کا احساس ہی ختم ہو جاتا، دنیا سے بے خبر میں کہانی یا نظم کے انگ انگ میں سما جاتا اور کہانی میرے اندر جذب ہونا اور میرے لہو میں دوڑنا شروع کر دیتی، معاً درخت پہ چہکتی چڑیوں کی آوازیں سارا طلسم توڑ دیتیں، ایک بار تو میں چڑیوں ہی کے بارے میں ایک کہانی پڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک شوخ سی چڑیا میرے بیڈ سے ملی ہوئی کھڑکی پہ آکر بیٹھ گئی اور زور زور سے بولنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ کہانیوں میں کیا دھرا ہے مجھے سنو، میری سنو۔

کبھی کبھی تو میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بھانت بھانت کی چڑیاں عین میرے سر پہ سوار

ہو کر کانفرنس منعقد کئے ہوئے ہیں یا جیسے اسمبلی میں کوئی بل پیش ہے اور خوب دھواں دھار بحث ہو رہی ہے اور کوئی بھی فریق اپنی ہار ماننے پر تیار نہیں اور کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ مختلف رنگوں اور مقاموں سے تعلق رکھنے والی ہزار ہا چڑیاں اپنی اقوام متحدہ بنائے ساری دنیا کے جھگڑے لے کر بیٹھ گئی ہیں اور کوئی بڑی طاقتور چڑیا اپنے ویٹو کے حق کو استعمال کر کے سب کو خاموش کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چڑیاں تو خیر بیچاری چڑیاں ہی ہوتی ہیں درختوں درختوں اڑتی پھرتی ہیں، زیادہ بلندیوں تک تو پہنچ نہیں سکتیں لیکن ہاں آسمان کی بلندیوں پر اڑنا اور ساتویں آسمان پر تھگلی لگانے کا کام تو گرہ باز کبوتر ہی انجام دیتے ہیں لیکن گرہ باز کبوتر بھی باز اور شاہین کا لقمہ تر بن جاتے ہیں، درخت پر کبوتر کبھی نہیں اترتے اور شاہین یا باز تو بہر حال ایسی پستی کی طرف نگاہ حقارت سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں آسمان کی بیکراں وسعتوں سے پرواز کرنا، جاڑے کے صاف و شفاف کھلے اور دھلے آسمان پر سورج کی کرنوں سے نہاتے ہوئے ہوا کی موجوں پر آہستہ آہستہ بہتے ہوئے اڑنا کیسے مزے کی بات ہے اس مزے سے بیچاری ننھی چڑیاں محروم ہیں انھیں چرنے چگنے کی خاطر زمین میدانوں کھیتوں کھلیانوں سے رشتہ قایم رکھنا پڑتا ہے اور چرنے چگنے کے بعد انھیں اپنے گھونسلوں میں لوٹنے کی دھن ہوتی ہے اپنے بچوں اپنے بچوں سے مل کر بیٹھ کر باتیں کرنے ہنسنے بولنے لطیفے سننے سنانے اور گیت گانے کہانیاں کہنے اور تبصرے کرنے یا تبادلہ خیالات سے زیادہ لطف آتا ہے انھیں زیادہ اونچا اڑنے کی مطلقاً فکر نہیں ہوتی وہ زمین سے اپنا ناطہ قایم رکھنے ہی سے زیادہ عافیت محسوس کرتی ہیں اور مجھے ان چڑیوں کی یہی ادا بہت بھاتی ہے اور وہ چڑیاں جو اس درخت سے ناطہ جوڑے ہوئے ہیں وہ تو مجھے اپنی بھی نزدیکی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔

مجھے اس درخت کی چھاؤں میں ہمیشہ بڑی گہری اور پر سکون نیند آتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے بچہ ماں کی گود میں سو جاتا ہے لیکن ایسے لمحے بھی کم آتے ہیں کیوں کہ کشمکش حیات اور جہد زندگی میں مہلت کہاں نصیب ہوتی ہے، جب ہوتی ہے تو میں آنکھیں بند کئے گھنٹوں اس کے گھنے سائے میں پڑا رہتا ہوں اور چندن بردے کا خواب دیکھتا رہتا ہوں جس پر کوہ قاف کی پریاں اترتی ہیں لیکن آج تک نہ مجھے چندن بردا نصیب ہوا اور نہ اپنا پرانا مالی لوٹ کر آیا جو اسے زمین میں بوتا اور عام پانی کے بجائے امرت جل سے اسے سینچتا اور پھر ممکن ہے کہ کوہ قاف کی پریاں چندن بردے پر اترتیں۔

ایک بار چند روز کے لئے میں شہر سے باہر چلا گیا، واپس آیا تو شہر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا، میرے پیچھے شہر میں آندھی آئی اور باد باراں کے اس طوفان میں ہزارہا درخت جڑوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہو گئے افسوس کہ میرے بیڈ روم پر سایہ فگن رہنے والا درخت بھی زمین بوس ہو گیا، لیکن کچھ اس طرح کہ اس کی جڑوں کا موٹا سا حصہ زمین کے اندر پیوست رہا۔ چڑیوں کے گھونسلے گر گئے، چڑیاں اڑ اڑا گئیں، میرا آنگن سونا سونا ہو گیا، پھر بھی میں نے اس لیٹے ہوئے درخت کو نہ اٹھوایا نہ کٹوایا، یوں ہی پڑا رہنے دیا۔

پہلے تو پڑا ہوا درخت سوکھنے لگا، کئی موسم اور کئی رتیں اس پر سے گزرتی چلی گئیں لیکن پھر رفتہ رفتہ پڑے ہوئے درخت نے مٹی کو پکڑنا اور اس کی جڑوں نے اندر ہی اندر پھیلنا شروع کیا اور پھر جگہ جگہ اس میں نئے اکھوے پھوٹنے لگے ہری ہری کونپلیں نکلنے لگیں پتیاں ہری بھری اور شاخیں قوت نامیہ سے باروَر ہونے لگیں تو مجھے اس کے پنپنے کی آس بندھی کیوں کہ اب ایک درخت سے متعدد درخت نمودار ہو رہے تھے اور کوئی دن جاتا تھا کہ اس پر چڑیاں اپنے گھونسلے بنا کر رہنا اور چہچہانا شروع کر دیں اور میرے بیڈ روم کو اپنے زمزموں سے بھر دیں اور میں چندن بردے کے خواب دیکھتے دیکھتے سو جاؤں اور پھر کوہ قاف سے پریاں آ کر درخت پر اترنے لگیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ شاید میں اس درخت کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا یا شاید جاگتا رہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالباً غنودگی کی حالت میں پہنچ گیا تو معاً محسوس ہوا کہ اسی درخت کی جڑ سے چندن بردا نکلنا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے بڑھنے اور پھیلنے پھولنے لگا کوہ قاف سے پریاں آ کر اترنے لگیں اور کہیں سے بوڑھے مالی نے کہا، دیکھا ماں، میں یہ کہتا تھا کہ چندن بردے پر پریاں آ کر اترتی ہیں —— شاید یہ خواب ہی تھا، دیوانے کا خواب کہہ لیجئے یا تحت شعور کا کرشمہ، بہر حال میں میٹھی نیند سے اٹھا، کمرے کے باہر آیا اور گھنے ہوتے ہوئے درخت پر چڑیوں کے گھونسلے کو تلاش کرنے لگا کہ مجھے ایک زخمی چڑیا نظر آئی —— جو درخت کی ایک شاخ پر سر نیوڑائے بیٹھی تھی اور اس کے جسم کے کسی زخمی حصے سے تازہ تازہ سرخ سرخ لہو بوند بوند کر کے نیچے زمین پر گر رہا تھا اور مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ ☐

مغیث الدین فریدی
نئی دہلی

غزل

اب ہاتھ سے رکھ دو سازِ طرب اب نام نہ لو پیمانوں کا
ساغر سے چھلکنے والا ہے اس وقت لہو انسانوں کا
اب گردشِ ساغر بھی ہے نئی اب موجِ مئے رنگیں بھی نئی
دستور بدلتا جاتا ہے اے پیر مغاں میخانوں کا
ہر موجِ نسیمِ گلشن پر رفتارِ جنوں سے لغزش ہے
زنداں سے رہا ہو کر بھی وہی انداز رہا دیوانوں کا
ہو خیر ترے پیمانوں کی برہم ہے نظامِ میخانہ
اب رنگ پہ محفل آئی اللہ نگہباں جانوں کا
وہ آنکھ چرائے بیٹھے ہیں ہم آہ و فغاں سب بھول گئے
ہلکی سی نظر کی جنبش نے منہ پھیر دیا طوفانوں کا

حنیف کیفی

غزل

خیرہ ہوئی نگاہ کہ بے نور ہو گئی
وہ سیلِ روشنی تھا کہ بینائی کھو گئی
رخ موڑنے چلا تھا میں سیلابِ وقت کا
میری انا کی موج مجھے ہی ڈبو گئی
اس شہرِ بے اماں سے کہیں دور جا بسو
آ کر یہاں ہر ایک کی پہچان کھو گئی
فرصت کہاں کہ اور کسی سمت دیکھتے
اپنی ہی جستجو میں بسر عمر ہو گئی
دل کو ہے اک مشغلۂ خواب رات دن
ہم کو جگا کے حسرتِ نوخیز سو گئی
کیفی ہوئے ہیں جمع یہاں کتنے درد و غم
ہستی ہماری میر کا دیوان ہو گئی

سید محمد عقیل
صدر شعبۂ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

گوشۂ عافیت میں طبقاتی کشمکش کا مطالعہ

پریم چند نے پریم آشرم (گوشۂ عافیت) سنہ ۱۹۲۰ء میں مکمل کیا۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں اس وقت ملکی اور معاشرتی ترقی کے لئے صرف دو ہی راستے نظر آتے تھے۔ پہلا راستہ یہ تھا کہ زرعی نظام پر کاشتکار کا پورا قبضہ ہو اور ملک ایک امدادِ باہمی کاشتکاری اسکیم کے تحت آگے بڑھے اور دوسرا، ایک اوپری طبقے کے مطابق یہ کہ ملک کو صنعتی ترقی کی طرف لے جایا جائے جس کے مؤید ملک کے بڑے بڑے کارخانوں کے مالک اور ان کے مددگار تھے۔ پریم چند کے دو ناول، گوشۂ عافیت اور چوگان ہستی، انھیں نقاطِ نظر کا ایک طرح سے تجربہ اور تجزیہ ہیں۔ کسان تحریک میں، زمین کی لڑائی اور کارخانہ داروں کی اجارہ داری اور کسان کی زمین کی ملکیت کے درمیان چوگان ہستی آگے بڑھتا ہے۔ یہی مسائل پریم چند کے اِن دونوں ناولوں کا مسئلہ ہیں۔

ہر اچھے اور بڑے ناول کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے پس پُشت، فکر کی جولانی کے ساتھ ساتھ، ایک ایسا تصوّراتی نظام ہوتا ہے، جس میں اس دور کے انسانوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی تنقیدِ حیات بھی شامل ہوتی ہے اور اسی سے ناول نگار کی وابستگی اپنے دور کے انسانوں سے پتہ چلتی ہے یا اس کی بے تعلقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ وابستگی لمحاتی بھی ہو سکتی ہے اگر اس ایک لمحے میں انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہو۔ پریم چند کے ہندوستان کے سامنے، اِن دونوں ناولوں کی تخلیق کے دوران یہی صورتیں تھیں۔ انقلاب رُوس نے ایک طرف ہندوستان جیسے حالات رکھنے والے ملک کی تقدیر بدل دی تھی، جس کی بازگشت، اقبال سے لے کر پریم چند کے بلراج تک سنائی پڑتی ہے۔ دوسری طرف، پہلی جنگ عظیم کے ملبے تلے، ہندوستان کے کسان دَب دَب کر تباہ ہو رہے تھے۔ کھیتیاں اور فصلیں تباہ ہو چکی تھیں لیکن کسانوں سے زبردستی لگان وصول کر کے، کسانوں کو مل مزدور یا نوکری پیشہ بننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ زمین، کسان کی اپنی نہ تھی ایک طرف تو اسے فصل کا نقصان اٹھانا پڑا اور دوسری طرف لگان اور اضافہ لگان کا خمیازہ بُھگتنا

پڑ رہا تھا۔ گوشۂ عافیت میں یہی مسئلہ ہے جس میں کسان اور فیوڈل کلاس کے درمیان، ایک کشمکش، ایک معاشی مسئلہ بن جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فلسفی، اور عملی زندگی بسر کرنے والوں میں ہمیشہ ایک بعد رہا ہے اور جن کی نظر، انسانوں کی عملی زندگی پر نہ ہو، وہ حیاتِ انسانی کا صحیح طور پر احاطہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لئے دنیا کے تمام اچھے ناول نگار اپنی تحریروں میں انسانوں سے زندہ رہنے کا کوئی نہ کوئی تجربہ، ان کے مسائل یا ان کی زندگی سے نچوڑے کسی نہ کسی فلسفۂ حیات کی تشکیل کرتے رہے ہیں۔ یہ فلسفۂ حیات لمحات اور آفات کا پروردہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ انسانوں کے ایک ایسے بڑے طبقے کو اپنے گھیرے میں لئے ہوتا ہے، جس میں کبھی کبھی پوری صدی دھڑکتی نظر آتی ہے۔ ان پر گزرنے والی زندگی اپنی آسودگی اور پریشانیوں کی تصویر، پورے ماحول اور کرداروں پر منعکس کر دیتی ہے۔ گوشۂ عافیت کی شروعات، ان سطروں سے ہوتی ہے۔

> "شام ہو گئی ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بیل کھیتوں سے آگئے ہیں۔ گھروں سے دھوئیں کے کالے بادل اٹھنے لگے ہیں۔ لکھن پور میں آج حاکم پرگنہ کی ہڑتال تھی گاؤں کے معززین، دن بھر ان کے گھوڑوں کے پیچھے دوڑتے رہتے تھے۔ جاڑا ختم ہو چکا ہے لیکن لوگ عادتاً الاؤ کے گرد بیٹھے ناریل پی رہے ہیں اور حکام کے طور طریق پر اپنے خیالات ظاہر کر رہے ہیں۔"

پھر سنگھرش کی صورت آگے چل کر رونما ہوتی ہے اور پریم چند گوشۂ عافیت کے کرداروں کو مختلف طبقوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

۱۔ "تحصیل دار کی توند اتنی بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ناند ہے۔

سکھو۔ رسوت کا پیسہ بدن پھلا دیتا ہے... بنا حرام کی کوڑی کھائے، دیہہ پھول ہی نہیں سکتی۔

منوہر نے ہنس کر کہا۔ ہمارے پٹواری کی دیہہ کیوں نہیں پھولتی۔ سوکھے آم بنے ہیں۔" (سرکاری عمال)

۲۔ "چھوٹے سرکار جب سے مالک ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہو کیسا اودھم مچا رہے ہیں رات دن جا بجا۔ بیدخلی اکھراج کی دھوم مچی ہے۔ کارندہ صاحب کہتے ہیں کہ اب اس گاؤں کی باری ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ (زمیں دار اور ان کا عملہ)

۳۔ "منوہر۔ ہوگا کیا۔ تم ہمارے کھیت پر چڑھو گے۔ ہم تمہارے کھیت پر چڑھیں گے
چھوٹے سرکار کی چاندی ہوگی سب سے پہلے سکھو مہتو دوڑیں گے۔
سکھو۔ سکھو دوڑیں گے تو کون کہے منوہر نہ دوڑیں گے۔"

(کسان اور ان کی خود غرضیاں)

ابتدائی سطریں، بڑی معنی خیز ہیں اور کسی حد تک علامتی بھی۔ 'شام' 'دن بھر کا تھکا ہارا ہونا'، اور 'گھروں کا دھواں' کسانوں کی کوششوں اور ناکامیوں کے ساتھ ساتھ، ان کی جماعت کی بڑی اچھی تصویر پیش کرتا ہے جس کے پس منظر میں کسانوں کی ایک مجموعی تصویر ابھرتی ہے جو اپنی زمین کی صورتِ حال پر الاؤ کے گرد اجتماعی صورت میں بیٹھے ہوئے دکھائے جاتے ہیں اور اس طرح ایک طبقہ بن جاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے جو ہندوستان کے حاکموں کے کارندے ہیں اور رشوت ستانی اور ظلم و جور سے اپنے ہم وطنوں کو روندر ہے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان زمین داروں اور جاگیرداروں کا ہے جو ہر وقت کسانوں کی زمین پر لگان کا اضافہ کرکے یا کسانوں کو بے دخل کرکے پھر اسی زمین کو زیادہ قیمت پر دوسرے کسانوں کو دینے اور ان سے منافع حاصل کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چوتھا طبقہ ان کسانوں کا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کا استحصال کرتے رہتے ہیں اور معمولی مفادات کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں زمین دار اور عمال کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ پریم آشرم، انہیں مسائل کے گرد گھومتا ہے۔ ان میں سے کچھ طبقے وقتی اور غرض مندانہ ڈھنگ سے بھی بنتے ہیں جنھیں معاشی اور اقتصادی سطح پر الگ نہیں کیا جاسکتا مگر گوشۂ عافیت میں ان سے ٹکراؤ اور آپسی کشمکش، واقعات میں پیچیدگی بھی پیدا کرتی ہے اور تھیم کو ایک کشمکش اور تشویش سے دوچار کرتی رہتی ہے۔ اس طرح ناول کا دائرہ کار بڑھتا جاتا ہے جس میں گاندھی جی کی قیادت اور ان کے وقتی فیصلے بھی ناول نگار پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں پھر بھی پریم چند کے تقریباً تمام کردار منوہر، دکھرن بھگت، سکھو، گردھر، گیان شنکر، بلراج، قادر میاں اور رائے صاحب، اپنے انفرادی مزاج اور کردار سے تھیم کو یکسانیت سے بچاتے بھی ہیں۔ گویا یہ کردار پریم چند کا MAIN PACKAGE PLAN نہیں ہیں کہ واقعات کو ایک ڈھنگ سے چلاتے رہیں۔ لیکن یہ سب اس ناول کا مسئلہ ضرور ہیں جن پر انگریزی نوآبادیاتی نظام کا گھیرا پڑا ہوا ہے۔ دراصل اس ناول کی تصنیف کے وقت پریم چند ایک آئیڈیل نظامِ زندگی کے خواہاں تھے اور ہندوستان کی تمام پیچیدگیوں کے باوجود یہ سوچتے تھے کہ زمین داروں اور جاگیرداروں کو چاہئے کہ وہ زمینوں کو، کاشتکاروں کے حق میں واگزار کردیں جیسا کہ انقلاب روس کے بعد

روس میں ہوا۔ اسی واسطے پریم شنکر کو اپنے بھائی گیان شنکر کا مد مقابل بنا کر۔ پریم شنکر کے ذریعہ ساری جائداد کسانوں کے حق میں چھوڑنے کی تجویز پیش کرتے ہیں اور پھر مایا شنکر کے ذریعہ اسے عملی شکل بھی دیتے ہیں۔ رائے صاحب اور گائیتری، گاندھی جی اس اسکیم کی پیداوار ہیں کہ امیروں کو چاہئے کہ وہ غریبوں کے محافظ بنیں جسے تاریخ میں گاندھی جی کی ٹرسٹی شپ اسکیم کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن آگے چل کر خود پریم چند بھی اس اسکیم کے مخالف بنتے گئے کیوں کہ گاندھی جی کی یہ اسکیم، زمین داری کی پوزیشن اور مضبوط کرکے، بندھوا مزدوری اور استحصال کے مواقع مزید فراہم کرتی ہے اور کسانوں کو خود اپنی قیادت کا موقع ہی نہیں ختم کر دیتی، بلکہ ان کے ہر مسئلے کو فیوڈل کلاس کے سپرد کر دیتی ہے۔ جو گائیتری اور رائے صاحب کی طرح مذہبی رسوم کی ادائگی سے بھی اپنی برتری کا احساس نچلے طبقے پر ثبت کرتی جاتی ہے جسے گیان شنکر بھی اپنی پالیسی میں شامل کر لیتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو ان کی معاشی پوزیشن اور مضبوط ہوتی ہے، دوسری طرف مذہب کی یہ اُدارتا کسانوں کو ذہنی طور پر خود استحصال کے لئے بخوشی تیار کرتی جاتی ہے۔ گویا فیوڈل طبقے کا یہ ایسا رُخ ہے جو معاشی طور پر پست طبقے پر، ایجابی شکل میں حاوی ہو جاتا ہے جس پر دھرم کرم کا ہالہ ہے جو گیان شنکر کے زمین دارانہ رُخ سے الگ ہو کر کسانوں کو اپنے دام تزویر میں پھنساتا ہے۔ ایک طرح سے یہ فیوڈل کلاس میں آپس کی جنگ زرگری اور ایک ہی طبقے میں طبقاتی کشمکش کا وہ نمونہ ہے جو سکھو مہتو اور منوہر کی سطح کا ہے، جو ایک دوسرے کی زمین لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ بولی لگانے کے متمنی ہیں۔

پریم چند، اگر کسانوں کے مسائل، ان کی نفسیات، استحصال کرنے والے زمین داروں فیوڈل کلاس اور ان کے گماشتوں کی سرشت سے اچھی طرح واقف نہ ہوتے تو گوشۂ عافیت، دیہی معیشت اور مسائل کی دستاویز نہیں بن سکتا تھا۔ پریم چند صرف ایک ناظر محض نہ تھے اور نہ قصّہ گو۔ اپنے اس ناول کے ذریعہ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کو ایک نئی لڑائی کا ڈھنگ سکھانا چاہتے تھے جس سے کسانوں کو ایک نئی زندگی کا ادراک ہو سکے اور وہ اپنی طبقاتی جنگ کو ایک نیا موڑ دے سکیں۔ اور یہی ہوا۔ کسانوں کی یہ دنیا، اپنے اندرونی مسائل سے بھی نپٹتی ہے اور پھر ان اندرونی مسئلوں سے اوپر اٹھ کر، اُس باہر کی دنیا کا احساس کرتی ہے جو بلراج کی زبان سے یہ جملے کہلاتی ہے۔

"تم لوگ تو ایسی ہنسی اڑاتے ہو جانوں کا سکار کوئی چیج ہی نہیں ہوتا

جمیداری کی گلامی ہی کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ لیکن ٹھاکر ہچاکے گھر جو اکیا ساتا
ہے، اس میں لکھا ہے کہ روس دیس میں کاسکاروں ہی کا راج ہے۔ وہی جو
چاہتے ہیں کرتے ہیں۔" (گوشۂ عافیت جلد اول ص ۳۰۰)

رائے صاحب جو روشن خیال زمین دار ہیں اور ان کے انداز سے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قومی تحریک سے بھی ذہنی طور پر وابستہ ہیں، بدلتے ہوئے ہندوستان کی دیہی معیشت اور سرمایہ دار طبقے کے مفادات پر بھی ان کی نظر ہے۔ جب کپڑے کی ایک کمپنی کے ایجنٹ سے گفتگو کرتے ہیں تو ان کا انداز نہ زمین دارانہ ہے اور نہ تاجرانہ۔

"رائے صاحب: میں اس قسم کی صنعتی تحریکوں کو ملک کی خوشحالی کا ضامن نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ لالہ جگت رام اور منوہر جی کی خوشحالی، ملک کی خوشحالی نہیں ہے۔ آپ کی یہ کمپنی بھی خوشحالوں ہی کو خوشحال بنائے گی۔ بدحالوں پر اس کا اثر بہت کم پڑے گا۔ بے شک آپ چند ہزار مزدوروں کا وسیلہ معاش پیدا کر دیں گے مگر یہ مزدور زیادہ تر کاشتکار ہی ہوں گے۔ اور میں کاشتکاروں کو مزدور بنانے کے سخت خلاف ہوں۔"

ایک طرح سے یہ پریم چند کی اپنی آواز ہے جو گوشۂ عافیت اور چوگان ہستی سے گئودان تک سنائی پڑتی ہے کہ کسان کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کچھ نہیں کہ وہ کھیت چھوڑ کر مزدور ہو جائے۔ اور یہی آواز اندرونی مسائل کو چھوڑ کر باہر جھانک کر دیکھ لینے کی کوشش بھی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ پریم چند پر اکتوبر انقلاب کا بھی اثر ہو سکتا ہے اور اس بصیرت کا بھی جو انھوں نے خود دیہات میں رہ کر اس نو آبادیاتی ہندوستان میں حاصل کی تھی۔ شاید اس طرح بغیر طبقاتی سماج کی تمنا بھی ان کے دل میں موجود رہی ہو۔ ۱۹۰۵ء سے درمیان اپنی ایک تقریر میں لینن نے جو روسی کاشتکاروں کا نقشہ پیش کیا ہے، وہ پریم چند کے اس وقت کے ہندوستان سے کتنی مطابقت رکھتا ہے۔

" THE PEASANT, THEN WERE UNABLE TO WRITE, THEY WERE UTTERLY CRUSHED BY IGNORANCE; THEY HAD NO HELPERS ... AT LAST, THE PEASANT TOO, LOST PATIENCE. IN THE SPRING OF 1902, THE PEASANTS OF POLTA KHARKOV, ROSE AND WENT AGAINST LAND LORDS, BROKE OPEN THEIR BONUS, SHARED THE CONTENTS DISTRI-

BUTED AMONG THE STARVING, THE GRAIN THAT HAD BEEN SOWN AND REAPED BY THE PEASANTS AND APPROPRIATED BY THE LAND LORDS AND DEMANDED A NEW DIVISION OF LAND. THE PEASANTS DECIDED AND RIGHTLY DECIDED THAT IT WAS BETTER TO DIE FIGHTING THE OPPRESSOR THAN TO DIE FROM STARVATION WITH-OUT FIGHT.[1]"

گوشۂ عافیت، میں ایک جامد سماج ہے جسے متحرک کئے بغیر کسی سماجی انقلاب کا تصور ممکن نہیں اور اسی لئے پریم چند نے ایک طرح کی طبقاتی جنگ چھیڑی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کیسا سماجی انقلاب چاہتے تھے اور ان کے پاس انقلاب کا کیا تصور تھا ان سے ایک طرف، عیش پسندوں کی اجاڑ، کھوکھلی اور بے کیف زندگی ہے تو دوسری طرف کسانوں کی سیدھی سپاٹ، بے رس اور ایک ڈھرے پر چلنے والی لگان اور بے دخلی کے مسائل میں الجھی ہوئی غیر متحرک طرز معاشرت، اور انہیں صورتوں کے مختلف موڑوں سے پریم چند واقعات کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔ یہاں تقابل مقصود نہیں اور نہ یہ کہنا مقصود ہے کہ پریم چند اور ٹالسٹائے کے مسائل اور کردار ایک ہیں مگر انقلاب سے پہلے ٹالسٹائے کی دنیا، اور پریم چند کی دنیا حیرت انگیز طور پر ایک جیسی ہے اور کرداروں میں بھی دلچسپ مطابقت ہے۔ ٹالسٹائے سے متعلق لوکاچ کا مقالہ پڑھتے ہوئے دو تین باتیں دلچسپ نظر آئیں۔ وار اینڈ پیس میں ROSTOV خاندان کے معاشی حالات کا بکھراؤ، جٹا شنکر کے خاندانی بکھراؤ سے کس قدر ملتا جلتا ہے وہی خرّاج مزاج، تعلقہ برباد ہونے پر بھی وہی پرانی قدروں کا رکھ رکھاؤ۔ کانسٹینٹن لیون (CONSTAN-TINE LEVIN) بالکل گیان شنکر کی طرح، روسٹاف، سے زمین داری اور کاشتکاروں کے مسائل کو لے لیتا ہے اور کاشتکاروں سے اسی طرح کا برتاؤ کرتا ہے جیسا کہ گیان شنکر، اپنے کاشتکاروں سے کرتا ہے۔ لوکاچ کا جائزہ لیون کے لئے اس طرح ہے۔

"HE FIGHTS NOT ONLY TO RECOVER HIS MATERIAL PROSPARITY AS A LAND OWNER BUT HAS TO CARRYON AN INCESSANT INNER STRUGGLE, A STRUGGL MOVING FROM CRISIS TO CRISIS IN TRYING TO CONVINCE HIMSELF THAT HIS

---

[1] ALLIANCE OF THE WORKING CLASS AND PEASANTS P. 81 BY LENIN — MOSCOW 1959

EXISTENCE AS LAND OWNER IS JUSTIFIED AND THAT HE HAS A RIGHT TO EXPLOIT HIS PEASANT."[۵۱]

پریم چند، برٹش گورنمنٹ کے ملازم بھی رہ چکے تھے اور بہت کچھ گاندھی جی سے متاثر بھی تھے اس لئے وہ کسی ایسے انقلابی رویے کے قائل نہ تھے جو سردار بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کا راستہ بنا، تاہم وہ ایک اندرونی سماجی انقلاب کے خواہاں تھے اور جس کے لئے ان کے پاس دو صورتیں ہیں۔ یا تو زمیندار اپنی زمین داریاں چھوڑ کر، پریم شنکر اور مایا شنکر کی طرح دست بردار ہو جائیں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ کسان اپنی زمین پر قابض ہو کر آسودہ حال ہو جائیں یا پھر ایک زرعی انقلاب سے کسان اپنے طبقاتی اتحاد کے ذریعہ ایسی صورت پیدا کر لیں کہ زمین داری کا قلع قمع ہو جائے۔ کسانوں کا استحصال کرنے والے سیٹھ ساہوکار ختم ہوں۔ اس کا اظہار انھوں نے بعد کو کیا بھی کہ "میں کمیونسٹ ہوں مگر میری کمیونزم یہ ہے کہ ہمارے دیس میں زمین دار اور سیٹھ وغیرہ جو کسانوں کا استحصال کرتے ہیں، باقی نہ رہیں۔"

مگر یہ تبدیلی اندر سے پیدا ہونی چاہئے اور اس اندرونی تبدیلی میں کسی طاقت، ہتھیار یا بورژوا جمہوری طبقات سے ٹکراؤ کی ضرورت نہیں، بلکہ اصلاح، اخلاقیات اور دھرم کرم کے ناتے، غریبوں کی قسمت سنوارنے کا جذبہ، دنیائے وطن کے دل میں پیدا ہو اور اس طرح سب متحد ہو کر کسانوں کی قسمت بہتر کریں۔ حکومت سے آزادی کے خواہاں ہوں۔ کسی انقلابی جنگ کی ضرورت نہیں۔ یہ صورت پریم چند کے ذہن میں کانگریس کی پالیسیوں سے رونما ہوتی ہے کہ ہم اپنی قسمت خود نہیں سنوار سکتے اپنے سماج کو بہتر بنانے کی فکر نہیں کرتے ورنہ خود بخود سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اسے پریم چند کا فکری تضاد کہہ لیجئے یا تصور پرستی یا ان کا تخیلی نظام اخلاق، جو حقیقتوں سے انھیں تھوڑی دیر کے لئے دور لے جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء کے آس پاس یہ جذبہ اوپر کے اُس بورژوا اور مڈل کلاس طبقے میں بھی موجود ہے جو خود کو وطن پرست سمجھتا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر چکبست کی نظموں میں جو ہوم رول سلسلے کی نظمیں ہیں اور اس وقت کے سیاست دانوں خصوصاً گوکھلے، دادا بھائی نوروجی اور سی۔ آر۔ داس، سب کے یہاں سوچنے کا یہی طریقہ ہے۔ گویا انگریز تو انصاف پسند ہے، دراصل ان کے کارندے، اہل ہند کے دشمن ہیں۔ ہمارا سماج ہی گڑبڑ ہے۔ بس یہ ٹھیک ہو جائے تو سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ اس دور کے پریم چند میں بھی قریب قریب یہی جذبہ کبھی کبھی ابھرتا ہے۔ "گوشۂ عافیت" میں بھی "صاحبوں" پر براہ راست الزام نہیں آتا۔ ناول کی ابتدا

[۵۱] STUDIES IN EUROPEAN REALISM BY LUKACKS P. 160
EDITH BONE TRANSLATION 1950 EDITION.

ہی میں انگریزوں کی تصویر یوں ابھرتی ہے۔

"منوہر نے کہا بھائی حاکم تو انگریز ہے۔ وہ نہ ہوتے تو اس دیس والے حاکم، لوگوں کو بیس کر پی جاتے۔

دکھرن بھگت نے تائید کی۔ "جیسا ان کا اکبال ہے ویسا ہی نارائن نے سبھاؤ بھی دیا ہے۔ انسا یہ کرنا تو یہی جانتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ گھوس گھاس سے کچھ مطلب نہیں۔" (گوشۂ عافیت ص۸)

مگر سماجی انقلاب، صرف اخلاقی اور اصلاحی قوتوں سے ممکن نہیں۔ یہ بات رفتہ رفتہ گاندھی جی کی سمجھ میں آئی اور پریم چند کے بھی۔ اینگلز نے اقوام مشرق کی تحریک آزادی، میں ایک جگہ اس خالص سماجی انقلاب، کے لئے لکھا ہے کہ:

"جو شخص ایک خالص سماجی انقلاب کا منتظر ہے، اسے کبھی ایسا انقلاب دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ ایسا شخص محض زبان سے انقلابی ہے اور در اصل انقلاب کا مطلب نہیں سمجھتا۔" (کاؤتسکی کے نام اینگلز کا خط)

لیکن اسی خط میں ستمبر ۱۸۸۲ء میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

"جن ملکوں میں دیسی باشندے بستے ہیں، جو محض غلام اور محکوم ملک ہیں مثلاً ہندوستان، الجیریا اور ڈچ پرتگالی اور ہسپانوی مقبوضات، وقتی طور پر پرولتاریوں کو انھیں اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو تیزی سے انھیں خودمختاری کی طرف لانا چاہتے ...... یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ مرحلہ کس طرح طے ہوگا۔ شاید بلکہ یقین غالب ہے کہ ہندوستان میں تو انقلاب آئے گا۔" (کاؤتسکی کے نام اینگلز کا خط)

خود ہندوستانی سیاست میں کسانوں کی حالت کی تصویر، جواہرلال نہرو نے "میری کہانی" میں اس طرح پیش کی ہے:

"مجھے معلوم ہے کہ وہ (کسان) لگان کے روز افزوں بوجھ سے دبے جارہے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ انھیں کھیت سے بے دخل کیا جاتا ہے اور ان کی جھونپڑیاں تک چھین لی جاتی ہیں۔ پھر اوپر سے مار پڑتی ہے۔ غرض چاروں طرف سے خونخوار گدھ

ان پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ ہمارے
سارا دن محنت کرتے ہیں۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتے ہیں لیکن شام کو انھیں
پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ ہماری چیز نہیں ہے۔" (میری کہانی)

یہاں بھی ایک دلچسپ مماثلت دیکھئے کہ جوش نے جب اپنی نظم "کسان" لکھی تو کم و بیش یہی خیالات نظم میں پیش کئے۔

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر | جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی محنت کو، جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے | دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے

ایسی صورت میں پریم چند کی سمجھ میں ایک مثالی کل ابھرتا ہے جس پر وہ اس ناول کا اختتام بھی کرتے ہیں مگر وہ بات جو انھوں نے اپنے خطبے میں کہی تھی کہ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اس سے آگے چلنے والی مشعل ہے، تو یہ بات انھوں نے اپنی تحریروں سے بعد کو ثابت بھی کر دی کہ صرف سماج سدھار کے بل بوتے پر اب ہندوستان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ میدان عمل گئودان، اس کی اگلی کڑی ہیں۔ اس کے لئے سنگھرش کرنا ہوگا۔ اور اس طرح پریم چند گاندھی جی سے آگے بڑھ کر سوچتے نظر آتے ہیں۔ گوشۂ عافیت کے چند کرداروں میں بھی یہ انقلابی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ منوہر اور بلراج اس کے نمائندے ہیں۔ یہاں تک کہ دکھرن بھگت بھی سالگ رام کی مورت پھینک کر، ظلم و جبر کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ غوث خاں کا قتل بھی ہوتا ہے اور حکام کے خلاف صف آرائی بھی، جو گاندھی جی کے عدم تشدد سے ایک قدم آگے کی بات ہے۔ کیوں کہ کسان اب اس ظلم کو سہنے کے لئے تیار نہیں جس کا ذکر نہرو نے کیا ہے۔ اور گاندھی جی کسی ایسے اقدام کے لئے تیار نہیں تھے جو گوشۂ عافیت کے یہ چند کردار کرتے ہیں۔ پریم آشرم (گوشۂ عافیت) پریم چند نے دو برسوں میں تیار کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے سیاسی موڑ اپنا رخ بدلتے تھے، پریم چند، اپنے کرداروں کے ساتھ ہندوستانی سیاست کو ایک طرح کا مشورہ فراہم کرتے جاتے ہیں مگر جب گاندھی جی سے ان کی عقیدت بڑھ جاتی ہے تو ان سے اختلاف بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اور پھر زمین بانٹنے کا وہ حل نکالتے ہیں جس کا اشارہ انھیں انقلاب روس کی کامیابی سے ملتا ہے اور جو ہندوستانی سیاست میں قبل از وقت ہونے کی وجہ سے مثالی معلوم ہوتا ہے۔ مارکس نے کمیونسٹ پارٹی کے منشور کا پہلا جملہ جب لکھا تو اس میں یہی کہا تھا کہ "آج تک کی موجودہ سوسائٹی کی تاریخ ایک طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔" تو یہ طبقاتی کشمکش آج بھی ہندوستان میں چل رہی ہے لیکن پریم چند کی خواہشات کی تمام شقیں ابھی پوری نہیں ہوئیں۔ ہاں کسان کا مسئلہ جس کا

اور اک گوشۂ عافیت، میں پریم چند نے کیا تھا، بہت کچھ پورا ہو گیا ہے۔
اس مقالے کی ابتدا میں، گوشۂ عافیت میں چار طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو مختلف محاذوں پر اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنی جنگ لڑتے ہیں۔ (۱) وہ کسان جو کھیت مزدور ہیں اور زمین کا کوئی حصّہ جن کے پاس نہیں (۲) وہ جو زمین رکھتے ہیں مگر آپس کے تفرقوں کا شکار ہیں (۳) وہ سرکاری عمال جو کسانوں کا خون چوستے ہیں۔ (۴) زمین دار طبقہ، جس کی مختلف شکلیں، گیان شنکر، گائتری اور رائے صاحب وغیرہ ہیں۔ یہ طبقات، اگرچہ اپنی انفرادی، ذہنی کیفیات کا ایک فرد کی حیثیت سے بھی مظاہرہ کرتے رہتے ہیں مگر اجتماعی مسائل میں کسانوں کا صرف ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ زمین سے مالکانہ قبضے کے لئے زمین داروں سے لڑنا، گویا ایک بڑے دائرے میں یہ ایک پرولتاری طبقہ بنتا ہے جو فیوڈل نظام کے خلاف صف آرا ہے۔ اسی طرح زمین داروں میں بھی مختلف اشخاص، انفرادی مزاج کے افراد ہیں مگر ان کے ذہن کی تشکیل کم و بیش ایک ہی لیجے پر ہوئی ہے کہ کاشتکاروں کی محنت کا استحصال کریں کیوں کہ وہ زمین کے مالک ہیں جن کی تصویر پریم چند کے ذہن میں OPPRESSOR اور EXPLOITER کی شکل میں ابھرتی ہے۔ رائے صاحب، ایک طرح سے نرم دل کے زمین دار ہیں اور پریم شنکر، زمین داروں کی اصطلاح میں "برباد شدہ"۔ ان میں طبقاتی نفرتیں اور خود غرضیاں طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کرتی ہیں جن کے بیچ سے انقلابی چنگاریاں بھی نکلتی رہتی ہیں اور پریم چند، ان تمام طبقات کی نفسیات، ان کی سماجی حقیقتوں اور معاشی صورتِ حال سے اپنی واقفیت کا ایسا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ کبھی کبھی تو یقین نہیں آتا کہ اس نظام میں پستے ہوئے کسی آدمی کی سیاسی بصیرت، اس حد تک بھی پہنچ سکتی ہے؟ جہاں فکشن کا مزاج، کہکشاں کا سانحہ، شہاب کی سرگزشت، زیدی کا حشر، اور تم میرے ہو جیسا بنا ہو، وہاں اس طرح کی یکہ تازی ادب کے میدان میں بھی آسان نہیں کہ ادیب اکثر پاپولر فکشن کے رنگوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے شہرت طلبی اسے ڈھرے پر کھینچ لے جاتی ہے جس پر قبولیتِ عام کا کارواں چل رہا ہے ذرا سوچئے کہ پریم چند نے اردو فکشن کی دنیا میں، عام قاری کے نقطۂ نظر سے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔؟ اور یہ محض ان کا تجربہ کرنا نہ تھا بلکہ اِس نقطۂ نگاہ پر ان کا پختہ عقیدہ تھا، جیسا کہ انہوں نے بعد کو ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس میں، حسن اور ادب دونوں کے معیار بدلنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس طرح گوشۂ عافیت، میں پریم چند کے ادبی اور سیاسی دونوں نقاطِ نظر، عام روش سے ہٹ کر پیش ہوتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ اپنی ہر تحریر میں، مصنف، خود کو کسی نہ کسی کردار میں

پیش کر دیتا ہے، تو شاید پریم چند خود کو، پریم شنکر اور قادر میاں کے روپ میں ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہی پریم چند، جب بلراج اور منوہر کو پیش کرتے ہیں تو ناول میں تیور بدل جاتے ہیں۔ شاید منوہر اور بلراج ان کے دل کی وہ خواہش ہیں جسے پریم چند بعض اسباب سے پوری کرتے ہوئے گھبراتے تھے کیوں کہ وہ انقلابی کی پوری نفسیات سے باخبر تھے اور اس حد تک جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلراج اور منوہر کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"بلراج۔ جھگڑے کی بات کیوں نہیں ہے۔ کوئی ہم سے گلی کیوں مانگے؟ کسی کا دیا کھاتے ہیں یا کسی کے گھر مانگنے جاتے ہیں۔ اپنا تو ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑتے۔ تو ہم دھونس کیوں سہیں۔ نہ ہوا میں نہیں تو دکھا دیتا۔"

"دونوں ساتھ ساتھ گاؤں میں پہنچے تو ہل چل مچی ہوئی تھی۔ چاروں طرف جبر اور کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ قادر کے دروازے پر ایک پنچایت سی بیٹھی ہوئی تھی۔

"منوہر (بلراج سے) اچھا جا کر چٹ پٹ کھا پی لو۔ آج میں بھی تمہارے ساتھ رکھوالی کرنے چلوں گا۔ ... منوہر نے پوچھا۔ کلہاڑا خوب چلتا ہے نا؟

بلراج: ہاں آج ہی تو رگڑا ہے۔؟

منوہر۔ تو اسے لے لو .... تم دو ایک ہاتھ چلا کے لیے ہو جانا اور سب میں دیکھ لوں گا ..... میرے ہاتھوں میں اب وہ بل نہیں کہ ایک چوٹ میں وارا نیارا ہو جائے۔"

(گوشۂ عافیت ص ۳۴۹)

اور پھر غوث خاں کا قتل ہو جاتا ہے۔

یہ آوازِ نئے ابھرتے ہوئے ہندوستان کی آواز ہے جو دکھرن بھگت، بسیسر شاہ یا قادر میاں کی آواز سے کس قدر مختلف ہے؟ بالکل اسی طرح جس طرح نئی تعلیم سے آراستہ، گیان شنکر، جٹا شنکر اور پریم شنکر سے مختلف ہے۔ پھر دکھرن بھگت کی پوجا پاٹ اور گایتری کی پوجا پاٹ میں جو معاشی پستی سے مقابل بلندی کا طعنہ ہے۔ وہ فیوڈل مذہبی روایت پرستی کے تار و پود بکھیر دیتا ہے جہاں عبادت الٰہی میں بھی طبقاتی شعور حاوی نظر آتا ہے۔ جس سے مذہبی ظاہر پرستی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور جہاں پہنچ کر مذہب سماتا نہیں بلکہ طبقات کا سبق پڑھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دکھرن بھگت کا سالگ رام کی مورت کا پھینک دینا، کوئی چاہے تو پریم چند کی آریہ سماجی ذہنیت سے وابستہ کرے مگر مورتی کی اس توہین میں جو طبقاتی نفرت کا اعلان ہے وہ بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آتا۔ گویا بھگوان بھی طبقوں میں

بنٹے ہوئے ہیں اور انھیں سے خوش ہوتے ہیں جو صاحبانِ ثروت ہیں۔ اس طرح عقیدت اور جذبہ بھی دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کو نظر میں رکھ کر انسانوں میں پھیلے ہیں۔ دکھن بھگت، جب تحصیلدار کے چپراسی سے جوتے کھا کر واپس آتے ہیں تو قادر میاں، اس کو سمجھا کر تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر دکھن بھگت کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"دکھن (ہنس کر) یہ سب من کو سمجھانے کا ڈھکوسلا ہے کادر میاں۔ یہ پتھر کا ڈھیلا ہے۔ نیرا مٹی کا پنڈا۔ میں اب تک بھول میں پڑا تھا..... آج آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا..... 'یہ لو ٹھاراج جاؤ جہاں تمھارا جی چاہے۔ تیس سال کی بھگتی کا تم نے مجھے یہ بدلہ دیا۔ یہ کہہ کر بھگت نے سالگ رام کی مورت کو زور سے ایک طرف کو پھینک دیا... تیس سال کی روحانی عقیدت مٹ گئی۔ مذہبی اعتقاد کی دیوار ہل گئی۔"

یہ نفرت اس نظام اور طبقے کے خلاف بھی ہے جس نے بھگت کی عقیدت کا مذاق اڑایا تھا اور اسے پوجا کرنے سے پہلے گھسیٹ کر تحصیلدار کے سامنے جوتوں سے پٹا تھا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس طرح مذہب کی توہین کر کے پریم چند نے ہندوؤں کے مذہبی جذبے کو چیلنج کیا ہے۔ یہ صورت تھوڑی دیر کے لئے اس وقت پیدا ہو جاتی، اگر پریم چند چپراسی اور تحصیلدار کو بجائے سرکاری کرچاری کے کسی مخالف فرقے سے وابستہ کر دیتے مگر وہ تو چاہتے تھے کہ ہر مکتب خیال سے لوگ، اس نظامِ زندگی کے خلاف صف آرا ہوں، جس میں کسی کا ایمان اور عقیدہ بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔ ایسے نظامِ زندگی میں عبادت اور عقیدہ سب بے معنی ہیں۔ اس لئے یہ سنگھرش جو سیاست کے راستوں پر چل پڑا ہے، اس میں شامل ہونے کے علاوہ، دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ اور یہ بھی کہ غلام قوموں کی نجات، اب حاکموں کے خلاف، ہر طرح کے اقدام کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر انھیں اپنا کلچر، اپنی تہذیب بچانی ہے تو یہ اقدام کرنا ہوگا۔ صنعتی تہذیب بھی معاشی تحفظ چاہتی ہے اور اگر کسی طبقے کو یہ معاشی تحفظ حاصل نہیں تو اس کا ادب، اس کا کلچر اور اس کے مذہبی عقائد، کچھ محفوظ نہیں رہ سکتے۔

مظلوم قوموں کی عجیب نفسیات ہو جاتی ہے۔ کبھی تو وہ ایک بڑے خطرے کے مقابلے میں متحد ہو کر اپنا تن من دھن، سب کچھ لگا دیتی ہیں لیکن کبھی معمولی مفاد کے لئے، ان کے افراد، آپس میں بغض و حسد، کینہ پروری ایک دوسرے کو دھوکہ دینے، چغلیاں کھانے اور حکمرانوں کے خلاف جنم لیتی ہوئی تحریک کی سراغ رسانی میں ایسی دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے مقاصد کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔

اور یہ صورتیں ایسی محکوم قوم کے ہر طبقے میں نمودار ہوتی ہیں۔ ناول نگار ایک بڑے تھیم کی رو میں اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دے تو ایسا ناول نگار، ایسی بہت سی حقیقتوں سے محروم رہ جاتا ہے جو انسانی ذہن اور سماج دونوں کی سچائیاں ہیں۔ اور زندگی سے کیف وکم کی طرح ناول کے اس عظیم تھیم میں ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں جس کی تکمیل، ان چھوٹی سچائیوں کو چھوڑ کر ایک بے رس تھیم کی تکمیل بن جاتی ہے۔ گوشۂ عافیت میں مسئلہ ایک زرعی نظام کی صحیح تقسیم سے انقلاب تک پہنچنے کا ہے۔ مگر یہ پریم چند کا جینیس (GENIUS) ہے کہ انھوں نے اس زرعی انقلاب تک پہنچنے میں دوسرے سوشلسٹ ناول نگاروں کی طرح، ان افراد کے کرداروں اور ان کی ذہنی اور سماجی کیفیات کو نہیں چھوڑا، جو اس انقلاب تک پہنچنے میں مددگار ہوں گے۔ اس قومی نفسیات کے ساتھ، پریم چند نے تقاضائے بشری کی کمیوں کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ اسی وجہ سے، ان کے اس ناول میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے گرد وپیش کے انسان نہ تو گم ہوتے ہیں اور نہ مسائل، جو ایک بڑے گھیرے میں ملک کی آزادی کی طرف بھی گامزن ہیں یہی نہیں بلکہ ناول نگار کے ذہن کو بھی زینہ بہ زینہ اگلی لڑائی کے لئے تیار کرتے رہتے ہیں اور نئے راستے بھی سجھائے جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے پریم چند، زرعی انقلاب کے تھیم سے نکل کر اپنی فکر کی جولانگاہ، چوگان ہستی میں ایک ایسے تھیم کو بناتے ہیں جو مزدوروں اور فیکٹری کا تھیم بنتا ہے اگر چہ اس کے ساتھ کھیتوں اور کسانوں کا مسئلہ بھی ثانوی حیثیت سے جڑا ہوتا ہے۔

گوشۂ عافیت کے کردار، مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود، اپنی چھوٹی چھوٹی رقابتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان بیرونی کیفیات کے دباؤ میں پستے ہوئے کرداروں کا سماجی اور نفسیاتی کردار بھی دیکھئے۔ سکھو چودھری کے گھر سے غوث خاں نے کوکین برآمد کرائی ہے اور بے قصور سکھو کو سزا دلوانا چاہتے ہیں۔ مال برآمد ہو گیا۔ گاؤں والے افسوس کرتے ہیں کہ بے گناہ سکھو، غوث خاں کی دشمنی کا شکار ہو گیا۔ لیکن یہی گاؤں والے، سکھو کے خلاف گواہی دے کر اس کے خلاف مقدمے کو اور مضبوط کرتے ہیں اور اس کی بے عزتی کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں صرف چند جملے اشارے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

> "داروغہ نور عالم نے گاؤں پر چھاپہ مارا۔ سکھو چودھری نے کبھی کوکین نہیں کھائی تھی اس کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ لیکن ان کے گھر میں ایک تولہ کوکین برآمد ہوئی۔ پھر کیا تھا مقدمہ تیار ہو گیا۔ حراست میں لے

لے گئے۔ انھیں یہ یقین ہو گیا کہ میں بری نہ ہو سکوں گا۔ انھوں نے خود کئی آدمیوں کو اسی طرح سزا دلائی تھی۔"

یہاں آخری جملہ خاص طور پر نظر میں رکھنے کے قابل ہے۔ پھر سکھو کے خلاف گواہی دینے والے بھی اسی گاؤں کے آدمی ہیں جو اپنے کردار کا اسی حد تک اظہار کرتے ہیں جس کے وہ اہل ہیں۔ اور وہیں ان کی کارکردگی ختم ہو جاتی ہے۔ زمین دار طبقہ بھی اس علت سے خالی نہیں۔ پریم شنکر کی شہرت کے حسد میں، ان کا سگا بھائی، گیان شنکر، ہر بدنامی، پریم شنکر کے سر تھوپ کر اسے نامقبول بنانے کی فکر کرتا ہے۔ غوث خاں کے قتل کی ذمہ داری بھی پریم شنکر کے سر تھوپی جاتی ہے۔

"گیان شنکر: کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو۔ میں ان ٹکڑ گدے کسانوں سے دبا پھروں..... ان کی مجال تھی کہ میرے مقابل میں کھڑے ہوتے۔ ہاں جب اپنے ہی گھر میں آگ لگانے والے موجود ہوں تو جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ میں ایک بار نہیں سو بار کہوں گا کہ اگر بھائی صاحب نے انھیں سر نہ چڑھایا ہوتا تو آج ان کے حوصلے اتنے نہ بڑھتے۔

ودیا۔ سارا شہر جس کی پوجا کرتا ہے، اسے تم گھر میں آگ لگانے والا کہتے ہو۔

گیان شنکر: ایسی دنیاوی عزت کی ہوس ہی تو ان تمام فسادوں کی جڑ ہے۔"

(گوشۂ عافیت ص ۲۶۴)

یہاں ایک دلچسپ بات کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔ گوشۂ عافیت کے کردار، ایک فیوڈل وراثت کے ساتھ سوچتے اور معاملات سے الجھتے ہیں اور اس گرے ہوئے سماج میں سارے مسائل ایک کم کے گولے کی طرح آ کر گرے ہیں جس سے تمام طبقوں میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اگرچہ یہ حرکت ایک ناگواری کے احساس کے ساتھ وجود میں آتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ مسائل نہ ہوتے تو سوسائٹی آرام چین سے گزران کرتی۔ نہ لگان بڑھتا، نہ اضافے کا مسئلہ ہوتا اور نہ یہ صورتیں وجود میں آتیں لیکن تمام کرداروں کی حرکت اور عمل کے ساتھ جو سوسائٹی میں ایک ارتقائی کیفیت رونما ہوتی ہے وہ اس ناگواری کے احساس کے ساتھ ملکی سیاست اور سماج کے ارتقا کی ایک کڑی بھی بنتی ہے۔ فیوڈل سچویشن سے جو کشمکش کی کیفیت رونما ہوئی ہے، وہی اس سوسائٹی میں انقلاب بھی لاتی ہے۔ مسائل کے حل کی کوشش، کرداروں کو اقدام کے لئے تیار کرتی ہے اور یہ اقدام، سیاست اور طبقاتی جنگ کے لئے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ہندوستانی سماج جو ۱۹۱۵ء تک محض اصلاح اور انگریزوں

سے مجھوتے کا تقاضہ کرتا تھا، وہ زمینوں کو کسانوں میں تقسیم کرنے کا متقاضی ہوتا ہے اور بیرونی حکومت سے خلاف صف آرا ہوکر عدم تعاون، معافی لگان اور پھر اسٹرائیک کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ روس میں انقلاب سے پہلے۔ سرفڈم (SERFDOM) کی اسٹیج تھی جو کسانوں کی مجبوری لڑائی سے کسانوں (PEASENTRY) میں تبدیل ہوگئی، اور پھر یہ (PEASENTRY) نوکر شاہی کی اسیر ہوگئی جس طرح آج ہندوستانی عوام نوکر شاہی کے اسیر ہیں۔ پھر سوشل ڈاکریٹ، سیاسی آزادی کے لئے نوکر شاہی کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اس طرح جیسے جیسے سوسائٹی میں شگمرش بڑھتا جاتا ہے کسان بھی سماجی ارتقا کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ہیگل کا نظریۂ ارتقا کی طرف یہ اقدام، شگمرش نمو سے درمیان ہوتا ہے۔ جہاں گیان شنکر اور حکومت کی تدبیریں پست پڑتی جاتی ہیں اور کسانوں کی تحریک، روز بروز انقلابی ہوتی جاتی ہے اور اس طرح تاریخ سے ارتقا کی طرف بھی یہ سماجی اور طبقاتی جنگ، اقدام کرتی ہے جسے تاریخ کا معاشی مادی ارتقا سمجھنا چاہئے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کی فکر کا دائرہ، ان حدود کو بھی پار کر جاتا ہے، جہاں ہیگل نے سوسائٹی کے ارتقا پر ایک حد پر پہنچ کر 'STOP' کا حکم لگایا ہے اور اس طرح ارتقا کی بھی ایک حد مقرر کردی ہے جہاں سے زوال شروع ہوجاتا ہے جسے ہیگل نے "PROSAIC CONDITION OF THE WORLD" سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح یونان اور روم کی تہذیبوں کا حشر ہوا۔ مگر مارکس اور اینگلز نے انسانی سماج سے ارتقا کی تاریخ کو پابند نہیں کیا اور یہ حکم لگایا کہ سماجی ارتقا، بغیر کسی روک ٹوک سے نمو پذیر ہوتا رہتا ہے کیوں کہ پیداواری طاقتوں (PRODUCTIVE FORCES) کا کوئی انت نہیں، کیوں کہ انسانوں سے عمل کا بھی کوئی انت نہیں، جو ارتقا کی صورتوں کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ اب ذرا گوشۂ عافیت کے مایا شنکر کے طویل اعلان کے چند جملے ملاحظہ کیجئے جسے پریم چند کی آئیڈیلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

> "مجھے اندیشہ ہے کہ میری باتیں بعض حلقوں میں بے سود اور بے موقع اور بعض حلقوں میں باغیانہ اور انقلاب انگیز سمجھی جائیں گی ..... میرا خیال ہے کہ مجھے کسانوں کی گردنوں پر اپنا جوا رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری اخلاقی کمزوری اور بزدلی ہوگی اگر میں اپنے اصول کو مصلحت پسندی پر قربان کردوں ..... میں آپ سب صاحبوں کے سامنے ان حقوق اور امتیازات سے دست بردار ہوتا ہوں جو رواج اور نظام معاشرت نے مجھے دیئے ہیں۔

میں اپنی رعایا کو قیدِ اطاعت سے آزاد کرتا ہوں۔ وہ نہ میرے اسامی ہیں اور نہ میں
ان کا زمین دار۔ وہ سب میرے دوست اور میرے بھائی ہیں۔ آج سے وہ سب
اپنے مزروعہ کے خود مالک ہیں۔ ... آپ کو آزاد کرکے میں خود آزاد ہو گیا۔"

(گوشۂ عافیت ص ۱۲)

۱۹۴۷ء تک پریم چند کے یہ تصورات یقیناً محض آئیڈیلزم تھے لیکن سماج کا ارتقا جاری ہے اور ۱۹۸۱ء تک پہنچ کر چک بندی ایکٹ (CONSOLIDATION OF LAND ACT) نے پریم چند کے ان تصورات کو حقیقت میں تبدیل کر دیا جسے ہندوستانی سیاست اور دانشور، آئیڈیلزم سے تعبیر کرتے تھے۔ اب اپنے ذہن میں پریم چند کے اس جملے کو پھر سے دہرائیے۔ کہ:

"ادیب وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے
مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔"

یہ ضرور ہے کہ پریم چند کے یہاں طبقات کی کشمکش کا وہ طریق کار نہیں جو کسی ماہر سماجیات یا تاریخ کا مادی شعور رکھنے والے کے یہاں ملتا ہے مگر انھوں نے اپنے تجربے سے جو کچھ ہندوستان کے عوام اور خصوصاً کسانوں سے متعلق سمجھا تھا، اس وقت کی تیزی سے بدلتی ہوئی جس زندگی کا ادراک انھوں نے کیا تھا، وہی ان کی ایسی آگہی بنتا ہے جو انہیں اصولی ماہر سماجیات کی طرز فکر سے الگ کر کے ایک عملی اور مادی زندگی کا نباض بناتا ہے اور جس کی مدد سے پریم چند نے اپنے دور کی سماجی تاریخ کو ناول اور افسانوں کے صفحات میں اس طرح متشکل کر دیا ہے جس کی مثال عالمی ادب میں سوائے ٹالسٹائے کے شاید ہی کہیں ملے۔ یہی پریم چند کی عظمت کا راز ہے، یہی ان کی ترقی پسندی اور یہی ان کا طبقاتی شعور، جو انہیں اپنے دور میں دوسرے فنکاروں سے ممیز کرتا ہے۔ □

رفیق شاہین
II/۱۴۷، گورنمنٹ پریس کالونی، علی گڑھ

غزل

وہ شخص جتنا دور تھا اتنا قریب تھا
ذہنوں کا فاصلہ بھی عجیب و غریب تھا
دنیا کو دے رہا تھا جو کل درسِ زندگی
وہ شخص آج دیکھا تو نذرِ صلیب تھا
الزام بے وفائی کا کس کس کے سر رکھوں
سچ تو یہ ہے میں آپ ہی اپنا رقیب تھا
ہر چند وہ فرشتوں میں شامل رہا مگر
ٹوٹا بھرم جب اس کا تو چہرہ مہیب تھا
پہنے خوشی کے ہار سبھی نے مگر مجھے
غم بھی نہ راس آئے یہ میرا نصیب تھا
دنیائے سیم و زر کے خداؤں کے درمیاں
محرومیوں کا کرب چھپائے ادیب تھا

نظم

داستانِ زندگی
مختصر ہے کس قدر
عمر کا لمبا سفر
راستے کے تین موڑ
ایک ہوٹل
ایک دفتر
ایک گھر
اور پھر
ختم سفر

روشن نگینوی
پشاور، پاکستان

غزل

یہ دورِ انحطاط عجب حال مست ہے
جتنا بھی جو بلند ہے اتنا ہی پست ہے
ہر بوالہوس بہار میں ساغر بدست ہے
ساقی! ہمارے واسطے کیا بندوبست ہے
مشتاق عرضِ شوق کا مدت سے ہے کوئی!
لیکن یہ میرے زعمِ جنوں کی شکست ہے
اہلِ زمیں پہ یورشِ آفاتِ روز و شب
یہ آسماں بھی اپنا عجب سرپرست ہے
اس انقلابِ وقت کا یہ رنگ دیکھنا
شہرت میں جو بلند ہے قامت میں پست ہے
اہلِ کرم سے مل کے کھلا ہے یہ ماجرا!!
ان میں ہر ایک میری طرح تنگ دست ہے
روشن چراغِ فن کو لئے پھر رہا ہوں میں
ماحول اتفاق سے ظلمت پرست ہے!

علی امام نقوی

۸۳ - جوبی میکر چیمبر II
نریمان پوائنٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱

عذاب مانگنے والے

"مجھے معلوم ہے وہ دن کون سا ہے !"

شیروانی والے نے حتمی انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"سچ ۔۔۔ ؟" سائل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں ! مجھے معلوم ہے !"

"تو پھر بتاؤ ..... مجھے ..... ان سب کو ..... جہاں تک تمھاری آواز پہنچے۔ خدا کے لئے بتا دو کہ یہ آگ ہمارا پیچھا چھوڑے۔ ہم عذابوں سے محفوظ رہیں اور نعمتیں ہم پر اتریں !"

"افسوس ... میں بتا نہیں سکتا کیوں کہ میں جانتا ضرور ہوں اس دن کی بابت، لیکن میں مانتا نہیں اس دن کی اہمیت کو ۔ !"

"اے لوگو ۔۔۔ اے لوگو !"

شہر کے سب سے بڑے چوک کے درمیان کھڑے ہو کر اس نے آواز لگائی۔ مشینی شہر کے مشینوں کے پرزوں سمان لوگ بھاگ چلتے چلتے رکے۔ آواز لگانے والے پر ایک نظر ڈالی۔ کچھ آگے بڑھ گئے۔ بلا کسی ردِّ عمل کا اظہار کئے۔ کسی کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال ابھرا۔ کسی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ کچھ مزید توقف کے بعد سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن بیس پچیس افراد ادھر ادھر سے اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو ہی گئے۔ آواز لگانے والے نے گھوم کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پھر کھنکار کر اس مختصر مجمع سے مخاطب ہوا۔

"اے لوگو ! تمھیں کچھ پتہ ہے ؟"

"کاہے کا ؟"

"اس دن کا !"

"اس دن کا؟"

پوچھنے والا حیران ہوا۔ پھر اس نے اپنے آس پاس کھڑے لوگوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جواباً سب نے لاعلمی میں شانے اچکائے اور سب کے بعد اس نے بھی شانے اچکاتے ہوئے آواز لگانے والے سائل سے پوچھا۔

"کس دن کا؟"

"افسوس... تمھیں بھی نہیں معلوم"

مایوسی سے اس نے سر جھکا لیا پھر آہستہ سے بولا۔

"قسم ہے اس زمین کی، اس زمین کے باپ کی اور اس باپ کے پیدا کرنے والے کی، تم سب گھاٹے میں ہو"

"گھاٹا؟"

اور پھر چاروں طرف اسی ایک لفظ کا ورد ہونے لگا۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

پھر اس بھیڑ میں موجود کسی آفس کے چپراسی نے سہمے سہمے لہجے میں آواز لگانے والے سے پوچھا۔

"باوا۔ اپن کچھ بولینگا"

آواز لگانے والے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر سر کی خفیف سی جنبش سے اسے اجازت دی۔

"اپنا کلیان ہو جائے گا۔ سچی بولتا۔ بس ایک بابا بتاؤ بابا اپنا....." چپراسی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قہقہے ابل پڑے۔ قہقہوں کی آواز سنتے ہی ادھر ادھر سے کچھ اور لوگ اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ چپراسی نے خجالت اور خفگی سے مجمع کو دیکھا اور بھیڑ سے نکل گیا۔

"سچ کہتا ہوں تم سب خسارے میں ہو۔ میری طرح کیوں کہ تمھیں بھی نہیں معلوم!"

"کیا نہیں معلوم؟" ایک سوٹ بوٹ والے جنٹلمین نے اس سے سوال کیا۔

"وہ دن! جس کا ہمیں علم نہیں!"

"کون سا دن؟ ہم تو بہت سے دنوں کو جانتے ہیں۔ ایسٹر، نیو ایئر، ہولی، دیوالی، عید، بقرعید، پیپے ٹی، بینک ہالی ڈے"

"کون ہو تم؟"

سوال کرنے والے نے پھر اک نیا سوال کیا، کسی قدر کرخت لہجے میں۔

"ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی؟ کون ہو تم؟"

اس کے لہجے سے وہ شخص قدرے سٹپٹایا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں۔۔۔ میں ۔۔۔ پار۔۔۔۔سی ہوں۔"

سوال کرنے والا ایڑیوں پر گھوم گیا اور مجمع سے مخاطب ہوا۔

"تم سب غور سے سنو۔ ہم نے غلط دنوں کو حافظے میں جگہ دے رکھی ہے۔ وہ دن ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ جاؤ مندر، گرجا اور اگیاری میں اور پوچھو اس دن کے بارے میں جسے جاننا ضروری ہے!"

"تم جانتے ہو۔۔۔؟"

اطمینان بھرے لہجے میں کسی نے اس سے پوچھا۔ اس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی مولوی نما فرد تھا۔ ممکن ہے مولوی ہی ہو، چھوٹی موری کا پاجامہ، اس پر شیروانی پہن رکھی تھی اس نے۔ چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔ خط تازہ بنا ہوا لگ رہا تھا۔ آواز لگانے والا اس کی طرف بڑھا۔

"تم نے کچھ کہا؟"

"ہاں بھائی۔ میں نے پوچھا تھا، تم جانتے ہو اس دن کو؟"

"جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ پر یہ تو بتاؤ۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔؟"

"آدمی ہوں!"

"اس دنیا میں آدمی سبھی ہوتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"سنا ہے یہاں ہندو، عیسائی، یہودی اور مسلمان ہوتے ہیں۔"

"آدمی دلچسپ ہو، چلو مان لیا۔ میں آدمی نہیں مسلمان ہوں، پھر؟"

"پھر یہ کہ مجھے تمھاری تلاش تھی۔"

"ہوں!"

"ہاں کسی مسلمان کی!"

"کیوں، یہ خصوصیت کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے یہ سوال تمھاری کتاب سے ملا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"سوال کا پوچھتے ہو یا..."

"کتاب کو تم کیا سمجھو گے"

"ٹھیک کہتے ہو۔ اسے سمجھنے کا حق صرف تمہارا ہے! اسی لئے میں تم سے جاننا چاہتا ہوں بتاؤ وہ دن کون سا ہے جس دن اس کائنات کو پیدا کرنے والا تم سے راضی ہوا تھا۔ اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں تمام کی تھیں۔ سنا ہے اس دن تمہارا دین بھی مکمل ہوا تھا۔"

مولوی نما شخص کی آنکھوں میں حیرت کے سائے اتر آئے۔ پیشانی پر شکنیں ابھریں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سائل نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"جانتے ہو۔؟ اس روز کسی نے کہا تھا کہ ... آج کا اعلان تمہاری اپنی خواہش کا اظہار ہے۔ خدا کا حکم نہیں۔ اور اگر تم نے وہی کہا ہے تو میں اسے ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ اور ـــ وہ ہستی جو تمام عالمین کے لئے رحمت قرار دی گئی تھی، خاموش تھی۔ انحراف کرنے والے نے کہا تھا .... کہو خدا سے کہ مجھ پر عذاب نازل کرے! .... اور کہا تم جانتے ہو کہ جس ہستی نے ہمیشہ آتے ہوئے عذاب لوٹائے اور دعا کی کہ پالنے والے مجھے اتنا عزم عطا کر کہ میں انھیں سمجھا سکوں اور انھیں توفیق کہ یہ سمجھ سکیں .... لیکن .... اس روز اس رحیم نے عذاب کو ٹالنے کی دعا نہ کی۔ اس پر .... یعنی انکار کرنے والے پر ایک پتھر گرا اور وہ .... وہ مر گیا .... جانتے ہو اس دن کو۔ جس دن کا واقعہ میں نے بیان کیا ہے"

وہ جس نے سائل کو چھیڑا تھا سر جھکائے کھڑا رہا۔ بھیڑ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ جو سائل کو اب تک خبطی سمجھے ہوئے تھے ان کا اشتیاق جاگ اٹھا تھا۔ بھیڑ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اور شیروانی والا کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجمع میں سے کسی منچلے نے شیروانی والے کو مخاطب کیا۔

"بتاؤ ملاجی ـــ آپ ہی بتاؤ .... اپن کو تو کچھ معلوم نہیں"

"یہ .... یہ .... آدمی...."

شیروانی والے نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن سائل اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"میں پاگل ہوں خبطی ہوں .... یہ غلط ہے میرے بھائی"

شیروانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سر جھکا لیا۔ اس نے سنا۔ سائل کہہ رہا تھا۔

"یہ غلط ہے کہ میں پاگل ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں پاگل ہوتا جا رہا ہوں اور یقین کرو اگر یہی طور طریقے رہے تو ایک دن ہم سب پاگل ہو جائیں گے۔

چند لمحوں کے لئے پھر خاموشی چھائی پھر مولوی نما شخص نے مجمع سے نکل جانے کی کوشش کی تو سوال کرنے والے نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پلٹا، نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر حقارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا۔

"اب کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس دن کا پتہ!"

"تاریخ میں کئی اہم دن محفوظ ہیں، جنتریاں بھری ہوئی ہیں!"

"پھر تمھیں ضرور معلوم ہوگا، بتاؤ، خدا کے لئے بتاؤ کہ میں پاگل ہونے سے بچ جاؤں۔ بتاؤ وہ کون سا دن تھا جب تمام نعمتیں نازل ہوئی تھیں اور کسی نے عذاب مانگا تھا!"

"مگر یہ مسئلہ کیا ہے؟ تم دیکھ رہے ہو ہم آگ میں جل رہے ہیں اور تم اس دن کو ڈھونڈ رہے ہو!"

"اس آگ سے ہم کہاں تک بچ پائیں گے۔ یہ آگ برسوں پہلے خود ہم نے لگائی تھی۔ تمھیں یاد ہوگا برسوں پہلے ہم نے کسی کا گھر جلایا تھا کسی محترم خاتون کی پسلیاں توڑ دی تھیں اور پہلا قدم اٹھانے کی خاطر چوتھی منزل پر کمند ڈالی تھی .... یاد ہے .... ؟ وہی آگ آج بھی ہمارا پیچھا کر رہی ہے اور اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو اس دن کا پتہ چلاؤ جب تمام نعمتیں نازل ہوئی تھیں ...

"مجھے معلوم ہے وہ دن کون سا ہے؟"

شیروانی والے نے حتمی انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"سچ ـــ؟" سائل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں مجھے معلوم ہے!"

"تو پھر بتاؤ مجھے .... ان سب کو، جہاں تک تمھاری آواز پہنچے۔ خدا کے لئے بتادو کہ یہ آگ ہمارا پیچھا چھوڑے۔ ہم عذابوں سے محفوظ رہیں اور نعمتیں ہم پر اتریں۔"

"افسوس .... میں نہیں بتا سکتا کیوں کہ میں جانتا ضرور ہوں اس دن کی بابت لیکن مانتا نہیں اس دن کی اہمیت کو!"

"گویا تم بھی اپنے لئے عذاب مانگتے ہو!"

"میں ہی کیا سب .... سب۔ میرا مطلب ہے سب ہی۔"

دھوپ تیز ہو چلی تھی لگتا تھا سورج سروں پر آن رکا ہے۔ وہ شاید دم لینے کو رکا تھا اور کسی نے عین اسی لمحے ٹرانسسٹر آن کر دیا تھا۔ اناؤنسر کی آواز ابھری۔

"آخر میں آپ پھر ایک مرتبہ خبروں کا خلاصہ سماعت فرمائیں۔

میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا

پاکستانی حزب اختلاف نے اعلان کیا ہے کہ برسر اقتدار طبقہ کے مظالم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بیروت میں نہتے فلسطینیوں پر فلنجسٹوں اور اسرائیلی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔

ایران عراق جنگ میں ہزاروں سپاہی مارے گئے ہیں اور ہنوز جنگ جاری ہے۔

روس نے افغان مجاہدین کے مطالبات ٹھکرا دیئے۔

اسرائیل نے بیروت میں اپنی خونریز کارروائی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے سلامتی کونسل کے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔□

راھے فدائی
بی ۔ایس ۔اے ۔کالج ، ویلور ۶۳۲۰۰۴

کچھ تو آخر سوچنا ہے !!

بند مٹھی میں ہے دست ناتواں کے
عظمت و تقدیس رفتہ کی نشانی ! زرد چنگاری
شدت احساس کے باعث
ذرۂ خورشید کرہ آتشیں صورت
زخمہائے اندروں میں شعلہ زن ہے !
شش جہت کی انگلیوں سے اک رہے ہیں قہقہے
اف ! تعفن آشنا آب و ہوا
کاسۂ رعب و حمیت کی گرفت
مضمحل ہونے لگی !!
ہاں ! تو کیا
بند مٹھی کھول دیں
اس شرارہ جاں گسل کو پھینک ڈالیں
عظمت و تقدیس کی واحد علامت
ذمۂ نابود کر دیں
دولت نایاب خاک آلود کر دیں
کچھ تو آخر سوچنا ہے !!!

ظہر الفساد....

فساد بحر و بر سے چشم عبرت وا نہ ہوگی ؟
دراں حالیکہ اس نے
(وفور انسیت میں) ظالم و جاہل پکارا تھا
مقام مور اونچا
وقار زاغ اعلیٰ
نگاہ دہر میں احسن سگ و خنزیر ٹھہرے ہیں !
فساد بحر و بر سے چشم عبرت وا نہ ہوگی ؟
دراں حالیکہ اس نے
(مکمل ذمہ داری سے) شرف بخشا ہے اپنی جانشینی کا
مگر جاہل !
محبت کی غلط تعبیر کرتا ہے
خود اپنے ہاتھ سے دوزخ بناتا ہے !

معجزہ

ایک قاتل
مشک و عنبر میں لہو حل کر رہا ہے
تاکہ دنیا
یہ گواہی دے سکے
اس نے جو کچھ کر دکھایا
معجزے سے کم نہ تھا

آصف فرخی

بوڑھی کہانی

صرف بوڑھی عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔

ایک شہر تھا جو دنیا کے سرے پہ پہاڑوں کے بیچ واقع تھا۔ اس پر سے آگ اور لہو کے دریا گزر گئے۔ لکھوکھا موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ شہ زور مرد قتل ہوئے، ننھے بچوں کے حلق پہ چھریاں پھریں اور عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالی گئیں۔ شہر کی آبادی کچھ بھاگ گئی، کچھ لوگوں نے جان بچانے کو تبدیلیٔ مذہب اختیار کی اور کچھ غلاموں کی طرح بذریعۂ نیلام فروخت کئے گئے۔ کوچہ بازار کے علما و فضلا اور مضراب بجانے والوں اور داستان سنانے والوں کے لئے شہرت یافتہ تھے ویران ہوئے، گلیاں جن میں مہر و ماہ کا کٹورا بجتا تھا ان میں خاک اڑنے لگی۔ عبادت گاہوں میں ناقوس کی جگہ گدھے کے رینکنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ بے کفن لاشیں گلیوں میں پٹی پڑی تھیں، کوئی اتنا نہ تھا کہ ان پر کلمہ پڑھتا۔ گدھ اور کوے اور مردار خوار ایسے پیٹ بھرے ہوئے کہ لاش پر منہ مارتے اور چھوڑ دیتے اور گیدڑ مُردے کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبا لیتے، باقی چھوڑ دیتے۔ مکانات ڈھا کر زمین کے برابر ہوئیں۔ جو زندہ بچے وہ قافلے بنا کر بھاگ نکلے، جو رہ گئے ان میں سے مردوں کو قتل کر ڈالا گیا اور حملہ آور چار سے چالیس سال تک کی عورتوں کو ہنکا کر لے گئے۔

تاخت و تاراج شہر میں باقی رہ جانے والی سٹھیائی ہوئی بڑھیاں، لاٹھیاں ٹیکتی، گٹھریاں سنبھالتی، گھسٹتی رینگتی کھانستی کھنکارتی کانپتی کراہتی چیختی چلاتی سڑی بسی بڈھی نانیاں دادیاں۔

پہلے پہل انہیں پوری طرح اندازہ نہ ہو سکا کہ ہو کیا گیا۔ بھیجے بھجے کوستی کاٹتی اِسے اُسے برا بھلا کہتی دبکتی جھکتی پاندان کھولے پان لگاتی، چوکی پہ بیٹھی چھالیا کترتی رہیں دو پٹوں پر چکا اور ہانڈیوں میں پیاز کا بگھار لگاتی رہیں۔ بہت سے بہت یہی سمجھا ہوگا کہ دنیا کو اپنے سر پر اٹھانے والی گائے نے سینگ بدل لیا ہے۔ بلبے دالانوں میں سفید چاندنیاں بچھا کر انہوں نے مرنے والوں کی فاتحہ دلوائی۔ سر ڈھک کر دعائیں مانگیں، چنے بتاشے پڑھے گئے اور پڑھے ہوئے سپاروں کا

ایک طرف کوڑھیر بن گیا۔ حاضرین سے عاری محفل میں اگر کی بتیاں سلگ سلگ کر خوشبودار دھوئیں میں تحلیل ہوتی رہیں۔ فاتحہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جانے کے بجائے وہ ایک ایک کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

لوگوں سے خالی تباہ حال شہر میں بچی کھچی یہ سٹھیائی ہوئی لاوارث بڑھیاں جو گم شدہ تعبیلوں کی طرح بھلادی گئی تھیں، سردی اور سونے پن کے ہراس میں اور نزدیک سمٹ آتیں۔ بے چراغ عمارتوں میں یہ خبط الحواس بڑھیاں موم بتیوں کی طرح معلوم ہوتیں، ایک سانچے کی بنی، ایک ہی مٹی کا خمیر، وہی بہت قافلوں اور لشکروں کے روندے ہوئے میدانوں جیسے جھریائے چہرے، ایک سے حلیے۔ آڑے تنگ پاجامے کلیوں والے کرتے اور ڈھائی گز کے دوپٹے جو سروں کو ڈھانپتے کندھوں پر پڑتے۔ سفید آنکھوں سے نہ جانے کیا تکے جاتیں، آپ ہی آپ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتیں اور چپکے چپکے دعائیں مانگتی رہتیں حتیٰ کہ ان کا سارا وجود ایک دعا بن جاتا، جو مر چکے تھے ان کے لئے فاتحہ اور ان کے لئے بھی جو پیدا نہ ہوسکے۔ وقت گزارنے کے لئے پرانے غراروں شلوکوں پر سے گوٹا ادھیڑنے لگتیں یا ہار سنگھار کی ڈنڈیوں سے زعفران رنگ بنانے لگتیں، بے خواب لمحوں کی لمبی جگار میں ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتیں، کبھی لگتا کہ رات کی آخری بس کھڑکھڑاتی چلی جا رہی ہے، کبھی غنیم لشکروں کی آمد سنائی دیتی اور کبھی گلیوں کی خاموشی کو مسافروں سے خالی رکشے توڑتے ہوئے سنائی دیتے۔ کبھی وہ ایک دوسرے کی غم گساری کرتیں، کبھی آپس میں جوتا چلنے لگتا۔ ذرا ذرا سی بات پر تیوریاں چڑھ جاتیں اور مٹھی میں بال پکڑ کر کھینچ ڈالتیں "بالزادی قطامہ قلماقنی شتفتل نامراد گیسو بریدہ ....." خوب گالیاں کوسنے دہرائے جاتے، برتن اٹھا کے دے مارتیں، جوتیاں اچھالتیں، دستی پنکھے سے پیٹ ڈالتیں اور لڑ بھڑ کے پھر مل بیٹھتیں، پان کی گلوریاں بنا بنا کر دینے لگتیں کہ ایک دوسرے کے علاوہ ان کا بچا ہی کون تھا۔ اور گلوریوں کی پیک تھوک تھوک کر بہت چاؤ سے اپنی گزری باتوں کے پٹارے کھولتیں، یادیں تازہ کر کے ان کی بازطلبی کرتیں ..... اپنے حالات، گزرے واقعات، پرانے در و دیوار، پرانی محبتیں، پرانی عادتیں، بیتی چیزیں .....

مدت بعد لوگ لوٹنے لگے، شہر میں آبادی کا نقشہ کھنچا، گلی کوچے پھر چہروں سے آباد ہوئے ان میں سے کچھ وہاں کے پرانے باسی تھے جو لوٹ آئے تھے، کچھ کو آباد ہوتے ہوئے شہر کے نت نئے مواقع کھینچ لائے اور جو اس شہر میں آئے تھے ان میں سے بعض نیکوکاری و راستی سے بھٹک گئے

تھے اور بعض کو اداسی نے جا پکڑا تھا۔ اور ان ہی میں سے بعض ایسے بھی تھے جن سے ان بڑھیوں کی کیس دور پسے کی عزت داری نکلتی تھی۔ خس و خاک سے اپنی تعمیر میں معروف شہر میں کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ان بڑھیوں کا کیا کیا جائے پپ لپ کرتی کپکپاتی پسی ہر رہ بڑھیاں، ایک پاؤں قبر میں لٹکائے ہوئے پھر بھی اپنی باقیماندہ زندگی سے پوری حریفانہ قوت کے ساتھ چمٹی ہوئی۔ کسی کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے رشتے داروں نے بھی انکار کر دیا کہ وہ ناخوشگوار گزرے ماضی کی ان پھیری پھیپھری میری غلیری صورتوں میں کہاں تک مغز کھپاتے۔ سب ایک جہانِ تازہ کی بنیاد ڈال رہے تھے، وہ ان خبطی بڑھیوں کا کیا کرتے۔ آخر کار شہریوں کی کاؤنسل نے ان کی عمر اور لاچاری پہ ترس کھا کر انھیں اصطبل نما ایک پرانی عمارت الاٹ کر دی حالانکہ اس طرح انھیں وہاں کا بچی ہاؤس جیسا مفید ادارہ بنانے کا منصوبہ ترک کرنا پڑا، مگر وہ اپنے ماضی کو اس کا جائز مقام دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا شہر بھر کی ساری پرانی دھرانی بڑھیاں نکل پڑیں جیسے موسم بہار کی صفائی میں کونے کھدروں سے کاٹھ کباڑ اور گودڑ نکالا جاتا ہے، اور اس عمارت میں یوں جمع ہو گئیں جیسے بربادی کے دنوں میں ہوئی تھیں۔ پہلے پہل وہ تیرے میرے گھروں میں گھستی پھریں کہ کوئی انھیں رکھ لے، ہر ایک کی تھوڑیوں میں ہاتھ ڈالنے لگیں کہ اے بٹوا بس ذرا سا کونہ اتنی سی جگہ کہ میری پٹاری اور جائے نماز سما جائے، دعائیں دوں گی..... لیکن پیر تسمہ پا کو کون جانے بوجھے گلے منڈھتا اور کہاں سے ان کے لئے وہ سب کچھ فراہم کیا جاتا جس کی ضرورت نئی زندگی کی تعمیر کرنے والے نوجوانوں کو تھی۔ چنانچہ شام گئے باڑے لوٹنے والے ڈھور ڈنگر کی طرح وہ اس عمارت میں بھر گئیں اور شہریوں کی کاؤنسل کو ہاتھ پھیلا پھیلا کر کوسنے لگیں "مولا کی تیغ ٹوٹے، بجلی گرے۔ قبر بجو گھسیٹیں۔ ہیضہ سمیٹے انھیں، الٰہی ہمارا صبر پڑے، اپنے پیاروں کو روئیں....." اور اتنا چیخنے پیٹنے سے گلے بیٹھ گئے تو اپنے لئے پان بنانے لگیں۔ پان کھاتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے اپنی مشکلیں اور پریشانیاں اور اپنی اپنی افتاد کہنے لگیں، اور اب ان کے مسائل متداول سے ارتفاع حاصل کر کے مکاشفانہ ہو گئے تھے، وہ دور دیس کی باتیں سنائیں اور بیتے دنوں کی، رفتہ و گزشتہ کو دھیان میں لائیں، ان طور طریق کا ذکر کرتیں جو اب متروک ہوتے اور ان لوگوں کا گمان جو کھوئے گئے.....

رات گئے ان میں سے کوئی جاگ اٹھتی اور پکارنے لگتی "آئیں بوا کہانی کہیں؟ ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانہ چڑا لایا چاول کا دانہ، دونوں نے مل کر پکائی کھچڑی، اور کھچڑی

جو بیٹھے تو اس میں گمی نہیں، چڑیا بولی..... اور کہانی کہیں؟ ایک تھی شہزادی، نام اس کا چنج پھلا بادشاہ زادی، روز صبح سویرے نہار منہ پانچ پھولوں میں تلتی تھی، پورے پانچ پھول نہ ایک کم نہ ایک زیادہ، کیا مجال کہ پانچ سے چھٹا پھول چڑھ جائے، تھی بھی پھولوں سی کہ ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا..... سنتی ہو کہ سو گئیں؟"

کوئی ہنکارہ نہ بھرتا تو کہانی رک جاتی اور بڑھیا آہستہ سے پوچھتی "اے سب سو گئے؟"

سب سو گئے۔

کسی کو خیال آتا کہ اے بیوی آج تو ساون کو جی چاہتا ہے۔ جہاں پھوار پڑی اور دس بوندیاں گرنے لگیں ساری گوئیاں اکٹھی ہو گئیں۔ گھٹائیں جھوم رہی ہیں، کوئل کوک رہی ہے، آم میں جھولے پڑ گئے، کڑھائیوں سے پکوان اترنے لگے، جھولوں میں پینگیں بڑھ رہی ہیں، کوئی ملہار گاتا ہے کوئی ساونیاں کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری ساون آیا..... اور بسنت کس دھوم سے منتی تھی۔ جانیں اب بھی کوئلیں کوکتی ہوں گی کہ نہیں، لڑکیاں بالیاں گیتوں میں بھیا باوا کو یاد کرتی ہوں گی کہ نہیں، اب بھی آتے ہوں گے ساون اور بسنت؟" پھر نیند بھری آواز میں کوئی اپنی جیسی خستہ حال ماما اصیل پھوپھو اناٹمغلانی کو ہدایات دینے لگتی کہ اچھی دیکھنا فرش چاندنیاں بچھواؤ، آنگن میں چھڑکاؤ کرواؤ، عطر کی پھریریاں ہوں اور خاصدان آئے، پان کے بیڑے تیار رکھو، جیسے ہی کہار آواز دیں اور بی بیاں سے اترنے لگیں گلاب پاش سے عطر گلاب چھڑکنا اور دسترخوان قرینے سے بچھا کر کھانے چن دینا نرگسی کوفتے اور گاؤزبان اور شب دیگ اور تنجن اور شاہی ٹکڑے.... اے کہاں غارت ہو گئیں سب کی سب، کون زمین نگل گئی کون آسمان مٹا گیا؟ اب کہاں وہ انجمن وہ بزم کی رونق، محفلوں کی آرائش، وہ مہندی لگے ہاتھ، کاجل رچی آنکھیں، ہونٹوں پہ لاکھے، دانتوں پہ مسی کی دھڑی، میدہ شہاب رنگ، ہاتھوں میں چوڑیاں، پیروں میں پائل ماتھے پہ جھومر، کہاں ہیں وہ لب کے مصری کی سی ڈلیاں اور بول کے امرت کے سے گھونٹ؟"

سب کھو گئے

کوئی اور بوڑھی عورت نیند سے چونک پڑتی اور یاد کرتی کہ وہ شہر پناہ وہ قلعہ اور باغ اور باؤلی کہاں گئے۔ وہ کیا ہوئے بڑے بڑے جھاڑ فانوس کنول طاق میں جلتے چراغ، طلائی شمعدانوں میں کافوری شمعیں، وہ آبدار خانے چاندی کی ٹھلیاں برنجی صراحیاں، کیا ہوئے وہ دیوالی کے دیئے، شب برات کا حلوہ اور آتش بازی کے انار، عید کی سویاں اور عیدی کا سوانگ

علم تعزیے، ضریح اور دلدل کے قدموں کے نشان، بی بی کا کونڈا، مشکل کشا کا آسرا، دعاؤں میں اثر دلوں میں چین زمین پہ فراوانی..... وہ امام ضامن، نیاز، منتیں، عرس، وہ قبروں کی چادریں وہ باپ دادا کی قبریں، آبائی مکان، گھر کے پیڑ، بزرگوں کی ہڈیاں، وہ شہروں کی گلیاں، تکیوں کی رونق، تیر تیوہار چوک کی بہار، پھول والوں کی سیر، سلطان جی کی سترھویں آٹھوں کا میلہ، میلے ٹھیلے وہ سہرے کی لڑیاں، کلائی کا کنگنا، شگون کی مٹھائی، نقل، وہ نوبت نقارہ، ڈھولک تاشہ، منڈھا، وہ سانچق بری، چوتھی چالے دولہا کے شہ بالے..... کہاں گئے وہ مہندی ابٹن صندل، وہ رسمیں وہ زمانے وہ ہر شے میں نظم کی سی بندش۔

سب مر گئے

مردہ ماضی کے کھنڈر پر بستے نو آباد شہر میں جمع یہ باسی تباسی سوکھی سڑی مرگھلی کبڑی چندھی بڑھیاں اپنے زمانوں کا یوں ذکر کرتیں جیسے گزرا ہوا وقت وہ روایات کا گم شدہ شہر ہو جو دور ابتدا میں ذلت اور گمراہی سے بچنے کے لئے جھیل کی تہ میں بیٹھ گیا تھا کہ زیر آب ان کو بہتر زیست ملی اور پاک تر، بہ نسبت اس کے جو زمین پر تھی اور موسم گرما کے ایام الراس السرطان میں کبھی کبھی چند منتخب لوگ جس کی گم شدہ کلیساؤں کی گھنٹیاں سن سکتے ہیں اور پانی کے نیچے شہر کے چراغ جھلملاتے دیکھ سکتے ہیں۔

یہی بڑھیاں اس قبیلے کی طرح تھیں جس کے چند گنے چنے افراد باقی رہ گئے ہوں کہ ان میں سے کوئی مرجائے تو اس کے ساتھ وقت اور تاریخ کا ایک اچھوتا جزو ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ ساری انہونی باتیں پہاڑوں کے بیچ واقع ایک شہر میں ہوئیں جو دنیا کے ایک سرے پر تھا۔ ☐

● عرصے کے بعد آج اچانک "الفاظ" کا مجنوں گورکھپوری نمبر موصول ہوا تو یاد آیا کہ الفاظ کی ہم سے بھی آشنائی ہے۔ ورنہ یہی شمارہ مہینہ بھر پہلے شبنم مناروی سے مستعار لے کر پڑھ چکا ہوں۔

"الفاظ" کے تازہ شمارہ میں ایک صاحب نے جوش کی یادوں کا جنازہ نکالا ہے۔ اگر انھوں نے جوش کا خاکہ لکھا ہے تو خاک ڈالی ہے۔ احوالِ واقعی لکھا ہے تو جوش کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ اگر یہ مضمون ہے تو خام بندھا ہے۔ رپورتاژ ہے تو سفر کی شرط اور قلم کی طلب پوری نہیں کی گئی جوش جو کچھ تھے ان سے زمانہ آگاہ رہا۔ جو کچھ کہتے تھے، سُن لیا کرتے تھے۔ انھیں پاکستان نے قبول کر لیا تھا مگر انھوں نے پاکستان کو قبول نہیں کیا تھا۔ ورنہ جو کچھ وہ کہا کرتے تھے اور لکھا کرتے تھے، کوئی اور ہوتا تو پاکستان میں اسے پھانسی دی جا چکی ہوتی۔ انھیں جو مراعات ملتی تھیں، وہ لیتے بھی تھے اور ناشکری بھی کرتے تھے۔ "یادوں کا جنازہ" لکھنے والے نے انھیں پاکستان کی "مسموم فضا" میں ایک معصوم پرندے کے طور پر پیش کیا ہے اور اس بات سے ادب کا ہر قاری واقف ہے کہ وہ کتنے معصوم تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اقبال کو گالیاں دیں۔ اقبال سے علمی و ادبی یا سیاسی یا کسی بھی دوسری نہج کا اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان کی شاعرانہ حیثیت پر بھی دوبارہ نظر ڈالی جا سکتی ہے مگر جوش کا یہ کہنا کہ "ایک اقبال پنجاب میں کیا پیدا ہو گئے، سر علامہ اقبال بن گئے، اور میں کہتا ہوں ہمارے لکھنؤ میں باورچی ٹولہ اور نخاس کی گلیوں میں ہزاروں اقبال اب بھی مارے مارے پھر رہے ہیں" جوش کی صوبائی عصبیت کا عکس ہے۔ اگر زندگی میں ان کے ساتھ کہیں پنجاب میں کوئی سماجی یا ادبی زیادتی ہوئی بھی ہے (جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے) تو اس کا بدلہ انھیں اقبال سے نہیں لینا چاہیے۔

ان کے اصل جملے تک رسائی نہیں۔ نہ معلوم یہ بات انھوں نے کہی یا مصنف نے زیبِ داستاں کیا ہے لیکن اگر یہ جوش نے کیا ہے اور مصنف نے اس سے ان کی کسی عظمت کا کوئی مینار بلند کرنے کی کوشش کی ہے تو افسوس کہ خاکہ نگار یا مضمون ساز کو ناکامی ہوئی ہے۔

اب ذرا اس جملے پر غور کیجیے جو اوپر واوین میں درج کیا گیا ہے۔ اس میں جوش اقبال کی شاعری پر نہیں، سماجی مرتبے پر پھبتی کستے نظر آتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو اس جملے کی ساخت سے حسد کی بو ضرور آ رہی ہے۔

اسی مضمون میں "مضمون گھڑ" نے جوش کے دو تین واقعات ان لوگوں کے بھی لکھے ہیں جو انکی

موجودگی میں ملنے آیا کرتے تھے اور جن سے جوش آمد پر تپاک سے ملتے تھے اور جن کے چلے جانے پر ان ملاقاتیوں کی بھد اڑایا کرتے تھے۔ اس کردار کے آدمی کی شخصیت کے جھول خود اسی مضمون میں نظر آرہے ہیں۔ افسوس مصنف نے انھیں خوبیاں بنا کر پیش کیا ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے اچھے اوصاف پر تضحیک کی روشنائی ڈالی ہے۔

اقبال کا پنجابی ہونا ایک زمانے سے کھٹکتا چلا آرہا ہے اور صرف اسی بات پر یار لوگوں نے زبان و بیان سے لے کر صنعتوں اور سکتوں کے حربوں سے ہر بار اقبال کو نشانہ بنایا ہے مگر دوسری طرف خود صاحبانِ کمال اہلِ زبان شعرا کے ہاں بھی فاش غلطیاں ملتی رہی ہیں، جنھیں اب سند کا درجہ حاصل ہے۔ جوش کی وفات پر مرحوم حفیظ جالندھری کا بیان جوش جیسی عصبیت کا پرتو تھا۔ یقیناً یہ قابلِ تحسین بات نہیں۔ اقبال، جوش اور حفیظ تینوں مر چکے ہیں مگر یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ جوش اور حفیظ ایک ہی سطح ذہنی کے مریض تھے۔ اقبال کا ان دونوں میں سے کسی سے کوئی تقابل نہیں۔

میں یہ بات پھر دہراؤں گا کہ اقبال یا جوش یا کسی بھی تیسری شخصیت سے کوئی سا بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر جوش کی ذہنی حالت کو دیکھے بھالے یا سمجھے بغیر اس کے بیانات کو ادبی اعتبار بخشنا کوئی قابلِ قدر کارنامہ نہیں۔ اس مضمون کے مصنف کو جوش سے کسی بھی رنگ میں عقیدت ہو سکتی ہے مگر آپ ایک ذمہ دار مدیر کی حیثیت سے اس طرح کے مضامین کو جگہ دے کر ادبی فضا کو الٹ پلٹ کرنے میں خام فکر لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

میں اس بات کو افتخار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوش کو جو کچھ پاکستان میں ملا، ہندوستان میں کبھی نہ ملتا۔ جو لوگ ان کی رہائش اور دیگر مراعات سے آگاہ ہیں، وہ تائید کریں گے کہ سرکاری طور پر وہ بہت سی سہولتوں سے بہرہ اندوز تھے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں اور میرے اس دعوے کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ ہندوستان کے معیار زندگی کے پیشِ نظر انھیں تنگدستی یا کم از کم قناعت سے رہنا پڑتا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ پاکستان کی ہمیشہ تضحیک کیا کرتے تھے۔

میں خواہش رکھتا ہوں کہ میرے ان جذبات کو من و عن پیش کیا جائے۔ مجھے جوش سے کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی ادبی حیثیت معلوم ہے، ان کے کردار سے سب لوگ آگاہ ہیں۔ ان کی سماجی زندگی ان کے خطوط اور تالیفات میں منعکس ہے۔ جوش کے اقبال کے بارے میں منفی تاثرات ظاہر کرنے پر بھی اقبال کا قد نہیں گھٹ سکتا، جس طرح حفیظ جالندھری کے بیانات سے جوش کی شخصیت زائل نہیں ہو سکتی مگر ان "مڈل مینوں" کو جو ان غیر ذمہ دارانہ بیانات سے خوشی ہو رہی ہے، اسے ہوا دے کر ان کے بچکانہ جذبات کو "الفاظ" کی زینت نہ بنائیے یا کم از کم "الفاظ" کی رائے کا حاشیہ ضرور دیجیے۔ اقبال ہندوستان میں اگر بے وقعت ہو گیا ہے تو پھر کھل کر سامنے آئیے۔

طارق جامی، ریاض، سعودی عربیہ

ہمیں افسوس ہو کہ آپ کو ہماری نیت پر شبہ ہوا۔ ہندوستان میں اقبال کو ایک بلند مقام حاصل ہے کیوں کہ یہاں اقبال کے نام سے کوئی "سیاسی مفاد" وابستہ نہیں ہے۔ ہم لکھنے والوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اسے بلا کاٹ چھانٹ شائع کرتے ہیں اس کا ثبوت آپ کا یہ خط ہے۔ (ا۔پ)

● یار، ستم ہے لٹ گئے ہم؛
بمبئی نے علی گڑھ سے شہریار کو لوٹا اور علی گڑھ والے اطہر پرویز نے مجھ بمبیا کو لوٹا۔
طرز تحریر لٹ گیا اور بہتر ہاتھوں میں، نرم نرم گداز اور محنتی ہاتھوں میں جا پہنچا۔
اب میں سینہ کوٹوں (چھاتی پیٹوں) یا پوٹا ٹیک دوں، اختر انصاری پر اتنا اچھا، ایسا نفیس، دلنواز اور جامع مضمون نہیں لکھ سکتا۔ حالانکہ پڑھا وہی ہے جو آپ نے پڑھا ہوگا (ان کی معروف تصانیف میں سے)

الفاظ آج ہی آیا، آج ہی دونوں مضمون سمیت پڑھ ڈالا: وحید اختر + اطہر پرویز، لفظ لفظ پڑھا اور عش عش کرتا رہ گیا۔

پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔ میں نے ادب کا مطالعہ وغیرہ اور متفرق مضامین آپ کے دیکھے ہیں، بڑی سوجھ بوجھ کے تھے۔ مطالعے کی مشقت کے ساتھ تصنیف ہوتے ہوں گے، مگر ایسے؛ کہ ظاہرا وہی کہا جا رہا ہے جو پہلے سے اوروں کو معلوم ہے، بدیہی سی بات ہے، لیکن ذرا تم کر غور کرو تو بات کی دوسری تہہ بھی کھلتی ہے۔ تب لطف آتا ہے۔ بے تکلفانہ طرز بیان کی پرکاری پر نظر جاتی ہے۔

میاں، ہم نے یہ طرز خاص کا سرمایہ اپنے سینے کے بینک لاکر میں رکھ چھوڑا تھا، کبھی کبھار "لاکر" کھولا کرتے تھے۔ اب جو یہ مضمون دیکھا تو پتہ چلا کہ علی گڑھ کا ایک تالے والا ہمارے لاکر کی چابی بنا کر لایا، سرمایہ نکال لے گیا، اسے INVEST کر دیا۔ اصل مع سود موجود ہے، ٹک ٹک دیدم... چلو اچھا ہوا۔ سرمایہ ہلاک ہونے سے بچا۔ FLUID ہو گیا اور بڑھے گا فیض پہنچائے گا۔

پرچہ پہلے سے بھی دلکش ہو گیا۔ اب صرف یونیورسٹی، کالجوں کے اساتذہ کا رسالہ نہیں رہا۔ یقین ہے کہ سرکولیشن بھی بڑھا ہوگا۔

ظ، انصاری، بمبئی

● "الفاظ" مجھے پابندی سے مل رہا ہے جس کے لئے آپ کا بیحد ممنون و مشکور ہوں۔ اختر انصاری پر گوشہ مجھے بہت پسند آیا۔ یہ گوشہ نکال کر آپ نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ الفاظ کا یہ کارنامہ یاد رکھا جائے گا کہ اس نے زندگی میں بھولے بسرے لوگوں کی بابت اردو والوں کی توجہ تو دلائی ورنہ لوگ جیتے جی انھیں بھول گئے ہیں۔ افسوس کہ ہم کس قدر احسان فراموش ہیں۔

رضوان احمد، عظیم آباد ایکسپریس، پٹنہ

● "الفاظ" ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ اردو کے کسی بھی عاشق، اتنی دور بیٹھے کسی انسان کو اردو کے

یسے رسالوں کا کس قدر انتظار رہتا ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ ناروے تو یورپ کا ایسا دور دراز کا خطہ ہے جہاں "الفاظ" جیسے رسالوں کی شکل صرف خوش نصیبوں کے گھروں میں ہی نظر آجاتی ہے۔ آپ کی عنایت سے ان خوش بختوں میں میں بھی شامل ہو گیا ہوں۔ الفاظ پر دن بدن نکھار آتا جارہا ہے۔ آپ کی محنت اور کاوش کا ایک ایک صفحہ گواہ ہے۔

ہرچرن چاولہ، اوسلو، ناروے

● "الفاظ" کا مطالعہ چند برسوں سے کر رہا ہوں۔ اس عرصہ میں ہر شمارہ خوب سے خوب تر یا۔ پیش نظر شمارہ اختر انصاری کی علمی و ادبی شخصیت کا آفتاب بن کر دنیائے ادب پر طلوع ہوا جس ، تیز روشنی میں موصوف کی سرگرمیوں کا بھرپور جائزہ لے پایا۔ ان کا یہ شعر:

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو   مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

خصوصاً پسند آیا۔ عبدالصمد کا افسانہ "مکالمے اور مرحلے" موجودہ دور کا ترجمان ہے۔ حقیقت پر بنی اس قدر کامیاب افسانے کی تخلیق موصوف کا ہی محتاج تھی۔

شمیم عالم مصحفی، گریڈیہ (بہار)

● "الفاظ" برابر موصول ہو رہا ہے۔ مئی اگست شمارہ محترم اختر انصاری صاحب کے فکر و ن کا آئینہ دار ہے۔ اختر انصاری کی ہمہ جہت شخصیت اور علمیت کا اولین اعتراف الفاظ کے گراں قدر صفحات میں ہوا ہے۔ اختر صاحب کے فن میں پوشیدہ انسان دوستی (انسانوں کے مطالعہ کی روشنی میں) اور فن افسانہ کے تعین ان کے احساس ذمہ داری نے ان کو بلند سے بلند تر بنا دیا ہے۔ احساس سب رہے اعتراف اکثر کو۔

ڈاکٹر شکیل احمد، مئوناتھ بھنجن (اعظم گڑھ)

● ماہ اگست کا "الفاظ" ملا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ "الفاظ" جیسا معیاری رسالہ میرے وطن اور میرے آبائی شہر علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ "الفاظ" اردو زبان کا وہ تاج ہے جس میں معیاری اور تخلیقی نگارشات کے گرانقدر اور بیش بہا نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مجاز لکھنوی، فراق رکھپوری، جوش ملیح آبادی، احسان دانش اور ساحر لدھیانوی جیسے عظیم شعرائے کرام ہم سے بے وفائی رگئے۔ ترقی پسند تحریک کے خالق (اردو ادب میں) پروفیسر اختر انصاری رسم وفاداری کو اس عمر کی ختیاں جھیل کر بھی برابر نبھاتے چلے آرہے ہیں۔ سرورق پر ان کی تصویر "الفاظ" کی قدر و قیمت یں اضافے کی باعث ہے۔ پروفیسر وحید اختر کا مقالہ فکر انگیز اور حقیقت پر بنی ہے۔ باقی شعر و نظم سے متعلق فن کاروں نے اپنے اعلیٰ خیالات و نظریات سے الفاظ کو خوب نکھارا اور سنوارا ہے۔ سبھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رفیق شاہین، علی گڑھ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شائع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

۱۔ شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی ۲۔ مجھے بولنے دو ۳۔ اُردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم ۴۔ کارگر شیشہ گری۔ میر کا مطالعہ ۵۔ غالب۔ ایک مطالعہ۔
۶۔ سب رس۔ جدید اردو میں ۷۔ قلم کی کاشت ۸۔ اقبال اور عالمی ادب
۹۔ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۱۰۔ محمد اقبال ۱۱۔ سعادت حسن منٹو۔
۱۲۔ کلام نیرنگ ۱۳۔ بہار میں اردو تنقید ۱۴۔ سفر اپنی ذات کے اندر۔
۱۵۔ افسانوی ادب۔ ۱۶۔ پردۂ ساز

شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی • ڈاکٹر افضل امام • موڈرن پبلشنگ ہاؤس • تیس روپے

کتاب میں سب سے پہلے جوش کی حیات کو بلحاظ سنین پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کی حیات کے اہم واقعات، ان کے مختصر حالات اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے: بحیثیت فن کار جوش کی نظم نگاری، غزل گوئی، رباعی نگاری، مرثیہ نگاری، نثر نگاری پر علاحدہ علاحدہ باب قائم کئے گئے ہیں جن میں جوش کا ادبی مقام معین کیا گیا ہے۔

جوش پر جو ایک خاص مکتبۂ فکر کی جانب سے الحاد کا الزام لگایا گیا ہے، مصنف نے اس کتاب میں اپنے دلائل اور خود جوش کے بیانات اور اشعار سے اس کی تردید کی ہے اور جوش کے عقیدے کو واضح کیا ہے مگر فاضل مصنف اس بات سے بھی منکر نہیں کہ "جوش کی شخصیت بڑی پُر پیچ ہے اور سادہ بھی۔ وہ کبھی نشتر تہوں میں پوشیدہ نظر آتے ہیں اور کبھی خاک پر تڑپتے ہوئے"

نظم نگاری کے باب میں جدید نظم کی مختصر تاریخ اور جوش کی نظم گوئی کی نمایاں خصوصیات کا ڈاکٹر افضل امام نے بصیرت افروز محاکمہ کیا ہے۔

غزل گوئی کے باب میں مصنف نے جوش کی غزلوں کے نمائندہ اشعار پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کے یہاں جذبہ بھی ہے اور تخیل بھی، یہاں بھی ان کا تخلیقی ذہن قلب و نظر کی قوس قزح پیدا کر رہا ہے۔

رباعی گوئی کے باب میں مصنف نے رباعی کی تعریف اور مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے جوش کی رباعی گوئی پر اپنی فکری بصیرت کا اظہار کیا ہے اور جوش کی رباعیوں کو مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کرکے ان کی رباعیوں کے نمونے پیش کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ" اس صدی میں جوش سے بڑا اردو شاعری میں کوئی رباعی نگار شاعر نہیں ہو سکا۔

جوش کی مرثیہ نگاری ایک اہم باب ہے۔ اس میں مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ جوش نے تقلید سے گریز کیا ہے اور اپنے لئے الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے فکر اور اسلوب میں نئے نئے تجربات کئے ہیں۔

کتاب کا آخری باب جوش کی نثر نگاری پر ہے جس میں جوش کی نثر کے اقتباسات پیش کرکے ان کی نثر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسرے نقادوں کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے اور بڑے عالمانہ طور پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ وہ جہاں جوش کی نثر کی خوبصورتی اور اسلوب کی رومانیت کے قائل ہیں وہاں انھیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ وہ "یادوں کی برات" میں جہاں شخصی خاکے پیش کئے گئے ہیں وہاں اعتدال نہیں برت سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر مصنف "یادوں کی برات" کے ان نثری ٹکڑوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے جس میں زبان کی بے راہ روی اور ابتذال کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے تو تنقید کا یہ پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں ان رسائل اور کتابوں کی ببلوگرافی بھی دی گئی ہے۔ جن کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ جوش کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک وسیلہ ہے جس سے ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر اور زاویۂ فکر کی نشاندہی ہوتی ہے۔

— ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی

مجھے بولنے دو • رضوان احمد خاں • زیور پبلی کیشنز، باقر گنج، پٹنہ • قیمت: ۲۵/-

زیر نظر کتاب ان اداریوں کا مجموعہ ہے جو ممتاز صحافی اور ادیب رضوان احمد خاں نے وقتاً فوقتاً "عظیم آباد اکسپریس" میں قلم بند کئے۔ رضوان احمد خاں بے باک صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ حق گو اور بے باک ہیں اور یہ اداریے اس کا ثبوت ہیں۔ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس تحریر کی لذت میں ہمارے دل کی دھڑکن ہے: اور یہ بات تو ہم بھی کہہ سکتے تھے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ سچ بولنے سے زیادہ مشکل کوئی اور عمل نہیں — حقیقت یہ ہے کہ رضوان احمد نے یقیناً اس سچائی کی قیمت چکائی ہوگی — لیکن یہ بات بھی کچھ کم تسکین کی نہیں کہ ہر پڑھنے والا لبیک کہے گا۔

میں ایلیا اہرن برگ کے اس قول کو اکثر دہراتا ہوں کہ کسی ادیب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق پر قادر ہو جو ہمیشہ کے لئے ہو بلکہ اس کو ایسا ادب بھی تخلیق کرنا چاہئے جو خواہ ایک لمحے کے لئے ہی ہو لیکن اس ایک لمحے میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو"۔ قوموں کی زندگی میں ایسے لمحے بار بار آتے ہیں اور اس وقت ادیب کے حساس قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں صحافت اس کی

مدد کرتی ہے۔ رضوان احمد نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور یہ اداریے لکھے ـــ جنھیں یقیناً صحافت کے اعلیٰ ترین نصاب میں نمونے اور مثال کے طور پر پڑھانا چاہیے۔ میں رضوان احمد خاں کو مبارکباد دیتا ہوں اور اردو پڑھنے والوں سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب پر ایک نظر ڈال لیں پھر باقی کتاب کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اپنے آپ کو پڑھوائے گی۔ میں نے خود بھی ساری کتاب ایک نشست میں پڑھی اور اسی طرح احباب کو پڑھوائی ہے۔ رضوان احمد کا اسلوب تحریر دلکش اور صاف ستھرا ہے۔

ـــ اطہر پرویز

اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم ● محمد حنیف کیفی ● ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ● قیمت : ۶۰/۰۰

یہ ایک حقیقت ہے کہ نیا ادب عام طور پر اتنا اپنے مواد سے نہیں پہچانا گیا جتنا اسلوب اور تکنیک سے۔ لیکن ادب کے نقادوں نے اس فنی تنوع پر زیادہ توجہ نہیں دی کیوں کہ یہ کام دیدہ ریزی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ضخیم کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے : (۱) جدید اردو نظم میں تجربے اور ان کا پس منظر، (۲) انگریزی بلینک ورس : فن اور ارتقا، (۳) فری ورس : ہیئت اور تکنیک، (۴) اردو میں نظم معرا کی ابتدا، (۵) نظم معرا کا عبوری دور، (۶) آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، (۷) نظم معرا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ـــ ۶۰۰ صفحات کی اس کتاب میں موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ حنیف کیفی نے مغرب میں ان اصناف کے ارتقار کا جائزہ لیتے ہوئے ـــ اپنے کلاسیکی سرمایے کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا ہے اور ان کی فنی حیثیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ہمارے سامنے ان کا تاریخی پس منظر بھی آجاتا ہے۔ شعر و ادب کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ میں پروفیسر آل احمد سرور کی اس رائے کی تائید کرتا ہوں کہ "حنیف کیفی کا یہ علمی و ادبی کام اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔"

مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے اس کتاب پر پہلا انعام دے کر حق شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

ـــ اطہر پرویز

کارگہ شیشہ گری ـ میر کا مطالعہ ● ڈاکٹر حامدی کاشمیری ● ادارۂ ادب، سری نگر ● قیمت ۴۵/۰۰

میر تقی میر بلاشبہ عظیم شاعر ہیں۔ ان کا نام بڑے ادب اور احترام سے لیا جاتا رہا ہے اور ان کے بعد کے سخن شناسوں نے ان سے عقیدت کا اظہار کیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ میر کی شاعری پر بہت کم کام ہوا ہے۔ دراصل میر کی ضخیم کلیات چھ دواوین پر مشتمل ہے۔ میر نے ان دواوین کو جوں کا توں رکھا اور کبھی انتخاب کی زحمت گوارا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دواوین اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "بلند شش بغایت بلند و پستش بغایت پست"۔ جس میں پلڑا موخر الذکر کا ہی بھاری ہے۔ میر کے جو انتخاب ہوئے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے کلام میر کی طرف

زیادہ توجہ نہ دی کیوں کہ یہاں "دیوان غالب" کی طرح تیار شدہ مال نہیں ملتا بلکہ اگر کوئی کام کرنا چاہے تو اسے خود محنت کرنا پڑے گی۔ میر کے عقیدت مند شعرا کی کمی نہیں لیکن انھوں نے بھی میر کا تتبع محض ان کی لفظیات تک کیا ہے۔ جدیدیت کے نقادوں نے میر کی شاعری میں ذات کی شناخت کا تصور اپنایا۔ گویا انھوں نے میر کی شاعری کو آئینہ تصور کیا اور اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ میر کے واسطے سے اپنی شناخت کروانے میں لگ گئے اور وہ کام پھر بھی رہ گیا۔ میر اپنے عہد کی آواز تھے۔ ان کے یہاں روح عصر جگمگاتی نظر آتی ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ حامدی کاشمیری نے "میر کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے ترجیحی طور پر ان تنقیدی تصورات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے"۔ یہ اچھی بات ہے کہ انھوں نے مغربی تنقید کے اصولوں کو میر کی شاعری سے نہیں ٹکرایا جیساکہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ حامدی کاشمیری نے میر کا مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں اس کی تفہیم کی طرف قدم بڑھایا۔ میں اس مطالعے کے لئے حامدی کاشمیری کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ادب کے تمام حلقوں میں دلچسپی اور شوق سے پڑھی جائے گی۔

—اطہر پرویز

غالب — ایک مطالعہ • ممتاز حسین • انجمن ترقی اردو، کراچی • قیمت ./٧

یہ کتاب غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر شایع کی گئی تھی۔ ممتاز حسین اردو کے بڑے اور معتبر نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور اس کا ثبوت ان کے مختصر مضامین میں بھی نظر آتا ہے۔ زیر نظر کتاب غالب کے فکر و فن پر بحث ہے۔ اور اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ ممتاز حسین نے غالب کو بڑے غور سے پڑھا ہے۔ بقول جمیل الدین عالی "ان کی تنقید منفی تبصروں یا محض چست فقروں سے پروان نہیں چڑھتی — ان کا انداز تنقید خالص سائنسی ہے۔ جامع اور مدلل اور ممکن حد تک غیر جذباتی اور غیر جانبدار —"

ممتاز حسین کا یہ کام "غالبیات" میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

—اطہر پرویز

سب رس — جدید اردو میں • قاضی انیس الحق • اشاعت گھر گورکھپور • قیمت ۵۰/..

سب رس آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے لکھی گئی۔ اور اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ساڑھے تین سو سال کے بعد بھی اس کی ادبی اہمیت کم نہیں ہوئی اور آج بھی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کی قدیم زبان — جب اردو زبان اپنے تشکیلی دور میں صحیح طور پر داخل بھی نہیں ہوئی تھی اور پھر اس کا تمثیلی بیان — اس کی تفہیم میں دشواری پیدا کرتی ہے۔ قاضی انیس الحق نے سب رس کو جدید اردو میں منتقل کرکے اس مسئلے کو بڑی حد تک حل کردیا

ہے۔ اور اب یہ کتاب ایسی زبان میں تیار ہوگئی ہے جسے عام لوگ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں پرانی کتابوں کو دوبارہ جدید زبان میں لکھنے کی رسم نہیں ہے اس لئے لوگ ایسی کتاب کو دیکھ کر چونکتے ہیں۔ انگلستان میں شیکسپیر کے ڈرامے مختلف سطح کے قارئین کے لئے لکھے گئے ۔۔۔ چارلس ڈکنس کے ناول آسان سے آسان زبان میں ملتے ہیں اور جب طالب علم یونیورسٹی میں آکر اصل کتاب کو پڑھتا ہے تو اسے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔ قاضی انیس الحق نے بہت اچھا کام کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ طالب علموں کے علاوہ اب عام قاری اس کتاب سے لطف اندوز ہوسکیں گے۔

۔۔۔ اطہر پرویز

قلم کی کاشت (مجموعہ کلام) ● محمد عثمان عارف نقشبندی ● بیدل اکیڈمی، بیکانیر ● قیمت ۳۰/۔۔

اس سے پہلے عارف نقشبندی کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" شایع ہوکر مقبول ہوچکا ہے اور اس سے پہلے قومی و وطنی شاعری کا مجموعہ "نذرِ وطن" ۱۹۷۶ء میں شایع ہوا تھا جس پر راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کا انعام بھی ملا۔ عارف صاحب نقشبندی سلسلہ طریقت سے تعلق رکھتے ہیں ۔۔۔ زیر نظر مجموعہ ان کی غزلیات پر مشتمل ہے۔

عارف کی غزلوں میں جہاں ایک طرف کلاسیکی شاعری کا رچاؤ پایا جاتا ہے وہاں دوسری جانب ان کے یہاں جدید غزل کی بے ساختگی بھی ہے اور ان دونوں نے مل کر ان کو اپنا ایک انداز عطا کیا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں ۔۔۔ وہ خارج کی دنیا سے بھی بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اپنی داخلی کیفیات بھی موضوعِ سخن بناتے ہیں اور اسی لئے ان کی شاعری میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی ۔۔۔ اور اسی سے ان کی غزلوں میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ انسان کے کھوکھلے پن کو دیکھتے ہیں۔ اپنے عہد کے دلوں کی دھڑکن سنتے ہیں اور یہی ان کے یہاں روحِ عصر کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے ۔۔۔ عارف خدا بہت ملے انسان کم ملے

لیکن اس کے باوصف ان کے یہاں مایوسی کا احساس نہیں ہے ؎

مضبوط ہوں اس درجہ کہ نازک بھی ہوں اتنا ۔۔۔ فولاد کی دیوار ہوں شیشے کا بدن ہوں

مجھے امید ہے کہ عارف نقشبندی کا یہ مجموعہ بڑے شوق سے پڑھا جائے گا۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ اعلیٰ درجے کی ہے جس کے لئے ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۔۔۔ اطہر پرویز

اقبال اور عالمی ادب ● عبدالمغنی ● گریسنٹ پبلی کیشنز، گیا ● قیمت ۔/۴۰

زیر تبصرہ کتاب اصلاً پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ اس کے ابواب اور موضوعات بحث قریب قریب وہی ہیں جو پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب کے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالمغنی نے بحث کو اس نوعیت سے پھیلایا ہے کہ ان کی کتاب کی انفرادی و آزاد حیثیت بھی

استوار ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے مغربی شعریات و ادب کا بڑی بالغ نظری سے جائزہ لیا ہے اور اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ ہر ادب کی اپنی آزاد حیثیت ہوتی ہے۔ اسے اپنے سیاق سے الگ کر کے جانچنا اور غیر مماثل ادبی روایات کا آپس میں موازنہ کرنا ہمیشہ غلط نتائج تک پہنچائے گا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے بڑے عالمانہ انداز میں اس مجہول سحر کو توڑا ہے جو مغرب پرستی کی وجہ سے جدید ذہن پر طاری ہے۔ انھوں نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ادبی فکر و تصور کے پیش رو اہلِ مغرب نہیں رہے ہیں بلکہ بہت کچھ انھوں نے مشرق سے مستعار لیا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے استفادہ کو سرقہ کیوں نہ کہا جائے۔

"اقبال اور عالمی ادب" آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب خاصا طویل ہے۔ اقبال کی نثر و نظم سے حوالے بڑی وافر تعداد میں دیئے گئے ہیں۔ اسی صورت سے مغربی شعراء و نقاد کے برمحل حوالے بھی بحث کو باوزن و وقیع بناتے ہیں۔ کتاب کا لہجہ تند ہے جیسا کہ عموماً تصنیفات میں ہوتا ہے۔ اقبال کی عظمت کو مستحکم کرنے کے لئے ملٹن، دانتے اور گوئٹے کی تقلیل کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس اختلافِ رائے کے باوجود میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم کچھ کھوتے نہیں بلکہ بہت کچھ پاتے ہیں۔ بعض اوقات ساز کو چھیڑنے سے ہی بہترین نغمے وجود میں آتے ہیں، مغنی کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اقبال کا مطالعہ مغربی سیاق میں کرنے کے لئے یہ کتاب ناگزیر ضرورت بن جائے گی۔

— ابن فرید

تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ • ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

• اقبال اکادمی پاکستان، لاہور • قیمت ۔/۷۲

پی ایچ۔ ڈی کے لئے آئے دن مقالات جمع کئے جاتے رہتے ہیں، ان کی تحقیقی و علمی حیثیت جو ہوتی ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہی کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تحقیقی مقالہ ہے تو قاری کتاب کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف اردو ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ان تمام علوم میں روش اردو سے زیادہ عام ہے جن کے علمبردار فخر سے اپنی گردنیں دو دو گز اونچی رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی جہالت کی اس کہر آلود فضا پر کوئی نہ کوئی ستارہ نمودار ہو ہی جاتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ایسا ہی ایک منور ستارہ ہے۔ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ڈاکٹر ہاشمی کے پی ایچ۔ ڈی تحقیقی مقالہ کا موضوع رہا ہے اور یہی اس کتاب کا عنوان بھی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں اردو کلام کے مجموعے، فارسی کلام کے مجموعے، مکاتیب کے مجموعے، مستقل نثری تصانیف، متفرق نثری مجموعے، ملفوظات کے مجموعے اور اقبال کی مرتب کردہ درسی کتب کے بارے میں ہر ممکنہ معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ہر کتاب کے پہلے ایڈیشن کا مسودات سے موازنہ کر کے کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن مقامات پر نثر و نظم میں وضاحتی نوٹ یہ حوالجات

کی ضرورت تھی۔ انھیں تحقیق و تصدیق کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ گھپلا اقبال کے مضامین اور مکاتیب کے سلسلہ میں کیا جاتا رہا ہے۔ جس کسی کو اقبال شناسی کا دعویٰ ہوا ہے اس نے دو تین مجموعوں کے مکاتیب و مضامین کو گھال میل کر کے ایک نیا مجموعہ تیار کر لیا ہے۔ ایسے ہیرا سائٹوں کی "اقبالیات" سے تطہیر اشد ضروری تھی۔ پھر ان تحریروں میں بے احتیاطی کی وجہ سے جو غلطیوں کی فراوانی ہو گئی ہے اس کی بھی تصحیح ضروری تھی۔ یہ فریضہ ڈاکٹر ہاشمی نے بڑی دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ کے علاوہ دو اہم ضمیمے بھی ہیں۔ ضمیمہ اول میں اقبال کی تصانیف کے بارے میں تمام طباعتی معلومات اور تمام ایڈیشنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ضمیمہ دوم میں اقبال کی وہ تحریریں شامل کی گئی ہیں جن کا پتہ پہلی بار ڈاکٹر ہاشمی نے لگایا ہے۔

'اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ' ایک اہم اور ناقابل فراموش کتاب ہے۔ اقبالیات میں اس کی حیثیت حوالہ جاتی کتاب کی ہے۔ اس سے استفادہ کیے بغیر اقبال کی نثر و نظم کے صحیح متن کا مطالعہ ممکن نہ ہوگا۔ میں ڈاکٹر ہاشمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اقبال پر بہت بڑا کام کر دکھایا ہے اور وہ بھی پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ کی شکل میں۔

—— ابن فرید

محمد اقبال ● مصنف: میر شکر میر، مترجم: کبیر احمد جائسی ● اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر ● قیمت ۱۸/..

روسی زبان میں اقبال کے کلام کے انتخابات شایع ہوتے رہے ہیں۔ ایک انتخاب اقبال کے فارسی کلام کا بھی شایع ہوا ہے جس کا مقدمہ تاجکستان کے ممتاز ادیب میر سید میر شکر نے ایک طویل مقالہ کی صورت میں لکھا ہے۔ یہ مقالہ کل اکیس صفحات کا ہے۔ لیکن اس کے شروع میں ڈھائی صفحات کا پیش لفظ پروفیسر آل احمد سرور نے اور ساڑھے صفحات کا مقدمہ ڈاکٹر جائسی نے لکھا ہے۔ مقالہ کے بعد مترجم نے اکیاون صفحات کی تعلیقات لکھی ہیں۔ میر شکر کا مقالہ تعارفی قسم کا ہے، اس کا تحلول جدلیاتی ہونا فطری بات ہے، لیکن اس نظریۂ فکر کے تحت بھی اردو میں پُرمغز تحریریں منظرعام پر آچکی ہیں۔ میں میر شکر اور ان کے مقالہ کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ ڈاکٹر جائسی نے مقدمہ اور تعلیقات کی صورت میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصل مقالہ سے زیادہ علمی اور وقیع ہے۔

—— ابن فرید

سعادت حسن منٹو ● پروفیسر محمد حسن ● دارالاشاعت ترقی، دہلی ● قیمت مجلد تیس روپے، غیر مجلد ۲۳ روپے۔

نفسیات کے بین الاقوامی شہرت کے حامل پروفیسر محمد حسن نے منٹو کی شخصیت کا مطالعہ تحلیل نفسی کے زاویہ سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر عنوان و ذیلی عنوان اس طرح لکھا ہوا ہے: "سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی تجزیہ)" یہ تفصیلی عنوان پروفیسر

محسن کی رسائی کو خود بخود واضح کر دیتا ہے۔ ان کا شخصیتی مطالعہ اس مواد پر منحصر ہے جسے منٹو نے MANIFEST کیا ہے۔ اس اظہار میں وہ بہت سے LATENT عوامل پوشیدہ ہیں جن سے منٹو کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی نشوونما ہوئی ہے۔ ڈاکٹر محسن کا طریق مطالعہ CASE STUDY کا ہے جس کے لئے انھوں نے SECONDARY ماخذ کا استعمال کیا ہے۔ خاندانی حالات، ابتدائی زندگی، ازدواجی زندگی، فلمی دنیا، زندگی کا آخری دور، عادات وخصائل، مزاج وافتادِ طبع اور ذہنی کشمکش و داخلی انتشار وغیرہ ایسے پہلو ہیں جن کو پروفیسر محسن نے علمی وتحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ منٹو کے افسانوں کے موضوعات، کردار، پلاٹ، جنسی پہلو، لفظیات کی نفسیات اور ترقی پسندانہ رجحان وغیرہ ایسے مباحث ہیں جن کا نفسیاتی تجزیہ کرکے پروفیسر محسن نے نئی بصیرت عطا کی ہے۔ منٹو کے سلسلہ میں ان کا رویہ ہمدردانہ ہے مثلاً ان کا موقف یہ ہے کہ جن افسانوں میں منٹو میں کی صورت میں موجود ہے ان میں وہ حجاب کا اہتمام کرتا ہے اور جہاں یہ پردہ اٹھ جاتا ہے وہاں پورا افسانہ صیغۂ غائب میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ بے حجابی میں بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں جاتا۔ یہ تجزیہ بڑا دلچسپ ہے اور توجہ طلب بھی! پروفیسر محسن نے پوری کتاب میں منٹو کی شخصیت کے مثبت پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے دوستوں کے لئے بھی لائقِ اعتنا نہ تھا۔

منٹو پر یہ ایک اہم کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ منٹو کی شخصیت وفن کے باہمی رشتہ کو صحیح طور سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

— ابنِ فرید

کلامِ نیرنگ

● مرتبہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل ● مکتبہ اسلوب، کراچی ● قیمت ۲۵/-

میر غلام بھیک نیرنگ کشمیری پنجابی بھی تھے اور اقبال کے معاصر بھی۔ اقبال سے ان کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ میر صاحب علم مسلم زعماء میں سے تھے اور سرسید احمد کی تحریک علی گڑھ کے سرگرم موید! وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کی تنظیم کے رکن رہے تھے۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسی ومعاشرتی زندگی میں انھوں نے بڑا نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ اس پہلو کے متوازی ان کی علمی وادبی زندگی بھی خاصی نمایاں رہی ہے۔ ان کی تصانیف میں ان کا مجموعۂ کلام ایک خوشگوار تنوع پیدا کرتا ہے جو ان کی زندگی ہی میں دوبار شایع ہوا تھا۔ میر صاحب کی شعری حیثیت پر خود اقبال کو فخر تھا:

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر　　ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

نیرنگ کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ ان کی روایت سے وابستگی اور تقلید سے بغاوت ہے۔ ان کے یہاں عصری شعور اور مثبت تعمیری انقلاب کی آرزو واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اقبال سے مخلصانہ تعلقات ہی کا اثر ہو یا ان کی افتادِ طبیعت کہ وہ شاعری کو منفعل ومجہول بے معنویت تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اسے توانا تخلیقی

اظہار قرار دیتے تھے، اسی لئے ان کی شاعری میں اقبال ہی کی طرح استقبالیت و اثباتیت جلوہ گر ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انھوں نے اقبال کی نقالی نہیں کی ہے بلکہ اپنی انفرادیت قائم و برقرار رکھی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے "کلام نیرنگ" کو اس کے دوسرے ایڈیشن کو اساس بنا کر نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ اس کے شروع میں پیش لفظ کے علاوہ انھوں نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں انھوں نے میر صاحب کی زندگی، سیاسی و ثقافتی خدمات، میر صاحب کی شاعری کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اصل مجموعہ کے آخر میں انھوں نے نیرنگ کا غیر مدون کلام بھی شامل کر لیا ہے، جس نے اس مجموعہ کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ مکتبہ اسلوب نے شایع کر کے یہ حقیقت منوالی ہے کہ انھیں کتاب شائع کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

ــــ ابن فرید

بہار میں اردو تنقید • ڈاکٹر اعجاز علی ارشد • گدھ پنچ، باغ پاٹو، پٹنہ • قیمت ۱۵/۰۰

بہاری اپنی علاقائی شناخت کے معاملے میں خاصے خود شعور ہوتے ہیں۔ چنانچہ علاقائی تحدید کے پیش نظر بہت سی ایسی تصنیفات منظر عام پر آئی ہیں کہ اگر وہ نہ آتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس رو میں کوئی اچھا اور قابل توجہ کام بھی ہو جایا کرتا ہے جو پچھلے غبار کو صاف کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر ارشد نوجوان ادیب و نقاد ہیں۔ انھوں نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے کہ اپنے ادبی کیریر کی ابتدا مستقل تصنیف سے کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی ابتدا تذکروں کے تذکرے سے ہوتی ہے، اس کے پیش رو نقادوں کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب کا اصل متن چھ تنقید نگاروں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ امداد امام اثر، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، شکیل الرحمٰن، عبد المغنی اور وہاب اشرفی ہیں۔ باقیات الصالحات کے طور پر محققین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ادبی تنقید کی جھلکیاں کے تحت ان متعدد تنقید نگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے جو ابھی مقام اعتبار حاصل نہیں کر سکے ہیں لیکن ان کے یہاں مستقبل کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

خوبیاں خامیاں ہر کتاب میں ہوتی ہیں۔ وہ اس کتاب میں بھی ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس میں خوبی ہی نظر آئی۔ ڈاکٹر ارشد موضوع پر گرفت، استدلال و توازن اور تنقیدی محاکمہ میں بردباری کی صفات سے آراستہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں وہ ساتواں نام بن سکیں گے۔

ــــ ابن فرید

سفر اپنی ذات کے اندر • اطہر راز • 21, COLWOOD GARDENS, COLLIERS WOOD, LONDON S.W. 19, UK. • قیمت درج نہیں

'سفر اپنی ذات کے اندر' اطہر راز کی طویل نظم ہے جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جنھ

اوّل کا موضوع انا کے دشت میں اپنی تلاش ہے مجھ کو، حصۂ دوم کا موضوع میں خود کو ڈھونڈنے نکلا فاصلے نکلے اور حصۂ سوم کا موضوع مرے وجود کا حاصل انا پرستی ہے، قرار دیا گیا ہے تینوں حصوں کے مذکورہ بالا عنوانات کو اگر مربوط کر کے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری نظم کا مرکزی موضوع 'انا' ہے۔ اس نظم کو ۳۲ بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر بند کے آخر میں ذیلی عنوان یا مرکزی خیال کو درج کر دیا گیا ہے۔ ہر بند کی ہیئت یہ ہے کہ وہ سات مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں ابتدائی پانچ مصرعوں کو قافیہ یا ردیف کا پابند نہیں کیا گیا ہے البتہ آخری دو مصرعوں میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسلوب روایتی نہیں ہے لیکن لفظیاتی تخریب کاری بھی نہیں ہے، اس لئے اسے جدید بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بندوں کے ذیلی عنوانات میں ذات، خرد، خدا، جبر، یقین، شر، سود و زیاں، خودی اور زمانہ وغیرہ کے آجانے اور انا کے مرکزی موضوع ہونے کی وجہ سے یہ تعجیل یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ راز نے اقبال کی تقلید کی ہے۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عجلت کا فیصلہ ہمیشہ عجلت ہی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس میں صداقت کم ہی ہوتی ہے۔ راز کے اپروچ، اسلوب اور موضوع کے برتاؤ میں اقبال سے مماثلت نہیں ہے۔ ان کا مسئلہ فرد کا مسئلہ ہے جو فکر کی امکانی جہات سے پھیلا ہوا ہے۔ ان کے یہاں مثبت، تعمیری اور صالح ذہن و فکر کی نمائندگی ملتی ہے۔ ان کے ٹھہرے ٹھنڈے اور دھیمے لہجے نے نظم کو منفرد حیثیت عطا کر دی ہے اور اطہر راز سے مستقبل میں بڑی توقعات وابستہ کر دی ہیں۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اس کی سٹنگ بھی حسن ہے۔ نصف سے زیادہ کتاب میں جوش، حفیظ، فراق، فیض، انور سدید، ظ انصاری، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری، اسلم فرخی، ممتاز حسین، خواجہ حمید الدین شاہد، علی سردار جعفری، خاطر غزنوی اور شہرت بخاری وغیرہ کی آرا شائع کی گئی ہیں جن سے خاصا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

—— ابن فرید

افسانوی ادب ● ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ●

قیمت ۳۰/..

اس کتاب کا ذیلی عنوان "تحقیق و تجزیہ" ہے۔ کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں اور انھیں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ایک حصہ پیش لفظ ہے۔ اس تقسیم کا جواز مصنف کے مطابق تاریخی ترتیب ہے۔ یہ ترتیب اصلاً مضامین کے موضوعات سے متعلق ہے۔ تمام مضامین فکشن (FICTION) سے متعلق ہیں، باغ و بہار پر مضمون بالخصوص تحقیقی ہے اور ترقی پسند و جدید ادب پر مضامین جائزاتی ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی نے افسانوی ادب کا خلوص و توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ان کی خصوصی دلچسپی سرشار اور کرشن چندر میں ہے۔ ویسے انھوں نے ایک ایک مضمون رسوا، پریم چند، بیدی اور انتظار حسین پر بھی لکھا ہے۔ موضوعاتی مضامین ناول کے فن، مستقبل اور جدید افسانہ پر ہیں، افسانوی

ادب کے مطالعہ میں اس کتاب سے خاطر خواہ مدد ملے گی۔ ڈاکٹر صدیقی نے سنجیدگی، اعتدال اور توازن کو ہر مضمون میں برقرار رکھا ہے۔

—— ابن فرید

پردۂ ساز ○ شہاب اشرف ○ کتابستان ۳۰ چک، الہ آباد ○ قیمت: ۱۵/۰۰

شہاب اشرف ایک کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ "پردۂ ساز" ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اس سے پہلے 'وادیٔ خیال' کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہو کر فراق گورکھپوری اور نیاز فتحپوری جیسے معتبر اور مستند ادیبوں سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ —— واقعہ الحروف کا معاملہ یہ ہے کہ جب بھی کسی شعری مجموعے میں خود شاعر یا کسی نقاد کے خیالات سے اس کا سامنا ہوتا ہے تو فطری طور پر ایسے خیالات کی تصدیق، براہ راست طریقے پر شاعری سے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس مجموعہ کو پڑھ کر کوئی بھی صاحب ذوق اندازہ لگا سکتا ہے کہ شہاب اشرف کی شاعری پر جو رجعت آرا کا ابتدائی صفحات میں کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک درست اور مبنی بر حقیقت ہیں۔

شہاب اشرف، اشرفی خانوادے سے تعلق رکھنے کے سبب تہذیب و شائستگی کے حامل اور علمی اور ادبی ماحول کے پروردہ ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت سے کسب فیض کرنے اور دلکش لی سطح پر زبان و بیان کو نکھار کر سامنے لانے کا رجحان بھی اسی سبب سے ملتا ہے۔ جدید تنقید اور جدید طرز احساس کے پس منظر میں شہاب اشرف کی قدر و قیمت کی پرکھ مناسب نہ ہو گی، کہ ان کا جہ بنیادی طور پر اردو شاعری کا روایتی بلکہ کلاسیکی لہجہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لہجے اور روایتی سخن کی حد بندیوں نے شہاب اشرف کے اظہار پر خاصے قدغن لگائے ہیں اور بار ہا ایسا احساس ہوتا ہے کہ شاعر موجودہ عہد میں زندگی گزار رہا ہے اور ساتھ ہی زندگی کے جدید مسائل کا شعور بھی رکھتا ہے مگر اپنے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی استعمال کے امکانات کو اس حد تک برت نہیں پاتا جو ان مسائل کے بیان کا بنیادی تقاضہ ہے —— ذیل کے دو شعر دیکھئے کہ یہ بظاہر اچھے شعر لگتے ہیں۔ دونوں میں ایک آنچ کی کسر کا بھی احساس ہوتا ہے ——

ہائے کیا انقلاب زمانہ ہوا ۔۔۔ سامنے تم ہو اور دل دھڑکتا نہیں

سب کچھ ہے میرے پاس مگر جب سکوں نہیں ۔۔۔ ویران کھنڈروں سا لگے ہے یہ گھر مجھے

شہاب اشرف کے اس مجموعے میں نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں لیکن اکثر نظمیں ایک خاص سطح کی رومانیت سے مملو ہیں اور قطعات سے کہیں زیادہ ان کے جوہر غزلوں میں کھلے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شہاب اشرف اپنے مزاج اور افتاد طبع کے اعتبار سے غزلوں کے شاعر ہیں۔ اس کی تصدیق پردۂ ساز میں شامل غزلوں سے بخوبی ہوتی ہے۔ چند بے ساختہ، برملا اور شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

ایک تمھیں کیوں یاد آتے ہو

کچھ لب و رخسار کی باتیں کرو ـــ جم گئی ہے برف سی جذبات میں
صدیاں گزر گئی ہیں کہ پتھر تراش کر ـــ انساں ترے نقوش قدم ڈھونڈتا رہا
کس سے ملئے کس سے باتیں کیجئے ـــ جس کو دیکھو گم ہے اپنی ذات میں

شہاب اشرف کا ایک اور بہت اچھا شعر بادی النظر میں میر تقی میر کے شعر سے

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

کی یاد دلاتا ہے۔ ان کا شعر ہے:۔

ہم اس جہان سے کس درجہ سرسری گزرے
ٹھہر سکے نہ کہیں چل چلاؤ ایسا تھا

مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مصرعے سے شہاب اشرف نے نہ صرف یہ کہ پہلے مصرعے کا سیاق و سباق بالکل تبدیل کر دیا ہے بلکہ بے ثباتی زندگی کی ہماہمی اور افراتفری کی طرف اشارہ کر کے انھوں نے اپنے خیال کو بالکل نئی جہت دے دی ہے۔

مجموعی طور پر پردۂ ساز ایک پرگو شاعر کا قابل لحاظ مجموعۂ کلام ہے جس کی پذیرائی کے لئے کسی تنقیدی سفارش کی ضرورت نہیں۔

ـــ ابوالکلام قاسمی

پروفیسر مسعود حسین کی علمی و تحقیقی تصنیفات و تالیفات

۱۔ قدیم اردو جلد اول   قیمت: ۱۵/۰۰

دیدہ زیب ٹائپ کی طباعت میں عثمانیہ یونیورسٹی کا علمی مجلہ جو پروفیسر مسعود حسین کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے پہلے شمارہ میں جو ۱۳۰ صفحات پر محیط ہے دکنی اردو کے متون کے علاوہ پہلی بار محمد افضل محمد کی بکٹ کہانی مدون ہو کر شائع ہوئی تھی۔

۲۔ قدیم اردو جلد دوم   قیمت: ۱۲/۰۰

اس شمارے میں دو قدیم ترین نظم و نثر عاجز کی "لیلیٰ مجنوں" اور میراں یعقوب کی شمائل الاتقیاء کے متن پہلی بار مرتب کر کے شائع کئے گئے

۳۔ قدیم اردو جلد سوم   قیمت: ۱۰/۰۰

عادل شاہی دربار کے نامور شاعر عبدل کی تصنیف ابراہیم نامہ کا متن حواشی و تعلیقات کے ساتھ پروفیسر مسعود حسین نے مرتب کر کے شائع کیا جسے ایک تحقیقی کارنامہ کہا گیا ہے۔

۴۔ قصہ مہر افروز و دلبر   قیمت: ۱۲/۰۰

شمالی ہند کا پہلا قصہ جسے عیسوی خاں بہادر نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں تصنیف کیا اور جو بول چال کی دہلوی زبان کا پہلا نقش ہے۔ پروفیسر مسعود حسین کی تہذیب و ترتیب کے ساتھ دیدہ زیب ٹائپ عبارت میں۔

۵۔ شعر و زبان   قیمت: ۵/۰۰

پروفیسر مسعود حسین کے وہ علمی، ادبی اور لسانی مضامین جو اپنے اسلوب نگارش اور علمیت کے باعث جانے پہچانے جاتے ہیں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ پہلی بار یکجا کئے گئے ہیں۔

۶۔ اردو زبان و ادب

ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضامین کا مجموعہ جس میں اردو زبان اور ادب سے متعلق مضامین ہیں شاعروں پر تنقیدی زاویہ سے اظہار خیال۔ فن شاعری سے متعلق اردو میں پہلی بار علمی مباحث۔ اردو زبان سے متعلق نئے نظریات۔ اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب۔ قیمت: ۱۲/۵۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

الفاظ

جلد ۸ | نومبر، دسمبر ۱۹۸۳ء | شمارہ ۶

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی   اطہر پرویز

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

زرِ سالانہ ---- ۱۶ روپے
قیمت ---- ۳ روپے

پرنٹر پبلشر ---- اسدیار خاں
مطبوعہ ---- جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی
کتابت ---- ز۔ رشید، الٰہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر : وز۔ ر آغا

پتہ : دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

گوشۂ وزیر آغا

افسانے

مضامین

نظمیں اور غزلیں

اور

مہمان اداریہ

چند ماہ قبل ایک معصور دوست نے، جو ادب کے سنجیدہ قاری ہیں، شکوہ کیا کہ "ادب کو کیا ہوگیا ہے؟ کہیں کوئی تحریک، کوئی نیا طاقتور میلان، کوئی تنازعہ، کوئی بحث نظر ہی نہیں آتی۔ آٹھ سے دس بارہ برس قبل جو گرما گرمی تھی، اب ٹھنڈی پڑگئی ہے۔ یہ بات انھوں نے معصوری کے لئے بھی کی اور تمام دنیا کے ادب کے لئے بھی لیکن خصوصیت سے اردو رسائل و جرائد کا حوالہ دیا۔ یہ احساس مجھے بھی تھا۔ عمیق حنفی نے بھی ایک ڈیڑھ برس پہلے کہا تھا کہ اب کوئی نئی بات شروع کی جائے، سردار جعفری نے گفتگو کا اجرا اس اعلان سے کیا تھا "گفتگو بند نہ ہو/ بات سے بات چلے" لیکن "گفتگو" بھی برسوں سے بند ہے۔ رسائل نکل رہے ہیں، بند ہو رہے ہیں، کچھ سخت جان ہیں جو پابندی سے یا غیر حاضری کے طویل وقفوں کے بعد سامنے آتے رہتے ہیں۔ "شب خون" گوشے دار ہوگیا۔ ایک "شاعر" ہے جسے اعجاز صدیقی مرحوم کے بیٹے پابندی سے نکال رہے ہیں، یا "آہنگ" ہے۔ سرکاری رسالوں کی تو مجبوری ہے کہ انھیں ہر ماہ وقت پر شائع کرانا مدیر کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ دوماہی رسالوں میں ادھر تین برس سے "الفاظ" تسلسل شائع ہو رہا ہے — لیکن اب تمام رسائل کو پڑھ کر احساس یہ ہوتا ہے کہ لوگ عادتاً لکھ رہے ہیں اور مدیر شوقیہ یا ضرورتاً انھیں چھاپتے رہتے ہیں۔ اب کسی پرچے کا کسی کو بجز ان نووارد ان ادب کے جو اپنی تحریریں سیاہ لفظوں میں ثبت دیکھنا چاہتے ہیں، انتظار نہیں رہتا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کتنے رسائل تھے جن کا ادیب اور سنجیدہ قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ "ہماری زبان" جیسے غیر ادبی رسالے کا اس کے ادبی کالم کی وجہ سے، "نصرت" کا اس کے چند اچھے شہر ناموں کی بناپر، سویرا، ادب لطیف، سات رنگ، صبا، کتاب، نئی قدریں، شاہراہ کا ان کے معیار اور نئے مباحث کی بناپر انتظار رہتا تھا۔ فنون، ادبی دنیا، نیا دور، ادب لطیف، شعر و حکمت، گفتگو، تناظر، سطور، حتٰی کہ تحریک تک کو لوگ شوق سے پڑھتے تھے کہ ان رسائل کے ہر شمارے یا خاص نمبروں میں کوئی نئی بات یا کچھ نئے ناموں کی چونکا دینے والی تخلیقات سامنے آتی تھیں۔ شب خون نے ہندوستان میں جدید ادب و شعر کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ "صبا" کے بعد کئی کوششیں "شب خون" سے پہلے اس سے قبل یہ کام "سوغات" نے کیا جس کا جدید نظم نمبر اب تو حوالے کی کتاب بن گیا ہے — پھر "شعور" نکلا۔ اس کا ہراول "میزان جدید" اس کے لئے زمین ہموار کر چکا تھا۔ "شب رنگ"، "گفتگو" اور ان کے بعد "عصری ادب" نے بائیں بازو کے میلانات کو ادب میں سہارنے اور فروغ دینے کی از سر نو کوشش کی۔

"اظہار" کے بعض شماروں نے بھی سنسنی پھیلائی۔ سنہ ۶۰ء تک میں حیدر آباد میں تھا، پرانے اور نئے ادیبوں کے حلقے میں روز کسی نو آمد رسالے یا کتاب کی بات بڑے خضوع و خشوع سے ہوتی تھی، علی گڑھ آیا تو خلیل الرحمٰن اعظمی اور ان کے حلقۂ احباب میں اجتماعی رسالہ خوانی یا کتاب خوانی کا شوق دیکھا ــ اس وقت ادیب اور شاعر رسائل ہی کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے تھے، یہی ان کی دلچسپی تھی مقصود بھی، منتہا بھی ــ بعض بزرگ اس 'رسالہ خوانی' کے شوق کا استہزائیہ انداز میں ذکر کر کے، پرانے مصنفین اور ان کی کتابوں کے سنے سنائے یا طالب علمی کے زمانے میں پڑھے ہوئے نام دہرا کر اپنی علمیت کا مظاہرہ فرماتے تھے، مگر رسائل سے ہمارا شغف کبھی ان کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا۔ کتابیں بھی عموماً نئے مصنفین ہی کی پڑھی جاتی تھیں۔ وہ شعری مجموعے ہوں یا افسانوی، تنقیدی مضامین ہوں یا بھولا بھٹکا ایک آدھ معیاری ناول، ہر مجموعے کا انتظار رہتا، پاکستان سے کوئی نئی کتاب آجاتی تو اجتماعی طور پر اس سے حظ اٹھایا جاتا، تنقیدیں ہوتیں، بحث چلتی۔ اسی طرح آزادی کے بعد کی نسل کے ہندوستانی ادیبوں کی کتابوں کا سطر بہ سطر، شعر بہ شعر مطالعہ ہوتا، مہینوں تذکرہ رہتا ــ اس وقت کے رسائل بھی نئی اچھی کتابوں کی پذیرائی میں ہمارے شریک ہوتے۔ کتنے نام، کتنے میلانات، کتنے تجربے ایسے ہیں جو پورے برصغیر کے لکھنے والوں میں مشترک تھے، اور اب ہمارے ادب کے مزاج، معاصر احساس و اظہار اور ایک حد تک ہماری ثقافت و تخلیق کے اجزا بن گئے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ بنگلہ دیش کے وجود میں آتے ہی، کچھ دانستہ، کچھ نادانستہ طور پر ہندوستان کے بیشتر لکھنے والوں کا رشتہ پاکستانی رسائل سے منقطع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یہ خلیج اتنی بڑھ گئی کہ اب ادھر اور ادھر کے نئے لکھنے والے ایک دوسرے کے نام سے بھی پوری طرح آشنا نہیں، اگر آشنائی ہے تو بھی سرسری ہے گاہے گاہے قسم کی۔ اس کا سبب سیاسی اختلاف نہیں بلکہ یہ ہے کہ اب ہم ادب ہی کے بارے میں کچھ لاپرواہ سے ہو گئے ہیں۔ سنہ ۵۰ء اور سنہ ۶۰ء والی نسلوں کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا ہو تو سنہ ۷۰ء اور اس کے بعد سامنے آنے والوں کو کیا ہوا؟ حالانکہ اب اردو کا اثر و حلقۂ اشاعت اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ٹورنٹو سے نکلنے والا "اردو انٹرنیشنل" ہندوستان و پاکستان کے ادیبوں کے ساتھ امریکہ، یورپ اور دوسرے ایشیائی ممالک کے اردو لکھنے والوں کی تخلیقات کو بھی سمیٹ کر پابندی سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

رسائل اب بھی نکل رہے ہیں، پہلے سے زیادہ خوبصورت، طباعت کا معیار بھی بلند ہے پیش کش بھی زیادہ حسن کارانہ ہے۔ کتابیں اب بھی چھپ رہی ہیں۔ شاعری میں یک رنگی کتنی ہی آگئی ہو، مگر اچھے مجموعے گاہے گاہے سامنے آتے ہی رہتے ہیں۔ افسانہ تجریدیت و علامتیت کی بے راہ روی میں کتنا ہی ناقابل مطالعہ ہو گیا ہو، لیکن اچھے افسانے اب بھی لکھے جا رہے ہیں، تنقید کا معیار اب پہلے سے بلند ہو گیا ہے، عمومی کلیہ سازی کی جگہ تجزیاتی مطالعہ و محاکمہ کا میلان بڑھا ہے، تحقیق میں قابل قدر کام ہو رہا ہے، ادبی معیار کے نئے ناول بھی کبھی کبھی سامنے آ ہی جاتے ہیں ــ پھر کمی کیا ہو گئی ہے؟ عدم دلچسپی کیوں بڑھ رہی ہے؟ پہلے کی سی گرمی اور روشنی کیوں نہیں ملتی؟ رسائل میں پرانے اور نئے لکھنے والوں پر طویل و عریض گوشے چھاپنے کا رواج عام ہے ــ لیکن ان گوشوں کا وہ اثر کیوں نہیں ہوتا جو

پہلے کسی ادیب پر لکھے گئے، ایک مضمون یا کسی کتاب کے ایک تبصرے کا ہوتا تھا؟
غور کیجئے تو اس کے اسباب خود معاصر ادب میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ پندرہ سال قبل تک ادب ہماری زندگی تھا، اس کے مسائل و مباحث ہماری زندگی کے مسائل تھے۔ ترقی پسندی کی ادب پر گرفت اسی وقت ڈھیلی ہوئی جب وابستگی کے شدید جذبے اور اس کے معتبر اظہار کی جگہ نعروں نے لے لی۔ ترقی پسندی کی ادبی سیاسی آمریت کے خلاف نئی نسل کا احتجاج و جہاد اپنی انفرادیت کے حق کا تحفظ تھا اور اپنے ذاتی و اجتماعی تجربوں کے ادبی اظہار کے لئے آزادی کا مطالبہ تھا۔ یہی احتجاج ہندوستان میں جدیدیت کی اساس تھا۔ پاکستان میں نومولود ملک کے لئے تہذیبی جڑوں کی تلاش، قومی تشخص، ادبی اظہار اور مہاجر ادیبوں کی بے زمینی اور نئی زمین سے مطابقت پذیری کے مسائل پر سنجیدہ فکر و بحث نے جدیدیت کے لئے زمین ہموار کی ــــ جدیدیت عالمی میلانات کا مجموعہ سہی، لیکن ہر ملک، ہر تہذیب میں اس کا زور (EMPHASIS) اپنے سماجی ڈھانچے، سیاسی نظام اور تہذیبی روایات یا ان میں ہونے والے تغیرات کے مطابق ہوتا ہے۔ ہم نے پاکستانی رسائل کی شان و شوکت، طمطراق و ضخامت اور وہاں کے لکھنے والوں کو جلد ہی جو شہرت مل جاتی ہے، اس سے مرعوب ہو کر بہت سے ایسے مسائل و میلانات کو جو ہماری اپنی روح کو چھوتے نہیں تھے، جو ہمارے تخلیقی تجربے کی بھٹی میں پکے نہیں تھے، اپنا لیا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ دونوں ملکوں میں اردو ادب کے بیشتر عناصر مشترک نہیں ہیں۔ یقیناً ہماری روایت ایک ہی ہے اور وہ ناقابل تقسیم ہے ــــ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جب ہم اس ناقابلِ تقسیم ادبی روایت کی بات صدق دل سے کرتے ہیں تو پاکستان کے بعض نظریہ ساز ناقدین اسے خود تقسیم کی نظریاتی اساس پر بالواسطہ حملہ سمجھتے اور یہ لکھتے ہیں کہ یہ دعویٰ ہی گمراہ کن ہے ــــ اپنی جگہ ایسے حضرات بھی صحیح ہیں اس لئے کہ ۳۷ سال میں بہت پانی بہہ چکا ہے تقسیم کی سرحدوں میں بہت سا خون جذب ہو چکا ہے۔ دونوں ملکوں میں نہ صرف سیاسی نظام کا اختلاف ہے بلکہ عام زندگی کی اقدار بھی بہت مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں جیسی بھی ہو، جمہوریت ہے، وہاں مستقل فوجی آمریت۔ سوشلزم اور سیکولرزم ہمارے دستور کی اساس ہیں، وہاں دستور کوئی ہے ہی نہیں، ہے تو نذرِ طاقِ نسیاں۔ ہمارا سماج کثرتیتی (PLURALISTIC) ہے، ان کا وحدانی، اگر اختلاف ہے تو لسانی اور علاقائی، کم از کم مذہبی نہیں۔ طبقہ واری ڈھانچہ اب تک دونوں جگہ ہے۔ ہمارے علمی اور ادبی مطالعے کے ماخذ ایک ہی ہیں، بیشتر مغربی مشرقیت کی تعریف میں ہمارا ان کا اختلاف ہے، حالانکہ پاکستان کے تصور مشرقیت کے ہم نوا ہمارے ملک میں بھی ہیں۔ تصورِ کائنات و تعبیر ثقافت کے یہ اختلافات فروعی نہیں، اصولی ہیں۔ ان سے ذہن کی تشکیل ہوتی ہے، تخلیقی مزاج بنتا ہے۔ اردو میں جو کچھ اور جتنا وقیع کام پاکستان میں ہو رہا ہے، علمی، سائنسی، ثقافتی، اور وہ ساری علمی کاوشیں جو ہندوستان میں اردو کے توسط سے ہو رہی ہیں، دونوں ملکوں کے اردو والوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں ــــ لیکن جہاں تک تخلیق کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ دونوں تخلیقی فن کاروں کے کرب کی شدت ایک سی ہوگی، لیکن اس کی کیفیت مختلف ہے۔ وہ زمانہ آزادی و تقسیم کے فوراً بعد کا تھا جب نصرت،

سویرا، سات رنگ، ادب لطیف، نئی تحریریں وغیرہ ہمیں اپنے تجربے کے اظہار کی آوازیں لگتی تھیں۔ اب شعوری یا غیر شعوری طور پر کئی پاکستانی ادبی جرائد ہندوستان کے لکھنے والوں کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ اس کے پیچھے ایک سیاسی مقصد ہے، وہ یہ کہ دنیا میں جہاں کہیں اردو کی تدریس و تعلیم ہو یا ریڈیو، ٹی۔ وی۔ اور جرائد اردو کا استعمال کرتے ہوں ان پر اجارہ داری کا حق حاصل کرنا، یہ کہہ کر کہ اردو تو ہندوستان میں ختم ہو چکی ہے، پاکستان کی سرکاری زبان ہے ۔ مجھے تو ان ہندوستانی ناقدین پر حیرت، کبھی کبھی افسوس اور اکثر عبرت ہوتی ہے جو بزبان قلم فرماتے ہیں کہ تخلیقی ادب کا معیار پاکستان میں ہمارے ملک سے کہیں زیادہ بلند ہے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو علیحدہ سے بحث چاہتا ہے کہ آیئے تنقید میں، تحقیق میں، نظم میں، غزل میں، افسانے میں، ناول میں الگ الگ ہر صنف کا معروضی جائزہ لیا جائے جو ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ۔ اس طرح کی تنقید کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ پاکستانی رسائل و ناقدین کے لئے اپنے کو قابل قبول و قابل اشاعت بنایا جائے۔

ایک تو یہ سبب ہوا کہ ہم نے معاصر ادب اور اس کے مسایل و مباحث کے لئے خود اپنے تخلیقی تجربے پر انحصار کرنے کی بجائے سرحد کی ادھر دیکھنے پر زور دینا شروع کیا، اس لئے ادبی مباحث و تخلیقات اور اس کے ساتھ جراید ہمارے لئے ہماری زندگی اور تجربہ کا مسئلہ نہیں رہے بلکہ IRRELEVANT ہو گئے۔

دوسرا سبب وہی ہے جو ترقی پسندی کے رد کا باعث بنا ۔ جس میلان کو ہم جدیدیت کہتے ہیں ۔۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے ذاتی میلان یا مفاد حاصل کو یہ نام دیتا ہے ۔ وہ ابتدا میں تو تخلیقی فنکاروں کے داخلی وجودی تجربے کی زمین سے پھوٹا تھا جب وہ برگ و بار نکالنے کی منزل میں آیا تو ایسے ناقدین منصۂ شہود پر آ گئے جو اس میں اپنی مرضی اور پسند کے کاغذی (یا جرائدی ؟) پھل پھول ٹانکنے لگے ۔ بالکل نئے لکھنے والوں نے ان کاغذی برگ و بار میں سے وہ، جو انہیں مفیدِ مقصد نظر آئے، اپنی تخلیقات کی قباؤں میں سجانے سنوارنے شروع کر دیئے۔ ہر بتدی نے تخلیق کا آغاز ایک مخصوص محدود ادبی نقطۂ نظر سے شروع کیا ۔ تخلیق کسی باہر سے اپنائے ہوئے نظریے کے اظہار کا نام نہیں، اپنے تجربے کے بے محابا اظہار کا نام ہے ۔ اور تخلیق بے محابا اظہار اپنی زبان اپنے ساتھ لاتا ہے ۔ یہاں زبان کا معاملہ بھی پہلے سے دوسروں نے طے کر دیا تھا، روایت سے تعلق کا مسئلہ بھی فیصل ہو چکا تھا۔ انحراف، انقطاع، لسانی حرمتوں کی شکست، لفظیات کا تخلیقی استعمال (خواہ لفظ کے صحیح لغوی معنی سے ہی آگاہی نہ ہو)۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے وہی ہوا جو ہونا تھا، بغیر انفرادی واردات کی بے روح، فارمولا گزیدہ، نظریہ گرفتہ، مقبول عام استعارات کی بستہ زبان میں نظم و غزل لکھی جانے لگی۔ افسانے پر بُرا وقت یوں آپڑا کہ کہانی کہنے کے فن کو داستانِ پارینہ سمجھ کر علامتیت و تجریدیت فیشن بنائی گئی۔ اس تجربے کی زد میں آنے والے وہی صحیح سلامت رہے جن کا تجربہ معتبر اور جن کی تخلیقی صلاحیت غیر معمولی تھی ۔ نظم میں افتخار جالب اور غزل میں ظفر اقبال کے ناکام اور غیر شاعرانہ تجربات شکستِ الفاظ و خبطِ معانی کو معیار قرار

دیا گیا تو غزل و نظم میں زبان نادانی، مزاج لفظ ناشناسی اور فن ناواقفیت کے ساتھ یکسانیت و مہملیت کو فروغ ہوا — اس قسم کے تجربوں سے نظریہ تراش ناقدین اپنی امتوں کو وسیع ہوتا دیکھ کر کتنے ہی خوش ہولیں، ادب کے قارئین کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے ؟ — غیر جانبدار، اپنی انفرادیت کے محافظ لکھنے والوں نے اس ہنگام دار و گیر میں قلم و قرطاس کے گوشہ عافیت کو ترجیح دی، مباحث سے الگ ہوگئے۔ شکر ہے کہ اب عمیق حنفی سراخوابی کے لمبے وقفے سے غوطہ لگا کر شعر کی ماہیت پر روشنی ڈالنے کے لئے قلم بکف ابھرے ہیں۔

سلیم احمد، جن کے بہت سے نظریات سے مجھے اختلاف ہے، بہر حال ذوق سلیم کے ساتھ ذہانت اور قوت ایجاد کے مالک تھے۔ انھوں نے جدید غزل کے مزاج کی تشکیل بھی کی، اور ان کے اثر نے۔ خدا انھیں بخشے، بہتوں کو گمراہ بھی کیا۔ مگر جب سنجیدگی سے انھوں نے غور کیا تو لکھا کہ "جدید غزل ایک بے کلچر معاشرے کی پیداوار ہے۔ ہم اپنا کلچر گم کر چکے ہیں اور نیا ہم نے ابھی پیدا نہیں کیا۔ اس لحاظ سے جدید غزل صرف ایک خلا میں سانس لے رہی ہے" نظم کے باب میں ان کے یہ جملے پڑھئے: "شاعری کی اصناف کے جو بہے بھلے نمونے موجود تھے، انھیں اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ ان سے کچھ سیکھا جاتا قصیدہ پر درباریرستی کا الزام تھا، مثنوی پر عشق بازی کا، مرثیہ کو ویسے ہی ایک محدود صنف سخن سمجھا جاتا تھا۔ غرض نظم نگاری کی تحریک کسی بڑی روایت کے تسلسل کے بجائے ہر روایت سے بغاوت کے اصول پر ہوئی .... اس کے پاس اپنا کوئی وجدان بھی نہیں تھا ... پیروی مغرب ہوئی تو مگر مغرب کی بھونڈی پیروی کی صورت میں" میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ جدید نظم نے ترقی پسند نظم کو رد کر کے اس سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا — حالانکہ آزادی کے بعد کی نئی نظم نے جن جہات میں اپنا سفر شروع کیا تھا، اس سے افق وسیع تر ہونا چاہئے تھا، خواہ ضمیر ظاہر کے رجزیہ بیانیہ طویل کینٹو ہوں یا عبدالعزیز خالد کی بقول یک — نقاد قصیدہ نما نظمیں، یا اس خاکسار کی طویل نظمیں (آزاد)، یا عمیق حنفی کی سند باد و شہرزاد وغیرہ یا خلیل الرحمٰن اعظمی کی ہجریات، یا مرثیہ کا نئی حسیت کے ساتھ احیا — یہ سب ہماری نظم کے سرمائے میں نئے ابعاد کے اضافے کی ضمانت بن سکتے تھے، مگر 'جدیدیت' کے ذہن بستہ تصور اور تصور بستہ اظہار نے سب کو یک قلم القط کر کے جس شاعری کو سراہا اور اسے مشتہر کیا، وہ نہ ہمارے تخلیقی تجربۂ اظہار سے کوئی مناسبت رکھتی تھی نہ ہمارے موجودہ مسائل اور زندگی کی ترجمان تھی۔ نتیجے میں صرف غزل، وہ بھی یکساں، یک رنگ اہمال زدہ غزل کی ارزانی ہوئی — جس کا تعلق نہ عصری شعور سے ہے نہ روایت سے۔

اگر کسی لحاظ سے ہمارا ادب ہماری زندگی سے وابستہ نہیں تو پھر ادبی رسائل و جرائد، شعر و افسانے کے نئے مجموعے دلچسپی اور بحث کا موضوع کیوں بنیں ؟ ہم ان کا بے تابانہ انتظار کیوں کریں ؟ اس عدم دلچسپی کو توڑنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اسباب اور بھی ہیں لیکن ان سے بحث کے لئے بعض اصناف کی تفصیلی بحث ضروری ہے —

(۱) اپنے عصر اور اس کے تقاضوں، اپنے معاشرے اور اس کے مسائل سے تخلیقی سطح پر وابستگی

اور اس کا سچا اظہار۔

(۲) کلاسکیت کی طرف واپسی کہ ابھی ہماری قدیم اصناف ادب میں توسیع اور اظہار کے بے پناہ امکانات ہیں۔ اپنی ادبی روایات کی بازآفرینی کے بغیر ہمارا ادب بے تہذیب خلا کا ادب بنا رہے گا۔

محض عصری حسیت اور جدیدیت کے نام کی تسبیح پڑھنے سے ادب کی عاقبت نہیں سنور سکتی۔

—— وحید اختر

وزیر آغا

کون اسے روک سکتا ہے ؟

زمیں پر جھاڑیاں
خیمے لگائے
منتظر بیٹھی ہیں
اس جھونکے کی — جو اک روز
پژمردہ پہاڑوں سے اتر کر آئے گا
خیموں کے پردوں کو
لرزتی انگلیوں سے چھو کے دیکھے گا
بڑے ہی پیار سے سہلائے گا
اور نیند سے نا آشنا
خیموں کے پردوں کے عقب سے جھانکتی آنکھیں
اسے حیرت سے دیکھیں گی
پھر اک آنسو بھری نازک سی سرگوشی اسے
آواز دے گی
اور کہے گی :
آ، خدارا آ !!
مجھے میرے بدن کے اس جہنم سے رہائی دے
مجھے آزاد کر مجھ سے !!

مگر جھونکا کہ اک صحرائی بدو ہے
کبھی خیموں کی جانب چور قدموں سے نہیں آتا
دہکتی سرخ آنکھوں
تیز لانبی برچھیوں سے لیس ہو کر
اک سیہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے چمٹا
وہ آتا ہے — تو دھرتی کانپ اٹھتی ہے
پرندے پھڑپھڑا کر آسماں کی سمت اڑتے ہیں
دبک جاتے ہیں غرّاتے ہوئے کتّے
طنابیں ٹوٹتی ہیں
لفظ مرتے ہیں
ہزاروں ساعتوں میں
وقت — کٹ کٹ کر بکھرتا ہے
سموں کی ضرب سے
خیموں کی ساری دھجیاں
چاروں طرف اڑ اڑ کے
گرتی ہیں
خزاں میں جس طرح
شاخوں سے پیلے پات گرتے ہیں

چمکتی ریت پر
چاروں طرف خیمے ہی خیمے ہیں
مکینوں سے کہو
پردوں سے مت جھانکیں
کھو پردوں سے لگ کر
یوں کھڑے رہنے کا آخر فائدہ کیا ہے
اسے آنا ہوا
تو کون اس کو روک سکتا ہے ؟

انور سدید

اردو ادب میں وزیر آغا کا مقام

وزیر آغا کے مطالعے میں سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کا ادب فطرت کی گود میں پرورش پاکر پروان چڑھا ہے اور انھوں نے اس نامعلوم کو تلاش کرنے کی کاوش سب سے زیادہ کی ہے جو اپنے ہمہ رنگ جلووں کے ساتھ ہمارے اطراف وجوانب میں موجود ہے اور کائنات کی ہر کروٹ کے ساتھ ہمارے سامنے اپنے متنوع اور بوقلموں مظاہر پیش کرتا رہتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس عہد کی میکانکی زندگی نے فرد کو پہلے خود غرض بنایا اور پھر فطرت سے اس کا رابطہ توڑ دیا۔ چنانچہ نامعلوم کی جستجو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی اور فرد مادے کے بوجھ تلے دب کر نان جویں کا غلام بن گیا۔ وزیر آغا کا ادب فرد کو مادّے کے بوجھ اور نان جویں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور فطرت کے ساتھ دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا مقصد انسانی المیے کو ابھارنا نہیں بلکہ گم شدہ مسرت کی بازیافت کرنا ہے، اس ضمن میں اولیں حیثیت وزیر آغا کی شاعری کو حاصل ہے جس میں ارضی مظاہر کو آفاقی تصورات کے ساتھ دربستہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور فرد کو اپنے زخم گننے کے بجائے کائنات کے بھنڈار سے اپنے حصے کی مسرتیں سمیٹنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ انشائیہ وزیر آغا کی تخلیقی شخصیت کا دوسرا روپ ہے۔ لیکن یہاں آفاقی تصورات ابھارنے کے بجائے موجودہ زندگی کے متحرک روپ کو پیش کرنے اور اس کی ہر گردش سے نیا لطف اٹھانے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ وزیر آغا کا انشائیہ مزاج اور فکر کے اعتبار سے ان کی شاعری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ان دونوں میں ایک حدِ امتیاز ضرور موجود ہے۔ شاعری میں ان کا رخ عمودی ہے اور وہ زمین کی سطح سے بار بار بلند ہوتے اور ان خشک سوتوں کو دوبارہ جاری کرتے ہیں جنھیں بیسویں صدی کے بیشتر شعرا نے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس انشائیہ میں وزیر آغا زمین کے ساتھ پیوست نظر آتے ہیں وہ فطرت کے بوقلموں مظاہر میں گھرے ہوئے اس کی ہر لرزش کا بھید معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ انشائیہ میں ان کی جہت بالعموم افقی نظر آتی ہے

اور وہ انسان کو وجود کے بوجھ سے نجات دلانے اور اسے لطافت احساس سے سرشار کرنے میں زیادہ کوشاں ہیں۔ وزیر آغا کا تیسرا روپ تنقید میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس میں تلاش و انکشاف کے زاویے زیادہ نمایاں ہیں تاہم ان کی تنقید اس حقیقت کا اثبات ہی ہے جو انھیں فطرت کے مطالعے اور تخلیق کے نادر تجربے سے حاصل ہوئی ہے۔ وزیر آغا کی ادبی شخصیت کی ان تینوں جہات کے پس پشت مشاہدے اور مطالعے کی کثیر روشنی موجود ہے، ان کے تخلیقی عمل اور فکری استدلال نے مشاہدے اور مطالعے کو متوازن امتزاج سے ایک ایسے اور جنل پیکر کو جنم دیا ہے جو اپنا روپ کبھی شاعری میں، کبھی انشائیے میں اور کبھی تنقید میں ظاہر کرتا ہے۔ اور اپنی ہر نمود کے ساتھ اردو ادب پر دیرپا اثرات ثبت کر دیتا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف تخلیق کا معیار قایم کیا ہے بلکہ ادب اور زندگی کی مختلف جہات اور تصورات پر ایک منفرد نظر ڈال کر اسے حقیقت کی ایک نئی پرت سے آشنا بھی کیا ہے میں اس اجمال کی تھوڑی سی مزید تفصیل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

وزیر آغا ادب کے میدان میں اس وقت داخل ہوئے جب برصغیر میں بیسویں صدی کی دو فعال تحریکیں آپس میں متصادم تھیں۔ بظاہر ان دونوں تحریکوں کا رخ انسان کی طرف ہی تھا اور ان تحریکوں کے ادبا دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاری سے پیدا شدہ بد اطمینانی کا احساس بھی رکھتے تھے۔ تاہم ان دونوں کے احساسی رویے اور اس کے تخلیقی اظہار میں نمایاں فرق تھا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو خارجی سطح پر متحرک کرنے کی کوشش کی، ادب کو ایک مخصوص نظریے کی ترسیل کا وسیلہ بنایا اور ان زخموں کی نمائش کا اہتمام کیا جنھیں دیکھنے کی سعادت ان ادبا کو بہت کم نصیب ہوئی تھی۔ بقول میراجیؔ "اس گروہ میں ایسے شعرا کی کثرت تھی جو کہ جذبات و خیالات کلیۃً اپنے نہیں تھے اور جن کے پاس کوئی ایسا خیال نہیں تھا جسے وہ شعر کے ذریعے پیش کرتے، اور اسی لئے انھوں نے چند تبلیغی باتوں کو جو نثر میں بہتر طور پر ادا کی جا سکتی تھیں۔ ایک سطحی اور کم و بیش غیر موثر انداز میں ظاہر کرنا شروع کر دیا۔" دوسری طرف جدیدیت کی تحریک نے جس کے ابتدائی ڈانڈے علامہ اقبال کی شاعری کے ساتھ ملتے ہیں اور جسے میراجی نے نئے خطوط پر استوار کرنے کی کاوش کی تھی شاعری کا فطری طریق استعمال کیا اور یوں اپنی ہستی کی گہرائیوں سے اس آواز کو ابھارا جو مرئی اور غیر مرئی کو آپس میں مربوط کر دیتی ہے۔ اور ایک نیا جہانِ معنی آشکار کرنے کے علاوہ خیال افروزی سے فرد کو موجود زندگی سے ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع بھی دیتی ہے۔ اس شاعری میں ندرت بھی

بھی تھی اور لطافت بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کی شاعری نے جو گھن گرج پیدا کیا تھا وہ عقل و دانش کے اظہار کے باوصف زمانے کو زیادہ عرصے تک متاثر نہ کرسکا۔ اس کے برعکس میراجی کے قبیل کے شعرا نے چونکہ جذبے کے انکشاف، اور احساس کی ترجمانی کے لئے تخلیق کا بالواسطہ طریق استعمال کیا تھا اس لئے اس میں سحر انگیزی زیادہ تھی۔ چنانچہ اسے قبول و دوام بھی حاصل ہوا اور مستقبل میں جدیدیت کے سوتے اسی شاعری سے پھوٹے۔

جدید اردو شاعری میں وزیر آغا کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم میں ہیئت کو بدلنے کے بجائے موضوعات کے تنوع کو روبہ عمل لانے کی کاوش کی۔ زرعی معاشرے میں زندگی گذارنے اور عملی طور پر کاشتکار ہونے کی وجہ سے انھیں تخلیقی عمل کو حیاتیاتی سطح پر معائنہ کرنے کا وافر موقعہ ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے زمین اور اس کے تمام مظاہر کے ساتھ ایک انوکھی وابستگی پیدا کی اور لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی ہوئی فطرت کا مشاہدہ کرنے، تصور کا نیا حسی دائرہ بنانے اور مظاہر کی ندرت دریافت کرنے اور حقیقت کو شاعری کی خوابناک صورت میں پیش کرنے کا تجربہ بھی کیا۔ وزیر آغا کے یہ تجربات اتنے نادر تھے کہ انھیں ابتدا ہی میں نظم جدید کے ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت میں قبول کرلیا گیا۔ وزیر آغا نے جدید اردو نظم کو اپنے انداز عمل سے بدلنے کی کاوش کی ہے تو انھوں نے موضوعات کے اچھوتے پن اور اپنے تخلیقی عمل سے اردو نظم کو ایک نئے مدار میں داخل کرنے کی سعی بھی کی ہے۔

جدید نظم کے ایک مشعل بردار کی حیثیت سے وزیر آغا نے لفظ کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور اس کے بطون سے جذبے کی پوشیدہ جوالا کو تلاش کرنے کی سعی کی۔ ان کی دوسری عطا یہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم کے لئے ایک نیا علامتی نظام عطا کیا اور لفظ کو جامد معنی کے سطحی مدار میں ظاہر کرنے کے بجائے لفظ کو علامت کی نئی ابعاد سے متعارف کرایا۔ اس تمام عمل میں بلاشبہ ان کی دونوں آنکھیں خارج کا ہی مشاہدہ کرتی ہیں لیکن ایک تیسری آنکھ جس کا تعلق تخلیق کے ساتھ ہے وہ ان کے داخل میں کھلتی ہے۔ اور یہ تیسری آنکھ مشاہدے کی دونوں آنکھوں سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ حقیقت جب وزیر آغا کے خلق کردہ علامت کا روپ دھارتی ہے تو مرئی دیوار کو توڑ کر ذات کے پھیلاؤ اور وجود کی مسافت کو بھی عبور کر جاتی ہے۔ خالص نظم کی یہ آواز ہمیں یوسف ظفر، قیوم نظر، خلیل الرحمٰن اعظمی، مجید امجد، منیر نیازی، ضیا جالندھری، بلراج کومل اور تخت سنگھ وغیرہ کے ہاں بھی ملتی ہے اور یہ ان کی انفرادیت کی بھی مظہر ہے۔ تاہم وزیر آغا کو ان سب میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے نظم جدید کے اس خالص روپ کو قبول عام کی سطح پر پہنچایا اور بہت سے نئے شعرا کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کی

تخلیقات سے معاشرے کے اجتماعی وجود (COLLECTIVE SELF) کو "اوراق" میں پیش کرنے کی کاوش بھی کی۔ اول الذکر شعرا کے ہاں تخلیقی سرگرمی تو بلاشبہ بہت ہے لیکن ان کے اثرات کا دائرہ خود ان کی ذات کے گرد ہی گردش کرتا ہے۔ اس کے برعکس وزیر آغا نے جدید نظم کی جو مثال اور نمائندہ تخلیقات پیش کیں ان کا محیط وزیر آغا کے فکری ارتقا کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا ہے اور یوں اس کے اثرات کا دائرہ بھی وسیع تر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کو میرا جی کے بعد جدید اردو نظم کی مضبوط، توانا اور فعال آواز قرار دیا گیا۔ اور اس تخلیقی جدیدیت کو جو وزیر آغا کی نظموں سے داخلی طور پر پھوٹ رہی تھی قبول کرنے میں کوئی عذر مانع نہ رہا۔

آزادی کے بعد اردو غزل نے روایت سے واضح انحراف کیا تھا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یادوں کے جلے ہوئے بسیرے اردو غزل میں در آئے تو غزل میں بے چارگی، پژمردگی اور مایوسی کی عمومی کیفیت کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا۔ اس دور میں وزیر آغا نے غزل کی طرف پیش قدمی کی تو اسے زیریں منزل سے بالائی منزل کی طرف سفر کا ایک قدم قرار دیا۔ غزل کی طرف یہ پیش قدمی چونکہ نظم جدید کے ایک خوش فکر شاعر نے اختیار کی تھی اس لئے وہ فنی رویّہ جو جدید نظم کی تخلیق میں روبہ عمل آتا ہے اب غزل میں بھی اپنا جوہر دکھانے لگا۔ چنانچہ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ غزل اپنی عمومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے باوصف اب شاعر کے وجود کی گہرائیوں سے بیدار ہونے لگی ہے اور یوں قلب و روح میں پرورش پانے والے احساسات و جذبات کا ذاتی زاویہ نسبتاً زیادہ روشن ہونے لگا ہے۔ اور غزل میں وزیر آغا کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اطراف و جوانب کے مظاہر و آثار کو ہی اردو غزل میں مروّج نہیں کیا بلکہ نظم کے مزاج کو غزل کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی کی اور یوں اجتماعی تجربے کا رخ شخصی تجربے کی طرف موڑ دیا۔ اردو غزل میں اس تجربے کی نہ صرف پذیرائی ہوئی بلکہ اب جو نئی آوازیں اُبھر رہی ہیں ان میں زندگی کے مانوس تجربات کو وزیر آغا کے سے تخلیقی انداز میں پیش کرنے کا رجحان موجود ہے۔ نتیجتاً اس سے غزل کا فن اب ایک نئی کروٹ لے چکا ہے۔

میرا جی کے عہد میں جدید شاعری کے متعدد ابتدائی سوالات اٹھائے گئے تھے اور ان سوالات کی دھند میں میرا جی کا تصادم ترقی پسند ادبا کے ساتھ عمل میں آیا تھا۔ تاہم درمیانی عرصے میں جب ترقی پسند تحریک کی سیاسی جہت آشکار ہو گئی اور اس کی تبلیغی شاعری نے اپنا اثر ضائع کر دیا تو یہ تصادم کچھ عرصے کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وزیر آغا نے نظم جدید کی نشاۃ ثانیہ کی اور نئے زمانے کے مزاج، جہت اور مسائل کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا سلسلہ شروع کیا تو وہ تمام سوالات جو میرا جی کے عہد میں لاینحل

رہ گئے تھے ایک دفعہ پھر سامنے آگئے۔ وزیر آغا نے سابقہ ادھورے سوالات کو وسیع تر تناظر میں پرکھنے کی کاوش کی تو وہ نظریاتی تصادم بھی ایک دفعہ پھر رد عمل آ گیا جو میرا جی کی وفات کے بعد معدوم ہو گیا تھا۔ وزیر آغا کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے لاینحل اور ادھورے سوالات کو نئے علوم کی روشنی میں حل کیا۔ چنانچہ اردو ادب میں وزیر آغا کو ایک ایسے نظریہ ساز کی حیثیت دی گئی جو امکانات کے تاریک جہاں کو نئے زاویوں سے منور کر دیتا ہے۔

ایک ادبی مفکر کی حیثیت سے وزیر آغا کی اولین نمود ان کی کتاب "مسرت کی تلاش" سے ہوئی تھی۔ اس کتاب میں مسرت کے فلسفے کو زندگی کے مختلف زاویوں سے سمیٹنے کی کاوش کی گئی ہے۔ یہاں وزیر آغا ہیں مولانا رومی، برٹرنڈ رسل، میکڈوگل، فرائیڈ، فاولر، اقبال، شیلے، سوامی رام تیرتھ اور لیو تانگ وغیرہ مغربی اور مشرقی مفکرین سے انجمن آرائی میں مصروف نظر آتے ہیں اور ان کے افکار کی روشنی میں مسرت کے مختلف زاویوں کو تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ ایقان بے حد معنی خیز ہے کہ مسرت کا حصول احساس تنہائی کو مغلوب کرنے اور دوسرے افراد کے قریب تر آنے میں ہی پنہاں ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے وزیر آغا نے انسانی زندگی کی جن جہتوں کو نمایاں اہمیت دی ہے کہ اس میں محبوب سے قرب، فن میں دوسروں تک بات پہنچانے کی دھن اور روحانی تصورات میں انسان کے لئے بے لوث محبت کا جنم وغیرہ چند ایسے زاویئے ہیں جن سے افراد کے مابین مفاہمت پیدا ہوتی ہے اور نتیجے میں اجتماعی مسرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وزیر آغا کی یہ کتاب ان کی ابتدائی تصنیفات میں شمار ہوتی ہے تاہم اس کتاب کی تفہیم کے لئے بھی وزیر آغا کے اطراف و جوانب بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ اور اس کتاب کے مطالعے سے بھی کئی ایسے مفکرین سے تعلق خاطر پیدا ہو جاتا ہے جو اردو ادب کے لئے یا تو بالکل اجنبی ہیں یا پھر جن کے افکار و نظریات پر روشن خیالی سے نظر نہیں ڈالی گئی۔

وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کو ایک عہد ساز اور عہد آفریں تصنیف قرار دیا گیا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وزیر آغا محدود نکتے کو نسبتاً کشادہ تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ تلاش حقیقت کے سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے مسرت کی ماہیت معلوم کرنے کی سعی کی تھی۔ "اردو شاعری کے مزاج" میں جب یہ نظریہ اخذ کیا گیا کہ شعر کا مزاج دھرتی کے مزاج سے تشکیل پذیر ہوتا ہے اور یہ باہر سے آئی ہوئی کروٹوں کو قبول کرنے اور خود میں سمو لینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ برصغیر کی شاعری نے گیت سے نظم تک جو ارتقائی سفر طے کیا ہے وزیر آغا نے اس تمام کا مطالعہ اس نظریئے کی روشنی میں کیا ہے اور اسے ثبوت برصغیر کے قدیم و جدید شعرا کے کلام سے فراہم کیا۔ ایک اور جملہ

نقاد کی حیثیت میں انہوں نے اردو شاعری پر متذکرہ نظریئے کے اطلاق تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس طویل مطالعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ گیت، غزل اور نظم اردو شاعری میں تخلیقی ابال کے تین مرحلے ہیں اور یہ مرحلے کائنات میں وجود کی نمو، جست اور ایک طویل سفر سے مشابہ ہیں۔ گیت عدم کی لکیر پر اس مقام پر جنم لیتا ہے جہاں انسان کے دل میں محبت کی پہلی کروٹ جنم لیتی ہے اور دل اپنے محبوب کو سامنے بٹھا کر اس کی پوجا کرتا ہے۔ غزل جذبے کی بنیاد پر تخیل کی جست کو پیش کرتی ہے اور بت کو مجبور کر کے ایک آئیڈیل تک پہنچ جاتی ہے۔ نظم کے امتیازی اوصاف تحرک، انفرادیت اور شعورِ ذات ہیں اس لئے نظم عدم کی لکیر سے منقطع ہو کر خود ایک الگ "کل" کی صورت اختیار کرتی ہے اور پھر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ "اردو شاعری کا مزاج" کی اشاعت سے پہلے گیت، غزل اور نظم میں جو امتیاز موجود ہے اسے صرف ہیئت کے فرق سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ وزیر آغا نے اس محدود تصور کو وسعت عطا کی اور واضح کیا کہ یہ تینوں اصناف مزاج کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں اور برصغیر پاک و ہند کے ثقافتی اور تہذیبی تناظر میں ان تینوں کو کسی ایک خاص مقام سے منسلک کرنا ممکن نہیں۔ وزیر آغا نے تلاش و تحقیق کے اسی سفر میں وادیٔ سندھ کی قدیم تاریخ تک ہی رسائی حاصل نہیں کی بلکہ تہذیب الارواح کے مختلف مدارج کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ وزیر آغا کے متذکرہ نظریات، ادب پر ان کا اطلاق اور استخراجِ نتائج وغیرہ اردو ادب کے لئے نئے تھے۔ چنانچہ ان سے نہ صرف تحرک پیدا ہوا بلکہ انہیں ایک نئی اور مسلسل بحث کا نقطۂ آغاز بھی قرار دیا گیا۔ یہ بحث گزشتہ ستر برسوں پر پھیلی ہوئی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کتاب نے اردو ادب پر مستقل اثرات ثبت کئے ہیں اور اردو تنقید کو ایک نئی جہت دے دی ہے۔ چنانچہ وزیر آغا کے تحلیلی انداز، تجزیاتی طریق اور ادب اور ادیب دونوں طرف مثبت رویے نے ادبی تنقید کی مدھم رفتار کو تیز تر کر دیا ہے۔

"اردو شاعری کا مزاج" میں اردو شاعری کی تین اصناف کی جرأت مندانہ پرکھ اور مزاجی اعتبار سے شعرا کے ہاں پرورش پانے والے مختلف رجحانات کا حقیقت افروز تجزیہ کرنے اور اردو ادب کو چند نئے نظریات سے پہلی دفعہ آشنا کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ تاہم میری نظر میں اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وزیر آغا اس کتاب کے ثمرات سمیٹنے کے بجائے اس پر اسرار عمل کی ماہیت معلوم کرنے پر مائل ہو گئے جس کے تحت مختلف فنون میں تخلیقات جنم لیتی ہیں۔ "اردو شاعری کا مزاج" میں وزیر آغا نے تخلیقی عمل کے شاداب موضوع کو متعدد مرتبہ مس کیا ہے، لیکن اس پر پوری نظر نہیں ڈالی۔ یہ موضوع اس کتاب کی تکمیل کے بعد بھی طویل عرصے تک ان کے ذہن پر چھایا رہا اور وہ اس پر مسلسل غور و فکر کرتے

رہے۔ وزیر آغا نے "اردو شاعری کا مزاج" میں غزل کو تخیل کی جست قرار دیا ہے تخلیقی عمل کے مطالعے میں
ان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ پورا تخلیقی عمل اصلاً وہ عمل ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ہی وجود کی
بامشقت قید سے رہائی پاتا ہے بالکل ایسے جیسے کوئی شے کسی مدار میں مسلسل گھومتے چلے جانے کے بعد
معاً ایک کر ایک نئے اور کشادہ تر مدار میں چلی جاتے۔ پرانے مدار سے نئے مدار میں داخل ہونے کے لئے
تخلیقی جست ضروری ہے اور یہ جست ہی ظہور تجلیات کے ایک نئے نقطے کا آغاز قرار پائی ہے۔ وزیر آغا
نے جست کے اس انقلاب آفریں نظریئے کو سماجی، تاریخی اور اسطوری حقائق سے مرتب کیا اور فنون لطیفہ
پر عملی اطلاق کر کے اسے مبین ثبوت فراہم کر دیا۔ وزیر آغا کا بنیادی تھیسس (THESIS) یہ ہے کہ:

"زندگی ایک ارتقائی تسلسل کے تحت دائرے کی لاکھوں برس پرانی کھائی میں گھومتی
چلی جاتی ہے مگر پھر کسی داخلی تموج کے باعث یکایک ایک زقند (LEAP) سی بھر کر
ایک ارفع تر اور کشادہ تر مدار میں پہنچ جاتی ہے۔ فرد اور معاشرے کے رشتے میں بھی
اس خاص زقند نے ہی اصل کام سرانجام دیا ہے اور اگر معاشرہ پرانے پتھر کے زمانے
سے راکٹ کے دور تک آ پہنچا ہے تو یہ سب ایسی مختلف جستوں کا ہی کرشمہ ہے جن کے
بارے میں انسانی تحقیق ابھی تک مہر بہ لب ہے۔ کائنات اور زندگی کا سب سے بڑا
راز بھی شاید یہی ہے کہ وہ دائرے کے عمل میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ گاہے گاہے
ایک پُراسرار سی جست بھی بھرتی ہے۔ یہ سوال کہ وہ آئندہ کب ایسا کرے گی یا اس
جست کی نوعیت کیسی یا توانائی کس قدر ہوگی انسانی فہم و ادراک سے بالا ہے۔۔"

تخلیقی عمل کے بارے میں وزیر آغا کا یہ تھیسس نہ صرف اہم تھا بلکہ یہ ایک بالکل نیا نظریہ تھا۔ وزیر آغا
نے تحقیق کی ایک ایسی زمین کو کریدا تھا جس میں پہلے کبھی ہل نہیں چلایا گیا تھا اور زمین اپنے خزینے
کو اپنے بطون میں چھپائے کسی زیرک اور نکتہ ور محقق کا انتظار کر رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب
مشرق میں وزیر آغا تخلیقی عمل میں جست کے نظریئے کو دریافت کر چکے اور ۱۹۷۰ میں ان کی کتاب
چھپ بھی گئی تو آٹھ نو سال کے بعد مغرب میں پرگوجائین نے (۷۹-۱۹۷۸ میں) اس کا مطالعہ طبیعات
کے زاویے سے کیا۔ پرگوجائین ادب کا آدمی نہیں اور اس کے مضامین مثلاً FROM BEING TO BECOMING،
TIME، ORDER OUT OF CHAOS اور STRUCTURE AND FLUCTUATIONS شائع
ہوئے تو انھیں بھی طبیعات کے مطالعوں میں ہی شمار کیا گیا۔ صنعت تحقیق کے اس فرق کی بنا پر وزیر آغا
کے نظریئے کا پرگوجائین کی دریافت سے موازنہ کرنا تو ممکن نہیں اور یوں بھی ان دونوں کے مطالعے ان کی

ذاتی اور آزادانہ تحقیق کا ثمر ہیں اور کسی ایک نتیجے پر پہنچنا محض اتفاقی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ زمانی اور معانی فاصلے کے باوجود وزیر آغا اور پرگوجائین کے نظریات بڑی حد تک مماثل ہیں۔ وزیر آغا جس نتیجے پر ادب کے راستے سے پہنچے ہیں تقریباً اسی نتیجے تک پرگوجائین طبیعات کے راستے پہنچا ہے اور یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ GERMINATING SEED جس پر وزیر آغا نے اپنا نظریہ استوار کیا ہے اسی سے پرگوجائین کی دریافت نے جنم لیا ہے۔ ایلون ٹافلر نے اپنی کتاب "تیسری لہر" (THE THIRD WAVE) میں اس نظریے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

PRIGOGINE'S WORK NOT ONLY COMBINES CHANCE AND NECESSITY BUT ACTUALLY STIPULATES THEIR RELATIONSHIP TO ONE ANOTHER. IN BRIEF HE STRONGLY SUGGESTS THAT THE PRECISE POINT AT WHICH A STRUCTURE "LEAPS" TO A NEW STAGE OF COMPLEXITY, IT IS IMPOSSIBLE IN PRACTICE AND EVEN IN PRINCIPLE TO PREDICT WHICH OF THE MANY FORMS IT WILL TAKE. BUT ONCE A PATHWAY HAS BEEN CHOSEN, ONCE A NEW STRUCTURE COMES INTO BEING, DETERMINATION DOMINATES ONCE MORE."

مندرجہ بالا اقتباس میں پرگوجائین نے مندرجہ ذیل تین نکتے پیش کئے ہیں:

۱۔ کوئی بھی سٹرکچر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک بذریعہ جست پہنچتا ہے۔

۲۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جست بعد میں کیا صورت اختیار کرے گی۔

۳۔ جبر اور قدر میں ایک رشتہ موجود ہے۔ ابتدا جبریت (DETERMINATION) سے ہوتی ہے۔ پھر زقند آتی ہے جو قدر کے تابع ہے۔ اس کے بعد ایک نیا مدار وجود میں آتا ہے اور جبریت پھر غالب آجاتی ہے۔

پہلے دو نقطوں کے بارے میں وزیر آغا کا ایک اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ اب تیسرے نکتے کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

" خود حقیقت بھی جو ازلی و ابدی ہے اپنے اظہار میں ان دونوں صورتوں

(جبر اور قدر) کو استعمال کرتی ہے مگر اس طور کہ جب جبر غالب نظر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے حقیقت حدود کے اندر سکون پذیر ہو گئی ہے۔ اور جب قدر مسلط ہوتا ہے تو وہ حدود کو توڑ کر باہر کی طرف لپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حدود سے اوپر اٹھنے کا عمل بنیادی طور پر ایک تخلیقی عمل ہے جسے قدر کے تحت شمار کرنا چاہئے۔ وجہ یہ کہ تخلیقی عمل ایک سے دوسرے مدار میں چلے جانے کا نام ہے۔ یوں پہلے مدار کے جملہ بندھن اور رشتے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور حقیقت اپنے شانت روپ سے باہر آنے کی دھن میں ریشم کے کیڑے کا سا کردار ادا کرتی ہے۔ یعنی وہ ریشم کے جال کو تار تار کرتی ہے (CHAOS) اور باہر نکل آتی ہے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ دوبارہ اپنے گرد ایک جال سا بننے لگتی ہے۔ یہ گویا جبر (DETERMINISM) کی ایک صورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقیقت کے شانت روپ میں مبتلا ہونے کا سارا عمل....

ایلون ٹافلر نے اپنا تھیسس پرگوجائین سے ماخوذ کیا ہے اور اس کے مطابق زرعی اور صنعتی نظام کی لہروں کے بعد جب تیسری تہذیبی لہر بیسویں صدی کے لگ بھگ دنیا میں آئی تو اس لہر کا انداز ارتقائی نہیں تھا بلکہ ایک جست کے ذریعے نمودار ہوئی تھی۔ ایلون ٹافلر کے الفاظ یہ ہیں :

THIS PRESUMABLY GOES FOR THE LEAP FROM THE SECOND WAVE TO THIRD WAVE CIVILIZATION AS WELL AS FOR CHEMICAL REACTION.

گویا جست کے متذکرہ نظریئے کو مضبوط بنانے کے لئے ایلون ٹافلر نے پرگوجائین سے ہی مدد طلب کی ہے۔ ایلون ٹافلر کی کتاب THE THIRD WAVE جس میں اس نے یہ موقف اختیار کیا۔ ۱۹۸۰ میں شائع ہوئی جب کہ "تخلیقی عمل" جس میں ایلون ٹافلر کے تھیسس کا بنیادی خیال موجود ہے۔ ۱۹۷۰ میں چھپی تھی ایلون ٹافلر نے پرگوجائین کے انکشافات سے اپنا تھیسس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ وزیر آغا نے حیاتیات کے تصور (MUTATION) کا پہلی بار ۱۹۷۰ میں سماج اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اطلاق کر کے ایک نیا تھیسس پیش کر دیا تھا۔ مزید آگے بڑھنے سے قبل مندرجہ ذیل اقتباس "تخلیقی عمل" سے ملاحظہ کیجئے جس میں ایلون ٹافلر کے THIRD WAVE کا بنیادی تھیسس موجود ہے۔

"آج کی مغربی تہذیب کا حال کچھ یوں ہے کہ وقت کی کشادہ مرج ٹھہری گئی ہے

مگر اس سطح پر ان گنت لہریں متلاطم ہیں اور شکست و ریخت (CHAOS) کا میلان دم بدم شدت اختیار کر رہا ہے۔ یہ کیفیت دیوبالا کے روایتی طوفان کے مماثل ہے کہ اس کے نتیجے میں بے ہیئتی کی فضا پیدا ہو رہی ہے جو ہمیشہ نئی تقلیب (MUTATION) کا گہوارہ ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ تقلیب کے آثار جا بہ جا نظر آنے لگے ہیں۔ چاند کی تسخیر اور دوسرے سیاروں کی اور دوسرے سیاروں کی متوقع فتح، نیز ریڈیو دوربین کے ذریعے کائنات کی وسعتوں کا ادراک ـــ یہ تمام باتیں ایک نئے شعور کی آمد کا اعلامیہ ہیں۔ مگر یہ نیا شعور صرف طبیعات تک محدود نہیں۔ حیاتیات، علم الانسان، نفسیات اور دوسرے علوم کے ذریعے جو انکشافات ہو رہے ہیں وہ بھی ایک نئے انسان ہی کی جھلک پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسا انسان جو بالآخر شکست و ریخت کے ملبے کے نیچے سے برآمد ہو گا اور کائنات کے بارے میں ایک نیا زاویۂ نگاہ پیش کر دے گا۔ مغرب کے زوال پسند حکما نے صرف چھال کے تڑخنے کا منظر دیکھا ہے۔ ابھی تک وہ بیسویں صدی کی تخلیقی قلب ماہیت (یہ وہی چیز ہے جسے ایلون ٹافلر نے تیسری لہر (THIRD WAVE) کا نام دیا ہے۔) کا شعور حاصل نہیں کر سکے لیکن اب کچھ سرگوشیاں سی ہونے لگی ہیں۔ مثلاً اس خیال کا اظہار کہ جب زندگی نے سمندر سے خشکی پر قدم رکھا تو یہ ایک بہت بڑی تخلیقی جست تھی اور اب کہ انسان نے ہوا کے سمندر سے خلا کے سمندر میں قدم رکھا ہے تو یہ کسی طور پر بھی مقدم الذکر سے کم نہیں۔ بہرحال بیضہ کے اندر سے خول کو ٹھونگے مارنے کی آوازیں مسلسل اور متواتر آنے لگی ہیں۔ دیکھئے غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔"

وزیر آغا کی کتاب "تخلیقی عمل" چونکہ اردو میں چھپی اور اس کا انگریزی ترجمہ تا حال مکمل نہیں ہوا[1] اس لئے اس کے اثر و عمل کا دائرہ برصغیر تک محدود رہا۔ تاہم اس سے یہ حقیقت ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ وزیر آغا روایتی انداز کے نقاد نہیں۔ ان کا فکر اپنے معاصر فکر سے آگے ہے۔ وہ حقیقت کو نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں اور تلاش و جستجو کے اس عمل میں منفرد نتائج اور جنل نظریات پیش کرتے ہیں

---

[1] پروفیسر آر۔ اے۔ خان نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر تا حال وہ ترجمے کا کام نہیں کر سکے۔ (انور سدید)

وزیر آغا کی متذکرہ کتاب کا ترجمہ اگر انگریزی میں ہو جاتا تو مجھے یقین ہے کہ اس کی بازگشت مغرب کے علمی حلقوں تک بھی پہنچتی اور اس کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ مجموعی طور پر اب یہ کہنا ممکن ہے کہ وزیر آغا نے اردو تنقید کو عالمی تناظر میں ابھارنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے مغربی علوم سے استفادہ تو کیا ہے لیکن وہ اس سے مرعوب ہرگز نہیں ہوئے۔ چنانچہ نتائج حاصل کرنے میں وہ اپنی مشرقیت کو کو قربانی کی بھینٹ نہیں چڑھاتے۔

تخلیقی عمل کے بعد وزیر آغا کے ہاں ایک اور تھیسس کے خدوخال ابھر رہے ہیں اور یہ ایک بہت پرانے مسئلہ یعنی BEING اور BECOMING یا جوہر اور وجود کو ایک بالکل دائرۂ نور میں لانے کی کاوش قرار پا سکتے ہیں۔ وزیر آغا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کے ہاں آگہی کے دو پیٹرن موجود ہیں، ان میں ایک تو واہمی (MYTHICAL) ہے اور دوسرا منطقی۔ وزیر آغا لکھتے ہیں :

> "قدیم انسان کے ہاں جب آگہی کا نزول ہوا تو اول اول اس کا واہمی پہلو ہی منظر عام پر آیا۔ یہ پہلو جوہر یا معنی کا وہ ادراک تھا جس کی انسان نے "نام" سے نشان دہی کی۔ نام گویا شے یا واقعہ کی غالب ترین اور اہم ترین خصوصیت یا جوہر کا تشخص تھا۔ یوں واہمی سوچ نے تمام تر روشنی کو ایک نقطہ پر مرتکز کر دیا۔ مگر بعد ازاں جب منطقی سوچ نے جنم لیا تو روشنی کا دائرہ بتدریج پھیلتا چلا گیا اور آگہی کی حدود پھیل کر تعقلات اور تجریدی تصورات تک چلی گئی۔"

وزیر آغا کا تھیسس یہ ہے کہ انسان واہمی سوچ کی مدد سے اپنے بطون کی غواصی کرتا ہے اور وہاں سے قوت حاصل کر کے باہر کی طرف لپکتا ہے۔ یہ قوت منطقی سوچ ہے جو اسے کائنات کو تصرف میں لانے اور تعقلات قائم کرنے کی روش پر گامزن کرتی ہے اور اس کی آگاہی کے دائرے کو کشادہ کر دیتی ہے مگر پھر جب قوت صرف ہو جاتی ہے تو انسان واپس آتا ہے اور واہمی سوچ کی مدد سے ایک بار پھر اپنے اندر اترتا ہے جہاں اسے دوبارہ نئی قوت ملتی ہے اور وہ ایک بار پھر باہر کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ اندر اترنے اور باہر لپکنے کا یہ انسانی وطیرہ ازلی و ابدی ہے اور سسی فس کے اسطورے گہری مماثلت رکھتا ہے کہ چٹان کو لڑھکا کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچایا جائے اور شام کو چٹان لڑھک کر دوبارہ زمین پر آجائے مگر چونکہ یہ اسطور (ABSURDITY) اور بے معنویت کے احساس کو سامنے لاتی ہے اس لئے وزیر آغا نے اسے عبور کر کے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ہر بار جب انسان باہر کی طرف لپکتا ہے تو سابقہ مدار کو پار کر کے ایک نیا کشادہ مدار وجود میں لاتا ہے۔ گویا انسان کی آگہی کا دائرہ وسیع

سے وسیع تر ہو رہا ہے اور اس لئے انسانی مساعی بے معنویت کے ذیل میں نہیں آتیں۔ وزیر آغا نے دوسرا نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ ہر بار جب انسان باہر کی طرف لپکتا ہے تو آگہی کی نئی شمعیں روشن کرتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ شمعیں تو بجھ جاتی ہیں لیکن ان کی تو LUMINOSITY اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ لہذا انسان کے بار بار اپنے بطون میں اترنے، وہاں سے پرومیتھیس کی طرح روشنی چرا کر لانے اور اس روشنی سے آگہی کی شمعیں جلانے کا جو عمل ہے اس سے پوری کائنات بتدریج روشن ہو رہی ہے۔ وزیر آغا کے الفاظ یہ ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسا ذی روح ہے جسے روشنی کی مشعل (آگہی) تو حاصل ہوگئی ہے مگر جسے ابدی تاریکی زود یا بدیر اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ اور روشنی کا یہ ننھا سا نقطہ بجھ کر رہ جاتا ہے۔ تاہم انسان جس مشعل کو جلاتا ہے اس کی لو تصورات، خیالات اور تخلیقی مظاہر کی صورت میں مشعل کے بجھ جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ جیسے جیسے انسانوں کا کارواں اس اندھیری کائنات میں آگے ہی آگے بڑھتا ہے اور مشعلیں نمودار ہوتی اور بجھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک پراسرار لو (LUMINOSITY) میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں کائنات آہستہ آہستہ ایک مستقل نوعیت کی پراسرار روشنی سے منور ہو رہی ہے یعنی اسے اپنی ہی ذات کی آگاہی حاصل ہونے لگی ہے۔ چونکہ اسے یہ آگاہی انسان کی وساطت سے حاصل ہو رہی ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہم انسان ہی اس کائنات کی "آگاہی" ہیں۔ مگر اس کی سزا ہمیں یوں ملی ہے کہ ہم آگاہی کے آشوب میں مبتلا ہوگئے ہیں، آپ چاہیں تو اس سزا کی ابتدا کو زوال آدم خاکی کے واقعے سے بھی منسوب کر سکتے ہیں۔"

فلسفہ میں BEING اور BECOMING کو دو مخالف اور متضاد کیفیتوں کے روپ میں ابھارا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان دونوں میں ذنگل ہو رہا ہے۔ وزیر آغا نے اس مسئلہ کو ایک بالکل نئی روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ ایک دوسری کو کروٹ دیتی ہیں۔ BECOMING کا سارا تحرک اور بے قراری ہمیشہ BEING کے اندر سے جنم لیتی ہے اور پھر جب یہ تحرک اور یہ بے قراری ختم ہو جاتی ہے تو BEING میں سے دوبارہ تحرک کی ایک لہر برآمد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دونوں متضاد اور مخالف نہیں

ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں، وزیر آغا اپنی نئی کتاب "آشوب آگہی" میں دہبی سوچ اور منطقی سوچ کے اسی ربط باہم کو عالمی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کتاب کے چند ابواب "اوراق" میں شائع ہو چکے ہیں اور ان سے وزیر آغا کے بنیادی تھیسس تک رسائی ممکن ہے۔ ان کا یہ مطالعہ مکمل ہو گیا تو علمی و ادبی حلقوں میں اسے ایک اوریجنل (ORIGINAL) نظریے کی حیثیت حاصل ہوگی اور یہ اذہان کو برانگیختہ کرنے میں بھی بے حد معاون ثابت ہوگا۔

شاعری اور تنقید میں وزیر آغا نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں انھیں پیش نظر رکھا جائے تو وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں کی کہکشاں میں بالکل الگ اپنے حصے کی روشنی نمایاں طور پر پھیلاتے نظر آتے ہیں۔ وہ عالمی سطح کے ان عہد ساز ادیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہیں جنھوں نے ادب پر اپنے مستقل اثرات ثبت کئے ہیں اور تنقیدی مباحث سے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کہکشاں میں دبِ اکبر کی طرح انھیں دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس دبِ اکبر کے ستاروں سے اگر خطِ مستقیم کھینچا جائے تو ذرا سے فاصلے پر انشائیہ کا ستارا نظر آتا ہے جو اکیلا چمک رہا ہے اور جس کی تمام روشنی وزیر آغا کی ذات سے چھنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انشائیہ وزیر آغا کی تخلیقی جست بھی ہے اور ان کی شخصیت کی آئینہ دار بھی، وہ اس صنف کے کوزہ گر بھی ہیں اور انھوں نے ہی اسے گلِ کوزہ فراہم کی ہے۔ ان کے نزدیک بیسویں صدی میں انشائیہ وہ واحد صنف ہے جو سماجی ہمہ اوست کے بحرِ بیکراں میں ایک آزاد جزیرے کا منظر دکھانے پر پوری طرح قادر ہے۔ انھوں نے انشائیہ کو ادب کے لمحاتِ آزادی کا بہترین اظہار قرار دیا ہے اور یہ ایسی آزادی ہے "جس کے صدر دروازے سے گزر کر ادیب آفاقیت کے بے نہایت ایوان میں داخل ہو جاتا ہے"۔ چنانچہ انشائیہ وزیر آغا کے لئے ایک صنف اظہار ہی نہیں بلکہ ایک طریقِ حیات بھی ہے۔ شاعری وزیر آغا کے تصورات، تجربات اور احساسات کا بالواسطہ اظہار ہے لیکن انشائیہ میں انھوں نے زندگی کا مرقع ذوق پیدا کیا ہے۔ شاعری اور تنقید میں ان کی حیثیت ایک ایسے مجدّد کی ہے جو کنویں کا پرانا پانی نکال پھینکتا ہے اور پھر اسے نئے، تازہ اور مصفّٰی پانی سے بھر دیتا ہے۔ انشائیہ کے فن میں ان کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے انشائیہ کی تخلیق اور تنقید کے علاوہ اس صنف کا صحیح ادراک بھی پیدا کیا۔ عامۃ الناس کے مزاج کی تربیت کی اور انھیں انشائیہ نگار کی آنکھ سے زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر آغا کے مروجہ انشائیہ سے قبل اردو ادب کے بعض نامور مصنفین کی غیر افسانوی نثر میں انشائیہ کے بکھرے ہوئے نقوش موجود تھے۔ سرسید نے ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کے طرز پر رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور ایڈیسن اور سٹیل کے انداز میں مضامین لکھے

تو ان مضامین میں سے چند ایک کا مزاج انشائیہ کے مزاج کے قدرے قریب تھا۔ عبدالحلیم شرر، میر ناصر علی دہلوی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حسین، فلک پیما مہدی افادی، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے مضامین کے بعض حصے سیاق و سباق سے منقطع کر لئے جانے کے بعد انشائیہ کے قریب آجاتے ہیں ۔
وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انشائیہ لکھنے کی کاوش کی تو اسے قابل تقلید مثال بھی فراہم کر دی۔ وہ اردو کے واحد تخلیق کار ہیں جو ایک طویل عرصے تک اس نووارد صنف میں تنہا قلم آرائی کرتے رہے اور اب جب کہ وہ "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک" اور "دوسرا کنارا" کی صورت میں انشائیوں کے تین مجموعے پیش کر چکے ہیں تو کہا جا سکتا ہے اردو ادب میں انھوں نے نہ صرف سب سے زیادہ انشائیے لکھے ہیں بلکہ انشائیہ نگاروں کی ایک نئی کہکشاں مرتب کرنے میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ چنانچہ اب انشائیے کا جتنا حلقۂ ادب ہے وہ وزیر آغا کے مدار میں ہی سرگرم سفر دکھائی دیتا ہے۔

وزیر آغا نے اپنی شاعری، تنقید اور انشائیہ سے ادب کا نیا ادراک پیدا کرنے کی سعی کی تخلیق کے وسیلے سے وزیر آغا نے کائنات کی لرزش خفی کو سننے اور اس کے بطون میں پوشیدہ اسرار کو یونانی مفکروں کے انداز میں سوال اٹھا کر تلاش کرنے اور اپنی خلاقانہ قوت سے آفاقی قدروں کا سراپکڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مثبت اور منفی میں سے کسی ایک کی طرفداری نہیں کی۔ بلکہ ان دونوں کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دے کر ان میں ادغام پیدا کرنے کی سعی کی۔ وزیر آغا انسان کے بنیادی گناہ کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ زندگی کی جاوداں قدروں اور انسان کی سرشت سے خیر کے زاویوں کو ابھارتے ہیں۔ زندگی پر ان کا ایقان مثبت ہے۔ اپنے مذہبی اور روحانی شعور سے وہ روح کی طہارت کرتے ہیں اور عملی طور پر ایک ایسے پا بہ گل انسان نظر آتے ہیں جن کی نگہ آسمانوں پر ہے۔ انھوں نے مقدار اور معیار دونوں زاویوں سے اردو ادب کو اتنی جاندار چیزیں دی ہیں کہ ذہنی تحفظات اور تعصبات کے باوجود ان کے فن کا اور ادب پر ان کے اثرات کا اعتراف بڑے پیمانہ پر کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا کو ایسے ادبا اور مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے جن کے نظریات، تصورات اور افکار نہ صرف اپنے عہد کے لئے اہم ہوتے ہیں بلکہ جو آنے والے زمانوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ☐

وزیر آغا (انشائیہ)

دسترخوان

ایک زمانہ تھا کہ اہل وطن فرش پر دسترخوان بچھاتے، آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھانا کھاتے۔ پھر جو زمانہ بدلا تو ان کے نیچے کرسیاں اور سامنے میز بچھ گئی جس پر کھانا چن دیا جاتا۔ پہلے وہ سر جوڑ کر کھاتے تھے اب سروں میں فاصلہ نمودار ہوا اور روبرو بیٹھا ہوا شخص مدِ مقابل نظر آنے لگا۔ مگر زمانہ کبھی ایک حالت میں قیام نہیں کرتا۔ چنانچہ اب کی بار جو اس نے کروٹ لی تو سب سے پہلے پلیٹ کو ہتھیلی پر سجا کر اور سرو قد کھڑے ہو کر طعام سے ہمکلام ہونے کی روایت قائم ہوئی پھر ٹہل ٹہل کر اس پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ انسان اور جنگل کی مخلوق میں جو ایک واضح فرق پیدا ہو گیا تھا کہ انسان ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا جب کہ جنگلی مخلوق چراگاہوں میں چرتی پھرتی تھی اور پرندے دانے دنکے کی تلاش میں پورے کھیت کو تختۂ مشق بناتے تھے، اب باقی نہ رہا اور مدتوں کے بچھڑے ہوئے سینہ چاکان چمن ایک بار پھر اپنے عزیزوں سے آملے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا ہماری تہذیب کا گراف نیچے سے اوپر کی طرف گیا ہے تو میں کہوں گا کہ بے شک ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے کیوں کہ ہم نے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کی روایت کو ترک کر کے کھڑے ہو کر اور پھر چل کر کھانا کھانے کے وطیرے کو اپنا لیا ہے جو چرنے یا دانہ دنکا چگنے ہی کا ایک جدید روپ ہے۔ کسی بھی قوم کے اوپر جانے یا نیچے آنے کا منظر دیکھنا مقصود ہو تو یہ نہ دیکھئے کہ اس کے قبضۂ قدرت میں کتنے علاقے اور خزانے آئے یا چلے گئے۔ فقط یہ دیکھئے کہ اس نے طعام اور شرکاء طعام کے ساتھ کیا سلوک کیا!

بچپن کی بات ہے۔ ہمارے گاؤں میں ہر سال کپڑا بیچنے والے پٹھانوں کی ایک ٹولی وارد ہوتی تھی۔ یہ لوگ سارا دن گاؤں گاؤں پھر کر ادھار پر کپڑا بیچنے کے بعد شام کو مسجد کے حجرے میں جمع ہوتے اور پھر ماحضر تناول فرماتے۔ وہ زمین پر کپڑا بچھا کر دائرے کے انداز میں بیٹھ جاتے۔ درمیان میں شوربے سے بھری ہوئی ایک پرات بحرالکاہل کا منظر دکھاتی جس میں پڑے گوشت کی بوٹیاں ننھے منے جزیروں کی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتی۔ وہ ان بوٹیوں کو احتیاط سے نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر

دیتے اور شوربے میں روٹیوں سے ٹکڑے بھگو کر ان کا ملیدہ سا بنانے لگتے جب ملیدہ تیار ہو جاتا تو شرکا طعام پوری دیانت داری کے ساتھ آپس میں بوٹیاں تقسیم کرتے اور پھر اللہ کا پاک نام لے کر کھانے کا آغاز کر دیتے۔ وہ کھانا رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر کھاتے مگر پشتو بغیر رُکے بے تکان بولتے۔ مجھے ان کے کھانا کھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ میں ہر شام حجرے کے دروازے میں آ کھڑا ہوتا، انھیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ وہ بھی مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے اور کبھی کبھی برادرانہ اخوت میں لتھڑا ہوا ایک آدھ لقمہ یا گوشت کا ٹکڑا میری طرف بھی بڑھا دیتے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان پٹھانوں کی پیش کش کو اگر کوئی مسترد کر دے تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ اس لئے میں بادلِ نخواستہ ان کے عطا کردہ لقمہ ترکو کلے میں دبا کر آہستہ آہستہ جگالی کرتا اور تا دیر انھیں کھانا کھاتے دیکھتے رہتا۔ عجیب منظر ہوتا۔ وہ کھانے کے دوران میں کمال سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے جب ایک شخص لقمہ مرتب کر لیتا تو پہلے اپنے قریبی ساتھیوں کو پیش کرتا اور ادھر سے جزاک اللہ کے الفاظ وصول کرنے کے بعد اسے اپنے منہ میں ڈالتا۔ اخوت، محبت اور بھائی چارے کا ایک ایسا لازوال منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا کہ میں حیرت زدہ ہو کر انھیں بس دیکھتا ہی چلا جاتا اور تب میں دسترخوان پر کھانا کھانے کے اس عمل کا اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل سے موازنہ کرتا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی کیوں کہ ہمارے گھر میں صبح و شام ہانڈی تقسیم کرنے والی بڑی خالہ کے گرداگرد بچوں کا ایک ہجوم سا جمع ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے جب بڑی خالہ کھانا تقسیم کر رہی ہوتیں تو ہماری حریص آنکھیں ہانڈی میں ڈوئی کے غوطہ لگانے اور پھر وہاں سے برآمد ہو کر ہمارے کسی شگی ساتھی کی رکابی میں اترنے کے عمل کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتیں۔ اگر کسی رکابی میں نسبتاً بڑی بوٹی چلی جاتی تو بس قیامت ہی آ جاتی ایسی صورت میں خالہ کی گرج دار آواز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہم بڑی بوٹی والے کی تکا بوٹی کرنے پر تیار ہو جاتے اور چھینا جھپٹی کی اس روایت کا ایک ننھا سا منظر دکھاتے جو نئے زمانے کے تحت اب عام ہونے لگی تھی۔

اسی زمانے میں کبھی کبھار ایک انگریز افسر بھی والد صاحب سے گھوڑے خریدنے کے لئے آ جاتا والد صاحب اس کے لئے میز کرسی لگواتے، انگریزی کھانا تیار کرواتے اور پھر گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ چونکہ ہم بچوں کو انگریز افسر کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی اور ویسے بھی ہمیں اس سے بہت ڈر لگتا تھا اس لئے ہم اکثر کھڑکی کی جالی کے ساتھ چہرہ لگا کر اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتے اور حیران ہوتے کہ صاحب بہادر کھانا کھا رہا ہے یا آپریشن کر رہا وہ اپنی پلیٹ میں ایک ابلا ہوا آلو لے کر بیٹھ جاتا اور پھر چھریوں اور کانٹوں سے گھنٹوں اس کے پرخچے اڑاتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میدانِ جنگ

میں کھڑا ہے۔ آلو اس کا دشمن ہے جسے وہ اپنے اسلو کی مدد سے زیر کرنے میں مصروف ہے۔ وہ جو کھانے کے معاملے میں رواداری، مفاہمت اور لطف اندوزی کا روادار ہوتا ہے، اس انگریز افسر میں مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ بعد ازاں جب انگریز قوم کی عادات و اطوار سے آگاہی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کو اپنی اس سلطنت کی حفاظت کے لئے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، جنگی مشقیں کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لئے وہ کھانے کی میز پر بھی اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں۔ سو ان کے لئے کھانا جسم کو برقرار رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ دشمن کو زیر کرنے کا ایک شاخسانہ ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی روایت ہمارا عزیز ترین ثقافتی ورثہ تھا جس کے ساتھ ہم نے عزیزانِ مصر کا سا سلوک کیا اور اب یہ روایت اول تو کہیں نظر ہی نہیں آتی اور کہیں نظر آجائے تو مارے شرمندگی کے فی الفور خود میں سمٹ جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ دسترخوان پر بیٹھنا ایک تہذیبی اقدام ہے جب کہ کھڑے ہو کر کھانا ایک نیم وحشی عمل ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو دائیں بائیں یا سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے آپ کے برادرانہ مراسم فی الفور استوار ہو جاتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں جیسے چند ساعتوں کے لئے آپ دونوں ایک دوسرے کی خوشیوں غموں اور بوٹیوں میں شریک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے بیٹھا ہوا آپ کا کرم فرما کمال دریا دلی اور مروّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پلیٹ کا شامی کباب آپ کی رکابی میں رکھ دیتا ہے تو جواب آں غزل کے طور پر آپ بھی اپنی پلیٹ سے مرغ کی ٹانگ نکال کر اسے پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھانے کے دوران لین دین کی خوشگوار فضا از خود قائم ہو جاتی ہے جو ہماری ہزار ہا برس کی تہذیبی یافت کی مظہر ہے۔ ایک لحظہ کے لئے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص آپ کا مدمقابل ہے اور اگر آپ نے ذرا بھی آنکھ جھپکی تو وہ آپ کی پلیٹ پہ ہاتھ صاف کر جائے گا۔ دسترخوان کی یہ خوبی ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی اعتماد کی فضا بحال ہو جاتی ہے اور آپ کو اپنا شریکِ طعام حد درجہ معتبر، شریف اور نیک نام دکھائی دینے لگتا ہے۔ دوسری طرف کسی بھی بوفے ضیافت کا تصور کیجئے تو آپ کو نفسا نفسی، خود غرضی اور چھینا جھپٹی کی فضا کا احساس ہوگا اور ڈارون کا جہد البقا کا نظریہ آپ کو بالکل سچا اور برحق نظر آنے لگے گا۔

دسترخوان کی ایک اور خوبی اس کی کفالت ہے۔ جب آپ دسترخوان پہ بیٹھتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی جملہ ضروریات کو بے طلب پورا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ سامنے دسترخوان پر ضرورت کی ہر چیز موجود ہے حتیٰ کہ اچار چٹنی اور پانی کے علاوہ خلال تک مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ دسترخوان

پر بیٹھنے کے بعد اگر آپ کسی کو مدد کے لئے بلانے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو میزبان نے حق میزبانی ادا نہیں کیا یا مہمان نے اپنے منصب کو نہیں پہچانا۔ خود کفالت دراصل ہماری ثقافت کا ایک امتیازی وصف ہے اور اس کا ہماری قناعت پسندی بلکہ تقدیر پرستی سے بھی ایک گہرا تعلق ہے۔ اپنے دیہات ہی کو لیجئے جو ہماری ثقافت کی صحیح ترین نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ اب تو خیر ان میں پہلی سی بات نہیں رہی ورنہ صدیوں تک انھوں نے نمک اور حملہ آور کے علاوہ شاید ہی کبھی کوئی چیز درآمد کی ہو ——
دلچسپ بات یہ ہے کہ کسان اپنے لئے خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے جو اس کے جسم کی ساخت اور تعمیر میں حصہ لیتی ہے مگر پھر جب اس کا اپنا بدن زمین کا رزق بن جاتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد زمین اسے دوبارہ غذا میں منتقل کر کے آئندہ نسلوں کو پیش کر دیتی ہے۔ اور یہ بات انسان تک ہی محدود نہیں۔ دیہات میں تو پرندوں، حیوانوں، پودوں اور انسانوں کی نسلیں سدا ایک دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یکجائی اور ہم مزاجی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انھیں محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں بجائے خود ایک دسترخوان ہے جو کھیتوں کے عین درمیان بچھا دیا گیا ہے جس پر وہ نسل در نسل بیٹھتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ ایک نسل جب کھانے سے فارغ ہو جاتی ہے تو دوسری نسل دسترخوان پہ آ بیٹھتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گزر جانے والی نسل، آنے والی نسل کے لئے غذا بن کر دسترخوان پر سج جاتی ہے مگر آنے والی نسل کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس رغبت سے اپنے ہی بزرگوں کی ہڈیاں چبا رہی ہے۔

دسترخوان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ آپ کو زمین سے قریب کر دیتا ہے جب کہ میز کرسی پر آتے ہی آپ زمین کے لمس سے محروم ہو جاتے ہیں اور جوتے پہننے کا عمل تو آپ کو زمین سے بالکل منقطع ہی کر دیتا ہے زمین ایک زندہ، دھڑکتی اور پھڑکتی ہوئی شئے ہے جس کی تحویل میں ایک پر اسرار قوت بھی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو نہ صرف اس قوت کی موجودگی کا علم تھا بلکہ وہ قدم قدم پر اس کے لمس سے بھی آشنا بھی ہوتے تھے۔ وہ کہتے کہ یہ قوت زیر سطح قوسوں، دائروں اور لکیروں کی صورت میں رواں دواں رہتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی ان کھانے میں بھی ان میں سے کسی لکیر کو چھو لیتا ہے تو اسے زمین کی قوت ایک برقی جھٹکے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ تب وہ زمین کے فیوض و برکات کے حصول کے لئے ان لکیروں اور کھائیوں کی تلاش کرتے اور جس مقام پر یہ لکیریں یا کھائیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ملتیں وہیں اپنے گھوڑے یا مندر تعمیر کرتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ مقام دراصل زمین کی پر اسرار قوت کے سرچشمے ہیں —— مگر پھر یوں ہوا کہ انسان بتدریج زمین سے منقطع ہو کر پہلے چوباروں پھر میناروں پر چڑھ گیا اور زمین سے جو اس کی ماں بھی تھی اور ان داتا بھی کٹتا اور دور ہٹتا چلا گیا۔ دسترخوان

کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زمین کے سینے سے چمٹا دیتا ہے تاکہ وہ براہ راست زمین سے اس کی پر اسرار قوت کو کشید کر سکے دسترخوان دراصل زمین کا لباس ہے اور دسترخوان پر بنی ہوئی قوسیں دائرے اور لکیریں زمینی قوت کی گزرگاہوں کے مماثل ہیں۔ چنانچہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں تو اس کی غذائیت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ میز کرسی پر یا چل پھر کر کھانا کھائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کھانے میں وہ برقی رَو موجود نہیں جو زمین کی شریانوں سے دسترخوان کی قوسوں اور پھر وہاں سے انسان کی رگوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔

دسترخوان آپ کو زمین کے لمس ہی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ انگلیوں کے لمس سے بھی متعارف کرتا ہے۔ چھری کانٹے یا چمچے سے کھانا کھانے میں وہ لطف کہاں جو ہاتھ سے کھانے میں ہے۔ اسی میں دوہرا لطف ہے ایک تو اس چیز کا لطف جو کھائی جا رہی ہے دوسرے انگلیوں کے لمس کا لطف! ممکن ہے آپ کہیں کہ میز کرسی پر بیٹھ کر یا چل پھر کر بھی تو انگلیوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جی ہاں یہ ممکن تو ہے مگر ایسے ہوتا نہیں۔ وجہ یہ کہ ہاتھ سے کھانا کھانے کے لئے آپ کے جسم کا ایک جگہ ڈھیر ہونا ضروری ہے اور یہ بات دسترخوان کے بغیر ممکن نہیں ڈائننگ چیئر پر بیٹھنا سرکس کی رسی پر کھڑا ہونے کے مترادف ہے چنانچہ کرسی سے پھسل جانے کا خطرہ ہمہ وقت سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ ایسے میں کوئی انگلیوں کے لمس سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہی حال بوفے ضیافت کا ہے۔ وہاں دو مسئلے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کس طرح ہتھیلی پر بیک وقت پلیٹ، چمچہ، روٹی اور نیپکن کو بیلنس کیا جائے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام ہے بلکہ اسے آرٹ کہنا چاہئے جو ویسے کی سینکڑوں ضیافتوں سے گزرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ٹریفک کا ہے جب آپ بوفے ضیافت کے جملہ مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو ہر قسم کی ٹکروں، دھکوں اور خلاف ورزیوں سے خود کو اور اپنی رکابی کو بچانا ہوتا ہے ایسے میں اگر آپ انگلیوں کی مدد سے کچھ کھانے کی کوشش کریں بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں کیوں کہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں آپ کو اپنی خوبصورت انگلی بھی ایک مڑا ہو بد وضع کانٹا ہی نظر آتی ہے۔

دسترخوان لامسہ ہی کو تسکین نہیں دیتا، شامہ، سامعہ اور باصرہ کو بھی سیراب کرتا ہے جب مہمان دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو مختلف کھانوں کی خوشبو آن واحد میں ان تک جا پہنچتی ہے اور جب پہنچتی ہے تو اس فراوانی کے ساتھ کہ وہ اسے نہ صرف ایک مشروب کی طرح پیتے ہیں بلکہ اس کی مختلف اقسام میں تمیز بھی کر لیتے ہیں مثلاً نان کی سوندھی باس، پلاؤ کی گرم خوشبو سے مختلف شے

ہے اور مجن کی تیز مہکار، فرنی کی ٹھنڈی سگندھ سے ایک جدا مزاج رکھتی ہے ـــــ یہ انکشاف دسترخوان پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بوفے ضیافت میں تو کھانوں مہمانوں بیہروں اور قناتوں کی ملی جلی خوشبو ایک ایسی بھاری بوجھل شے بن جاتی ہے کہ اسے خوشبو سے ہم رشتہ کرنا بھی بدمذاقی کی دلیل ہے سامعہ کی تسکین کا پہلو بھی دسترخوان پر ہی ممکن ہے یہاں کھانے والے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ہر کھانے والے کے ذہن سے ہڈیوں کے کٹر کٹرانے اور لقمے کے دانتوں میں پسنے کی آواز ایک شیریں نغمے کی طرح آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور آپ پر کیف و سرور کی بارش کر دیتی ہے۔ دسترخوان پر ہی آپ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہر کھانے والے کی زبان، دانت، تالو اور ہونٹ کھانے کے دوران مل جل کر ایک ایسی مخصوص آواز نکالتے ہیں جو نہ صرف دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے بلکہ جس میں کھانے والے کی ساری شخصیت سمائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کے اصل کردار سے آشنا ہونا ہو تو کھانے کے دوران اس کے منہ سے برآمد ہونے والی آوازوں پر کان دھریں کیوں کہ ہر شخص کے اندر کی ساری شرافت یا خباثت اس کے کھانے کی آواز ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

رہا باصرہ کا معاملہ تو اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔ دسترخوان پر آرام اور سکون سے بیٹھنا نصیب ہو تو کھانے کو نظر بھر کر دیکھنے کی فرصت بھی ملتی ہے۔ ورنہ دوسرے موقعوں پر کس بدبخت کو کبھی معلوم ہوا ہے کہ جس شے پر وہ دندانِ طمع تیز کئے ہوئے ہے وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر پوری دل جمعی سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور بوفے ضیافت میں انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھانا زہر مار کرنے میں وہی فرق ہے جو محبت اور ہوس میں ہے، خوش بو اور بو میں ہے، صبح کی چہل قدمی اور سوگز کی دوڑ میں ہے۔ □

وزیر آغا

کچھ نثری نظم کے بارے میں

اوراق غالباً اردو کا وہ پہلا جریدہ تھا جس نے نثری نظم کے موضوع پر ایک بھرپور بحث "سوال یہ ہے!" کے تحت پیش کی۔ یہ واقعہ پنڈورا کے صندوق کا ڈھکنا ہٹانے کے مترادف تھا کیوں کہ اس کے بعد پورے برصغیر ہند و پاک میں نہ صرف نثری نظم کی حمایت اور مخالفت میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا بلکہ ہمارے اکثر شعرا نے (انھوں نے بھی جو شعرا نہیں تھے) اور خاص طور پر ہماری نئی پود نے چند سالوں میں نثری نظموں کے انبار لگا دیئے۔ چونکہ یہ ساری تخلیق کاری کسی اندرونی طلب کے بجائے فیشن پرستی کے تابع تھی اس لیے ہزاروں تخلیق کردہ نثری نظموں میں سے ایک بھی اس دعویٰ کے ساتھ پیش نہ کی جا سکی کہ وہ زندہ رہنے والی تخلیق ہے حالانکہ جب آزاد نظم کا آغاز ہوا تھا تو ہمارے شعرا نے چند ہی برسوں میں متعدد ایسی نظمیں تخلیق کر ڈالی تھیں جو آج بھی زندہ ہیں۔ جہاں تک اوراق کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں نہ جانے کیسے یہ غلط تاثر پھیل گیا کہ وہ "نثری نظم" کا مخالف ہے حالانکہ اس بحث کے بعد بھی اوراق نے متعدد بار اپنے اداریوں میں اس بات کا اظہار کیا کہ چونکہ وہ جدیدیت کا حامی ہے اور ہر طرح کے ادبی تجربے کو خوش آمدید کہتا ہے اس لئے وہ نثری نظم کا بھی خیر مقدم کرے گا۔ البتہ اوراق کا موقف یہ تھا کہ "نثری نظم" شاعری نہیں بلکہ نثر کی توسیع ہے۔ لہٰذا اسے شاعری کے زمرے میں شامل کر کے غدر کی سی صورت حال پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ اوراق نے اس کے لئے "نثر لطیف" کی ترکیب وضع کی اور اسے ایک نئی صنف ادب کا درجہ دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اس کے امتیازی اوصاف کی نشاندہی ہو جانی چاہئے۔ بایں ہمہ اکثر لوگ اسے شاعری ہی سمجھتے رہے۔ پچھلے دنوں ریاض مجید نے اوراق کے اس موقف کی حمایت کی کہ نثری نظم شاعری نہیں ہے تاہم "نثر لطیف" کی ترکیب کے بجائے انھوں نے نثری نظم کے لئے "نثم" کا نام تجویز کیا۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتے تھے کہ نثری نظم نہ تو شاعری ہے اور نہ نثر بلکہ ان دونوں کا امتزاج ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا "نثری نظم" کی یہی ایک پہچان ہے کہ وہ نثر اور نظم کا مجموعہ ہو؟ کیوں کہ تجریدی اور علامتی افسانے سے لے کر انشائیہ بلکہ ڈراما تک میں شاعری کے عنا

سے مل جاتے ہیں۔ تو کیا انہیں بھی نثری نظم کے دائرے میں سمیٹ کیا جائے؟ بات دراصل یہ ہے کہ شاعری (POETRY) اور شعری مواد (POETIC CONTENT) میں بڑا فرق ہے۔ شعری مواد تو ہر صنف ادب میں (کم یا زیادہ) موجود ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تحریر مشکل ہی سے ادب کے تحت شمار کی جاسکے۔ رہا شعری مواد کی نوعیت کا مسئلہ تو اس کی بحث میں لفظ کے تخلیقی پیکروں سے لے کر تشبیہ، استعارہ، علامت اسطور، تلمیح غرض کہ بہت کچھ شامل ہوتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں بھی انشا کا ٹکڑا سیدھی لکیر پر رواں دواں ہونے کے بجائے قوسوں میں چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے بلکہ اور قوسوں میں چلنا ایک تخلیقی رویہ ہے۔ نثر کو ادب کی سطح پر لانے کے لئے شعری مواد کے بغیر چارہ نہیں۔ مگر شعری مواد بجائے خود شاعری نہیں ہے شاعری اس وقت وجود میں آتی ہے جب شعری مواد آہنگ سے مملو ہو جاتا ہے۔ بحر کے دائرے میں آئے بغیر شعری مواد میں شعریت اور غنائیت کی وہ نیت پیدا نہیں ہو سکتی جسے سحر کاری کا نام ملا ہے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ کوئی سا اچھا شعر لے کر اسے نثر میں ڈھال دیں یا ویسے ہی محض ایک آدھ لفظ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر اس کا آہنگ توڑ دیں تو ہر چند کہ اس کے شعری مواد میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ لفظوں میں کوئی کمی بیشی ہوگی مگر یہ شعر شاعری کے دائرے سے خارج ہو کر نثر کی سطح پر آجائے گا۔ یہ بات دوسری زبانوں کی شاعری کے تراجم میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ ترجمہ شعری مواد کو تو پیش کر دیتا ہے مگر اس آہنگ کو پیش نہیں کر پاتا جس میں اصل نظم تخلیق ہوئی تھی حقیقت یہ ہے کہ نظم اور اس کے آہنگ میں وہی رشتہ ہے جو جسم کا سانس کے زیر و بم سے ہوتا ہے۔ سانس کے آہنگ کو روک دیجئے تو وہ شعری پیکر جسے ہم نے جسم کا نام دے رکھا ہے آنِ واحد میں مرجھا کر بکھر جائے گا۔

جہاں تک میں غور کر سکا ہوں اردو میں نثری نظم کی آمد کسی داخلی طلب کے باعث نہیں بلکہ انحراف اور بغاوت کی اس رَو کے باعث ہے جو اخلاقی اور مذہبی اقدار، سماجی بندھنوں اور مشینی نظریات کے خلاف مغرب میں عام ہوئی اور جسے ہم نے وہاں سے لاتعداد دوسری اشیا کے ساتھ درآمد کر لیا۔ مغرب میں انحراف اور بغاوت ایک واضح ردّعمل ہے، ہمارے ہاں محض ایک فیشن! مغرب کی سوسائٹی اس وقت کٹھالی میں ہے، رشتے، روابط اور ضابطے بڑی تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں اور وہاں کا فرد ہر دم تغیر پذیر صورت حال سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لئے قدم قدم پر خود کو تبدیل کرنے پر مجبور ہے۔ لہٰذا ہر شعبۂ زندگی میں بڑے پیمانے پر تجربات کر رہا ہے۔ مذہبیات اور معاشیات سے لے کر ازدواجی زندگی اور پھر فن کی تخلیق تک تجربات کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ جب کوئی پرانا نظام ٹوٹتا ہے تو ہزاروں دوسرے نظام اس کی جگہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب میں یہی

کچھ ہو رہا ہے ۔ وہاں کا فرد ہر نئی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک نیا ہتھیار (تجربہ) آزماتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ نیا ہتھیار کارآمد ثابت نہیں ہوا تو اسے پھینک کر کسی اور حربے کو آزمانے لگتا ہے ۔ یوں وہاں ایک THROW AWAY CULTURE نمودار ہو رہا ہے جس میں کوئی چیز بھی دائمی حیثیت نہیں رکھتی ۔ اخلاقیات سے لے کر بد معاشیات تک ، ہر چیز تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور فرد کو بھی اس تبدیلی کے ساتھ خود کو تبدیل کرنا پڑ رہا ہے ۔ یہ بات ادبی معاملات میں بطور خاص بہت نمایاں ہے ۔ فکشن کی بات چھوڑیئے ۔ خود شاعری کو لیجئے کہ اس میں کتنے متنوع تجربے ہوئے ہیں ۔ مغرب کے شعرا کو شاعری کے ایسے پیمانے درکار ہیں جو اس کی ذات کے اندر برپا ہونے والے طوفان اور اس کی نظروں کے سامنے ہمہ وقت ٹوٹتے ہوئے آفاق کو گرفت میں لے سکیں ۔ چنانچہ وہ مصوری سے لے کر بھی فنِ تعمیر حتیٰ کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں ہونے والے تجربات سے بھی اثرات قبول کرتا ہے اور اپنے شعری پیمانوں کو بقدرِ ضرورت تبدیل کرتا جاتا ہے ۔ لہٰذا مغرب میں کسی نئی صنفِ سخن کا وجود میں آنا ایک بڑے معاشرتی تناظر ہی میں اپنی کوئی معنویت رکھتا ہے ۔ اس کا ہیئت کے "تجربہ برائے تجربہ" سے کوئی تعلق نہیں ۔ بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ مغرب میں داخلی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فرد نے اپنے اظہار کے اسالیب کو اتنی بار بدلا ہے کہ اب یہ تبدیلی کوئی عجوبہ یا غیر معمولی چیز نہیں رہی ۔ مغرب میں ہر شخص ، لباس ، خوراک ، رہنے سہنے کے انداز بلکہ نظریات تک کو قبول یا رد کرنے کے معاملہ میں آزاد ہے اور دوسرے لوگ اس کی آزادی میں مخل نہیں ہوتے ۔ اگر وہاں کوئی مرد زنانہ لباس پہن کر برسرِ عام آ جائے تو لوگ اسے بھی ایک تبسم زیرِ لب سے زیادہ کا مستحق نہیں سمجھتے ۔ لہٰذا ادب کے معاملے میں بھی وہاں ہیئت کے تجربات یا نئی اصنافِ ادب کے رواج کو کسی جذباتی ردِعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ۔ جس طرح وہاں لوگ شخصی آزادی کے حق کو تسلیم کرتے ہیں ویسے ہی ادبی معاملات میں بھی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے ۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں آزادی کے یہ اقدامات فیشن کے طور پر نہیں بلکہ ضرورت کے تحت وجود میں آتے ہیں اور یہ ضرورت ہے اپنی ذات کو ہر دم تغیر پذیر ہوتے ہوئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی! چنانچہ شاعری میں بیشتر تحریکات کو اہمیت ملی ہے مثلاً امیجزم ، کیوبزم ، سرریلزم ، تجریدیت وغیرہ ۔ یہ مسئلہ کہ ان شعری رویوں اور تحریکات کو کس قسم کے پیمانوں میں پیش کیا جا رہا ہے اس بات کو انھوں نے اپنا دردِ سر نہیں بنایا جب کہ ہمارے ہاں شعری رویوں اور شعری تحریکات کے اصل جوہر کو تو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا البتہ پیمانوں کے معاملے میں مرنے مارنے کی صورت بار بار سامنے آتی ہے ۔ آزاد نظم کے سلسلے میں بھی دیکھئے

کہ جھگڑا اس بات پر نہیں تھا کہ آزاد نظم میں پیش کی گئی شاعری قابلِ اعتراض ہے یا نہیں۔ اعتراض صرف یہ تھا کہ آزاد نظم کیوں ہے، پابندکیوں نہیں ہے؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم ہیئت کے معاملے کو اتنی مریضانہ سنجیدگی کے ساتھ کیوں لے رہے ہیں؟

اس کے لئے ہمیں اپنے معاشرتی منظر نامے پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ بیسویں صدی کے موج در موج تبدیلیوں کے باوجود ہمارا معاشرہ ابھی تک جڑا ہوا ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان دوطرفہ آمد و رفت جاری ہے۔ اقدار، ضابطے اور پیٹرن سلامت ہے۔ سماجی نظام اور اس کا مظہر یعنی "گھر" ابھی ثابت و سالم ہے۔ ہمارے انداز نظر پر سماج کی گرفت اتنی کڑی ہے کہ سماجی ضابطوں سے معمولی سا انحراف بھی ہماری آنکھوں کو چبھتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بدبخت اگر مروج لباس کے علاوہ کوئی اور لباس زیبِ تن کرے، بالوں کو مقررہ لمبائی سے ذرا سا بڑھا یا گھٹائے یا سر پر مقبول عام "سر پوش" کے بجائے کوئی نامانوس سی ٹوپی رکھے تو فوراً انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ شخصی آزادی (بالخصوص کسی دوسرے کی شخصی آزادی) کے ہم بالکل قائل نہیں ہیں۔ ہر بات ضابطے اور روایت کے مطابق ہونی چاہئے۔ حتیٰ کہ بعض تو اس بات پر مُصر ہیں کہ شاعری میں بھی اساتذہ کے نقوشِ قلم سے سرمو انحراف نہ کیا جائے اور ساری زندگی ضرب الامثال کے چھتر تلے بسر کر دی جائے۔ ایسے منضبط ماحول میں معمولی سا انحراف بھی بغاوت متصور ہوتا ہے۔ اردو میں نثری نظم کی طرف ہمارے شعرا بالخصوص نوجوان شعرا کے میلان کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ چونکہ ہمارے نوجوان اپنے ہم عصر مغربی نوجوان کی تقلید میں باغی رویوں کو اپنانے کے خواہش مند ہیں اور انھیں علم ہے کہ ہمارا معاشرہ ہیئت کی تبدیلی (جو ظواہر کی تبدیلی کے مترادف ہے) کے خلاف فوری ردعمل کا اظہار کرتا ہے لہٰذا انھوں نے نثری نظم کے ذریعے اپنے تئیں شاعری کی منضبط ہیئت کو بدلنے کی کوشش کر کے گویا بغاوت اور انحراف کا علم بلند کیا ہے۔ مغرب میں نثری نظم کا رواج چونکانے یا ڈرانے کے لئے نہیں بلکہ ایک نئے داخلی منطقے سے آشنا ہونے کے لئے تھا۔ ہمارے ہاں یہ محض ایک باغی رویّہ ہے دوسری طرف نثری نظم کے خلاف ردعمل بھی ہماری اس "سماجی آنکھ" ہی کی کارستانی ہے جو ہیئت کی معمولی تبدیلی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ سو ہمارے ہاں نثری نظم کو رواج دینے والے نیز اس کے خلاف محاذ آرائی کرنے والے ــــ دونوں اپنے خاص سماجی تناظر میں محبوس ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نثری نظم ایک چیلنج کے طور پر ابھر آئی ہے جس کے خلاف محاذ آرائی کو ہمارے بعض بزرگ صلیبی جنگوں کا سا تقدس تفویض کر رہے ہیں۔

بایں ہمہ میں نثری نظم کو مسترد کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور نہ اس کے احکامات ہی کو نظر

انداز کرنے کا خواہاں ہوں۔ مگر میں اس بات کے حق میں یقیناً ہوں کہ اس نئی صنف ادب میں طبع آزمائی کرنے سے پہلے ہمیں اس کی حدود اور مزاج کا تعین کر لینا چاہئے۔ مغرب والوں نے نثری نظم کے سلسلے میں کبھی اس بات کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اسے قبول کرنا چاہئے یا رد! وجہ یہ کہ مغربی معاشرت میں شخصی آزادی کے تحت ہر قسم کے تجربے کی کھلی اجازت ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ماں کار تجربہ کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ اگر کامیاب ہو جائے تو ٹھیک ہے کامیاب نہ ہو تو پھر کوئی اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ ہمیں بھی نثری نظم کو تجربے سے گزرنے کی پوری اجازت دینی چاہئے کہ یہ کس حد تک ثمر بار ہوئی ہے۔ اور یہ جبھی ممکن ہے کہ ہم پہلے نثری نظم کے مزاج کا احاطہ کریں۔ مثلاً اس بات پر اصرار کرنا کہ "نثری نظم" شاعری ہے، اس کے فروغ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب میں شعری مجموعوں کے علاوہ افسانوں کے مجموعوں میں بھی نثری نظمیں شامل ہیں ـــــ اس فرق کے ساتھ کہ شعری مجموعوں میں انھیں بعض اوقات نظم کے انداز میں بھی لکھا گیا ہے جب کہ افسانوں کے مجموعوں میں یہ چھوٹے چھوٹے افسانوں کے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ گویا ابھی تک نثری نظم کی فارم کا تعین نہیں ہوا اور نہ اس کی ضرورت ہی محسوس کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغرب میں نثری نظم ـــــ شاعری اور فکشن دونوں سے جدا ہو کر ایک تیسری منفرد حیثیت میں ابھری رہی ہے۔ یہ تیسری حیثیت کیا ہے؟ ـــــ اس کا بھی تعین ہونا باقی ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ نثری نظم کو شاعری سمجھا گیا ہے اس لئے اسے تولا بھی شاعری کے دھرم کانٹے پر ہی گیا ہے۔ یوں نثری نظم کا اصل مزاج نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ انسانی سائکی میں مختلف منازل یا منطقے ہیں جن میں سے ہر ایک تک کسی خاص صنف ادب کا رہوار ہی پہنچ سکتا ہے۔ سو اگر شاعری کے منطقے کو "نثری نظم" کی مدد سے چھونے کی کوشش ہو تو نتیجہ معلوم! ۔ البتہ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ انسانی سائکی میں کہیں نہ کہیں کوئی منطقہ ایسا ضرور ہے جسے نثری نظم ہی منکشف کر سکتی ہے۔ مغرب میں لکھی گئی نثری نظم سے اس منطقے کی موجودگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے مگر ہماری نثری نظم سے بالکل نہیں ہوتا۔ وجہ یہ کہ ہم نثری نظم کو شاعری کے تابع کر کے اس کی پرکھ کے راستے میں خود ہی مزاحم ہو گئے ہیں۔ □

غزلیں

وزیر آغا

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

سحر کی اوس سے کہنا کہ ایک پل تو رکے
کہ ناپسند ہے ہم کو خاک پر رہنا

تمام عمر ہی گزری ہے دستکیں سنتے
مجھے تو راس نہ آیا خود اپنے گھر رہنا

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

سفر عزیز ہوا کو مگر عزیز ہمیں
مثالِ نکہتِ گُل اس کا ہم سفر رہنا

شجر پہ پھول تو آتے رہے بہت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا اس کا بے ثمر رہنا

عجیب طرزِ تکلم ہے اس کی آنکھوں کا
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا

ورق ورق نہ سہی عمرِ رائیگاں میری
ہوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا

ذرا سی چوٹ لگی اور گھر کو اوڑھ لیا
کہاں گیا وہ تمھارا نگر نگر رہنا

محشر بدایونی

برگ و بار، سی - ۵۷، بلاک ایل
شمالی ناظم آباد، کراچی، پاکستان

پناہ اب نہیں دیوار و در کے اندر بھی
کبھی مکاں تھا مکاں کی حدوں سے باہر بھی

کچھ ایسی گھر میں ستارہ فشانیاں ہوئیں رات
مجھے تو اچھا لگا تیرگی کا منظر بھی

میں خود کو کس لئے کم مایۂ سفر سمجھوں
مری بساطِ ہنر دشت بھی سمندر بھی

جو سرد خوں تھے غمِ روزگار سے گزرے
میں تازہ دم ہوں کڑی دھوپ سے گزر کر بھی

اڑیں ہوا میں نہ یوں تازہ واردانِ ہنر
ابھی نکلنا ہے اگلی مسافتوں پر بھی

مرا ہی جوہرِ فن کیا کہ فرق بینوں کو
گمانِ کذب نمائی ہے آئینوں پر بھی

حیدر قریشی
مدیر اعلیٰ جدید ادب، نزد ہیڈ پوسٹ آفس
خان پور، ضلع رحیم یار خان (پاکستان)

مامتا

میں لان میں کھڑی جہاز کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہوں۔ اس جہاز میں میری ممی گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہیں۔ ڈیڈی انہیں سی آف کرنے ائیرپورٹ تک گئے ہوئے ہیں۔ زری اور روبی بھی ممی کے ساتھ گئی ہیں ——— جہاز میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور میں آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر جانے لگتی ہوں۔ ڈرائنگ روم میں آکر میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی ہوں۔

ڈرائنگ روم کی سامنے کی دیوار میں ایک بڑا سا آئینہ نصب ہے ——— اچانک مجھے اس آئینے میں ایک خوبصورت سا جہاز پرواز کرتا نظر آتا ہے ——— میں تھوڑا غور سے دیکھتی ہوں ——— اُف فوہ ——— (حیرت ہے!) ——— اس میں ——— اس میں تو میری امّی کی روح پرواز کر رہی ہے۔

"امّی آپ نے تو ساری زندگی ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا تھا پھر موت کے بعد یہ جہاز کا سفر کیسا؟" میں امّی سے پوچھتی ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں پہنچ گئی ہوں۔ امّی کو مختلف انجکشن لگائے جا رہے ہیں ——— ہم سب بھائی بہن ان کے سرہانے کھڑے ہیں۔ اور ڈیڈی۔ (نہیں ڈیڈی نہیں ابو ——— ڈیڈی ممی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ابو امّی کے ساتھ ———) ابو کے چہرے پر گہری تشویش جھلک رہی ہے۔ عجیب سے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ابو کا چہرہ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے گلے سے لپٹ جاؤں ——— مگر میں نے تو آج تک منہ در منہ کبھی ابو سے کوئی فرمائش تک بھی نہیں کی۔ جو کچھ بھی مانگنا ہوتا امّی کی معرفت مانگتی یا پھر چٹ لکھ کر مانگتی ——— پھر میں اتنی جرأت کیسے کروں ——— میں نے گھبرا کے ابو کے چہرے سے نظریں ہٹالی ہیں اور امّی کی طرف دیکھنے لگی ہوں۔ امّی کی بجھی بجھی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئی ہیں اور میری آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔

میں سیتی ڈریم سے واپس ڈرائنگ روم میں آگئی ہوں۔ آئینے میں اب وہ خوبصورت جہاز نظر نہیں آرہا۔ ابو—— نہیں ڈیڈی، ڈیڈی ائیرپورٹ سے واپس آگئے ہیں۔ میں نے ایڈو کے ابو کو خیریت سے پہنچنے کا خط ابھی تک نہیں لکھا اس لئے خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔

سوئیٹزرلینڈ سے زیبی کا خط آیا ہے۔ وہ بڑے مزے کی سیر کر رہے ہیں۔ ممی نے ڈھیروں پیار بھیجے ہیں—— آج ڈیڈی بھی ایک ہفتہ کے لئے سوئیٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔

ڈیڈی چلے گئے ہیں اور میرے ابو میرے پاس آگئے ہیں۔

"چلو بیٹی تمہاری امی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی"—— ڈالڈر کی خوبصورت وادی اور اس میں بہتا ہوا دریائے سرن کا صاف و شفاف پانی سوئیٹزرلینڈ کی کسی بھی وادی سے کم نہیں۔ لیکن ابو ان تمام نظاروں سے لاتعلق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کی طرف تیزی سے چل رہے ہیں۔ میں دو تین دفعہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گرنے لگتی ہوں مگر ابو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لئے بچ جاتی ہوں۔ ہم امی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارے بہن بھائی وہاں موجود ہیں۔ صرف زیبی نہیں ہے۔ امی پوچھتی ہیں "زیبی کہاں ہے؟"—— ابو خاموش کھڑے ہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ "سوئیٹزرلینڈ گئی ہوئی ہے" مگر کہہ نہیں سکتی کیوں کہ جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے آخر میں کھڑی تھی بڑھ کر آگے آجاتی ہے۔

امی کے سرہانے پڑے ہوئے آکسیجن کے سلنڈر دیکھ کر مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

ابو کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہیں اور میں پھر ڈیڈی کے ڈرائنگ روم میں واپس آگئی ہوں۔ یہاں ایڈو کے ابو میرے منتظر ہیں۔

"کہاں گئے سب گھر والے؟"

"ممی، زیبی اور روبی دو ماہ کے لئے اور ڈیڈی ایک ہفتہ کے لئے سوئیٹزرلینڈ چلے گئے ہیں"

"تمہیں کیوں نہیں ساتھ لے گئے" ایڈو کے ابو کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا ہے۔

"ایک تو اس لئے کہ لاہور سے سوئیٹزرلینڈ شیخوپورہ کی طرح نہیں ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گھر پر بھی تو کسی کو رہنا تھا"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری سگی ماں زندہ ہوتی اور تم اسے اس طرح ملنے آتیں تو وہ اگلے دن تمہیں گھر چھوڑ کر کہیں سیر کو چلی جاتی؟"

"دیکھئے مجھے میری ممی کے خلاف نہ بھڑکائیے۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کا بے حد خیال رکھتی

ہیں۔ آپ ایسی باتیں کر کے میرے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں ــــــ؟"

"میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں"

"مرد ہمیشہ عورت کو بھکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے اور عورت ــــــ وہ اپنی سادگی کے باعث بھر نا کردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے ــــــ آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے............"

قلم گرنے کی آواز سن کر میں بھی چونک اٹھتی ہوں۔ گرے ہوئے قلم کو اٹھا کر پھر سے ایڈو کے ابو کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں ــــــ مگر یہ کاغذ پر اب تک کیا لکھتی رہی ہوں ــــــ؟

ابو ــــــ ابو ــــــ ممی ــــــ ابو ــــــ ڈیڈی ــــــ امی ــــــ ممی ــــــ ڈیڈی۔

اپنی حماقت پر جھینپ کر پھر ایڈو کے ابو کو ان کے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی ایک ہفتہ سوئیٹزر لینڈ گذارنے کے بعد واپس آگئے ہیں۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیڈی سے ہر حال میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ امی کی وفات کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک ابو ہی رہے پھر محض ممی سے شادی کے بعد آپ ڈیڈی کیوں بن گئے؟ آپ پھر سے ابو کیوں نہیں بن جاتے؟ ــــــ مگر میں جانتی ہوں کہ میں اتنی جرأت کے ساتھ تو کبھی ابو کے سامنے بھی نہ بول سکی تھی پھر ڈیڈی کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــــ شاید امی اس سوال کا جواب دے سکیں! ــــــ یہ سوچ کر میں پھر سینی ٹوریم کی طرف چل پڑی ہوں ــــــ ابو ابھی تک ڈاکٹر سے کوئی مشورہ کر رہے ہیں ــــــ میں امی کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔ امی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں ــــــ ہڈیوں کا ڈھانچہ ــــــ مہاتما بدھ کی تصویر میری آنکھوں کے آگے گھوم گئی ہے۔ ہماری خاموش آنکھیں امی سے سوال کر رہی ہیں۔

امی نے بھیا کے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ بھیا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اب رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں۔ وہ بھی اشکبار ہے ــــــ اب زیبی کو پیار کیا ہے مگر وہ حیران حیران سی امی کو دیکھ رہی ہے۔ سب سے آخر میں امی نے مجھے بلایا ہے۔ جب میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی ہیں تو میں نے ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھے ہیں۔ راکھ کے ڈھیر میں دو چنگاریاں! ــــــ میں "امی جی" کہہ کر انھیں لپٹ جاتی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔ شاید یہ ممتا کی حرارت ہے؟ شاید! شاید!

ابو ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آگئے ہیں۔

"تمہاری امی ٹھیک ہو گئی ہیں اب ہم انھیں گھر لے جائیں گے"

"امی ٹھیک ہو گئی ہیں؟"

"امی ٹھیک ہو گئی ہیں؟"

دنیا میں کتنی دفعہ معجزے ہوئے ہیں۔ شاید اس دفعہ بھی کوئی معجزہ ہو جائے۔

ایک سپیشل ویگن آئی ہے۔ امی کو اس میں لٹایا گیا ہے۔ میں نے اپنے زانوؤں پر امی کا سر رکھ لیا ہے۔ باقی سارے بہن بھائی بھی ویگن میں بیٹھ گئے ہیں۔ ویگن ڈاڈر کے پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز سے گذر رہی ہے ـــــ بلندیوں اور پستیوں کے کتنے چکر لگا رہی ہے۔ ایک جگہ ویگن نے ہچکولا کھایا ہے اور میری چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ لیکن میں انھیں دبا کر صرف سسک کر رہ گئی ہوں ـــــ معجزوں کی امید ختم ہو گئی ہے۔

میں امی کی ڈھلکی ہوئی گردن کو سیدھا کرتی ہوں۔

"یہ تمھاری می نے تمھارے لئے کچھ تحفے بھجوائے ہیں" ڈیڈی نے دو خوبصورت سے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

ایٹو نیند سے بیدار ہو گیا ہے میں اس کے لئے دودھ بنانے لگتی ہوں۔ اسے دودھ پلا کر پیکٹ کھولتی ہوں۔ ایک پیکٹ میں میرے اور بچوں کے لئے بے حد قیمتی کپڑے ہیں۔ دوسرے پیکٹ میں بچوں کے لئے کھلونے ہیں۔ "ارے یہ جہاز" ـــــ میں حیرت سے اس کھلونے کو دیکھتی ہوں ـــــ "یہ تو بالکل وہی ڈیزائن ہے جو مجھے آئینے میں نظر آیا تھا۔ جس میں میری امی کی روح پرواز کر رہی تھی۔

میں پھر صوفے پر امی زادیے سے جا کر بیٹھ گئی ہوں۔ مگر آئینے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں اٹھ کر آئینے کے روبرو کھڑی ہو گئی ہوں ـــــ لیکن یہ کیا! ـــــ آئینے میں میری بجائے میری امی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ ٹی بی زدہ امی نہیں ـــــ خوبصورت اور جوان امی ـــــ بیماریوں کے روگ پالنے سے پہلے والی امی ـــــ اس عمر کی امی جب میری عمر بہ مشکل چھ برس تھی ـــــ میں چاہتی ہوں پھر سے چھ برس کی بچی بن جاؤں، پھر بچوں کی طرح شرارتیں کروں، مار کھاؤں، ضد کروں، جھڑکیاں کھاؤں ـــــ ارے ہاں ـــــ میں چھ برس کی ہی تو تھی جب میں قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ امی کتنی خوش تھیں اس دن ـــــ سارے خاندان میں امی کا سر اونچا تھا کہ میری ننھی سی بچی نے اتنی چھوٹی عمر میں کلام پاک ختم کر لیا ہے۔ جس دن میری "آمین" تھی امی مجھے بار بار چومتی تھیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

امی ابو کو "باؤجی" کہا کرتی تھیں۔ میں نے بھی ایک بار ایٹو کے ابو کو "باؤجی" کہا تھا مگر اس کے

ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے ـــــ میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں کا فاصلہ طے ہوگیا ہے ــــ آئینے میں اب امی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف ولاغر چہرے نے لے لی ہے مگر ٹی بی زدہ امی بھی مسکرا رہی ہیں۔

"امی! آپ نے دکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابّو کا ساتھ دیا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟"

"بیٹی اسے مقدر کہتے ہیں" امی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

"امی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟"

"مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے"

"میں ایسے مقدر کی ڈراؤنی آنکھیں پھوڑ دوں گی" میں چیخ اٹھتی ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہو کر نیچے گر جاتی ہوں ـــــ امی آئینے سے نکل کر باہر آتی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے مسہری پر لٹاتی ہیں اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ میں مسہری پر لیٹے ہوئے کروٹ بدلتی ہوں۔ پیشانی پر ابھی تک امی کے بوسے کا لمس جاگ رہا ہے۔ سامنے ایٹو ممی کے بھجوائے ہوئے خوبصورت ہوائی جہاز والے کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے میرے بڑے بچے رونی اور لڑکی کی نزہی کے کیرم کھیلنے کی آوازیں آرہی ہیں ـــــ ڈیڈی کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ڈیڈی کچھ دیر تک ایٹو کے ابو کے مستقبل کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

امی کے بوسے کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا ہے ـــــ میں امی سے ملنے قبرستان پہنچ جاتی ہوں امی کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر "ابو کو تلاش کرتی ہوں وہ یقیناً یہیں کہیں مجاور بن کر بیٹھے ہوں گے۔ شاید یہیں کہیں ہوں!

میں زور سے پکارتی ہوں ـــــــــــــــ "ابو ـــــ ابو ـــــ"

دوسری طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر میری آواز پھر گونجتی ہے ("ابو ـــــ ابو ـــــ")

میں پھر پکارتی ہوں ـــــ "ابو ـــــ ابو ـــــ آپ کہاں ہیں"

پہاڑوں سے ٹکرا کر میری صدا پھر گونجتی ہے ("ابو ـــــ ابو ـــــ آپ کہاں ہیں")

"ابو مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھام لو میں گرنے لگی ہوں ـــــ بکھرنے لگی ہوں" ـــــ

("ابو مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھام لو میں گرنے لگی ہوں ـــــ بکھرنے لگی ہوں")

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اپنے ابو کو نہیں پکار رہی بلکہ میں پہاڑوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔
میں پہاڑوں کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں۔

"ابو ــــ ابو ــــ" ("ابو ــــ ابو ــــ")

"ابو ــــ ابو ــــ" ("ابو ــــ ابو ــــ")

"اب ب ی ۔ ۔ ۔" ("اب ب ی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔")

میں چیختے چیختے بے دم ہو گئی ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔
میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مگر پہاڑ اپنی جگہ قایم کھڑے ہیں۔
"امی آپ ٹھیک کہتی تھیں ــــ مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے ــــ امی آپ ٹھیک کہتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔امی ابو ۔ ۔ ۔" میں بالکل بکھر کر رہ گئی ہوں۔
اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ریزوں کو جمع کر کے مجھے جوڑ رہا ہے۔ اس نے مجھے پھر سے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھائے قبرستان سے باہر نکل رہا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے "ابو" آگئے ہیں اور وہی مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔
میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں ــــ" اف وہ ــــ یہ تو ایٹو کے ابو ہیں"
مجھے شاید بخار ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا تھی اسلئے وہ جا چکے ہیں۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوں۔ اسی عالم میں دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ میری ممی میرے سرہانے بیٹھی ہیں انھوں نے اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھا ہوا ہے اور بڑے پیار سے میرا سر دبا رہی ہیں ــ مجھے اپنے خیالات پر شدید ندامت ہوتی ہے۔ میں لفظوں کو جمع کر رہی ہوں۔ "ممی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ممی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھی ممی" لیکن لفظ صحیح طور پر جمع ہی نہیں ہو پا رہے۔ میرے چہرے پر دو گرم گرم آنسو گرتے ہیں ــــ (ممی رو بھی رہی ہیں) میں جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں میں اپنی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ میرے سرہانے تو میری ننھی بچی نرمی بیٹھی ہے۔ پھر بھی میں لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
"ممی ۔ ۔ ۔ میری اچھی ممی ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔" □

ڈاکٹر وحید اختر

کوہِ ندا

آئی ہے صدائے کوہِ ندا، یا اہلِ قریۂ دل زدگاں
سب گھر سے نکل آئے باہر اکتائے ہوئے یک رنگی سے
سوچا نہ کسی نے نئی دنیا گلشن ہے کہ مقتل یا زنداں
بت خانے کے در سے بیٹر چھٹی، زہاد نے صحنِ حرم چھوڑا
اس شہر کی پوجا میں لذت نے سجدوں میں سوزِ دل کا نشاں
مکتب ہو، کلب یا دانش گہ، سب جھاڑ کے اٹھے دامن کو
اس شہر کے مکتب اور کتب بے سوز تھیں بے تابشِ جاں
اس شہر میں قید ضمیر و دل، پابستہ نظر، پابندِ سخن
حکام شریکِ سرقہ ہیں قانون ہے دشمنِ امن و اماں
اس شہر کی عشرت گاہیں تھی، بازاروں میں نقصاں کا سودا
بے آب و نمک ہیں روئے بتاں، بے رنگی و بو میں نگارستاں
آئی جو صدائے کوہِ ندا یا اہلِ قریۂ دل زدگاں
مسجد مے خانے سے پیراں، مکتب بازاروں سے طفلاں
کچھ دوش سے پھینک کر بوجھ چلے، کچھ سر پہ رکھ کر بار چلے
کچھ امیدوں کے فریب زدہ، کچھ مفرورِ قیدِ حرماں
کچھ توڑ کے طوق و رسن دوڑے، کچھ زنجیروں کو اٹھا کے چلے
کچھ پاس حیا سے گراں پا تھے، کچھ آتشِ شوق سے تھے جولاں
تھا شوق و بے تابی کے لئے برسوں کی مسافت کوہ ندا
نومیدی کے ماروں کے لئے پردیس ہے اک موعودہ جہاں
پوچھا نہ کسی نے خواب وہاں حیراں تو نہیں تعبیروں میں
زنداں بھی قبول اکتاہٹ کو، مقتل بھی بہلنے کا ساماں
یہ لوگ ہیں ہیزمِ نارِ شکم، تقدیر ان کی ہے دربدری
ماں باپ نے جنما تھا جب انھیں یہ لوگ بھی تھے شاید انساں
یہ تکر کے کہسار ندا امیدستان ہے یا مقتل
کھوئیں گے یہ کیا بجز زنجیریں، پائیں کہ نہ پائیں تازہ جہاں

آنا ہو جسے آ جائے یہاں، ہے منتظر اک نادیدہ جہاں
محزون غم بے آہنگی سے، افسردہ شہر کی تنگی سے
پوچھا نہ کسی نے ہوگا یہاں اک شہرِ نوا یا قبرستاں
رندوں نے خم سے منہ موڑا، ساقی نے جام و سبو توڑا
پیمانۂ و خم میں تشنگیاں سے بے کیفیت، تلخ دہاں
روحوں نے چھوڑ دیا تن کو، اور غنچہ و گل نے گلشن کو
بے ذوق و شوق اطفال و جواں، بے فیض یہاں پیرانِ مغاں
آزاد ہیں نقب زن و رہزن اور گورکن و دزدانِ کفن
دن روشنیوں کے قبرستاں، راتیں مضطر بے خواب مکاں
دوکانوں میں ایماں کا سودا، روحوں کا زیاں، جاں کا سودا
عشاق وفا بیگانہ ہیں، معشوق تھی آغوشِ مہماں
دیوانہ وار نکل آئے سب پیر و جواں، اطفال و زناں
آواز کے رخ پہ دوڑ پڑے حیراں گریاں، رقصاں خنداں
کچھ تج کے در و دیوار چلے، کچھ چھوڑ کے یار اغیار چلے
سب خود بیزار و خود کوشاں اک تبدیلی کے سب خواہاں
کچھ ٹھٹکے، کچھ گھبرا کے چلے، کچھ رک رک کر شرما کے چلے
لیکن بے تاب تھے سب یکساں، چلتے تھے سبھی افتاں خیزاں
ہر ایک قدم اک کوس کڑا، ہر سانس نزاعِ بیم و رجا
ہر شہر ہے شہرِ خیالستاں، ہر ملک نیا اک خوابستاں
سوچا نہ کسی نے واں بھی کہیں افکار نہ ہوں زنجیروں میں
کچھ شور سہی، فریاد سہی، ٹوٹے تو سکوتِ قبرستاں
کام ان کا ہے تسکینِ معدہ یا چاک بدن کی بخیہ گری
اب ان کا وجود ہے محض عدم یا سلسلۂ زنجیرِ گراں
دیدہ سے نادیدہ بہتر، اچھا ہو شاید آج سے کل
ہے کوہِ ندا اے دل زدگاں، گم گشتہ وجود کا شورِ فغاں

احمد سہیل

ولیم گولڈنگ

تعارف :

ولیم گولڈنگ (WILLIAM GOLDING) ۱۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو انگلستان کے مقام سینٹ کولم مائینسر میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نیوکیوری، کورینول کے قریب واقع ہے۔ بچپن میں اس کا مشغلہ ڈاک کے ٹکٹ اور انڈے جمع کرنا تھا۔ انیس سال کی عمر میں براسینوز کالج (آکسفورڈ) تعلیم حاصل کرنے گیا۔ وہاں دو سال رہا۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ فطری سائنس کی تعلیم حاصل کرے۔ اس نے اس کالج سے بی۔ اے اور تعلیم کا ڈپلوما حاصل کیا۔ وہ کچھ عرصے سماجی کارکن بھی رہا۔ فاضل اوقات میں وہ لندن کے ایک چھوٹے سے تھیٹر کے لئے ڈرامے لکھتا، اداکاری کرتا اور انھیں پیش کرتا۔ گولڈنگ نے ۱۹۳۹ء میں ANN BROOK FIELD سے شادی کی جو پیشے کے لحاظ سے تجزیاتی کیمیا داں تھی۔ گولڈنگ بشپ کے اسکول ورس ورتھ سالسبری میں انگریزی اور فلسفے کا استاد رہا۔ اس کے والد بھی پیشے کے لحاظ سے اسکول ماسٹر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اسے برطانیہ کی شاہی بحریہ کی خدمات کے لئے طلب کیا گیا۔ بحریہ میں وہ راکٹ لانچنگ کراف سیکشن کا کمانڈر رہا جنگ ہی کے دوران اس نے یونانی کلاسیک کا مطالعہ کیا۔ جنگ کے اختتام تک اس کے خیالات تبدیل ہوئے۔ انسان پر ظالمانہ رویے نے اس کو انتہا پسند کا قنوطی بنا دیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ دوبارہ ورس ورتھ اسکول میں استاد مقرر ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں گولڈنگ رائل سوسائٹی اور لٹریچر کا فیلو بنا۔

ولیم گولڈنگ قدامت پسند ادیب ہے۔ مگر ملنے ملانے والوں میں بہت مقبول، بہت خوبصورت گفتگو کرتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں وہ پیانو اور وائلن بجاتا ہے۔ اس کے خاندان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی شامل ہیں۔ یہ سب آج کل ولٹشیر (WILTSHIRE) سالبری میں مقیم ہیں۔

۱۹۸۳ء کا ادب کا نوبل انعام یافتہ

جب ۱۹۸۳ء کا فزکس کا نوبل انعام ایک بھارتی نژاد امریکی کو ملا تو لوگوں کا خیال تھا کہ ادب کا نوبل انعام اس بار تیسری دنیا کے کسی ادیب کو ملے گا۔ مگر اس بار یہ انعام برطانوی ناول نگار ولیم گولڈنگ کو ملا۔ یہ انعام برطانوی قوم کے لئے اس لئے بھی اہم تھا کہ تیس سال بعد کسی برطانوی باشندے کے حصے میں یہ انعام آیا۔ اس سے قبل ۱۹۵۲ء میں ونسٹن چرچل کو اس انعام سے نوازا گیا تھا۔

ولیم گولڈنگ کو پچاس کی دہائی کے آس پاس جانا گیا جب اس کی ناول THE LORDS OF THE FLIES شائع ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس کی تحریر کے تراجم ہوئے اور گولڈنگ کی شہرت برطانیہ اور برطانوی نوآبادیات سے نکل کر دور دور پھیل گئی۔ اس کے بعد اس کی سات ناولیں شائع ہوئیں جن میں THE INHERITORS ، THE SPIRE اور (۱۹۸۰ء) RITES OF PASSAG زیادہ اہم ہیں۔

گولڈنگ کی ناول THE LORDS OF THE FLIES کا پلاٹ اپنے عہد کے لحاظ سے خاصا غیر واضح اور مبہم ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ناول نگار نے ماضی اور حال سے اپنے آپ کو جدا کر کے اپنی تمام خواہشات، آرزوئیں، خواب، تمنائیں اور امیدیں مستقبل سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اس کے یہاں ماضی اور حال کا تصور مٹ چکا ہے۔ اسے انسانی زندگی کے تمام امکانات مستقبل میں ہی نظر آتے ہیں۔ ناول پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ گولڈنگ کے انسان کے پیچھے اندھیرا ہے اور اس کا وجود خاصی حد تک اندھیرے میں گھرا ہوا ہے، مگر اس کی آنکھیں سامنے سے آنے والی روشنی سے چندھیا سی گئی ہیں۔ کیا گولڈنگ ماضی کے تجربات سے قنوطی تجربہ اخذ کر چکا ہے؟ کیا اس کی نظر حقیقت پسندانہ ہے؟ ہرگز نہیں ـــــ یہ التباس کی روشنی ہے اور اس کا پریشان حال ذہنی رویّہ ـــــ جہاں درحقیقت وہ اندھیرے اور روشنی کے درمیان خود بھی مٹتا جا رہا ہے۔

بظاہر بھی اس کا یہ تصور مہمل نظر آ رہا ہے جو شاید حقیقت پسندانہ ہو! بعض جگہ یہ ناول پڑھنے والے کے ادراک کے لئے مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ ناول نگار کہانی کہتے کہتے اتنا الجھ جاتا ہے کہ ناول کا فن کارانہ اظہار ہمارے سامنے دم توڑتا نظر آتا ہے۔ بعض جگہ یہ ناول خاص فلسفے کی کتاب بن کر نظروں کے سامنے گھومتی ہے۔

گولڈنگ کی ناول "دی لارڈز آف دی فلائیز" میں انسانی صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے تیسری جنگِ عظیم کا تجربہ ضروری ہے۔ انسانیت کی تباہی کا عملی ادراک ہی اس ناول کی شرح ہے، اصل میں یہ محدود قسم کی نیوکلیائی کشمکش ہے جو کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ انسان اس سے دہشت زدہ

ہے مگر انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کی فطرت اسے کب اور کس وقت کہاں اور کیوں لے جائے ۔ نیوکلیائی کشمکش جدید انسان کی اذیت بن چکا ہے ، اس کا تصور ہی انسان کو پریشان کر دیتا ہے ۔ اس کی مثال یوں بھی دی جا سکتی ہے کہ آج کل امریکہ میں ایک فلم THE DAY AFTER ٹیلی ویژن پر دکھائی جارہی ہے ، جس میں نیوکلیائی تباہی اور اس کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے ، یہ فلم اتنی متنازعہ ہے کہ امریکی صدر نے بھی دو بار اس فلم کو دیکھا ۔ اس فلم کے خلاف جلوس نکالے گئے ، جلسے ہوئے ، ٹیلی ویژن ، ریڈیو ، اخبارات ہر طرف اس فلم کا چرچا ہے ۔ مراد یہ کہ نیوکلیائی کشمکش کا جو منظر (بعض کی نظر میں فرضی) پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر کئی افراد مر گئے کچھ کو دل کے دورے پڑے ، اسی قسم کی دہشت جو نیوکلیائی ہے ، گولڈنگ نے بیان کی ہے ۔ یہی اذیت اس کی کربناکی کا سبب ہے جو اس کے دل و دماغ پر اس قدر قبضہ کر چکی ہے جہاں موت اور فنا اس کے وجود کا ایک اہم ذہنی رویہ بن چکا ہے ۔ زندگی کی بے معنویت کے درمیان انسان زندہ ہے اور لمحہ کاٹ کر خوش ہوتا ہے کہ ہم فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ بقول گولڈنگ زندگی کی یہی بے معنویت اقوام کے درمیان محدود قسم کی نیوکلیائی کشمکش ہے جو لوگوں کو انگلستان سے باہر جانے پر مجبور کر رہی ہے ۔ کچھ لوگ آسٹریلیا جا رہے ہیں ۔ کچھ کینڈا کی طرف جانے پر مجبور ہیں ۔ ناول میں بحر ہند کے اوپر اڑتا ہوا ایک طیارہ جزیرے میں گر جاتا ہے ۔ اس حادثے میں صرف ایک نوجوان بچ جاتا ہے ۔ مگر اس "شکستہ کشتی" میں ایک نوجوان کتنے روز تک زندہ رہ سکتا ہے ۔ اس "شکستہ کشتی" میں کچھ برا نہیں سب اچھا ہے ۔ پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ اس کو اپنے وجود کو زندہ رکھنے کے لئے جزیرے کے وحشی قبائل کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے ۔ اس قبیلے کے بہت سے سردار اسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں جب کہ دوسرے سردار اس کی پرستش کرنے پر بضد ہیں ۔ یہی ناول کا مرکزی نکتہ ہے یعنی THE LORD OF THE FLIES ۔

گولڈنگ کے اس ناول کو پڑھنے کے لئے اس لئے زیادہ مشکل نہیں ہوتی کیوں کہ اس ناول میں کہانی کہنے کا انداز رابسن کروسو ، سوئیز فیملی رونیر ، TREASUR ISLAND یا GULLIVERS TRAIVELS کا سا ہے ۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ گولڈنگ نے ادبی درجہ کی ہوئی تحریروں سے متاثر ہی نہیں بلکہ ناول کا داستانی انداز انہی تحریروں سے لیا ہے ۔ گولڈنگ نے اس ناول کا بنیادی خیال اپنے ہم وطن مصنف BALLANT YNE سے لیا ہے اور اسے تھوڑا بہت تبدیل کر کے ناول میں پیش کر دیا ہے ۔ گولڈنگ ناول میں انسان کو چالاک اور عیار بتاتا ہے مگر وہ اس کو بیان کرنے میں ناکام ہے اور نہ ہی گناہگار گناہ سے نجات کی امید رکھتا ہے ۔

ناولوں کے علاوہ گولڈنگ نے ایک ڈرامہ بھی لکھا اس کا نام THE BRASS BUTTERFLY ہے جو اس کی ایک مختصر کہانی سے ماخوذ ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس نے مختصر مدت کے لئے ڈرامے اسٹیج کئے۔ اسی سال اس کی ایک طویل کہانی ENVOY EXTRA ORDINARY دوبارہ شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو نئی کہانیاں THE SCORPION GOD اور CLONK CLONK بھی چھپیں۔ پہلی کہانی مصر کی سلطنت سے متعلق ہے اور دوسری کہانی قدیم معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی۔ یہ دونوں کہانیاں بہت مضبوط اور جامع ہیں اور لگتا ہے گولڈنگ کا تاریخی مطالعہ بہت گہرا ہے۔ ان کہانیوں میں فرد اور رسوم کے درمیان تعلق دکھایا گیا ہے۔

گولڈنگ کے یہاں انسانی عظمت کا کوئی واضح تصور نہیں۔ اس کی ناولیں ظاہری طور پر انسانی صورتِ حال کی تاریک تصاویر دکھاتی ہیں جس میں انسانی قوتوں کا انحطاط اور کمزوریوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اس کی ناول THE INHERITORS کو ناول سے زیادہ داستان کی صورت میں پسند کیا گیا ہے۔ ناول کو پڑھ کر ذہن فوراً ایچ۔ جی۔ ویلز (H. G. WEELS) کی تاریخی OUT LINE کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں کئی صدیوں پہلے کی دو نسلوں کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ پہلی نسل کا نام NEANDERTHAL اور دوسری نسل کا نام HOMO SAPIENS ہے۔ یہ دونوں نسلیں اپنی بقا کے لئے جدو جہد کرتی ہیں۔ گولڈنگ نے NEANDERTHAL کو بہادر اور جری ہونے کے علاوہ دوسروں کے لئے ADMIRABLE بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ نسل جنگ وجدل اور قتل وغارت گری سے نفرت کرتی ہے۔ اس نسل میں ناول نگار نے تمام انسانی خصوصیات دکھائی ہیں، جن کو ہم اعلیٰ انسانی اوصاف کہتے ہیں۔ ناول میں HOMO SPIENS نے NEANDERTHAL کو تباہ کر دیا۔ اس ناول میں جس قسم کی انسانی خوبیاں بتانے کی کوشش کی گئی ہے وہ انسانیت کے لئے قطعی غلط ہیں۔ گولڈنگ اس ناول میں خود ہی اپنی فریب نظر کا شکار ہو گیا ہے۔ اسے دنیا دھند میں لپٹی نظر آتی ہے، کیونکہ افراد کے درمیان وہ تمام روابط منقطع ہو چکے ہیں جس کا تصور انسان کی "مثالی" دنیا میں ملتا ہے۔ ہم اپنے ظاہر میں انسان کی بڑائی کو جس قدر شدت کے ساتھ اپنی زبان سے برتتے ہیں، اتنی ہی شدت سے انسان ہمارے باطن میں گھٹتا جا رہا ہے۔ یہ اذیت پسندی اس لئے بھی کچھ زیادہ محسوس کی جاتی ہے کہ گولڈنگ کا انسان اپنی تہذیب نفس سے جدا ہو کر لاتعداد وسوسوں کا شکار ہے۔

ہمارے آباؤ اجداد ہم سے بہت کچھ چھپاتے ہیں کیونکہ وہ ہم سے بہت کچھ پوشیدہ رکھ کر ہی زندہ ہیں۔ اگر راز فاش ہو جائے تو نسلی تسلسل میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ ہے۔

گولڈنگ اسی تحریر میں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ہم بالکل مختلف دنیا میں رہ رہے ہیں۔ اگر NEANDERTHAL قبیلہ اس دنیا میں باقی رہ سکتا ہے تو دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، بقول گولڈنگ "یہ ایک احمقانہ تصور ہے۔ یہ دنیا کی بین الاقوامی تعریف نہیں ہو سکتی"۔

گولڈنگ کی ناولوں میں کسی حد تک انسان کی لایعنی صورت حال سامنے آتی ہے، ساتھ ہی ان ناولوں میں کہانی پن بہت ہے۔ اس کے پاس کہانی کہنے کا کوئی نیا اور اچھوتا انداز نہیں، جو ہمیں کبھی کبھار بڑے لکھنے والوں کے یہاں نظر آجاتا ہے، گولڈنگ کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے اس کو کہانی کہنے کے ماخذوں کا علم اس لئے بھی ہے کہ اس کا تاریخ کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔

۱۹۶۴ء میں گولڈنگ کی ناول THE SPAIR شائع ہوئی جس کی بنیاد مذہبی اشارتیت پر مبنی ہے۔ یہ ناول اس دلیل کو ثابت کرنا چاہتی ہے کہ انسان خدا کے لفظ کو پہنچ سکتا ہے اور ہماری کائنات میں ہر چیز اچھی ہے۔ رواقیت کا یہ تصور بیسویں صدی کے بیشتر لکھنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس قسم کے تصورات ہیمنگوے کی آخری تحریروں میں ملتے ہیں۔ وہ بھی خودکشی کرنے سے قبل ہر چیز کو رواقی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کیوں کہ مذہبی نظریات سے متاثر ہوکر لکھنے والے ادیب اور شاعر اسی یا اس جیسے تصورات کو قبول کرتے ہیں کیوں کہ زندگی کی بے ثباتی کا احساس انسان کے دل میں وسوسے ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ ان کی نظروں میں مابعد الطبیعیاتی لذت پسندی کا نیا دروازہ کھل جاتا ہے جو لکھنے والوں کے لئے خوش آئند بھی ہے اور المناک بھی! فرینک کرموڈ نے لکھا ہے "آپ اس ناول کی ہر سطر کے ساتھ اپنے آپ کو تنہا پائیں گے اور اس کو تمام توجیہات کا نمونہ محسوس کریں گے۔

PINCHER MARTIN گولڈنگ کی ایک ایسی ناول ہے جس میں دیگر ناولوں کے مقابلے میں قدرے نئی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس ناول میں کہانی کار خود ہی ایک کردار ہے اور ناول نگار اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ میری کہانی شروع ہونے پر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں مرچکا ہوں (ناول کے دوسرے صفحے پر)، بعض پڑھنے والے اس کو "قنوطیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اس بے معنی دنیا میں ناول نگار جس پُر اسرار شعور کے ساتھ زندہ ہے، وہ اس صورتِ حال میں لکھ سکتا ہے (جو اسے لکھنا چاہئے) لہٰذا اس کو آزادی کی تمنا ہے جو ناول نگار کو اس وقت تک مہیا نہیں ہو سکتی جب تک وہ زندہ ہے کیوں کہ انسان رسوم ورواج کے علاوہ اپنی جبلتوں کا بھی غلام ہے۔ غالباً اسی لئے گولڈنگ اپنے مرجانے کا مفروضہ تشکیل دیتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد آزاد ہے اور آزادی کے ساتھ

کھ رہا ہے۔

گولڈنگ کی ایک اور مشہور ناول FREE HALL ہے۔ جس کا مرکزی کردار بھی وہ خود ہی ہے۔ ناول میں کردار کی زندگی سے بہت گہری وابستگی ہے۔ ناول کے آخری حصے میں وہ جرائم کو رضاکارانہ قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ معاشرہ اس کو جرائم کرنے پر نہیں اکساتا اور نہ ہی فرد کو ماحول اور حالات متاثر کرتے ہیں بلکہ فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ گولڈنگ تمام انسانی قدروں اور اس کے مثبت اور منفی معاشرتی اعمال کو فرد کے وجود کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔ انسان کی اپنی اعلیٰ قدر ہے اور انسان آزادی کے ساتھ اپنی قدر اور اعمال کو منتخب کرتا ہے اور تمام اقدار اور اعمال کی بنیاد انسان ہی ہے۔ مگر گولڈنگ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے ذہن میں جس آزاد انسان کا تصور ہے وہ بہت دہشتناک ہے۔ FREE HALL میں انسان کرپٹ ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ماحول تو ہمیشہ سے معصوم رہا ہے جب کہ معاشرہ کرپٹ ہے اور یہی فرد کی شخصیت تشکیل کرتا ہے جس کے لاتعداد عوامل اور اسباب ہیں۔ انسان تو بعد میں وجود آتا ہے جب کہ معاشرہ تو کئی صدیوں سے انسان پر مسلط ہے۔

گولڈنگ کی ناولیں بنیادی طور پر الہیات اور اخلاقی تصورات کا اظہار ہیں۔ مگر اس کی ناولیں اس وقت قد میں دیگر عصری ناولوں سے بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ جب اس کی تصوراتی دنیا کہانی میں داخل ہوتی ہے اور ساتھ ہی جب خوبصورت اشارے گولڈنگ کی شاعرانہ دنیا میں نثر کا روپ دھارتے ہیں اور ہم اس کی تمام ناولوں میں ایک دانشورانہ جمالیت اور طنز کو محسوس کرتے ہیں بعض نقاد گولڈنگ کی تحریروں کو "ملک کی اہم اشارتی ناولوں میں شمار کرتے ہیں"۔ اب ولسن اور کرموڈ ہی نہیں بلکہ تمام دنیا یہ تسلیم کر چکی ہے کہ ولیم گولڈنگ بلاشبہ اس صدی کا عظیم ناول نگار ہے اور بقول ہائی مین (STANLEY EDGAR HYMAN) اتنا ہی دلچسپ بھی!! □

حبیب تنویر

نیا تھیٹر۔ 15 L ا بیر سرائے
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

دوسری بیٹی

ایک بھکاری لڑکی
میرے ذہن میں منڈلاتی ہے
چاند کی جیسی صورت ہے
نقرئی سی آواز
مچھلی جیسی آنکھیں ہیں
بھنوں جیسی چمکیلی
دانت بھی دس دس موتی ہیں
ہونٹ بھی ایک کلی کے دو ٹکڑے ہیں
باتیں بچوں ہی جیسی
شرم بھی پھولوں ہی جیسی

میں نے پوچھا کون ہو تم
کس نے تم کو بھیک سکھائی
باپ تمھارا کیا کرتا ہے
کیا ہے تمھاری ماں کا نام

اس نے تمھارا نام بتایا
میں نے جانا موت کا یہ پرنام ہے
بھیک تمھاری موت نے اس کو سکھائی ہے
پھر جو اس سے اور ذرا کچھ باتیں کیں
اس نے اپنی بہن کا ذکر کیا
یہ سن کر کچھ میری حیرت میرا تجسس اور بڑھا
مجھ کو تو بس اتنا علم تھا ایک تمھاری بیٹی ہے
میں نے اس کی عمر جو پوچھی
اس کے جواب سے میں نے جانا
یہ میری اپنی بیٹی ہے
آدھی میری آدھی تمھاری

انورامام

دوابی الفاظ
روڈ نمبر ۱۰، مکان ۵۹، جواہر نگر
مانگو، جمشید پور ۸۳۱۰۱۲

ہمزاد

میں پھر چل پڑا ہوں
شہر کی پر پیچ جیون سے لمبی ان سڑکوں پر بھٹکنے کے لئے
حالانکہ آج سے چند ماہ قبل کچھ غرض پرست لوگوں نے مجھے اپنی شان و شوکت کی خاطر قربان کر دیا تھا۔

ہاں اسی چوراہے پر
میں گاندھی کا مجسمہ بنا کر نصب کر دیا گیا تھا۔
میں اندر ہی اندر پھڑپھڑاتا رہا — چیختا رہا — گڑگڑاتا رہا — اور بڑی بڑی کوششوں کے بعد آج آزاد ہو پایا ہوں۔
جانے کیوں ان لوگوں کو میری آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی....
یہ بات صرف اسی شہر کی نہیں ہے
اس سے چند ماہ پیشتر میں دوسرے شہر کے مشہور چوراہے پر گوتم کا مجسمہ بنا کھڑا رہا۔
اس طرح مختلف شہروں کے مختلف چوراہوں پر، مختلف مشہور و معروف شخصیتوں کا پر تو بنا مجسمہ کی شکل میں نصب رہا — اور پھر اپنی جد و جہد، اپنی کوشش سے بھاگ نکلا — لیکن یہ آزادی بھی کب تک۔؟ پھر کسی کی نظرِ انتخاب مجھ ناچیز پر پڑے، اور میں مجسمہ بنا کسی چوراہے پر نظر آؤں۔
جب کہ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔
کہ ان مختلف شکلوں میں مختلف جسموں میں میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہوں۔؟
میں ان ہی خیالوں میں غلطاں، بھری پری سڑکوں سے ہوتا ہوا اب ویرانوں سے گذر رہا تھا وہ آج بھی میرے ہمراہ تھا۔ پھر ہم دونوں ہنستے کھیلتے جانے کتنا طویل سلسلہ طے کر کے... کتنی دور نکل آئے.... کہ یکلخت مجھے محسوس ہوا، جیسے اسے کسی نے جکڑ لیا... مجھ سے جدا کر لیا... چھین لیا ہو....

دل میں ایک خلش سی ابھری
آنکھیں بھر آئیں
کہ جب جب میں مجسمہ بنا، وہ دور کھڑا میری آزادی کا منتظر رہا، اور آج وہ قید ہو چکا تھا۔
میں اسے ڈھونڈتا رہا
نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں
کافی جدوجہد کے بعد ایک کنواں نگاہوں کے سامنے تھا۔
جہاں ایک بھیڑ سی تھی
پریشان حال
جسم پہ چیتھڑے لپیٹے
چہرے پہ بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھیاں
بجھی بجھی آنکھیں
ستے ہوئے چہرے
لاغر و کمزور جسم والے لوگ
ہر ایک اپنی اپنی باری کا منتظر تھا
ایک لمبی قطار یہاں سے وہاں تک کھڑی تھی
ہر ایک آتا کنویں میں رسی بندھا ڈول ڈالتا ــــــ بڑی بڑی کوششیں کرتا اور چند لمحوں بعد
بالکل ہشاش بشاش اپنے اپنے راستوں پر چل پڑتا۔
میں جانے کب تک اسی کنویں کی منڈیر پر بیٹھا رہا، اور اپنی باری کا منتظر رہا۔
اب بھیڑ چھٹ چکی تھی
میں نے بھی لاشعوری طور پر ایک رسی بندھا ڈول اس کنویں میں ڈال دیا۔
کافی دیر تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا
تب میں نے بے چین ہو کر کنویں کی آخری گہرائی تک جھانکا۔
وہ اندر بیٹھا سسک رہا ہے ــــــ رسی بندھا ڈول اس کے سامنے ہے ــــــ وہ ذرا سی
کوشش کرے تو باہر آسکتا ہے ــــــ لیکن جانے کیوں وہ ناامید ہو کر سسک رہا ہے۔؟
یہ اور اس طرح کے اور بہت سارے سوالات یکے بعد دیگرے بگولوں کی مانند ذہن میں منڈلاتے

رہے۔اور مجھے پریشانیوں کی اندھی کھڈ میں ڈھکیلتے رہے ـــــ میں سوچتا رہا ـــــ وقفہ وقفہ کے بعد اسے آوازیں بھی دیتا رہا۔

ایک طویل انتظار کے بعد اس کی نگاہیں اوپر اٹھیں

میں نے اشارہ کیا

اب وہ رسی تھامے آہستہ آہستہ اوپر آرہا ہے۔

کنویں سے باہر آتے ہی وہ پھر میرے ہمراہ قہقہہ لگاتا ہوا چل پڑا۔

ہم مسلسل چلتے رہے ـــــ جانے کتنی طویل راہوں کو پیچھے ـــــ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔اور اب تو مستقبل کے پیڑ پہ امید کی نئی کونپلیں اگ رہی تھیں ـــــ ہم دونوں خوش تھے ـــــ جانے کتنے یگ ان ہی راہوں میں بیت گئے ـــــ ہم بھٹکنے کی کئی داستانوں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور اچھے نتائج کے منتظر رہے۔

ایک روز ہم دونوں بھٹکتے بھٹکتے شہر کے مشہور چوراہے کے قریب سمٹ آئے ـــــ وہ ٹرافک کے اژدھام میں کہیں گم ہو گیا۔

لوگوں کی بھیڑ مجھے گھور رہی تھی۔

میں خوف زدہ سا اس بھیڑ سے ڈر کر ایک پان کی دوکان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

کہیں ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا تو.....؟

وہ سب اب بھی مجھے بغور دیکھے جارہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مجھے کسی نہ کسی شکل، کسی نہ کسی نام سے پہچان لیں ـــــ اور مجھے پھر مجسمہ بننے کی اذیت سے گذرنا پڑے۔

"نہیں.... نہیں۔" میں بہت زور سے چیخا اور دوڑ پڑا۔

مسلسل کئی دن کئی رات کی طویل مسافت کے بعد میں پھر شہر کے اسی مشہور چوراہے کے قریب کھڑا تھا لوگ باگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

میں اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگا ـــــ میری نگاہیں بھٹکتی ہوئیں اسے تلاشتی رہیں۔کافی دیر تک میں اسی عمل میں مبتلا رہا ـــــ اور بے حد پریشان ہو کر اسے آوازیں دینے لگا ـــــ پکارتا رہا ـــــ مسلسل پکارتا رہا ـــــ

اسی لمحہ کوئی میرے قریب آیا اور میرے کندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، میں سہم گیا اور خوف زدہ سا چیخ اٹھا ـــــ

"کون.... کون ہے....؟"

"میں.... میں ہوں....!"

"میں کون....؟

تب کوئی اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آیا

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

پہلے وہ مسکرایا

اور پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا، اس کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی،

"تم ہنس رہے ہو.... تمھیں شرم آنی چاہیئے.... میں خوف زدہ ہوں اور....؟"

"کیوں ــــ؟ کیا کسی کی بے وقوفی پر ہنسنا منع ہے؟"

"کس کی بے وقوفی....؟"

"تمھاری...."

"کیا مطلب....؟"

"واہ یار یہ بھی کوئی تک ہے کہ مسلسل تم اپنا ہی نام لے کر نہ جانے کسے پکارے جا رہے ہو....؟"

"تم نہیں سمجھو گے.... یہ تمھارے بس کی بات نہیں...." وہ پھر ٹھٹھا مار کر ہنسا اور اپنے راستے ہو

لیا۔

آج بھی مجھے لوگ ہانک گھور رہے ہیں۔

میں دوڑ کر بہت دور نکل آیا ہوں ــــ اب بری طرح ہانپ رہا ہوں ــــ سارا جسم پسینے سے شرابور

ہے ــــ ایک طویل راستہ دوڑ کر طے کرنے کے بعد ایسا ہی کچھ تو ہوتا ہے۔

دن گذرتے رہے۔

اس کی جدائی مجھے بے حد مغموم کر چکی تھی۔

ایک خلش جو اندر ہی اندر سرایت کر رہی تھی، اور میں اپنے اندر بارش کی بوندوں سے مٹی کی گیلی

دیوار کی مانند گھلتا پگھلتا رہا۔

اور ایک دن پھر، میں بھٹکتا ہوا اسی چوراہے کے قریب تھا۔

اور آج اس چوراہے پر کسی مشہور و معروف مرحوم سیٹھ کا مجسمہ نصب کیا جا رہا تھا۔

کافی بھیڑ تھی

اس بھیڑ میں مجھے وہ نظر آیا ——— بے حد مغموم سا، اداس سا ———
مجھے اس کی حالت زار پہ بے حد رحم آیا "بے چارہ"
میں بھیڑ کو ڈھکیلتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا۔

وہ انجان نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی نیا مسافر ہوں جو ابھی ابھی اس شہر میں وارد ہوا ہو

میں آبدیدہ ہو گیا۔
اس کے ہمراہ گذرے ہوئے منظر میری نگاہوں کے آگے رقص کرنے لگے۔
میں سسک اٹھا ——— سسکیاں فضائے بسیط میں پھیل گئیں۔
لوگ باگ مجھے حیرت زدہ سے تک رہے تھے۔ بھلا اس خوشی کے موقع پر رونا دھونا بڑی عجیب سی بات ہے۔
وہ آپس میں پھس پھسانے لگے۔
وہ آپس میں پھس پھساہٹ، چہ مگوئیاں بن گئیں
اور تب ایک آواز ابھری اور مجھے اندر ہی اندر چیرتی چلی گئی۔
"بے چارہ پاگل ہے...."
"پاگل ہے...." صدا بازگشت بن کر فضا میں پھیل گئی۔
میں بھاگ کھڑا ہوا.... بھاگتا ہی رہا.... بھاگتا ہی رہا....
میرے پیچھے شیطان بچوں کا ایک جم غفیر اینٹ پتھر پھینکتا، قہقہے لگاتا، دوڑتا چلا آ رہا تھا...
میں کچھ اور تیز دوڑ پڑا۔
دوڑتا رہا.... دوڑتا رہا.... گرتا پڑتا.... اوندھا سیدھا....
کبھی کبھی کوئی پتھر میرے سر پہ لگتا تو کبھی کوئی زہریلا قہقہہ میری سماعت کی کوٹھری کی دیواروں کو ہلا ڈالتا۔

میں دوڑتا رہا
مسلسل دوڑتا رہا
کتنی پرپیچ گلیوں سے
بازاروں سے

اونچی نیچی آڑی ترچھی سڑکوں سے
ویرانوں سے
جنگلوں سے
بستیوں سے
پارکوں سے
عبادت گاہوں سے ہوتا ہوا، اس نرم شیتل ندی کے کنارے آکر ادھ مرا سا گر پڑا اور کئی گھنٹوں تک اپنے ہوش و حواس سے بے بہرہ رہا۔
ندی کی لہریں آپس میں ملتی اور ٹوٹتی رہیں۔
اور ان کی چھینٹیں میرے چہرے کو بھگوتی رہیں۔
میں چونک اٹھا
"میں .... کہاں ہوں .... ؟" آواز ویرانوں سے ٹکرا کر گونجتی رہی۔
اور پھر میں نڈھال سا واپسی کے سفر پہ چل پڑا
چلتا رہا
ایک مدت گذر گئی
اور ایک روز میں اپنے مکان کے قریب بس اسٹینڈ کے پاس کھڑا تھا
منی بس آئی
میں اداس، غمگین سا بس میں سوار ہو گیا
اس کی جدائی سے میں خود کو بڑا بے مصرف سا، بے کار سا محسوس کر رہا تھا، کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔
بس چل پڑی
نگاہیں بھٹکتی ہوئیں بس کی آخری سیٹ تک لہرائیں
میں چونک اٹھا
وہ خوف زدہ ٹھٹھرا سا ادھر ادھر گھبرا کر تک رہا تھا جیسے کسی انجانے خطرے کی بو محسوس کر رہا ہو۔
اچانک اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں۔
وہ جوش و مسرت سے میری جانب لپکا۔

"کہاں مر گئے تھے ؟ میں نے سارا شہر چھان مارا.... اور تم....؟" اور بڑھ کر وہ مجھ سے ایسا بغل گیر ہوا کہ اسے اپنے سے جدا کرنے میں مجھے گھنٹوں اپنے آپ سے جنگ کرنی پڑی۔ تب کہیں وہ مجھ سے الگ ہوا۔

بس چلتی رہی.... لوگ اپنے آپ میں مست تھے.... اور وہ جانے کیوں بے چین و مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔ بار بار اپنے ہاتھ ملنے لگتا.... جیسے دل ہی دل میں کوئی پلان مرتب کر رہا ہو ــــ اور اسے پورا نہ ہوتا دیکھ کر مایوسی سے ہاتھ مل رہا ہو۔

جانے کتنے اسٹوپیج سے گذرنے کے بعد بس آخری اسٹوپیج پر رک گئی۔ تمام مسافروں کے ہمراہ میں اتر گیا، اور اپنی راہ ہولیا.... وہ مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا.... رفتہ رفتہ فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ یک لخت میری نگاہوں کے آگے ٹیگور چوک ابھرا ــــ سفید پوش بڑے لوگوں کی بھیڑ، ٹیگور کے مجسمہ کے ہمراہ دفن کرنے کے لئے کسی مفلس شخص کی تلاش میں ادھر ادھر تک رہے تھے

اچانک ان کی نظر مجھ ناچیز پر پڑی۔ اور وہ سب میری جانب لپکے۔

"نہیں.... نہیں.... اب میں زندہ لاش کی مانند مجسمہ بن کر جینے کے لئے نہیں.... بلکہ ایک محنت کش انسان کی مانند زندگی کی حقیقی مسرتوں کو لمحہ لمحہ جینے کے لئے ہوں.. صرف.... اور صرف اپنے لئے جینا چاہتا ہوں۔"

وہ ٹھٹھک گئے

مجھے حیران نظروں سے تکنے لگے

اور میں ذرا سہما سا بھاگ کھڑا ہوا

اور جب مڑ کر دیکھا تو وہ قید ہو چکا تھا

انکار کی شکل میں لوگوں کی لاتوں، گھونسوں کا شکار ہو چکا تھا

وہ پٹتا رہا

اور میں بھاگتا رہا.... بھاگتا رہا....

چند لمحوں بعد

وہ بھی دوڑتا ہوا مجھ سے آ ملا ــــ لہولہان، چیتھڑے میں لپٹا ہوا سا۔

میرے روبرو آتے ہی وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔

میں بھی اس کی حالت دیکھ کر مغموم ہو گیا۔

اور پھر ہم دونوں چل پڑے۔ □

سید امین اشرف

شعبۂ انگریزی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

غزلیں

سب اداشناسِ رہِ سفر ترے امتحاں سے گزر گئے
کبھی آندھیوں کو بجھا دیا کبھی دودِ شمع سے ڈر گئے

یہ تجلیاتِ نظر ہیں سب، شجرِ خزاں نہ گلِ طرب
کہیں آنسوؤں سے چھلک اٹھے کہیں رنگ و نور سے بھر گئے

یہ عجیب عالمِ حسن ہے کہ قرار ہے نہ فرار ہے
کبھی ابر بن کے نکل گئے، کبھی چاند بن کے اتر گئے

وہی عجزِ اہلِ نیاز ہے، وہی جبرِ عشوہ طراز ہے
کہ ثواب جتنے تھے دُھل گئے جو گناہ تھے مرے سر گئے

سنوں کس سے زمزمۂ چمن کہ کلی کلی ہوئی بے سخن
وہ طیور پا بہ سفر ہوئے، وہ نہال برگ و ثمر گئے

سرِ بزمِ ناز کہاں رکیں کہ وہ فرصتیں نہ فراغتیں
وہی بن گئی تری رہ گذر، ترے بیقرار جدھر گئے

کسی تیز دھوپ کی زد میں تھا کہ مکان سارا جھلس گیا
جو ہوائے کوچۂ جاں چلی در و طاق و بام سنور گئے

غبارِ ہجر نہ صحرائے یادِ جانانہ
بلندیوں نے گرا دی ہے قدرِ دیوانہ

میں بے بصر ہوں کہ وہ بزمِ ناز افسانہ
ضیائے شمعِ فروزاں نہ جانِ پروانہ

غیورِ شہر کو فطرت بھی آزمائے ہے
کھلا ہے بابِ کرم جھومتا ہے میخانہ

جھکی ہوئی ہے محبت کا بار اٹھائے ہوئے
تری نگاہ کے صدقے، حرم نہ بت خانہ

گزر گئی ترے مستوں کی بھی سلیقے سے
اداس رات نظر آ رہی تھی پیمانہ

انا سمجھتی ہے خود کو ہی شہسوارِ ہنر
نیاز مند بھی ملنے لگے حریفانہ

کسی کی راہ کا پتھر کوئی نہیں ہوتا
امینؔ دیکھئے دشمن کو بے حجابانہ

سراج منیر

سبھی رنگ کے ساون

In so far as profane art can be legitimate as it can be more than ever before, in this period of disfigurement and vulgarity- its mission is one of transmitting qualities of intelligence, beauty and nobility; and this is something which cannot be realized apart from those rules which are imposed on us, not only by the very nature of the art in question, but also by the spiritual truth flowing from the divine prototype of every human creation.

FRITHJOF SCHUON

Principles & Criteria of Art.

آج کل لوگوں کو حضرت امیر خسرو پہ حیرت ہوتی ہے کہ عربی میں مہارت تامہ اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے ہوئے گیت لکھتے تھے۔ لوریاں، کہہ مکرنیاں اور انمیلیں بنایا کرتے تھے۔ طرۂ پرپیچ و خم کے بجائے، مکھ پر ڈارے کیس لکھتے انھیں شرم نہیں آتی تھی۔ دانشوری کرنے پر آتے تو ان کے سامنے چراغ کس کا جلتا مگر وائے افسوس کہ نہ تنقید لکھی، نہ ادب کے کسی دبستانِ فکر کی بنیاد ڈالی، فلسفہ طرازی سے بھی دور رہے اور نظریہ سازی کی بھی زحمت نہ کی ــــ کہا کہ من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے، گریباں چاک کیا، مست و رقصاں سرسوں کے پھول لے کر اسی کج کلاہ کی طرف چلے ــــ خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند! علم و عقل کی اس رزمگاہ میں، جہاں جہل آثار فلسفوں

معلومات کے انبوہ اور علم کی قلت، موٹی کتابوں کے بے فیض ناموں سے ایک تعفن پھیلتا جارہا ہے۔
شاعری کا منظر نامہ ایک کج کلاہ، سرسوں کے تھوڑے سے پھول اور ایک مست الست گریباں چاک سے ترتیب پاتا ہے ——

نہ جہان ہے نہ غلام ہے
نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
نہ یہ عرش ہے، نہ وہ فرش ہے
مرا ساقی، ساقیا نام ہے
مرا ساقی، ساقیا کام ہے
مرا ساقی سب یہ حرام ہے
مرا ساقی میرا امام ہے
مرا ساقی میرا امام ہے

سرشاری کی یہ کیفیت جس کی سرحدیں جذب سے مل جاتی ہیں اور جس کے سکر میں، جس کے نشۂ تند میں، تہہ دار حیرتوں کے جہان جاگتے ہیں، تصورات، تعصبات، استدلالی عقل، کتابی علم، لغات کے قبرستانوں سے کھودے ہوئے لفظوں سے پرے ایک شعری جہان میں کسی گم شدہ سمت کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی موجودہ کیفیت اس امر کا تقاضہ کرتی ہے کہ اس شاعری کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اسے مختلف سطحوں پر انسانی تجربے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ اگر اس میں کھوٹ ہے تو اسے مسترد کیا جائے اور اگر یہ سرشاری کسی عظیم اور سچے سرتے سے پھوٹتی ہے تو اس میں شامل ہونا ایک بڑے اور شدید تجربے کے سکر سے گذرنے کے مترادف ہے۔

تنقید کا معاملہ ہی ایسا ہے کہ آپ تناظر قائم کئے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ شاعری کی وہ قسمیں جو کسی مجرد خیال سے جنم لیتی ہیں ان میں تو یہ طریقہ بہت کامیابی سے چلتا ہے اور اس میں رعب اندازی کے امکانات بھی بہت ہوتے ہیں لیکن ایسی جگہوں پر جہاں شاعری خیال مجرد اور سیاسی تحریکوں، سماجی نیک نیتی اور معاشی ضرورتوں اور ناکامیوں کے ردِ عمل کے بجائے شاعری کے داخلی موسم سے پیدا ہوتی ہو، وہاں یہ نظریہ بازی بہت خطرناک چیز ہے۔ چنانچہ صوٹتے ہی میں نے دو غلطیاں کیں۔ ایک تو میں نے سکر کو ایک بنیادی CATEGORY بنا کر صلاح الدین پرویز کی شاعری

کو ایک مزاج کے خانے میں رکھا اور دوسرے اسے مجرد خیالی کی شاعری کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ اس طرح ایک رنگا رنگ شعری جہان سے میں نے اپنی پسند کا ایک قطعہ چن لیا۔ ابھی اس شاعری کو سمجھنے کے لئے ہم ابتدائی مقدمات قائم کر رہے ہیں اس لئے یہاں اس غلطی کو درست کیا جا سکتا ہے شاعری کو سمجھنے کی کوشش ہمیشہ شاعر کے تجربے کے متوازی چلتی ہے۔ اس شاعری میں اہم ترین احساس ایک بہت سیال وجود کا ہوتا ہے جس کے اندر کسی نوع کے تجربے کی مزاحمت کم سے کم ہے۔ وہ اپنے آپ کو تجربے کے سپرد کر دیتا ہے کہ ذات کی کم از کم مداخلت کے بغیر تجربے کی اصل اور اس کی اولیں تازگی اپنا ظہور پائے۔ یہی طریقہ اس شعری تجربے میں شمولیت کا ہوگا۔ اپنے ذہن کو غیر مشروط طور پر اس تجربے کے تنوع کے سپرد کر دینا اور پھر یہ دیکھنا کہ رنگوں خوشبوؤں، آنکھوں، انگلیوں کے پوروں کے لمس، لبوں کے کنج میں جنم لیتے ہوئے موسموں اور ان سب سے بلند عشق کے لمحوں کی کائناتی یکجائی سے کیسے کیسے منظر ترتیب پاتے ہیں اور کون کون سے رنگ ابھرتے ہیں۔ اس شاعری کو پڑھ کر اس سے گذر جانا بہت آسان اور خوشگوار بات ہے لیکن اس کے اندر موجود سٹرکچر کی پیچیدگیوں کو جوڑ کر دیکھنا ایک عجیب جوکھم ہے اس لئے کہ یہ بظاہر سادہ لیکن بہت پرکار تجربہ ہے — اس کا موسم بہت طلسمی، ناقابلِ گرفت، پھسلواں اور فریبندہ ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اردو ادب میں اس شاعری کی اہمیت پر گفتگو کریں، ہمیں اس کی نوعیت کو مختلف سطحوں پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ شعری منظر دوسروں سے کتنا الگ اور کس قدر مماثل ہے اور یہ کہ اس میں بنیادی تجربہ تشکیل پا کر مختلف رنگوں میں کس کس طرح ظہور پاتا ہے۔ اس طرح کے مطالعوں کے لئے عام طور پر یا تو ادوار کو بنیاد بنایا جاتا ہے یا موضوعاتی تقسیم کی جاتی ہے۔ انھیں کے ذریعے اسالیب کے تغیر کو دیکھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ صلاح الدین پرویز کے سلسلے میں یہ دونوں طریقۂ کار ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ اس شاعری میں زمانی ادوار موجود نہیں ہیں۔ مختلف اسالیب پہلو بہ پہلو ایک ساتھ موجود ہیں اور ان کے درمیان سرحدیں واضح نہیں ہیں۔ یہ پورا شعری منظر تہہ دار بادلوں کی طرح ہے جن کی الگ الگ تہیں دکھائی تو دیتی ہیں لیکن الگ الگ پہچان میں نہیں آتیں، ہم اس کی موضوعاتی تقسیم اس لئے نہیں کر سکتے کہ یہ شاعری منطقی قضیوں کی طرح موضوعاتی تخصیص کرتی ہی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ باہم در آویزاں کیفیتوں کا ایک عجیب فوق حقیقی (SURREALISTIC) معمورہ ہے جہاں کیفیتیں اور موڈ ایک دوسرے میں پیوستہ ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صلاح الدین پرویز کے نقاد یہ تو سمجھتے ہیں کہ اس شاعری میں کوئی چیزے دگر ہے،

لیکن جب یہ سمجھانا پڑ جائے کہ وہ چیز ہے کیا تو ہائیڈگر کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ فی الحال یہی مشکل مجھے درپیش ہے کہ سیال کیفیتوں کے OVERTONES بنتے ہوئے اس شاعری کے لینڈ سکیپ کی کوئی منطقی تقسیم کیسے کی جائے۔ اگر صلاح الدین پرویز کی شاعری کے سلسلے میں ہائیڈگر کو زحمتِ کلام دی جا سکتی ہے تو ایلیٹ اور ملارمے وغیرہ کا ذکر تو بدرجہ اولیٰ آسکتا ہے۔ چلئے ہم یہی ٹوٹکا آزما کر دیکھتے ہیں۔ شاعری کے سماجی منصب پر گفتگو کرتے ہوئے ایلیٹ نے ایک جگہ میلارمے کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاعر قبیلے کی زبان کو جلا بخشتا ہے۔ پھر اس پر تفصیل بحث بھی ہے۔ اس بحث سے اصول ہم نے یہ سیکھا کہ شاعر کی طرف سب سے اچھی APPROACH زبان کا مزاج ہے۔ اس کی ہر تہ سے حیرتوں کا ایک نیا جہان وابستہ ہے۔ نئی اردو شاعری میں صلاح الدین پرویز اس امر میں سب سے الگ نظر آتے ہیں کہ ان کے یہاں شعری بیان کے جتنے اسالیب، زبان کی جتنی تہیں آتی ہیں، اسما، صفات اور افعال کے ربط کی جو نوعیتیں دکھائی دیتی ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتیں۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ اب شاعری کو بذریعہ مفتاح القواعد سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ سب سے پہلے ہمیں لسانی مزاج اور شیوۂ بیان کے اعتبار سے اس شعری کائنات کا جائزہ لینا چاہئے۔

۱۔ لسانی پیرایۂ بیان میں سر رئیلی اسالیب اور مغرب سے پیدا ہونے والے طرزِ احساس سے یک گونہ مماثلت۔

۲۔ فارسی مزاج جس میں تہذیبی وضعیں صوتی ایمجز میں ظاہر ہوتی ہیں۔

۳۔ سکر و سرشاری کے بیانئے جن میں اظہاریاتی سانچے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔

۴۔ جذبوں کے بیان کے سبک اسالیب جن پر کہیں دکنی اور کہیں پوربی کی چھوٹ پڑتی ہے۔

۵۔ خالص پوربی کے اسلوبی سانچے۔

۶۔ CONFESSIONS کی شکل میں خطابیاتی نثری نظمیں۔

ہم نے صلاح الدین پرویز کے شعری لینڈ سکیپ کو سمجھنے کے لئے یہ ایک کام چلاؤ سا نقشہ بنایا ہے۔ لیکن اس سے چند بنیادی وضعیں ہماری سمجھ میں آجائیں گی۔ شاعری کا تجزیہ کرنا ایک بہت غیر شاعرانہ حرکت ہے لیکن ایک پورے شعری مزاج کو سمجھنے کے لئے اس طرح کی کوشش سے مفر بھی نہیں خصوصاً صلاح الدین پرویز کی شاعری کے سلسلے میں ہمیں یہ TEXTUAL EXERCISE کرنی ہی

پڑے گی اس لئے کہ یہاں مختلف دھارے اس طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ سب کے بارے میں ایک تنقیدی فارمولا گھڑ لینا ناممکن ہے۔ یہ شاعری ہے کیا۔ یہ اس کے اندر اتر کے ہی معلوم ہو سکے گا۔ آیئے "جنگل" کے راستے شاعری کی اس بستی تک چلتے ہیں ــــ

جنگل کی ابتدائی نظمیں جس وقت شائع ہوئی ہیں اس وقت اردو شاعری اظہاریاتی سانچوں کی توڑ پھوڑ، نئی لسانی تشکیل اور تجربوں کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ افتخار جالب، انیس ناگی، ظفر اقبال، عباس اطہر وغیرہ پاکستان میں اور اسی طرح کے بہت سے لوگ ہندوستان میں اظہار کے نئے سانچے تراشنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں جو کچھ بھی سامنے آیا وہ عبرت و افسوس کا ایک طویل قصہ ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے اندر کی یہ خواہش بے جواز رہی ہو۔ معاملہ صرف یہ تھا کہ یہ لوگ عموماً ادب کے مزاج کو اور اپنے آپ کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ انھوں نے سارتر، ہیڈگر، مارکس، کامیو، مارلوپونتی اور جانے کس کس کو پڑھ رکھا تھا، اگر نہیں پڑھا تو بھگت کبیر کا ایک سادہ سا قول نہیں پڑھا تھا ــــ تو کہتا کاگد کی لیکھی میں کہتا آنکھن کی دیکھی۔ ان لوگوں کو یہ علم ہی نہیں ہو سکا کہ ادب ایک بر جانے والی معشوقہ تو ہے ہی، اس کے ساتھ ایک سخت ممتحن بھی ہے۔ چنانچہ دس برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ یہ آوازیں فراموشگی کی گلیوں میں گم ہوگئیں۔ شاعری کے بنے ہوئے سانچوں کو صرف ایک چیز توڑتی ہے ــــ وہ نیا جہانِ حیرت جو آدمی اپنے اندر دریافت کرتا ہے۔ اگر اپنے اندر حیرتوں کے در کھولے بغیر کوئی شخص شاعری کے سانچے توڑنے کی کوشش کرے گا تو اپنے گرد ملبہ اکٹھا کرے گا اور آخر کار اسی میں دب کر ہلاک ہو جائے گا۔ جنگل کی نظموں کے پیچھے افلاطون و ارسطو کے نظریات نہیں ہیں، اپنے اندر ایک جہانِ نو کی دریافت کی حیرت ہے، ایک بچے کا چلبلا پن ہے جو چیزوں کو جوڑ جوڑ کے اور توڑ توڑ کے دیکھتا ہے۔ اس کے پیچھے آہنگ کھیل میں بنائے ہوئے DOGGERALS کا اور لوریوں کا ہے۔ اس کی تمثالیں ریڈی میڈ کتاب سے نہیں بلکہ بچے کی آنکھ سے پھوٹتی ہیں ــــ شہد کی پیالیاں میں صاحبان بیٹھے ہیں۔ اس سطح پر صلاح الدین پرویز نے اپنا ایک نیا لسانی آہنگ اور تمثالوں کا نظام دریافت کیا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ بہت طلسمی منظر ہیں کہ ان میں اشیاء کا اپنا ایک تلازمہ ہے اور اس تلازمے کی بنیاد بچے کی ازلی حیرت ہے:

ایک لڑکی کے اسٹول پہ
ایک تکیہ ہے

تکیے پہ اک خواب ہے
خواب کی چار آنکھوں میں
دو بچیاں
خواب ہیں
چار آنکھوں کے
ہر خواب میں
ایک ہلکے بدن کا الم
خواب ہے
خواب پر — خواب ہے
خواب کے درمیاں
خواب ہے، درمیاں
خواب ہے —

.....آسمان پر کسی نے کالا پینٹ کر دیا ہے
تھوڑی دیر میں
بارش ہر چیز بہا دے گی
راجو کا پربھی!
پرنیتا!!
ہمارے بچے!!!
ڈسٹ کور سے آسمان صاف کر دو۔

یہ تو تاثر اور نگیٹیو سے ایک ایک منظر ہے لیکن تاثر اور نگیٹیو خود ہمارے نئے ادب کے گم شدہ بچے ہیں۔ ان پر تفصیل سے گفتگو آئندہ کبھی ہوگی۔ اس وقت تو صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہ سرریئلی منظر جو صلاح الدین پرویز کے ہاں ابھرتے ہیں ان کی اصل کیا ہے۔ پہلی بات تو ایک یہ نظر میں رکھنی چاہیے کہ اشیاء کی عام تجربی منطق اتنی شدید ہوتی ہے کہ آدمی دیر تک اس سے بھاگ نہیں سکتا چنانچہ سرریئلی تمثالوں کی دنیا میں آدمی کی سانس جلد اکھڑ جاتی ہے اور اس کا اظہار یا تو لایعنی ہو جاتا ہے

یا سپاٹ۔ ژاژ اور نگیٹیو اردو کے جدید ادب میں اس امر سے بھی ممتاز ہیں کہ ان میں کسی ایک تمثال کی تشریح نہیں بلکہ تمثال در تمثال، منظر در منظر کئی جہان ابھرتے ہیں جو ایک داخلی کیفیت کے ذریعے مربوط ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہیں۔ جو لوگ اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا چاہتے ہوں وہ ریں بو کی نظم A SEASON IN HELL غور سے پڑھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ طویل سرریئلی نظم آدمی کو کس طرح خون تھکوا دیتی ہے۔ ایک غیر منطقی منظر کو نگاہوں میں دیر تک تھامے رکھنا مشکل کام ہے۔ ژاژ میں صلاح الدین پرویز نے خصوصیت کے ساتھ ایک بہت پیچیدہ لینڈ سکیپ بنایا اور اسے تھامے رکھا ہے:

آئینہ آئینہ
دیوتا سے بڑا آئینہ
آئینہ
اور اس میں کئی سیڑھیوں کے نشاں
خون کی آہٹوں کا دھواں
کیا ہوا ــــ
خون ــــ چہرہ ــــ خدا
خوف۔ نیکی تجسس
خدا!
تو گٹھری کے اجلے گناہوں کو
چڑیوں کی شکلیں
عطا کر
خدا!
تو گٹھری کی سانسوں میں
امید رکھ

سنہ۶۰ء کی دہائی سے اردو ادب میں جو جدید تحریک چلی تھی یہ منظر اس کے فلسفے سے بہت کچھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اے کاش ان لوگوں کے پاس جتنا فلسفہ تھا اتنی شاعری بھی ہوتی۔ اصول یہ ہے کہ تحریکیں مرجاتی ہیں اور شاعری زندہ رہتی ہے۔ ریں بو نے شاعری کے بارے میں ایک مقدمہ قائم

کیا ہے کہ شاعری RATIONAL DISORDER OF THE SENSES ہے۔ یعنی سماعت، بصارت، لامسہ، شامہ شاعری کی تمثال کاری میں تمام حسیات ایک دوسرے میں برابر منعکس ہو کر تمثال بنائیں۔ یہ ایک طریقہ تھا شاعری کو پورے وجود کا تجربہ بنا دینے کا۔ مشرق میں بھی یہ طریقہ بہت استعمال ہوا ہے اور سرریئل تمثالوں کی منطق بہت حد تک اسی کے ذریعے عمل کرتی ہے صلاح الدین پرویز نے اس اصول کو اپنی داخلی واردات کے ذریعے کامیابی سے برتا۔ اصل میں شاعری کے اصول کتاب سے پڑھ کر سیکھنا بہت مہلک بات ہے۔ یہ وہ غلطی ہے جو اردو کی جدید شاعری میں کم و بیش ہر شاعر سے سرزد ہوتی ہے۔ ادبیات عالم پر نظر رکھنا ضروری ہے لیکن تنقید کی کتاب سے اصول پڑھ کر اس کے مطابق شاعری کرنا ایک احمقانہ دلیری کی بات ہے۔ ایک صاحب کا کہنا ہے:

"ایسا کرنا یوں ہی ہے جیسے تم پیراکی پہ ایک کتاب پڑھ کر جھیل میں چھلانگ لگا دو تو تم اس کی تہہ کو جا چھوؤ گے اور فوراً اوپر نہیں آؤ گے"

سو پچھلی دو دہائیوں کی شعری تاریخ اُن اہلِ جرأت سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے یوں ہی چھلانگ میں جھیل کی تہہ چھو لی مگر آج تک اوپر نہیں آئے ہیں۔ صلاح الدین کے ہاں اہم ترین چیز، سارے شعری عمل کا جوہر صرف ایک ہے ـــــ ہر شے ایک خالص داخلی واردات سے پھوٹتی ہے، یہ تصویریں ــ چاہے ایک خوابِ خوش گماں کی ہوں یا شبِ دہشت آثار کی، انسانی وجود کی ازلی رات میں ہی جنم لیتی ہیں۔ ان کے منظر شیگال کی تصویروں کی طرح حقیقت اور غیر حقیقت کے درمیان نامعلوم کے ایک نقطے پر ڈولتے رہتے ہیں ــ

صلاح الدین پرویز کی شاعری کی اصل ہیں ــ کیفیات، ان نظموں اور شخصی مزاج کے ربط کو ہمیں ایک تمثال کے ذریعے سمجھ لینا چاہئے۔ انسانی باطن کا لینڈ سکیپ ایک سمندر اور ایک آسمان سے بنتا ہے۔ ان کے درمیان صبحوں اور شاموں کے بدلتے ہوئے رنگوں کو منعکس کرتے ہوئے بادلوں کے پرے ہیں، یہی شاعری ہے۔ انہی پر منعکس ہوتے ہوئے رنگوں سے کیفیات بنتی ہیں اور کیفیات میں رہنا ایک طرح کا سکر ہے، شاعر کا کام اپنے اس سکر کو معنی نہیں بلکہ آہنگ کے ذریعے اس کیفیت کے داخلی RYTHM کو شیوۂ بیان میں شامل کر کے دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے۔

A POEM SHOULD NOT-MEAN, BUT BE!

میں اس مسئلے پر زیادہ نظریہ بازی کرنا نہیں چاہتا لہذا آئیے براہِ راست ان کیفیات کو ہی دیکھیں۔

پہنے ہوئے صدف کی شب
آئے کہاں سے دردِ دل
گھاؤ کے سب گداز گم
آنکھوں کے جوئبار گم
ہونٹوں کے کاسۂ شراب گردِ سراب سے اٹے
کہتے ہیں یارحیم "لا" بارشِ آفتاب میں
باغِ حریم میں حنا زرد سا ایک نام ہے
موسمِ ہجر، ہجرتی روحوں کی دھوپ چھاؤں ہے
خیمۂ سنگ سے پرے کوئی بھی راستہ نہیں
خیمۂ سنگ سے پرے لمبی سی ایک شام ہے

ہم اس نظم کے ساتھ جس منطقے میں داخل ہوتے ہیں وہ بنیادی طور پر فارسی مزاج سے تعلق رکھتا ہے ۔ عراق خاک سے آگے ہے سرحدِ فارسِ جاں کی ۔ جس طرح فارسی شاعری میں سبک ہندی اور سبک خراسانی وغیرہ کے الگ الگ مزاج ہیں اسی طرح اردو میں فارسی مزاج جب OPERATIVE ہوتا ہے تو اپنا ایک ماحول پیدا کرتا ہے ۔ اس ماحول کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شے کو یا کیفیت کو بیان کرنے کی بجائے ترکیبوں کے استعمال سے اسمار اور صفات کو جوڑ جوڑ کر اس اصل کیفیت کو ACTUALISE کرنے کی کوشش کرتی ہے جس پر اصل میں نظم کی بنیاد ہو ۔ اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ کوئی عنصر ــــ تمثال، آہنگ، معنی، منظر الگ دکھائی نہ دے بلکہ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر یک جان ہو جائیں ۔ فارسی مصوری میں نیم قوسی STYLISATION کی ہی اسی لئے جاتی ہے کہ اصل فگر FIGURE ماحول کے ساتھ یکجان ہو جائے۔ اس طرح کی نظموں میں صلاح الدین پرویز نے بنیادی طور پر کیا یہ ہے کہ اسمار کو صفات کے طور پر استعمال کیا ہے اور آہنگ کے ذریعے انھیں اس طرح ایک کیفیت میں سمیٹ لیا ہے کہ ہر چیز مل کر نظم ہمارے سامنے کسی منطقی بیانیے کے طور پر نہیں بلکہ ایک شامِ ملال کے تین منظروں کی صوتی اور تمثالی حقیقت بن جاتی ہے ۔ یہ نظم چونکہ طویل ہے لہٰذا اس پر تشریحی گفتگو یہاں ممکن ہے نہ مناسب ۔ یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ اس شاعری کے انوکھے اور نادر طریقۂ کار کا اندازہ ہو جائے ۔ اسی طریقۂ کار کا ایک اور منظر :

سب بدن آسا جھر تھے تیرۂ تصویر کے
عریاں عریاں ہو رہے تھے لذتِ یک پہر سے
اک اتو کھا آسماں لپٹا تھا جبلِ خوف سے
سب زمینیں جاگتی تھیں گرمیِ لاریب سے

جس طرح نثر میں لفظ کا جوہر معنی ہے اسی طرح یہاں اس شاعری میں لفظ کا جوہر اس کی صورت اور اس کی اور اس میں پوشیدہ تمثال ہے۔ اسی لئے میں عموماً یہ کہا کرتا ہوں کہ جدید اردو ادب میں صلاح الدین پرویز کی شاعری سماعی تخیل AUDITORY IMAGINATION کو استعمال کرنے والی سب سے اہم شاعری ہے۔ اس طریقۂ کار کی خصوصیت یہ ہے کہ مصرعہ جب سنیں تو محسوس ہو جائے کہ ایک تصویر بنتی ہے لیکن اگر اس تصویر کو بصری سطح پر متشکل کرنے کی کوشش کریں تو وہ "شے" کی CATEGORY میں نہ آئے۔ اس امر سے جو تخلیقی کشاکش پیدا ہوتی ہے وہ شعری کیفیات کو تخلیق کرتی ہے۔ کیفیات اس لئے کہ نظم کی تمثالوں کا نظام آہنگ کا بہاؤ اور یکے بعد دیگرے گذرتی ہوئی تصویروں کے ذریعے ہمارے حسیاتی نظام کے عناصر کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کرتی ہیں اور ان کے درمیان سے ابھرتی ہوئی بے صفت صورتیں ایک نادر شعری تجربے کی شہادت دیتی ہیں:

دشتِ شب یک روز
کہ سب عزو علا اک عالمِ غل میں جلتے رہے
بیتابیٔ گل ٹوٹی بھی نہیں اور سارے مکاں جلتے بھی رہے
نا دستی کوئی بادل سے بنی اک عرصۂ گل پہ بہتی رہی
اک بلبلِ لب خاموشی سے باراں رم جھم برساتی رہی
اک عالم ہو تھا زیرِ زمیں یک سکتۂ شب میں ڈوبا ہوا
تھا فرشِ زمیں پہ پھولوں کا عرشیلا مکاں دستک سے بندھا زندہ زندہ

اب تک تو ہم نے صلاح الدین پرویز کے ہاں شیوۂ بیان کے مختلف اعتبارات کو تکنیکی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک ضروری امر یوں تھا کہ صلاح الدین ایک بالکل تازہ حسیاتی سٹرکچر تخلیق کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے لئے بظاہر بہت اجنبی ہے لیکن اس کی صوتیاتی ترکیب اور اس کی تمثیل کاری ہمارے کسی قدیم نمونے کی بازیافت کرتی ہے، جب کائنات میں اشیاء الگ

الگ نہ تھیں۔ ابھی اسم اور جسم جدا نہیں ہوئے تھے اور زبان آٹھ قسم کے افعال اور چھتیس قسم کے اسمار میں منقسم نہیں ہوئی تھی، بس اسم تھے اور ان سب کے درمیان ایک اسم تھا ـــــ یہ شاعری آدم اول کی پُر حیرت نگاہوں سے کائنات کو پہلی بار ایک سیال حقیقت کے طور پر دیکھنے کا عمل ہے!

محمود ہاشمی نے لکھا ہے کہ صلاح الدین پرویز اسلوب کے نہیں بلکہ اسالیب کے شاعر ہیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ بہت درست ہے بلکہ یہ کہ ادبی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسالیب کے اس معمورے میں وہ کیا نقطہ ہے جس کے گرد دائرہ در دائرہ یہ سارا جہان اپنی تنظیم کرتا ہے۔ اگر یہ نقطہ موجود ہے تو ایک منضبط جہان اس سے ابھرے گا، ایک لینڈ سکیپ بنے گا اور اگر یہ نقطہ موجود نہیں تو اس خاک میں کہیں کہیں سونے کا رنگ ہے اور بس۔ سلیم احمد کا کہنا ہے کہ صلاح الدین پرویز کے ہاں ایک مرکزی نقطہ موجود ہے:

"تاریخ اس کے خون میں یاد بن کر موجزن ہے۔ تجربہ اس کے قلب کا زخم ہے، مشاہدہ اس کی آنکھوں کا نور ہے اور جب یہ نور، یہ زخم اور یہ یاد ملتی ہے تو صلاح الدین پرویز علامت در علامت زندگی کی تہوں میں اترتا چلا جاتا ہے، اس کی محبتیں اور نفرتیں اس کے دکھ اور خوشیاں اس کی عقیدتیں اور حقارتیں سب اس کے قلم سے ایک سیاہ روشنی کی صورت میں کاغذ پر بکھرنے لگتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی محبت اس ذاتِ گرامی سے ہے جو باعثِ تکوین کائنات ہے۔ جن کا نور پیشانی آدم پر اس وقت جلوہ گر تھا جب آدم میں روح پھونکی جا رہی تھی اور یہ محبت صلاح الدین کے قلب کا مرکز ہے اور اس مرکز میں جو روشنی ہے صلاح الدین اسی روشنی سے زندگی کی ہر واردات کو دیکھتا ہے ـــــ"

صلاح الدین پرویز کے سلسلے میں یہ بہت اہم بیان ہے اور اس کے ذریعے ان کے تخلیقی منظرنامے کی ترتیب ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں کچھ ضمنی مباحث اٹھانے پڑیں گے اور بات آگے بڑھانے سے پہلے کچھ اصول بیان کرنے ہوں گے تاکہ گفتگو میں الجھاؤ پیدا نہ ہو۔

نور کی مذہبیت تمام مذاہب عالم کا متفقہ موقف ہے۔ اپنشد میں بھی آتا ہے کہ روشنی سورج، چاند اور ستاروں میں نہیں بلکہ وجود کے مرکز میں پرش کا نور ہے جس سے ہر شے منور ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شے خود کیا ہے، محض اس ظہور، نور کی ایک جہت کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی بات کو غالب نے ایک جگہ نعت کے پیرائے میں بیان کیا ہے ـــــ

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اسی طرح توحید جمال کے بارے میں شیخ عراقی کا مشہور فقرہ ہے :

اللہ جمیلٌ و یحب الجمال ۔۔۔ ہر چہ ہست آئینہ جمال اواست ، پس ہر چہ باشد جمیل باشد۔
اشیائے کائنات کو ایک قدسی روشنی میں دیکھنے کا رویہ حسیات کے سارے عمل میں ایک SENSE OF THE SACRED پیدا کر دیتا ہے جو فی الاصل تمام عبادتوں کا جوہر ہے۔ یہ درست ہے کہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے اس کے درجے الگ الگ اور اس کے اطلاقات وسیع ہیں لیکن شعور قدس زندگی کے ادنیٰ ترین درجے پر بھی OPERATIVE رہتا ہے۔ یہی ستارہ داؤدکی الٹی مثلث کی رمز ہے۔

صلاح الدین پرویز کی شاعری میں طلب جمال اور سرشاریٔ عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسی مرکز کے گرد ان کی شعری کائنات اپنا نقشہ ترتیب دیتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس پورے معاملے میں صلاح الدین پرویز نے کہیں بھی مراتب وجود کی معنویت کو نظرانداز نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھوں نے اصطلاحات صوفیہ کی کتاب سے مراتب وجود کے باب کی تلخیص کر رکھی ہوگی بلکہ یہ شعور انسانی فطرت میں ہمہ وقت موجود ہے صرف ایک بار اس کے مرکزی تصور میں داخل ہوجانے کی دیر ہوتی ہے ۔۔۔ اس کا مذہبی پہلو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سطح پر اور دوسری سطح پر حضرت محبوب الٰہی سے منسلک ہے اس پر ہم ذرا ٹھہر کے گفتگو کریں گے۔ پہلے عام انسانی تجربے کی سطح پر اس کی جو جو صورتیں ظہور میں آتی ہیں اس پر بات کر کے ہم چند ابتدائی مقدمات واضح کر لیں ۔۔۔

آتش کدہ

اک عبادت گاہ

جب مزارِ صبح سے بیدار ہوتی ہے
تو آتش ناک ہو جاتی ہے کشتی

جس میں ہوتا ہے ہلال

تحتہا الانہار

بنتی ہے سمک ۔۔۔ گرداب در گرداب
چونک پڑتی ہے کتاب

لوحِ سینہ : سرمہ سا اک ابرِ ریشم سے بندھا
یا آفتاب
در کتابِ سیم تن، سب حرف : صاف آشنا باب
یا مہتاب ، یا یاقوت وش
کھول دیتی ہے کتاب
راہِ گنجِ منتہا ، نورِ زنخدانِ حسیں بالائے بام
اور پھر ہوتے ہیں گم ان کاکل اسرار میں
سب آفتاب و ماہتاب ، ارض و سمک ، گرداب در گرداب
اور پھر دل کے کسی آتش سے اٹھتی ہے صدا
حوری سرشت
قصرِ امکاں بے صراحی ، بے پیالہ ، بے مکیں
اے پری پیکر
گرا رطلِ گراں
ہونٹوں سے ٹپکا اک عبیر مست
اے گُل صفت مینائی ، مینائی بہ لب مینا پری پیکر
پلا دے ارغواں
گھل جائیں میرے سنگ لب
گھل جائیں سب دنداں ، زباں ، تا درونِ جسم
ہر عشرت کدہ
اور بن جائیں شراب

عشق چاہے جسم کی سطح پر ہو یا بارگاہِ قدس کی سطح پر اس میں ایک ہی طلب کارفرما ہوتی ہے اپنے وجود کو اس میں جو بظاہر غیر ہے ، حل کر دیا جائے ، حسیات ، شعور ، وجود کے دائرے سے قدم باہر رکھا جائے ، یہ جسم کو توڑ کر ، بلکہ دائرہ وجود کو توڑ کر اوپر نکلنے ، من و تو ، این و آں کی شناخت سے آگے جانے کا مرحلہ ہے۔ سرشاری کی یہ طلب صلاح الدین پرویز کے ہاں اتنی شدید ہے کہ ایک طرف رومی و عراقی کی یاد دلاتی ہے دوسری طرف پنجابی کے صوفی شعرا کی ـــــ تیرے عشق نچایا کر کے

تھیا تھیا! لیکن مقصودِ گفتگو یہ ہے کہ سرشاری کی نوعیت کا اندازہ کیا جائے تاکہ ہم اس پوری کیفیت کو اس کی اعلیٰ ترین سطحوں تک سمجھ سکیں۔ اس پر بات کرنے سے پہلے ہمیں ایک بنیادی اصول سمجھ لینا چاہئے۔ سکر اور سرشاری کسے کہتے ہیں؟

دنیا کی تمام تہذیبوں میں حقیقت اور سکر کا ایک بہت لازمی تعلق پایا جاتا ہے۔ انسان کو حقیقت کی معرفت جس سطح سے ملے گی اس سطح پر سکر یعنی ماسوا کا نسیان پیدا ہوگا۔ اگر جسمانی معرفت حاصل ہو تو حسیاتی سکر، اگر قلبی ہو تو جذب اور اگر روحانی ہو تو فنا — چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبوں میں کم و بیش معرفت دو استعاروں سے بیان ہوتی ہے — شراب اور شمع۔ اگر حقیقت انسان کے اندر اتر جائے تو اس کے شعور کو ساقط کر دیتی ہے اور کائنات کے ظاہر حسیاتی نقشے کو بدل دیتی ہے، یہ شراب سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے، اگر انسان حقیقت کی آگ میں اتر جائے تو وہ اس کے وجود کو فنا کر دیتی ہے جیسے شمع کی لو میں پروانہ۔ ان دونوں چیزوں میں حقیقت کو استعارہ آگ اور پانی کے آمیزے سے کیا گیا ہے۔ شراب میں آتش و آب یکجا ہوتے ہیں، دیئے کے تیل میں بھی۔ اس علامت کو سری کیمیا والے اور آگے تک لے گئے ہیں۔ عقل انسانی آگ ہے جس میں نور اور وحدت دونوں یکجا ہوتے ہیں اور ایمان پانی ہے جس میں سکون اور ٹھنڈک ہے۔ معرفت کامل اس وقت ہوتی ہے جب یہ دونوں مل جائیں، حقیقت کی طرف جو ابروبج ذہن سے کی جائے اسے سفید کہا جاتا ہے وہ برف کی طرح، ہیرے جیسی ہے اور پھولوں میں اس کا استعارہ گل یاسمن ہے، جو قلب سے کی جائے اس کا رنگ سرخ، اس کا عنصر آگ اور اس کا پھول گلاب ہے —
یہ ساری کیفیتیں، یہ سرشاریاں، فنا ہو جانے کی یہ خواہش صلاح الدین پرویز کے ہاں آپ کو قدم قدم پر نظر آئے گی۔ اس کے درجے مختلف ہیں کبھی یہ محبوب کے جمال میں کھو جانے کی کوشش ہے، کبھی ساقی کے لطف و کرم میں ڈوب جانے کی، کبھی آتش کدہ بن کر دہکنے کی اور کبھی پانی سے مرجانے کی۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ صلاح الدین کی اکثر تحریروں کی اعلیٰ ترین مابعد الطبیعاتی سطح پر تعبیریں کی جاسکتی ہیں اور وہ درست ہوں گی اس لئے کہ وہ اس شاعری کے بطن سے ہی پھوٹتی ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ یہ باتیں انھوں نے کتابوں سے پڑھ کر اخذ نہیں کیں، اس صورتِ حال میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ بحکم محبوب سبحانی یہ حضرت امیر خسرو کا ہی براہِ راست فیض ہوگا کہ حضرت مجدد کا قول ہے کہ علم سعدا پر الہام کر دیا جاتا ہے —
ہر کیف تو گفتگو سرشاری کی کیفیت سے متعلق ہو رہی تھی۔ یہاں یہ بات دھیان میں رہنی

چاہئے کہ صلاح الدین پرویز کے ہاں شعری کیفیات ایک عظیم کائناتی موسم سے پیدا ہوتی ہیں اور اس میں باطن بھی تبدیل ہوتا ہے اور خارجی دنیا میں موجود شے بھی بدلتی ہے ۔ یہ رشتہ ماورا کے ایک اصول ، ماورا میں ایک پُراسرار تغیر سے پھوٹتا ہے :

مالی ترے گلشن میں سبھی رنگ کے ساون
لکھتے ہیں سراپا ترے جادو کے قلم سے
تو موج ہے اور موج میں چنگی بھری لالی
رنگتی ہے سفینہ تجھے اور مجھ کو سرابی
تو دھوپ ہے اور دھوپ میں خنکی کی کیاری
رنگتی ہے تجھے نیند مجھے دل کی خرابی
تو رات ہے اور رات میں اک دھوپ سرائے
رنگتی ہے تری آنکھ کہ تو سو نہیں جائے
مالی ترے گلشن میں سبھی رنگ کے ساون
لکھتے ہیں سراپا ترا جادو کے قلم سے

اس طرح ہمہ وقت ایک سیال غیر یقینی اور متغیر کیفیت میں رہ سکنا ہی ایک بڑا شعری جوہر ہے۔ غالباً اسی چیز کو KEATS منفی صلاحیت (NEGATIVE CAPABILITY) کہتا ہے ۔

سرشار ہو جانے اور کھو جانے کی یہ کیفیات صلاح الدین پرویز کے یہاں سب سے عروج پر یا تو ساقی ناموں میں ہیں یا محبت کی نظموں میں ۔ ان کی تقدیسی نظموں میں ایک طرح کی عظیم سپردگی ہے جو اس سرشاری سے ہی پیدا ہوتی ہے لیکن ہے اس سے بالکل مختلف چیز ۔ صلاح الدین کی عشقیہ شاعری کے رنگ اور اس کی سرشاریاں ، اس کے سرور اتنے ہیں کہ ان کے بیان کو ایک پورا مضمون الگ چاہئے — کہ ہزار میکدہ می دود بر کاب گردش رنگ ما ! لیکن اس کے چند رنگ دیکھ کر ہم آگے چلتے ہیں ۔ ان میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کی تفصیل اس تحریر میں بیان نہیں ہو سکتی کہ اس کی نزاکتیں اور اس کے تلازموں سے پھوٹتی ہوئی کیفیات کے جہان ایک اور طرح کے تجزیے کا تقاضا کرتے ہیں کہ جس کا آغاز اگر یہاں کر دیا جائے تو یہ مضمون کتاب ہو جائے گا ۔ بہر حال اب صلاح الدین پرویز کے ہاں لہجوں کے آہنگ اور ان کے حشر آثار تیوروں کی طرف چلئے ۔ پہلے ایک نظم جس کے بارے میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ اپنی کیفیت اور رچاؤ کے لحاظ سے اردو شاعری میں انسانی تعلق کی ایک نادر دستاویز ہے ،

اتنی گہری سطح پر پورے وجود میں وفور پیدا کرنے والی چیز اردو میں میری نگاہ سے گزری نہیں ہے:

مجھے یوں جگائے رکھتا کہ کبھی نہ سونے دیتا
سرِ شام ہوتے ہوتے کوئی آکے یہ بتاتا
کہ خزاں برس رہی ہے، مری نیند کے چمن میں
مری رات کھو گئی ہے کسی جاگتے بدن میں
مری رات، رات حالی وہ حسب نسب پیاری
وہ گلاب چہرے والی وہ رحیم زلفوں والی
وہ برے دنوں کی ساتھی، وہ اداس گل کیاری
مرے ساتھ رہنے والی کہاں جائے گی دوانی
کہ نہ گھر ہے اس کا کوئی نہ گھر ہے میرا کوئی
کہاں جائے گی دوانی
کہاں جائے گی دوانی
ابھی کھل اٹھیں گے رستے کہ ہزار راستے ہیں
کہ سفر میں ساتھ اس کے کئی بار ہم رہیں ہیں
کہ دیا جلائے رکھیو کہیں وہ گزر نہ جائے
کہ ہوا بچائے رکھیو کہیں وہ بکھر نہ جائے
کہ خزاں برس رہی ہے مری نیند کے چمن میں
مری رات کھو گئی ہے کسی جاگتے بدن میں

میں اس نظم کا یہاں نہ تجزیہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ کوئی تشریحی کلمات کہنا چاہتا ہوں کہ ایسا کرنا اپنی بدذوقی پر مہر ثبت کرنے والی بات ہوگی۔ اس نظم کو یہاں نقل کرنے سے مراد صرف یہ ہے کہ انسانی تعلق کا جو بنیادی سانچہ صلاح الدین کے ہاں نمودار ہوتا ہے وہ نظر میں آجائے۔ اب محبوب کے جمال کو بیان کرنے کا جہاں تک معاملہ ہے اس سلسلے میں یہ چند سطریں دیکھئے لیکن یہاں اشارۃً ایک بات عرض کرتا چلوں کہ صلاح الدین میں ایک عجیب و غریب صلاحیت سراپا کو کیفیت بنا دینے کی ہے۔ اگر کاکل کا بیان ہے تو وہ اسے کاکل کے خم و پیچ سے پیدا ہونے والی کیفیات کے تلازموں میں ڈھال دیتے ہیں۔ واقعہ کو کہانی بنا دینا کوئی اہم بات نہیں ہے لیکن وجود کو کہانی بنا دینا بہت مشکل اور نازک

کلام ہے:

وہ سرو و صنوبر والی تھی، اک لافانی دل والی تھی
تھا نام سمند آرا اس کا، وہ نشہ و صفت دلاری تھی
وہ آتشِ کم آمیزی میں تھی اک ستھپک یاد آتی کی
وہ نخوتِ لب کی جنبش میں اِک منظر تھی غربالی کی
وہ چوخانے درویشی میں صد رنگ قفس بھی رکھتی تھی
تھے اس کے بڑے محلات کئی وہ پاس عنادل رکھتی تھی

بہرکیف اگر ہم ان نظموں کی مختلف تہوں کی تشریح میں پڑ گئے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم ایک اجمالی بیان کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ صلاح الدین کی شاعری کا یہ پہلو ایک بالکل الگ مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔

اگر تھوڑی سی نظریہ بازی کی اجازت ہو تو عرض کروں کہ صلاح الدین پرویز کے ہاں انسانی تعلق کی شاعری کی دو جہتیں دکھائی دیتی ہیں؛ افقی اور عمودی۔ افقی جہت میں اشیاء اور رجال کی علامتیں ان کی شعری کیفیتوں میں عجیب پُراسرار طریقے سے گھل جاتی ہیں۔ ان کی کیفیتیں بنیادی طور پر ایک گہرے ملال اور موجود کو یاد میں ڈھال دینے کی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ عمودی جہت میں یہ تجربہ سیاقی پیٹرن کو توڑ کر آگے جانے کی کوشش کرتا ہے اور مختلف تقدیسی رنگ اختیار کرتا ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تقدیسی علامتوں کے بار بار ذکر سے یہ نہیں جاننا چاہئے کہ ہماری کلاسیکی شاعری میں جس طرح اشیاء مجاز کے منظروں میں رہتے ہوئے حقیقت کا آئینہ بن جاتی ہیں، صلاح الدین پرویز کے ہاں یہ کیفیت ہوگی۔ یہاں یہ واضح ہونا چاہئے کہ وہ مجاز و حقیقت کے قضیے میں بنیاد رکھ کر شعر نہیں کہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شے کو محور بنا کر شاعری نہیں کرتے کہ اس پر ارتکاز سے مجاز و حقیقت کا ربط پیدا ہو بلکہ کیفیات کو بنیاد بنا کر شاعری کرتے ہیں۔ اس سے جو منظر پیدا ہوتے ہیں وہ مختلف سطح پر وجودی صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں احوال کی شاعری ہے۔ اس کی متوازی مثالیں دینے کے لئے مجھے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ ہمیں روایت میں بہت بڑی شاعری کی یاد دلاتی ہیں۔ اگر ہم ان احوال کو، اس شیریں بیان کو غور سے دیکھیں تو ہم ان میں کہیں کہیں عراقی، رومی اور کسی حد تک قرۃ العین طاہرہ کے احوال سے مماثلت پائیں گے۔ یہ سرشاری اپنے اندر مختلف تہیں رکھتی ہے۔ کہیں یہ حافظ کے ہاں

مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم' سے مماثل ہے اور کہیں اس کی لے طاہرہ کی آواز سے مل جاتی ہے:

ہلہ اے گروہِ حمائیاں بکشید ہلہلۂ ولا
کہ ظہورِ طلعت ماعیاں شدہ فاش وظاہر و برملا

ایک بات طے ہے کہ اگر ہم اسے کسی روایت کے نام سے پہچاننے کی کوشش کریں گے تو یہ براہِ راست فارسی شاعری سے متعلق ہو جائے گی۔ محبوب میں ایک تقدیسی جہت پیدا کرنے کی کوشش مغرب میں بہت معروف طور پر METAPHYSICAL POETS سے وابستہ رہی ہے۔ BLAKE کے ہاں بھی اس کے بہت قوی عناصر ملتے ہیں لیکن غیر معمولی غنزلیہ بہاؤ میں یہ چیز YEATS کے ہاں ظاہر ہوتی ہے:

BELOVED, LOOK IN THINE OWN HEART
THE HOLY TREE IS GROWING THERE
FROM JOY THE HOLY BRANCHES STATE
AND ALL THE TREMBLING FLOWERS THEY BEAR

"کہ خزاں برس رہی ہے مری نیند کے چمن میں

یہاں لازم ہے کہ صلاح الدین کی تازہ کتاب (جو ابھی شائع نہیں ہوئی) "چمبن" پر بھی تھوڑی سی گفتگو کر لی جائے۔ یہاں میں مثالیں دینے سے احتراز کروں گا لیکن اس بارے میں یہ چیز بالکل واضح ہے کہ چمبن میں صلاح الدین پرویز نے تجربے کو ایک محدود رقبے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ایک غیر معمولی DIRECTNESS پائی جاتی ہے۔ کیفیات زیادہ شفاف ہوتی جا رہی ہیں اور زیادہ زور اب تجربے کے بیان پر آگیا ہے۔ بہر حال ان چند سطروں میں اس کتاب کے پورے مزاج کو سمیٹا نہیں جا سکتا اس لئے کہ اس کتاب میں شامل تحریریں موسیقی کی کائنات سے غیر معمولی طور پر وابستہ ہیں اور جب تک انھیں موسیقی کی اصطلاحوں میں اور اس کے مزاج کے پس منظر میں رکھ کر نہ دیکھا جائے اس سے انصاف کرنا مشکل ہوگا۔

دنیا کے تمام مذاہب میں اصولِ نجات دو ہیں۔ اصول اور وجود۔ یعنی PRESENCE اور TRUTH۔ بعض جگہوں پر نجات اور معرفت اصول کے ذریعے ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر وجود کے ذریعے۔ اس امر کو ایک مثال سے سمجھئے۔ عیسوی روایت میں نجات کا مدار انجیل مقدس پر نہیں بلکہ براہِ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر ہے۔ اسلام میں وحی چونکہ قرآن ہے اس لئے نجات کا مدار

قرآن سے متعلق ہو جاتا ہے۔ ہندو مت میں اس کا دارو مدار اوتار کے وجود پر ہے۔ بدھ مت میں اصول یعنی اپائے پر۔ اصول ہو یا وجود، مقصود دونوں کا ایک ہے۔ اگر ہندو مت کی مابعد الطبیعیاتی اصطلاح میں گفتگو کیجئے تو ہم مایا کی اقلیم میں ہیں اور وہ نقطہ جہاں مایا اور آتما کا ربط ہوتا ہے ایک گہرا راز ہے۔ یہی راز ہے انسان کے ذریعے ظاہر ہو تو اسے ہم نبی کا AVATARIC FUNCTION کہتے ہیں اور اگر لفظ کے ذریعے وجود میں آئے تو وحی یا شرتی جانتے ہیں۔ اگر یہ مایا کی اقلیم میں ہی ACTUALISE ہو جائے تو ولایت کا راز ہے اور آتما کی اصل سے مایا کے مظاہر میں ظہور کرے تو نبوت کی حقیقت ہے۔ مایا اور آتما کا یہ نقطۂ ربط اپنی فوقی جہت میں رازِ تخلیق ہے اور اپنی سفلی جہت میں انسانی اور کائناتی وجود کی لایعنیت، جو روح اس کی فوقی جہت سے تعلق رکھتی ہے وہ مدارِ نجات سے عشق کرتی ہے اور جو سفلی جہت سے تعلق رکھتی ہے کلمہ اور اس کے راز کے امین مظاہر کو مسترد کرتی ہے۔ اس ساری بات کا بیان اس لئے ضروری ہوا کہ اس بنیادی اصول کو سمجھے بغیر ہم نعت و منقبت کی تقدیسی شاعری کی رمز کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس شاعری کا اپنا ایک روحانی عمل و فرع ہے اور اسے اسی میں رکھ کر دیکھنا چاہئے۔ فنونِ مقدسہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ چونکہ وہ اپنے CONTACT کی وجہ سے مقدس ہوتی ہیں اور ان کی تخلیق سے مراد احوال کا حصول نہیں بلکہ ایک روحانی برکت کا حصول مقصود ہوتا ہے اس لئے ان میں ایک روحانی واردات بننے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ فنونِ مقدسہ کے جو نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں ان کے پیشِ نظر یہ بات کچھ اتنی غلط بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اتنا ضرور ہے کہ جہاں DELIVERANCE THROUGH PRESENCE کا اصول موجود ہو گا وہاں تقدیس کی شاعری ایک روحانی واردات بن کر ابھرے گی اور یا تو عشق کی سرشاری میں ظہور کرے گی یا پھر کہانی کی طرح اپنے موضوع کو ACTUALISE کر کے ماجرائے گذشتہ کو بیان کرے گی۔ صلاح الدین پرویز کے ہاں یہ دونوں رنگ ہیں۔ واقعہ معراج کے بیان سے ایک اقتباس:

یہ آتشِ دل کی بستی ہے
یہ کون مسافر رکتا ہے
جلتا ہے نگینِ خاتمِ دل، آہٹ کا سایہ جلتا ہے
جلتا ہے ہر اک ذرہ ذرہ، "ہے" جلتا ہے لا جلتا ہے
اک آگ کا پردہ اٹھتا ہے
اک پردہ نشیں بے تابانہ

خود کاسہ دل چھاؤں کا بنا
بھر لیتا ہے اک پیاسے مسافر کو اپنی
آتش سے بھری تنہائی میں
پھر ابر دھڑکتا ہے زوروں
اور سب جل تھل ہو جاتا ہے
جل تھل جل تھل جل تھل جل تھل
جل تھل جل تھل جل تھل جل تھل

یہ بیان اور یہ طرز احساس اردو زبان میں اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے لیکن اس کے پیچھے بیان و طرح کی کئی روایتیں بولتی ہیں۔ جمال محمدی سے اپنے تعلق کے بیان کے لئے صلاح الدین پرویز نے اکثر پوربی یا دکھنی کے اسالیب اختیار کئے ہیں۔ اس کی رمز پر ہم ذرا ٹھہر کر گفتگو کریں گے پہلے اس پر ایک نظر:

کاکل والا سارا عالم
رحمت سے گھنی چوٹی تیری
برکت سے بڑی کنگھی تیری
کاجل ڈوری تیرے سنگی
درپن دریا تیرے آگے
جنگل بستاں تیرے پیچھے
سن رس نین کٹوروں والے

سن رس نین کٹوروں والے
تیری گود میں کتنا پانی
چھلک رہی ہے تیری پلک سے
آتی جاتی دنیا فانی
اب کیسے ہم کاجل بوئیں
کنگھی سے کاکل چنوائیں
درپن میں جھل جھل ڈوب جائیں

بل بل دنیا میں چھپ جائیں
رنجش دل میں کبھی نہ اترے
روز محبت سر سہلائے
خوشبو، دھند سے آگے جائے
پانی پریاں لے کر آئے
سورج دھوپ جھلکتی جائے ـــــ سن رس نین کٹوروں والے ـــــ

ان دو مختصر سے اقتباسات سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات صلاح الدین کے لئے کتنی بڑی روحانی واردات ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے اظہار کے لئے بہت سے سانچے استعمال کئے ہیں۔ پوربی گیتوں کے اسلوب میں ایک سریلی روحانی واردات، جو عالم تنزلیہ کے FORMLESS جہان سے خصوصی مناسبت رکھتی ہو، کو کھپا دینا ایک بہت بڑا تہذیبی کارنامہ ہے۔ یہی صورت حال صلاح الدین کے ہاں منقبتوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً حضرت خدیجہ کی منقبت اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی منقبت میں۔

سکر اور سرشاری کی دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں طریقت کے لینڈ سکیپ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی نے اسے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ چشتیہ کا نشہ شراب کے نشے کے مماثل ہے کہ شراب عشق دل میں جوش کھا کر منہ سے بہہ نکلی اور نقشبندیہ کا نشہ افیون کے نشے سے ـــــ چھیڑنا مت کر بھرے بیٹھے ہیں۔ صلاح الدین کے ہاں سکر اور سرشاری کی کیفیت چشتیہ کے سلوک میں پیدا ہونے والے جذب و شوق سے مماثل ہے اور اسے ہونا بھی چاہئے تھا۔ یہ سرشاری ساقی نامو میں اپنے عروج پر ہے۔ وہاں محبوب، مرشد، رسول اور بعض صورتوں میں حضرت الٰہیہ قدسیہ یکجان ہو جاتے ہیں اور مراتب وجود کا پورا نقشہ ایک عظیم و شدید سکر میں گم ہو جاتا ہے۔ اس روحانی لینڈ سکیپ کی بہت بڑی تہذیبی معنویت ہے اس لئے کہ صلاح الدین نے عام زندگی کے تجربوں کو شعور قدس کی اعلیٰ ترین سرشاریوں سے جس طرح جوڑ دیا ہے وہ بجائے خود ایک نہایت غیر معمولی تہذیبی واردات ہے۔

صلاح الدین پرویز کی ایک دنیا گیتوں اور لوریوں کی بھی ہے جو اپنے لسانی شیوۂ بیان کی وجہ سے اسی شعور قدس سے متعلق ہو جاتے ہیں لیکن اپنی ایک الگ حیثیت بھی برقرار رکھتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر مجھے اپنے قاری سے معذرت کرنی چاہئے۔ میں نے صلاح الدین پرویز کی شاعری

کے نمایاں پہلو تو بیان کر دیئے لیکن اس تصور میں سے بہت سے اہم رنگ غائب ہیں، اس شاعری کی کائناتی DIVERSITY کو مضمون میں سمنا یوں بھی مشکل ہے لیکن کم از کم یہ ہے کہ اب ہم صلاح الدین کے شعری لینڈ سکیپ سے پوری طرح متعارف ہو گئے سو آیئے اب اتنا تو غور کر ہی لیں کہ ہماری صورت حال میں اس شاعری کی تہذیبی معنویت ہے کیا ——

پچھلے کوئی پچاس برس تحریکوں کی بے وفائی کے سال ہیں، ترقی پسند تحریک آدم نو کی تخلیق کا دعویٰ کرتی ہوئی آئی اور نفاق، سازشوں، ضمیر فروشیوں اور بیرونی آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہوئی تاریخ کے عبرت کدے میں گم ہو گئی۔ اس بیان میں بعض لوگوں کا استثنا رہے۔ جدید شاعری کی تحریک ادب اور طرزِ احساس کی قلب ماہیت کے نعرے لگاتے ظاہر ہوئی اور دس برس سے بھی کم عرصے میں ردعمل، جھنجھلاہٹ اور ماورا سے تعلق رکھنے والی ہر شے کو مسترد کرنے کے رویئے پر زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہوئی دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ پاکستان میں نظم کی تحریک کو میٹھا برس بھی نہیں لگ سکا اور وہ اپنے موجدوں کے ہاتھوں ہی اپنے انجام کو پہنچی۔ یہ برس تاریخ ادب کی سفاکی کے سال ہیں۔ سو سال پہلے تک اس کی رحمت کا عالم یہ تھا کہ جس نے ایک سچا مصرعہ بھی کہہ دیا اسے اس نے سمیٹ کر اپنے سینے میں رکھ لیا۔ اب ہم نے اس کا جلال دیکھا کہ مسترد کرنے پر آئی تو، وہ جن کے نام کے ڈنکے بجتے تھے ان کا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا۔ تمام تحریکوں کا المیہ یہ تھا کہ وہ نہ ہندوستان کے مزاج کو سمجھ سکیں اور برصغیر کے مسلمانوں کے مزاج کو۔ ہندوستان وہ ہے کہ جہاں ویدوں اور اپنشدوں کی تدوین ہوئی اور یہ ملک زمانہ قدیم سے اوتار کے تصور پر زندہ رہا۔ مسلمان وہ قوم کہ ہر شہر میں ڈھونڈتے پھرے —— وہ شہروں کی دلہن مدینہ کہاں ہے۔ اس زمین پر اور اردو زبان کی گود میں تربیت یافتہ شعور کے سامنے کوئی ایسی چیز کامیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی جو انسان کے بنیادی شعورِ قدس سے تعلق نہ رکھتی ہو۔ پھر اردو تو وہ زبان ہے جس میں کنگھی چوٹی کے شعر کا براہِ راست رویتِ باری تعالیٰ کے معاملے سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں خالصتاً [illegible] مغربی معاشیات یا نفسیات کے اصولوں پر بنیاد رکھنے والی تحریکوں کو مسترد تو ہونا ہی تھا پھر ان سب باتوں کے علاوہ ہندی مسلم تہذیب کی رمز پر بھی کسی نے غور کرنا ضروری نہ سمجھا۔

تاریخ مذاہب کے مطابق اس سوئنتر کا پہلا مذہب ہندو مت ہے کہ جس میں SUPRA- انسانی تجربے میں شامل کر دیئے گئے ہیں اور آخری مذہب اسلام کہ جہاں FORMAL TRUTH

امر کو ہمیشہ کے لئے خلق کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ان دونوں کی تہذیبی طاقات ہندوستان کی سرزمین پر ہوتی ہے اور مذاہب سے جنم لینے والی تہذیبوں کا دائرہ اسی سرزمین پر مکمل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہر تہذیبی کارنامے میں خود بخود ایک آفاقی جہت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تہذیبی عناصر کی کثرت اور اصول کی وحدت سے اپنی شناخت کراتی ہے۔ صلاح الدین پرویز نے اس تہذیب کے دونوں POLES کو سمیٹ کر اپنا ایک روحانی تجربہ بنالیا ہے اور اس کے ایک مابعد الطبیعیاتی حقائق سے لے کر اس کے ادنیٰ تہذیبی مظاہر تک سب کچھ سمیٹ لیا ہے۔ اس کی تہذیبی اہمیت کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نئے ملک کی تخلیق کی مسرت اور ہجرت کے ملال نے ایک ادبی لینڈ سکیپ ترتیب دیا اور اس سے پاکستان میں ایک نئے طرز احساس کی بنیاد پڑی۔ ہند اسلامی تہذیب کا وہ پہلو جو ہندوستان میں تھا اس کا عہد جدید میں کوئی بڑا اظہار سامنے نہیں آیا اس لئے کہ اس میں کثرت کی جلوہ گری اتنی تھی کہ اس تہذیب کی تجلیات کو ایک منظر میں سمیٹنا مشکل تھا۔ اب ہم یقینی اور حتمی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تہذیبی لینڈ سکیپ کو شاعری میں اظہار دینے والا شخص مل گیا ہے۔ لیکن اس امر کو شاعری تک ہی محدود کر کے کیوں دیکھئے اس کا ایک بہت بڑا پہلو صلاح الدین کے ناول بھی ہیں، اس کی سماجی اور سیاسی سطحیں کنفیشنز میں بھی اظہار پاتی ہیں۔ صلاح الدین کی لوریاں، پوربی میں اس کے محبت والے گیت، دکنی کے لہجوں کی طرف گاہے گاہے ان کی مراجعت یہ سب کچھ ہمیں کیا بتاتی ہیں، ایک لمحے کے لئے اس پر غور کرلیں تو آگے چلیں —

شاعری کی زبان کے بارے میں آڈن نے غالباً کراؤس کا ایک قول نقل کیا ہے کہ میری زبان وہ آفاقی تجبہ ہے جسے مجھے روز بارہ بنانا پڑتا ہے۔ اصل میں قبیلے کی زبان کو جلا بخشنے کے معنی یہی ہیں کہ شاعر زبان سے متعلق طرز ادراک کے پیٹرن تبدیل کر دے اور اپنے گرد وہ زبان بولنے والوں، اس طرز ادراک کے سمندر میں تیرنے والوں کا پورا تجربہ منقلب کر دے۔ کسی نے اہل ولایت کے بارے میں ایک بات کہی ہے کہ —

THE SAINT PRAYS & THE UNIVERSE PRAYS IN HIM,

WITH HIM & THROUGH HIM

یہ بات بڑے شاعر کے بارے میں بھی اتنی ہی درست ہے کہ وہ ایک تجربے سے گزرتا ہے اور پھر اپنے لوگوں کو اس تجربے سے گزارتا ہے۔ وہ حیات کی تربیت نو کرتا ہے، روحانی نقشوں کو پھر سے کھینچتا اور کیفیات کے ایک نئے جہاں کو دریافت کر کے لوگوں کو اس میں شامل کرتا ہے، صلاح الدین کی

شاعری میں ان تمام چیزوں کی بنیاد میں عشق ہے ___

عشق عالیجناب رکھتا ہے جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیؑ تک اور وہاں سے نظام پیا اور خسرو تک اور پھر ساقیوں، مہ وشوں، شب وصال و سحر جمال تک صلاح الدین کے تجربے کی ہر اقلیم کسی نہ کسی شخصیت کے قدم کے نیچے ہے یہ ہے وجود کے ذریعے نجات کا مسئلہ ___ ایک کج کلاہ، سرسوں کے پھول، اور کوئی مست الست گریباں چاک

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست

جب تک آدمی خلق سے اس طرح روگرداں نہ ہو جائے وہ قاعدے کی بت پرستی بھی نہیں کر سکتا۔ صلاح الدین کی شعری قوت کا اصل راز یہی ہے کہ جب تحریکیں دربارِ شہرت میں نشستوں کی ایجنسی لئے بیٹھی تھیں اس وقت صلاح الدین نے صرف اپنے اندر کی آواز سنی، نہ کسی ردِ عمل میں رہے نہ کسی نعرے کے سحر میں آئے ___ ایک پرہجوم اور پرشور ادبی دنیا سے جس میں فلسفوں کی رزم ہو اور بنے بنائے تصورات کا ایک پورا نظام ہو منہ موڑ کر اپنے اندر دیکھتے رہنا بہت بڑی ریاضت ہے۔ چنانچہ اس ریاضت کا ثمر یہ ہے کہ اب اردو کی نئی شاعری کے مستقبل کا بہت کچھ دار و مدار صلاح الدین کے شعری تجربے میں شامل ہونے سے ہے۔ سچا تخلیقی عمل کسی پرہجوم ہال میں آرکسٹرا کا حصہ بننا نہیں بلکہ گلیوں میں اپنا اک تارا بجاتے پھرنا ہے ___ اے اونٹوں والے راستہ دے، صلاح الدین کے اک تارے میں کتنے سر ہیں کون جانتا ہے لیکن ایک بات جس کا کہہ دینا اس وقت ضروری ہے، آج ہندوستان اور پاکستان کے اکثر لکھنے والے اعتراف و اظہار سے قطع نظر صلاح الدین کی طرف دیکھتے ہیں، نقادوں کے مضامین، یونیورسٹیوں کے جلسے اور ان سب میں تالیوں کا بے پناہ شور روح کی مدھم، پرآہنگ اور سوزاں سازِ طلال سے پھوٹتی آواز کی سب سے بڑی دشمن تالیوں کی گونج ہے ___ میں پوچھتا ہوں صلاح الدین پرویز وہ آواز جو تم ادبی حلقوں، شعری کانفرنسوں، پرہجوم جلسوں، بھڑکیلے آرکسٹراؤں سے بچا کر یہاں تک لائے ہو کیا تم اسے تالیوں کی گونج میں کھو جانے دو گے؟ خدا تمہارے اکتارے کو سلامت رکھے سارے آہنگ اسی سے ہیں اور مدینہ اور بستی نظام الدین کی گلیوں کی خاک کو تمہاری پلکوں پہ سنبھالے رکھے کہ دلوں میں طلوع ہوتے سورجوں کے سلسلے خاک کے انھیں ذروں کے طفیل ہیں۔

تو رات ہے اور رات میں اک دھوپ سرائے
زندگی ہے تری آنکھ کے تو سو نہیں جائے

□

اسعد بدایونی

غزلیں

باشندہ ہیں دشتِ زیاں کا، سورج میرا ہم سایہ تھا
کس نے مجھ کو پیار کیا تھا، کس نے آنچل لہرایا تھا
سارے چراغ بجھے جاتے تھے، سارے دریچے تھراتے تھے
شام پڑے جب کوئی جھونکا، وادیٔ جاں میں در آیا تھا
سب کچھ یکسر بدل گیا تھا، ہر اک منظر بدل گیا تھا
دریا جس دن راہ چھوڑ کر بستی کی جانب آیا تھا
خلقِ خدا حیران کھڑی تھی کیسی عجب افتاد پڑی تھی
وجد میں آکر جب موسم نے رقص اچانک دکھلایا تھا
جن سے دیپک جل اٹھے تھے جس سے راتیں جاگ پڑی تھیں
وہ تانیں کس نے چھیڑی تھیں وہ نغمہ کس نے گایا تھا
ایک گھنا گہرا جنگل تھا جس میں دو آنکھیں روشن تھیں
ہر رستہ مسدود پڑا تھا ہر جانب کہرا چھایا تھا
وہ جھنکار کے گن گاتا تھا ساتھ رہا جلتا سورج جس کے
اس نے دھوپ قصیدے لکھے جس کی قسمت میں سایہ تھا

شام سے خوں مری آنکھوں میں اتر آئے
آئے گا وہ تو بہ ہنگام سحر آئے گا
راستے گرد سے اٹ جائیں گے رفتہ رفتہ
رفتہ رفتہ جو مسافر ہے وہ گھر آئے گا
اس مسافت میں ضرور آئے گی اک درد کی راہ
درد کی راہ میں درماں کا شجر آئے گا
وہ تو جھونکا ہے اسے راہ سے نسبت کوئی
کوئی دیوار نہ روکے گی جدھر آئے گا
ان دنوں جاں سے گزر جانے کی فرصت کس کو
کس کو در پیش محبت کا سفر آئے گا
شاہراہوں پہ ہجوم قد و قامت ہے کیا؟
کیا کوئی چاند سا چہرہ بھی نظر آئے گا؟
اس کے ہونٹوں سے برسنے لگے فریاد کے پھول
پھول کہتے ہیں وہ شیشے میں اتر آئے گا

محمد حجازی
(فارسی سے)
ترجمہ : راشد حسین
شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انتخاب

میرا ایک دوست تھا جس نے حال ہی میں مازندران میں جاگیر خریدی تھی۔ کافی عرصہ سے اس کا اصرار تھا کہ وہ دو تین روز کے لئے اس کے گاؤں چلا جائے، وہاں قیام کریں اور تھوڑی چین کی سانس لیں۔ اس نے بتایا اگر صبح سویرے ہی چل دیں تو ظہر کے وقت شیرین کلا پہونچ جائیں گے، اس روز جو وقت ملے گا اس میں اور اس کے بعد دوسرے تیسرے دن بھی تفریح کریں گے پھر جب کہو گے واپس آجائیں گے۔ وہاں کی آب و ہوا، اس کے مختلف مقامات کی نفاست کی تعریف جتنی وہ کر سکتا تھا کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بالائی جنگلی مرغوں کا لذیذ گوشت اور عمدہ عمدہ چیزیں کھلانے کے اچھے اچھے وعدے کر رہا تھا۔ یہاں یہ عالم تھا کہ ان دنوں سفر سے بہت وحشت ہو رہی تھی، دنیا میں کوئی جگہ اپنے گھر کے گوشۂ تنہائی کے مقابلہ میں اچھی نہیں لگ رہی تھی، لیکن کیا کیا جائے میرے دوست کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی تفریحات کو میرے ہی ساتھ منائے گا۔ اس کی یہ خواہش بالکل جائز تھی کیونکہ میں بھی تو اکثر اپنی تخلیقات سے اس کی سمع خراشی کرتا ہوں اور تعامل و ادبیات یہ ہے کہ وہ بغیر کسی قسم کی بیزاری کے اسے برداشت کرتا ہے۔

ہم لوگ صبح سویرے روانہ ہوئے، راستہ میں موٹر خراب ہو گئی لہٰذا شام کے وقت پہونچ سکے، تھکان اتنی ہو گئی تھی کہ جلد ہی سو گئے۔ اگلی صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے ہم لوگ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے ذوق زدہ اور خواب آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ کبھی تو دریا خاموش ہے کبھی شور انگیز، آسمان سے سیاہی چھٹ رہی ہے، ستارے جھلملاتے ہیں ساکت ہو جاتے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں آہستہ آہستہ سر ابھار کر خود نمائی کی کوشش کر رہی ہیں، پانی پر بچھی ہوئی تاریکی کی چادر جو دریا کے شور کو بھیانک بنا رہی تھی دھیرے دھیرے سرکنے لگی اور پھر پھٹ گئی۔ مازندران سے وہ تمام جن اور دیو جن کے بارے میں شاہنامہ میں پڑھا تھا بڑے بڑے پہاڑ، سر بہ فلک درخت اور عمیق دروں کی شکل میں نظر آنے لگے۔

مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پلک جھپک نہ جائے، آنکھیں حیران تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نقاشی سحر آمیز کا ذرا سا گوشہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ رنگ اس قدر ملے سے تھے کہ بالکل ایک دوسرے میں ضم ہو گئے تھے، تمام نقش و نگار ان رنگوں کے حسین امتزاج سے اپنی اپنی جلوہ نمائی کر رہے تھے اور ہر منظر لمحہ بہ لمحہ خیالات کے طوفان میں غرق کئے جا رہا تھا!

جب دھوپ نکلی اور اس نے دنیا کے رنگ و روپ کو دھو کر براق کی طرح صاف و شفاف کر دیا، میں نے یہ دیکھا کہ سبز مخملی پہاڑوں کی چوٹیوں پر باد نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے کبھی تو غنودگی کبھی بیداری کی کیفیت طاری ہو رہی تھی، دامن کوہ میں درخت اس طرح جھکے اور آپس میں سر جوڑے ہوئے تھے کہ کہیں رات کے راز عیاں نہ ہو جائیں، دریا کے دونوں جانب جہاں تک نظر کی رسائی تھی زمین کے نشیب و فراز پر بے شمار پھولوں سے فرش بچھے ہوئے تھے۔ ایک حصہ میں گل سرخ ہوا کے خوف سے ایک دوسرے سے بار بار لپٹے جا رہے تھے۔ ان پھولوں کے درمیاں میں ایک مجسم بڑے سرخ پھول کو دیکھا جو کبھی ادھر کبھی ادھر دامن بچا رہا ہے، ہر بار نزاکت سے ایک ہاتھ آتا ہے اور دامن کو نیچے سرکاتا ہے۔

میں چونکہ کافی دور تھا لہٰذا یہ دیکھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ سرخ شلوار والی لڑکی اس منہ اندھیرے سبزہ و گل کے درمیان کیا کر رہی ہے۔

جاگیردار دوست دھان کی کاشت، چراگاہ، ریشم کے کیڑوں کے بارے میں مستقل بولے چلا جا رہا تھا اور کسی قسم کے بھی سوال کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ میں بھی اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا، بس اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا منظر سے لطف اندوزی میں مشغول تھا اور دل ہی دل میں یہ احساس ستا رہا تھا کہ کاش ایسے موقع پر کوئی صاحب دل رفیق ساتھ ہوتا۔ دل شعر و نغمہ کے لئے ڈوب رہا تھا اور میں ایک لحن دل سوز کے لئے بیخود ہو رہا تھا۔

اچانک ایک گائے کی اداس و غمگین آواز بلند ہوئی، طویل بازگشت پہاڑوں اور دروں میں گونجنے لگی، خود ساختہ زیر و بم کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، بالکل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کسی معبد میں آسمان نغمگیں گھنٹیاں بجا رہا ہو۔

جذب و شوق سے میں بیتاب ہو اٹھا، آنکھوں کو بند کر لیا کہ دوبارہ اس دلکش نغمہ کو سنوں۔ اس بار آواز زیادہ زور اور آہنگ کے ساتھ دوسری طرف سے سنائی دی۔ یہ لگ رہا تھا کہ یہ کسی سوال کا جواب ہو۔ اب دونوں جانب سے نالہ ہائے دلسوز جاری ہو گئے۔

بے اختیار میں نے اپنے دوست سے پوچھا یہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا کیا واقعی تم نہیں جانتے ہو؟ تم تو بڑے دل والے ہو! میں نے کہا ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پھر بھی میں اس کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔

میرے دوست نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا اور ابھی وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ اس نے انگلی کو ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا کہ خاموش رہو اور سنو!

ایک لطیف آواز مجھے سنائی دی جو بادِ نسیم کے نرم و نازک جھونکوں سے کبھی ہلکی کبھی تیز ہو رہی تھی۔ میں الفاظ کو تو صحیح طور پر نہیں سمجھ پا رہا تھا لیکن اپنے دوست کی دبی دبی مسکراہٹ اور سر کی جنبش سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان بولوں سے واقف ہے۔

آہستہ سے اس نے سرخ شلوار والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ لیلیٰ ایک رومانی گیت گا رہی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گایوں کے پیار نے اس کے عشق کو بھی جگا دیا ہے، اس گیت سے میں واقف ہوں۔

جیسے ہی لیلیٰ کی آواز بند ہوئی ایک اور درد بھری آواز فضا میں چھا گئی۔ اس نے بتایا یہ مراد جو جواب میں گا رہا ہے لیلیٰ کا عاشق ہے ....

میں نے اسے ٹوکا باتیں نہ کرو خاموش رہو تاکہ میں سن سکوں!

مراد گا رہا تھا، گائیں کبھی رک رک کر اور کبھی مل کر گا رہی تھیں، پہاڑ، درّے، اور ممکن ہے تمام پھول پتے ان نغموں کا جواب دے رہے ہوں لیلیٰ بھی خاموش نہیں تھی .....

آرکسٹرا کی اہمیت اور سازوں کے زیر و بم کو میں اس روز سمجھا جبکہ عشق کے راز و نیاز سے میرے ہوش و گوش آشنا ہوئے۔ میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ اس کے بعد سے آرکسٹرا کے ہر ساز کو علیحدہ علیحدہ صحیح طریقہ سے سنوں گا، ان کے سُر اور آواز کو سمجھوں گا اور سازوں کی گفتگو بے سمجھے نہیں چھوڑوں گا۔

جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو میں نے کہا ہاں اب لیلیٰ و مراد کا قصہ مجھے بتاؤ!

اس نے بتایا کہ یہ دونوں عشق میں گرفتار ہیں اور ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور درمیان ہی میں کہہ بیٹھا کہ پھر ان دونوں کے بیچ میں کون سی رکاوٹ درپیش ہے۔ کیسی ہی رکاوٹ کیوں نہ ہو ہمیں آج ہی اسے دور کرنا اور ان کی شادی کی راہ ہموار کرنا ہے۔

وہ بولا کہ ان کے عشق کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ ایک اور عاشق بھی اس میں موجود ہے!

میں نے کہا کہ کیا مطلب! اس نے تفصیل بتلاتے ہوئے کہا کہ مراد ورستم چچازاد بھائی ہیں اور دونوں ہی لیلیٰ کے عاشق ہیں، لیلیٰ بھی دونوں کو پسند کرتی ہے اور مشکل یہ ہے کہ وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح بھی نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کوئی اس پیچیدہ مسئلہ کو حل نہیں کرسکا ہے، تینوں عشق کی آگ میں جل رہے ہیں اور سلگ رہے ہیں۔ دونوں چچا زاد بھائی آپس میں ایسے دشمن ہوگئے ہیں کہ کئی بار قتل تک کے وحشی ارادے سے لڑ پڑے اور ایک دوسرے کو شدید زخمی کیا۔ دو مہینے پہلے انھوں نے خود اور اپنے والدین کے سامنے بھی اس بات کا عہد کیا کہ آیندہ اب وہ نہیں لڑیں گے۔ یہ لڑکی اور لڑکے اصل میں کرد ہیں جو اب مازندران میں آبسے ہیں۔

میں نے کہا کہ تم لیلیٰ کو بلاؤ اس سے بات کریں گے بلکہ میں یہ معلوم کروں گا کہ ان دونوں عاشقوں میں سے وہ خود کسے زیادہ چاہتی ہے یا کم از کم کسے زیادہ اچھا سمجھتی ہے، ایسی حالت میں چاہے وہ دوسرے سے بھی ایک قسم کا تعلق یا ہمدردی کا جذبہ رکھے لیکن شادی کے لئے تو ان میں سے جسے زیادہ پسند کرتی ہو اسے منتخب کرلے جس کے نتیجہ میں تین جوان و حسین ہستیوں کو اس ہلاکت آمیز اذیت سے تو نجات مل جائے۔

لیلیٰ آئی اور سیدھی میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی شکل سے متانت اور غرورِ حُسن عیاں تھا۔ قد لمبا، گردن، سینہ، کلائیاں، پنڈلیاں اور اعضائے بدن اس بات کی عکاسی کررہے تھے کہ اس نے برسوں ایکسرسائز کی ہے، بالکل گول اور سڈول ہوگئے تھے، بیضاوی صورت، آنکھیں سیاہ اور چمکدار، ستواں ناک، ہونٹ ذرا موٹے، رخساروں کی سرخی صاف اور فراوانِ خون کی نشاندہی کررہی تھی۔ گھنے اور لمبے بالوں کو زرد ریشمی رومال کے حلقہ سے سر پہ باندھ لیا تھا، جمپر نیلا اور چست تھا۔

میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا —— قریب ہی میں ایک گاؤں خریدا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ رستم یا مراد میں سے کسی ایک کو اس گاؤں کے مکھیا کے لئے رکھ لوں۔ تمھارے خیال میں ان میں سے کون زیادہ مناسب و موزوں ہے؟

ایسا لگا کہ اس نے میرے مقصد کو سمجھ لیا، مسکرائی اور کہنے لگی کہ میں تو دونوں کو ایک ہی

حیثیت سے پسند کرتی ہوں۔

پوچھا کہ ان میں سے زیادہ طاقت ور کون ہے؟ بولی دونوں ہی بہت طاقتور ہیں۔

میں نے پھر سوال کیا کہ تمھارے خیال سے کون تم پر زیادہ مہربان ہے؟ اس نے کہا دونوں ایک ہی جیسا مہربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اچھا ان میں خوبصورت کون ہے؟ کہنے لگی آپ اپنی نگاہوں سے خود فیصلہ کرلیں' میری نظر میں تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

میں نے پوچھا کہ ان میں سے تمھیں کون زیادہ چاہتا ہے؟ بولی میں ان کے دل کے اندر تو ہوں نہیں کہ جان سکوں البتہ میں خود دونوں کو ایک ہی جذبہ سے چاہتی ہوں، ہم لوگ بچپنے سے ساتھ ساتھ بڑے ہوئے ہیں، دونوں میری خالہ کے لڑکے ہیں، دونوں ساتھ جوان ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی میں چھوڑ نہیں سکتی ہوں اور کسی کو بھی ذرا سی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی ہوں۔

عجیب بات ہے! ارے بھئی جوانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی بیویاں ہوں، تمھارے لئے بھی ضروری ہے کہ تم ایک اچھے شوہر کا انتخاب کرو، مگر حیرت ہے کہ تمھارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے!

کہنے لگی وہ چاہیں شادی کرلیں، میں نہیں کروں گی، میں بغیر شوہر کے مرجاؤں گی۔ چہرہ پر کسی طرح کا تاثر پیدا ہوئے بغیر آنسوؤں کے قطرے اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ آنسو نہیں ہیں خون جگر ہے جو آنکھوں سے بہہ نکلا ہے۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا ــــ ارے میں تو یونہی مذاق کررہا تھا، وہ لوگ بھی شادی وادی نہیں کریں گے .... لیکن میری حالت ایسی ابتر ہوگئی کہ مزید گفتگو کی ہمت نہیں رہی تھی، خاموشی سے گھر واپس چل دیا۔

مکھیا آیا اور اس نے کہا کہ خان مالک کی تفریح کے لئے آج بیلوں کی لڑائی کا انتظام کیا ہے۔ میں نے مخالفت کی کہ وحشیانہ عہد کی یہ بیرحمیاں اور تفریحات نہیں ہوں گی، کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ بے گناہ جانوروں کو جان سے مارتے ہو! ایسا لگتا ہے یہاں انسان نہیں بستے ہیں' ان لوگوں کے دل کینہ، حسد اور حرص سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ایک ذہنی عیش ہے نہ کوئی وجہ نہ سبب، بس ایک دوسرے کی جان لے رہے ہیں! ہم لوگوں سے عقلمند تو یہ حیوان ہیں،

کم از کم وہ یہ تو جانتے ہیں کہ گھاس اور پانی ان کے لحاظ سے ان کے لئے کافی ہے، لہٰذا وہ کھاتے ہیں، شکر ادا کرتے ہیں اور آپس میں بغیر کسی جھگڑے بکھیڑے کے رہتے ہیں۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اپنی شیطانی رُوح کو ان کے اندر بھی پھونکیں! نہیں میں اس کام کو بالکل نہیں ہونے دوں گا!

مکھیا ہنسا اور کہنے لگا سرکار! آپ لڑائی جھگڑے سے گھبراتے ہیں لیکن خان مالک بہت بہادر ہیں، ان باتوں پر وہ کوئی دھیان ہی نہیں دیتے ہیں۔

خان مالک نے کہا — اَرے بھئی یہ یونہی مذاق کر رہے ہیں، جاؤ تم بیلوں کی لڑائی کا انتظام کرو ہم یہ تماشہ ضرور دیکھیں گے۔ مجھے تو یہ کھیل بہت پسند ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کمرہ میں لے گیا اور کہا۔ اماں یار! تم سے زیادہ میں خود اس قسم کی بیرحمی سے گھبراتا ہوں، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میرے لئے مصلحتاً یہ بہت ضروری ہے کہ اسے با دلِ نخواستہ دیکھوں کیونکہ اگر کہیں ان گاؤں والوں اور خاص طور سے اس مکھیا نے ہمیں کمزور اور نرم دِل جان لیا تو بس پھر یہ سمجھو کہ اس معرکہ کے بعد ہماری بھی پگڑی اتار دی جائے گی۔

بات پوری طرح سمجھ میں آگئی لہٰذا میں نے کہا کہ ٹھیک ہے ان لوگوں سے کہو مراد اور رستم کو لائیں تاکہ میں ان کے مضبوط بدنوں کو تو دیکھوں۔

کچھ ہی دیر بعد رستم آیا، لیکن وہ شاہنامہ والے رستم کی طرح وہ شاخ دار ڈاڑھی رکھے اور سینگ دار ٹوپی پہنے ہوئے نہیں تھا، البتہ جوان بالکل اُسی رستم کی طرح تھا جس نے کبھی پیل دماں کو پٹخ کر قلعہ سپید کو فتح کیا تھا — سروقد، چوڑا سینہ اور تنگ کمر ویسی ہی تھی جیسی اس کی تعریف کی تھی۔ البتہ اس بات کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکا آیا پہلے والا رستم بھی اس ہی جیسا خوبصورت ہوا ہے، آنکھیں، بھنویں، ہونٹ، دانت، کان کی لویں اور ملاحت کیا اس کی بھی ایسی ہی رہی ہے؟ رستم کی مونچھیں تازہ تازہ بھیگنا شروع ہوئی تھیں، عمر بھی بیس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔

تمہیدی اور بے مقصد باتوں کے بعد میں نے اصل بات کہی کہ تمہارا شادی کرنے کا کب خیال ہے، کافی عمر گذر چکی ہے، جلدی کیوں نہیں کرتے ہو؟ کہنے لگا اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو دو سال پہلے ہی میں لیلیٰ کو حاصل کر لیتا لیکن کیا کروں وہ مراد کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہے۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہے، اتنا تو میں جانتا ہوں کہ اگر وہ تم کو مراد سے زیادہ نہیں چاہتی ہے تو اس کے برابر ضرور چاہتی ہے۔

اس نے کہا میں آج ہی اس مشکل مسئلہ کو حل کر رہا ہوں! میں نے اس سے پوچھا

وہ کیسے ؟

اُس نے بتایا — آج میں اور مراد اپنے اپنے بیلوں کو لڑا رہے ہیں، ہم نے آپس میں یہ طے کر لیا ہے کہ اگر میرا بیل اُس کے بیل کو ہرا دے گا تو لیلیٰ میری ہو جائے گی اور اگر اُس کے بیل نے میرے بیل کو ہرا دیا تو لیلیٰ کو وہ لے جائے گا، لیکن مجھے یقین ہے میرا بیل اُس کے بیل کو ضرور ہرا دے گا۔

اس دوران میں لوگوں نے اطلاع دی کہ مراد آگیا، رستم کو ہم نے رخصت کیا اور اُس کو بلایا، جیسے ہی وہ آیا ایسا لگا کہ رستم نے اپنے لباس اور حلیہ میں بس تھوڑی سی تبدیلی کرلی ہو اور واپس آگیا ہو، ہاں واقعی مراد بھی بالکل رستم ہی کی طرح تھا، معلوم ہوا کہ یہ اُس سے ایک دو مہینہ پہلے پیدا ہوا ہے، ان دونوں کی مائیں سگی بہنیں اور باپ سگے بھائی ہیں۔ دونوں اس قدر ہمشکل اور اتنے خوبصورت تھے کہ اگر میں کتنی ہی کوشش کروں کہ لیلیٰ کی آنکھوں سے دیکھ کر کوئی فرق محسوس کر دوں اور کسی ایک کو منتخب کر لوں تو یہ بالکل ہی ناممکن ہے۔

خود مراد کو بھی یہی امید تھی کہ اُس کا بیل اپنے رقیب کے بیل کو شکست دے دیگا اور اسے لیلیٰ کا وصال نصیب ہوگا۔ حالانکہ پہلے میں نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ بیلوں کی لڑائی نہیں دیکھوں گا اب اس پر مصر تھا جس قدر جلد ممکن ہو یہ کام شروع ہو۔

یہ لگ رہا تھا کہ بیل بھی اس سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ راہِ عشق میں اپنی جان کی بازی لگا رہے ہیں، لہٰذا ایک دوسرے کے لئے کسی بھی قسم کا خوف و ملال محسوس نہیں کریں گے۔

ظہر کے دو گھنٹہ بعد لوگوں نے کہا میدان تیار ہے، مُکھیا کے گھر کے قریب تقریباً ستر میٹر چوڑا ایک ہموار میدان تھا، اس کے ایک طرف دریا اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا سبز ٹیلہ تھا۔ تقریباً سو میدان کے بعد زمین نشیبی تھی۔ گاؤں کے تمام لوگ ٹیلہ کے اُوپر اور میدان کے دونوں کناروں پر جمع لگائے ہوئے تھے۔

ہم لوگ ٹیلہ پر زمین سے دو میٹر کی اُونچائی پر کھڑے ہو گئے، کچھ ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک شور بلند ہوا، رستم ایک قوی ہیکل بیل کے آگے آگے میدان میں آیا، گایوں کا گلّہ بھی اس کے پیچھے پیچھے پہونچا، رستم نے میدان کے ایک تہائی حصہ پر رُک کر کچھ دیر اپنے بیل کے سَر اور کان کو سہلایا۔ بیل وہیں کھڑا ہو گیا، گائیں بھی آگے پیچھے سو گئیں۔

تمام گاؤں والے گردن اچکا رہے تھے اور یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مراد کا

بیل سامنے کی طرف نشیب سے اُوپر آئے اور میدان میں داخل ہو. کافی عرصہ گزر گیا اور مراد کا کہیں پتہ نہیں تھا، رفتہ رفتہ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور لمحہ بہ لمحہ آوازیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ ان باتوں کے بیچ بیچ جنھیں میں سمجھ نہیں پارہا تھا اکثر مازندرانی مخصوص لہجہ کے ساتھ وطن وطن کا لفظ میرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا. میں اس کو کسی قطعی بات پر محمول نہیں کرسکا کہ ایسے موقع پر وطن کے لفظ کا استعمال کرنا کیا معنی رکھتا ہوگا، برخلاف اس کے حقیقتاً میرے تمام تر حواس اور نگاہیں لیلیٰ کی طرف لگی ہوئی تھیں جس کی گردن سب سے اُونچی تھی اور وہ ایک مجسمہ کی طرح عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اندرونی اضطراب کو دبا رہی تھی کہ کہیں کچھ ظاہر نہ ہوجائے، ایسے عالم میں میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ یہ لوگ کیا باتیں کررہے ہیں یا یہاں پر وطن کے کہنے سے ان کا مقصد کیا ہے۔

اچانک مراد کا سر، سینہ اور ایک مضبوط بدن نشیب سے اُوپر آیا، بیل اور گایوں کا گلہ بھی اس کے پیچھے تھا. رستم کا بیل آہستہ سے اُٹھا اور غصہ سے ڈکارا. ساری گائیں اُٹھ کھڑی ہوئیں مراد کے بیل نے ایک لمبا نعرہ لگایا، چند قدم آگے دوڑا اور پھر کھڑا ہوگیا، پیروں کو دائیں بائیں پھیلایا اور سر کو ایک طرف نیچے لایا. رستم کے بیل نے ایک ہی حملہ میں خود کو حریف تک پہونچادیا، دونوں کے سر اتنی زور سے ٹکرائے کہ لگا ان کا بھیجہ نکل پڑے گا. ایکدم سے پیچھے ہٹے اور پھر حملہ کیا، سر بالکل گتھ گئے، اس بار وہ الگ نہیں ہوئے، ایک دوسرے کو ڈھکیل رہے تھے. کبھی یہ کبھی وہ ہر بار ایک قدم یا اس سے زیادہ دوسرے کو پیچھے ڈھکیل رہا تھا۔

تمام مرد، عورتیں اور بچے ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھے، ان کے ہاتھ پیر اور شکلیں پیچ و تاب کھا رہی تھیں، بیلوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ کبھی آگے جھک جاتے کبھی سیدھے ہوجاتے تھے، بس لیلیٰ ایک مجسمہ کی مانند بالکل ساکت تھی اور نہ ہی کسی قسم کا اضطراب ظاہر ہونے دے رہی تھی. بیل ایک دوسرے کے ٹکریں مار رہے تھے اور مستقل ایک دوسرے کو پیچھے ڈھکیل رہے تھے، اسی گتھم گتھا میں ایک بار رستم کا بیل پیچھے بیٹھا. پھر میدان کے سرے پر پہونچا، اچانک ایک سخت حملہ کیا اور مراد کے بیل کو تیزی کے ساتھ نشیب تک پیچھے ڈھکیل لے گیا۔

میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ کیا ہوا، کیونکہ مراد کا بیل زمین پر گر پڑا، لوٹنے لگا، اور ایک خون کا فوارہ اس کے پیٹ سے پھوٹ نکلا! تماشائیوں میں چیخ و پکار شروع ہوگئی. پھر وہی وطن وطن کا لفظ ان کی زبان پر جاری ہوگیا۔ مراد آہستہ آہستہ میدان میں آیا، اس کی پیٹھ ماں کی طرف اور چہرہ

لیلیٰ کی طرف تھا. بلند آواز سے تھوڑی دیر اس نے تقریر کی اور کئی بار وطن کے لفظ کو اپنی زبان سے ادا کیا، اس کے بعد خاموشی سے مڑا اور چلنے لگا۔

ماں باپ دوڑے اور اس کے جسم سے لپٹ گئے، اس نے دونوں کو ایک جھٹکے سے ہٹایا اور چل دیا. مجمع میں ایک شور و غل بپا ہو گیا، پھر اسی قسم کی باتیں اور جملے جو "وطن" سے بھرے ہوئے تھے سنائی دے رہے تھے. ایسا لگ رہا تھا کہ سب کے سب یہ تو چاہ رہے ہیں کہ جائیں اور مراد کو واپس لے آئیں لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ مراد پکا ارادہ کر چکا تھا کہ وہ گاؤں، گھر، ماں اور باپ سب کو چھوڑ کر مازندران سے چلا جائے گا!

اچانک مراد مراد کی ایک آواز غصہ اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ سنائی دی. دیکھا نہ لیلیٰ دوڑی اور مراد کی گردن میں جھول گئی. اس کے بدن کی تھرتھراہٹ سے صاف عیاں تھا کہ وہ رو رہی ہے. اسی عالم میں کچھ دیر گزرنے کے بعد لیلیٰ و مراد ساتھ ساتھ واپس ہوئے اور ہمارے الکل سامنے آئے. مراد نے مکھیا سے کچھ کہا، مکھیا نے اس کا جواب دیا اور اور آخر میں اس خیال سے کہ ہم بھی اسے سمجھ سکیں شہری زبان میں کہا کہ انصاف تیرے ساتھ ہے، تیرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے، لہٰذا خدا کے واسطہ سے لیلیٰ کو تیرے حوالے کر دیا، لیلیٰ سو بیلوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے!

لوگوں میں ایکدم سے خوشی و مسرت کی آوازیں گونج گئیں. مکھیا سے ہم نے کہا کہ اس بات کو جلدی سے ہمیں بتاؤ. اس نے کہا کہ رستم نے دانستہ یا نادانستہ طور پر مراد کے ساتھ دھوکہ کیا ہے، طریقہ یہ ہے کہ جنگلی بیلوں کو اپنی اپنی گایوں کے ساتھ میدان میں دونوں طرف سے ایک ہی وقت میں داخل ہونا پڑتا ہے، یہاں یہ صورت ہوئی کہ رستم کا بیل آدھ گھنٹہ پہلے آیا اور زمین پر قبضہ جما لیا. ہوتا یہ ہے کہ بیل جس جگہ کھڑا ہو جاتا ہے بس اس کو اپنا وطن ہی سمجھ لیتا ہے، پھر تو اپنے وطن کی حفاظت میں اس کی طاقت دس گنا بڑھ جاتی ہے، اس کے بعد ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی بیل اس کو بھگا سکے. لوگوں کی داد فریاد اسی وجہ سے تھی اور خود مراد نے بھی اسی دھوکہ کے پیش نظر جو اس کے ساتھ کیا گیا یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اب مازندران سے چلا جائے گا. یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ رستم کے بیل نے اگر پہلے سے اس زمین پر قبضہ نہ کر لیا ہوتا تو مراد کا بیل اسی پہلی ٹکر سے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالتا. رستم نے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا لہٰذا خدا نے بھی لیلیٰ کے دل کو مراد کے دل سے جوڑ دیا۔

اسی شب میرے اصرار پر شادی قرار پائی، صبح تک سب نے گایا بجایا خوشیاں منائیں!

میں بھی بے پناہ خوشی سے سرشار تھا، اسی عیش و نشاط کے عالم میں مجھے یہ دکھائی اور سنائی دے رہا تھا کہ چاند ستاروں کے لوگ، آسمانی فرشتے، ساری مخلوق اور تمام ذرات عالم وطن کی محبت میں تالیاں بجا رہے ہیں ناچ رہے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ زندگی کی تاریکی میرے سامنے روشن ہو گئی ہو، تمام شکوک و شبہات سے گویا نجات حاصل کر لی ہو، اب مجھے معلوم ہے کہ آخر میں وطن کو کیوں عزیز رکھتا ہوں، میں یہ جانتا ہوں کہ مادرِ دہر نے اس محبت کو ہماری گھٹی میں گھول کر پلا دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اس کو اکثر پڑھا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انسان کا وطن سے محبت کا تعلق بالکل اس کے اپنے آشیانہ و مسکن کے تعلق جیسا ہوتا ہے جس کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور تدریجاً کوچہ و گلی، محلہ و شہر اور پھر مملکت تک پھیل جاتا ہے۔

آج میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ افلاطون نے یہ کیوں کہا ہے کہ "زندگی کی محکم ترین وابستگی، حب وطن ہے" یا پھر کیوں آج دنیا کے لوگ اپنے وطن کے لئے یہ تمام جانفشانی کرتے ہیں۔ □

سبطین اخگر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

غزلیں

۱

کیا تمنا تھی کہ 'دنیا بھر، رہا رونا مجھے
کس قدر مہنگا پڑا ہے آدمی ہونا مجھے

تخم آخر مت سمجھنا، بارہا کام آؤں گا
فصل جب کٹ جائے پھر اگلے برس بونا مجھے

اب تو کچھ پانے کی حسرت بھی مرے دل سے گئی
تو نہیں تو اور کیا باقی رہا کھونا مجھے

مشغلہ ہاتھ آگیا تیرے علاوہ بھی کہ اب
دن میں ذکرِ دوستاں اور رات بھر سونا مجھے

ان محل زادوں کا رشتہ، خاک باشندوں سے کیا
راس آیا اپنے خستہ گھر کا اک کونا مجھے

۲

بہار آئے نہ آئے خزاں تو آئے گی
کسی بھی رُت کی بالآخر زباں تو آئے گی

جو آپڑے ہیں یہ دن بھی گذر ہی جائیں گے
مجھے بھی رسم و رہِ دوستاں تو آئے گی

کنارِ آب مجھے اپنی جستجو ہے بہم
کہ موجِ عکس پسِ دیدباں تو آئے گی

زمانہ کچھ نہ کہے گا میں جانتا ہوں مگر
وہ بات تیرے، مرے درمیاں تو آئے گی

میں جانتا ہوں بھلا اور جائے گی بھی کہاں
کرن جو پھوٹی تہِ آسماں تو آئے گی

۳

پاؤں کے نیچے سمندر، آسماں اوپر نہیں
اب کوئی منظر مری آنکھوں سے بالاتر نہیں

کن حواسوں ہو گیا مجبور کیا بتلائیے
میں نے یہ جانا کہ مجھ سے دل مرا باہر نہیں

دیدۂ نا عاقبت اندیش کیا سمجھوں تجھے
اب تو بچپن کا کوئی سودا بھی میرے سر نہیں

جن دنوں خوابیدہ موسم تھے کوئی خواہش نہ تھی
اب جو نیندیں ہیں مری آنکھوں میں تو بستر نہیں

سوچتا ہوں اور کچھ ہو جاؤں تو باندھوں سفر
ان اڑانوں کے لئے کافی یہ بال و پر نہیں

ان زمانوں بات ہی کچھ اور تھی سب سب کا تھا
اور اب تو یہ کہ گھر ہوتے ہوئے بھی گھر نہیں

مجھ کو پہچانو! یہ یہ مشکل بہت ہے دوستو!
میں جہاں سبطین نقوی ہوں وہاں اخگر نہیں

ناصرہ شرما

۱۰۸، نیو کیمپس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

کچھ فلسطینی شاعری کے بارے میں

فلسطین عرب ممالک کا ایک ایسا تاریخی زخم ہے جو اُن کی عرب وحدت کے باوجود خون کے آنسو روتا رہا ہے۔ فلسطینیوں نے تاریخ کو یہ بتا دیا کہ وہ شکست کھانے والے نہیں ہیں۔ خون کی آخری بوند تک حق وفکر کی جنگ کو جاری رکھیں گے۔ اس جنگ کی زبان فلسطینی درد کا بیان، شعروں میں ڈھلنے لگا۔ شعر شاعروں کا خوبصورت طریقۂ اظہار رہے اور جس سے وہ وقت کے دھارے کو بھی موڑ سکتے تھے، تھکے دلوں میں نئی امنگ اور روشنی بھر سکتے تھے۔

نثر کی جگہ نظم نے لی، اس کی ایک وجہ بھی تھی کہ اس سماج میں جہاں جنگ ہی روز کا معمول بن جائے وہاں کتابیں لے کر ایک عام انسان جدوجہد نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی ہوں۔ اس کمی کو شاعری ہی پورا کر سکتی تھی جو زبان اور خیال کے ذریعے سے سینہ بہ سینہ ایک انسان سے دوسرے انسان کے پاس بغیر کاغذ کی مدد کے جا سکتی تھی۔

عرب کی سرزمین یوں بھی شاعری کے لئے ہمیشہ سے موزوں رہی ہے۔ بہرحال ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء کے دوران انقلابی گیت اور جنگی ترانے فلسطین میں رائج ہو گئے اور اس نئی شاعری نے لوگوں کے حوصلوں کو بڑھایا اور اندھیرے میں شمعیں روشن کیں۔

روایتی شاعری کا احساس ایک نئے مفہوم کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ شادی ہو یا روز پیدائش، خوشی کا موقع ہو یا غم کا فلسطین کی نئی شاعری لہولہان نظر آنے لگی ہے اور جس کو سُن کر سامعین کا خون کھولنے لگتا ہے۔

عرب شاعری کی محبوبہ تھی عورت ـــ مگر ۱۹۴۸ء کے بعد وہ عشق وطن میں بدل گئی۔ گرچہ عورت ہی علامت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کا مفہوم بدل گیا تھا۔ ادب میں طنز کا بھی اپنا مقام تھا۔ یہاں اس طنز میں نفرت نے بھی اپنی جگہ بنالی ہے۔ سلیم جبران کی یہ نظم ملاحظہ فرمائیں جس میں طنز کے نشتروں میں نفرت کی آمیزش بھی ہے:

ماں

لعنت میری ماں پر
جس نے دودھ پلایا اپنے سینے سے ایک خارجی کو
اور مجھے پیاسا رکھا۔

لعنت بھیجو اس پر
جس نے میرا بچھونا دے دیا خارجی کو
اور میں ساری ساری رات ایک پل کے لئے نہ سو سکا
میں ساری ساری رات کانپتا رہا

لعنت بھیجو اس ماں پر
جس نے اپنی ممتا دے دی ایک خارجی کو
اور مجھے کسی بھگوڑے کی طرح
اپنے دل سے نکال پھینکا۔

لعنت بھیجو میری ماں پر
لعنت بھیجو اس پر
لعنت، ساری عورتوں پر۔

دشمن کو للکار، بغاوت، اس نے نئی عربی شاعری کو ایک نیا احتجاجی لہجہ بخشا۔ چونکہ جدوجہد کرنے والے فلسطینی اس طبقہ سے تھے جو زیادہ تر غریب اور مصیبت زدہ تھا۔ اس لئے شاعری میں اسی طرح کے استعارے اور اشارے نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں فلسطین، جب صیہونیت کے قبضۂ اختیار میں آیا تو ایک تبدیلی آئی۔ شہروں کا سیاسی، معاشرتی اور ادبی ڈھانچہ اس تحریک سے اکثر متاثر ہوا۔ جنگ کے پہلے اور جنگ کے بعد شہر خالی ہونے لگے۔ یہ ہجرت کا ایک ایسا معاشرتی تجربہ تھا جس نے فلسطینی سماج میں ایک زبردست ہل چل مچا دی کیونکہ شہر ہی ادب اور سیاست کے گہوارے تھے۔

فلسطین کے وہ سارے علاقے جو صیہونیت کے قبضے میں تھے وہاں پر فوجی حکومت تھی اور جو اپنے مفاد کی خاطر احکامات صادر کرتے۔ ان کا خاص مقصد تھا ہر عرب کی شخصیت سے اس کی اپنی شخصیت کو کھرچ کر نکال پھینکنا اور وہاں پر صیہونی ادب اور سیاست کے بیج بونا۔ اس دردناک حادثے سے پہلے فلسطینی ادب کے سوتے عربی ادب سے پھوٹتے تھے اور یہ وہ دور تھا جب ادب پوری طرح سے پھل پھول رہا تھا۔ قاہرہ، مصر، شام اور لیبیا سے متاثر تھا اور ان زبانوں کے انقلابی شعرا فلسطین کی اس انقلابی تحریک میں شامل تھے۔ ابھی تک فلسطینی شعرا نے اپنے کلام کو عرب ملکوں کے پایۂ تخت میں ہی پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے دیکھا تھا اور زبردست شہرت پائی تھی۔ اس دور میں فلسطینی شاعری دوسرے ممالک میں مقبول ہو رہی تھی۔

۱۹۴۸ء کے بعد فلسطینی ادب ایک نئی تحریک سے دوچار ہوا۔ جلاوطنی، غریب الوطنی نے وطن کی محبت میں سوز پیدا کر دیا اور شاعری کا لہجہ قومی اور ملی ہو گیا۔ اسی کے ساتھ نئی شاعری بھی وجود میں آئی۔ پرانے ردیف قافیے ان کا ساتھ نہ دے سکے۔

یہ جدید شاعری کس طرح وجود میں آئی۔ دراصل شہر اجڑ کر فوجی دستوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ادیب اور شاعر جلاوطن ہوئے یا پھر جیل میں ڈال دیئے گئے۔ شہروں میں آکر مورچہ سنبھالنے والے زیادہ تر اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو مصیبت میں مبتلا تھے۔ نئی نسل کی آبیاری کو جس دانشورانہ روایت کی ضرورت تھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ جنگ اور فوجی حکومت نے فلسطینی ادب کا رشتہ دوسرے عرب ممالک سے پوری طرح منقطع کر دیا تھا۔ ایک عربی شعر، شاعر کی جان لینے کے لئے کافی تھا، جہاں تک تعلیم کا معاملہ ہے کہ اسکولوں اور یونیورسٹی میں کسی عرب کا داخلہ بالکل ناممکن تھا۔

ایسے خوفناک ماحول میں ضرورت تھی مردہ روحوں میں نئی زندگی کے پیغام کی، جدید عربی شاعری ترانوں اور گیتوں کی شکل میں ایک لب سے دوسرے لب اور ایک سینے سے دوسرے سینے کا طولانی سفر طے کرتی رہی فلسطینی شاعری کے لئے یہ دور ایک سیاہ دور تھا۔ یہاں پر عربی زبان اور ادب کی اشاعت ایک جرم کی حیثیت رکھتی تھی۔

فلسطین میں ظلم و استبداد ہوتا رہا، لیکن دنیا دیکھتی رہی مگر فلسطین قوم نہ تھکی نہ اس نے ہتھیار ہی ڈالے۔ خاید توفیق کے الفاظ میں:

فتح شکست سے بدتر ہے

کل ہی کی طرح
ہم چلّو بھر پانی میں تیرے نہیں ہیں
آج
ہم چلّو بھر پانی میں ڈوبے نہیں ہیں
انھوں نے راستہ لیا تھا مشرق کی سمت کا
سیاہ بادل
بچوں، پھولوں، فصلوں اور شبنم کے قطروں کو
قتل کرتے ہوئے
نفرت پھیلاتے
اسی راستے سے لوٹ جائیں گے
جس راستے سے آئے تھے
اصل بات نہیں ہے کہ وہ کب تک یہاں ٹھہریں گے
یہ فتح، شکست سے بدتر ہے
یہ فقط ایک ٹھہراؤ ہے کیوں کہ
گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
یہ عقب نشینی
قدم بھر، بہت جلد
دس قدم جلدتر ہوگی
کہو
یہ فتح، شکست سے بدتر ہے۔

حامدی کاشمیری

غزلیں

نوکِ ہر خار پہ مہتاب گری کس کی ہے
جادہ پیمانہ ہوئے بے بصری کس کی ہے

کون بے تیغ و سپر ساتویں در تک آیا
جانبازوں میں ترے بے جگری کس کی ہے

کالے پنجرے اُگ آئے ہیں نخیلِ انجم
کون معتوب ہوا، بے ہنری کس کی ہے

ہو کے بے ہوش گرے قاف کے طے کرنے پر
اب کوئی کیسے کہے سبز پری کس کی ہے

حرف شب پوش میں ہیں ساعقہ بیکر کیا کیا
دید سب کی ہے مگر دیدہ وری کس کی ہے

اپنا سایہ بھی یہاں ساتھ نہیں دے پاتا
دھوپ کی تیرگی میں ہمسفری کس کی ہے

کام کر جائے گا قاتل کوئی
اب نہیں میرے مقابل کوئی

کیوں قدم اٹھتے ہیں ہمسفرو
اب نہیں راہ میں حائل کوئی

آنکھیں ظلمت پہ لگائے رکھو
ابھرے گی صبحِ شمائل کوئی

دوستو، جوشِ سفر تو دیکھو
راستہ کوئی نہ منزل کوئی

کون سا مرحلہ ہے یہ، اس میں
کوئی آسانی نہ مشکل کوئی

کوہ امواج سے ڈرنا کیسا
منتظر ہے سرِ ساحل کوئی

(ڈاکٹر) اشفاق محمد خاں
سنٹر آف انڈین لینگویجز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو ــــ ایک قومی زبان

اردو زبان کی پیدائش اور اس کی ارتقائی منزلوں کی ایک طویل تاریخ ہے جس کے سماجیاتی اور لسانی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان کی تشکیل اور ساخت و پرداخت میں کسی حاکم کے حکم یا کسی قانونی اعلان کا اتنا دخل نہیں جتنا کہ اس زبان کی تعمیر میں ایک بڑی سماجی ضرورت کے تحت بنیادی عنصر وسیلۂ اظہار کی تلاش رہا ہے۔

ہندوستان جو ایک وسیع و عریض ملک ہے، مدت دراز سے مختلف علاقائی بولیوں ٹھولیوں، کا ایک اسٹیج بنا رہا ہے۔ اس اسٹیج کے مغربی دروازے سے پہلے پہل آریوں کے قافلے ویدک زبان میں مکالے بولتے ہوئے در آئے۔ سیکڑوں سال کے میل ملاپ سے سنسکرت وجود میں آئی۔ سنسکرت کے شانہ بشانہ دیسی بولیوں نے سر اٹھایا اور یہ الگ الگ اپنے اپنے علاقوں میں پروان چڑھتی رہیں۔ آریوں کی آمد (۱۰۰۰ سے ۶۰۰ سال ق۔م) سے لے کر ۱۰۰۰ عیسوی تک کا زمانہ سنسکرت کے عروج اور زوال، نیز دیسی عوامی بولیوں (پراکرت) اور ان کی ادبی اشکال (اَپ بھرنش) کے ارتقائی منزلوں کا زمانہ ہے۔

سنہء تک عوامی بولیوں (پراکرتوں) نے تیزی سے ادبی شکل اختیار کر لی تھی اور بالخصوص شورسینی پراکرت لسانی ارتقائی منزلیں طے کر کے ایک مسلّم ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ دوسری پراکرتیں بھی اپنے اپنے علاقوں میں اعلیٰ ادبی مدارج طے کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح سنسکرت "شدھ" ہو کر عوام سے دور ہو گئی تھی اور اس کی جگہ پراکرتوں نے حاصل کر لی تھی، بالکل اسی طرح اب پراکرتوں نے عوام سے رشتہ ناطہ توڑ لیا اور خواص تک محدود ہو کر رہ گئیں اور ان کی جگہ عوام کی زبانوں کا دھارا مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ عوامی زبان کے اس دھارے کو "اَپ بھرنش" یعنی بگڑی زبان کا نام دیا گیا۔ تعلیم یافتہ لوگ اس وقت اس بگڑی زبان (اَپ بھرنش) کو اَپ بھاشا" بھی کہتے ہیں لیکن یہی اپ بھرنش رفتہ رفتہ عوام کی زندہ زبان بن گئی اور تعلیم یافتہ لوگ اس اپ بھرنش

کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئے۔ چنانچہ گنگا جمنا کے درمیانی علاقے (دوآبہ) کی شورسینی اپ بھرنش ۱۰ ویں صدی عیسوی میں سارے شمالی ہند کی ادبی زبان بن گئی۔ اس وقت اپ بھرنش کی تین شکلیں تھیں۔ یعنی:

۱۔ ناگر اپ بھرنش ، ۲۔ براچڈ ، ۳۔ اپ ناگر

ان تمام اپ بھرنشوں پر شورسینی پراکرت کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ یورپ کے شاعروں کے کلام کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ بنگال کے شعرا بھی اسی زبان سے متاثر تھے۔ متھرا کے اردگرد برج کا علاقہ بھی شورسینی سے متاثر تھا۔ گویا شورسینی اپ بھرنش جو کبھی پراکرت تھی اب ایک طرح سے اس نے لنگو آفرینکا کا مقام حاصل کرلیا تھا اور پنجاب سے لے کر بنگال تک اس بھاشا کا رواج تھا۔ اس طرح اس شورسینی اپ بھرنش کا نام ہندی اور اردو کے طلبا کو اپنے ذہن میں رکھنا بڑا ضروری ہے۔ شاید اس لئے کہ یہی اپ بھرنش آگے چل کر مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی کی مختلف شکلوں کی ماں بن گئی۔ اور مغربی ہندی ہی جدید پراکرتوں کی ایک شاخ ہے یعنی اس میں ہندوستانی (کھڑی بولی)، برج، بندیلی، ہریانی (بانگڑو) اور قنوجی بولیاں شامل ہیں۔

ہندی ادب میں مغربی ہندی اور اس کی بولیوں (کھڑی اور برج وغیرہ) کے نمونے مسلمانوں کی فتح دہلی سے ذرا پہلے اور بعد تک ملتے ہیں۔ اس دور کو اپ بھرنش کا آخری دور بھی کہا جاسکتا ہے، شاید اس لئے کہ اس کے بعد ہندی ادب کا دور شروع ہوتا ہے جس کا نام "ویرگا تھا کال" ہے۔ یہ پرتھوی راج (۱۱۵۹ء تا ۱۱۹۲ء) کا زمانہ تھا۔ اس کے درباری شاعر چند بردائی نے پرتھوی راج کے حالات زندگی کے علاوہ اس کے عہد کی تاریخ معاشرت اور رزم بزم کو اپنی "راسو" نام کی نظم میں لکھا ہے۔

آریوں کی آمد سے لے کر ۱۰ ویں صدی عیسوی تک ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ کا مختصر سا جائزہ ہے۔ اس کے بعد اسٹیج سے دوسرا پردہ اٹھتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ درۂ خیبر سے ایک دوسرا قافلہ داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی سبکتگین (۹۸۶ء) اور محمود غزنوی (۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۶ء) کی آمد کے بعد محمد غوری (۱۱۷۵ء) کا پہلا حملہ ہوا اور دوسرے حملے (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج کو شکست ہوئی۔ گویا اب مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ جس طرح سے آریہ اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر ہزاروں سال کی مسافت اور صعوبتوں کے بعد ہندوستان پہنچے تھے اسی طرح سے یہ مسلمان بھی ترک وطن کرکے ہندوستان جنت نشان کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دونوں کی آمد کے اسباب

کے پیچھے سماجی اور اقتصادی ضرورتیں ہی رہی ہیں۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور زمین ان سب کو راس آئی اور یہ سب کے سب یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آمد کا یہ سلسلہ اورنگ زیب کے آخری عہد تک نظر آتا ہے۔

مسلمان جو اپنے ساتھ مختلف زبانیں (عربی، فارسی، ترکی، پشتو) اور تہذیبیں لے کر آئے تھے ان کے اثرات ہندوستانی زبانوں پر پڑے اور ساتھ ہی آئے ہوئے مسلمانوں نے ہندوستانی زبانوں اور تہذیبوں کے اثرات قبول بھی کئے۔ اس طرح سے ایک مشترک تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ لسانی اشترک کا خمیر تیار ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے ہندوستانی بولیوں (بالخصوص برج بھاشا اور کھڑی بولی) میں عربی، فارسی اور ترکی زبان کے الفاظ کی آمیزش شروع ہو گئی۔ حضرت امیر خسرو کے زمانے (۱۲۵۵ء تا ۱۳۲۵ء) تک ہمیں برج اور کھڑی بولی دونوں زبانیں ملتی ہیں۔ خسرو کی پہیلیوں، مکرنیوں اور دوہوں میں یہ زبان دیکھی جا سکتی ہے

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من　　　بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھا ہے

اس شعر میں فارسی اردو مخلوط ہے۔ مثال میں دو ایک غزلیں ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک بھاشا (ہندی) کا ہے

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس زمانہ تک برج بھاشا کو ممتاز حیثیت حاصل رہی اور کھڑی بولی اس کے زیر سایہ ساتھ دیتی رہی۔ البتہ مسلمان صوفیائے کرام کی سرپرستی سے کھڑی بولی نے ادبی شکل اختیار کر لی۔ یہ زبانیں اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ مسلمانوں کی آمد نے ان کو مزید سنوارا اور نکھارا۔ اس ارتقا کے پیچھے بھی سماجی ضرورت ہی کار فرما تھی۔ یعنی صوفیائے کرام اپنے مذہبی اور اخلاقی پیغامات کو عوام تک پہنچانا چاہتے تھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک معتدل اور قابلِ فہم وسیلۂ اظہار کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے زبان و بیان کے جو تجربے کئے وہ بڑی حد تک مفید اور کامیاب ثابت ہوئے۔ ایک نئی زبان کی تشکیل و تعمیر میں بلاشبہ صوفیائے کرام کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ امیر خسرو کے بعد کی زبان کا اندازہ درج ذیل صوفیوں، سنتوں اور بھگتی وادی شعرا کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں کھڑی بولی، برج، ہریانی اور راجستھانی بولیوں کے اثرات

ملتے ہیں نیز عربی فارسی کی آمیزش بھی نظر آتی ہے ؎

نام دیو (مرہٹی شاعر) (۱۲۷۰ء تا ۱۳۵۰ء)
مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں تے آیا

کبیر داس (۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء)
کبیر شریر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نقارہ سانس کا باجے ہے دن رین

گرو نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء)
سانس مانس سب جیو تھارا — تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے — سچے پروردگارا

تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء)
جو مینا میں نا کہے بیٹھی شکر کھائے
جو بکری میں میں کرے سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر
فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر

سورداس بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں، فرماتے ہیں ؎

کھیت بہت کاہے تم تانے، سین سی آواج (آواز)
دیو نہ جانت پار اُتر آوے، چاہت چڑھین جہاج (جہاز)

اکبر اور جہانگیر کے زمانے کے شعراء کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نوری اعظمی (۱۵۵۶ء)
ہر کس کے خیانت کند البتہ تبرسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

سعدی کاکوروی (۱۵۹۳ء)
ہمنا تُمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ بیت ہے

۱۶۲۵ء۔ محمد افضل جھنجھانوی کی ایک الم انگیز مثنوی اردو میں ملتی ہے اور ایک نظم "بارہ ماسہ" مشہور ہے۔

۱۶۶۲ء۔ شاہجہاں کے دربار کا منشی چندربھان برہمن کی غزل کا مطلع مشہور ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

۱۶۹۰ء اورنگ زیب کے زمانے کے ایک شاعر مرزا معز فطرت فارسی کے شاعر تھے ہندوستان

میں رہتے رہتے ہندوستانی (اردو) میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ ان کا ایک شعر خاصا مشہور ہے ؎

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے
در گلشنِ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

غرضیکہ کھڑی بولی نے جو بعد کو اردو کہلائی برج بھاشا اور فارسی کو پس پشت ڈال دیا۔ اور اس طرح اردو شاعری کا سنگِ بنیاد ۱۸ ویں صدی کی ابتدا میں رکھا گیا اور زبان و بیان کے تجربوں کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کی بنا پر اردو (لشکری زبان) میں نت نئے محاورے الفاظ اور ضرب الامثال اپنی جگہ بناتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں اور بولیوں کے اختلاط سے اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اس اختلاط اور اشتراک کی بنا پر اردو زبان کی حیثیت مشترک قومی زبان کی ہے اور دنیا کی مالدار ترین زبانوں میں سے ایک کہی جا سکتی ہے۔ اسی لئے اس زبان میں اظہار کی قوت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کے ارتقا میں علاقائی بولیوں کے الفاظ کی آمیزش نے چار چاند لگائے ہیں۔ ہمارے بعض شعرا نے علاقائی زبانوں کے الفاظ، آہنگ اور لب و لہجہ کا استعمال عربی، فارسی، ہندی الفاظ کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے اور بعض جگہ صرفی و نحوی اور لسانی تراکیب میں اختراعات کر کے زبان کو نئے الفاظ بھی دیئے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ایک نظم درج کی جاتی ہے۔ اس نظم میں بندیلی اور اودھی زبان اور لہجہ کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا موضوع کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں، لیکن زبان و بیان کا جو تجربہ پیش کیا گیا ہے وہ میرے تئیں بڑا دلچسپ اور قابلِ لحاظ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

بارات کا نقشہ

سُرَت ہوں حقیقت برائت کی انشا ۔۔۔ للاطول عمرو بنے ہیں گے نوشا
بڑے دُوُو اوسط دوانے خصوصاً ۔۔۔ علی العام ہراک کو پٹھرائے ہیں رقا
بڑے کرّو فرّن سے سج کر برائت ۔۔۔ چلی زرد بھتیا سے سوٹے مھوبا
شُتر اور فیلن پہ دھَوں دھَوں گرم ڈھول ۔۔۔ بجن لاگے فیل اور فیلن کے گھنٹا
دھری مُوڑ موزوں پہ پگیا مجرّخ ۔۔۔ ستارن کے زُمرن میں ماہ دو ہفتا
للا کے خسر پورہ بخشن میں نوکر ۔۔۔ خُسر فوت فُد اور خسریا بقایا
رُسَیّن میں پکوت ہیں کھانے مُذیق ۔۔۔ مچھلین کے شُروا بکرین کے قلیا

(شراب نوشی)

وہ خود آپ پیوت تو ہیں اک کجریا | رفیقن کو بخشت ہیں مشکن کے مٹکا
کوئی ہوش رفتہ کجریاً میں اوکت | کوئی ٹک رہا اندروں پائے جاما
چنانچہ مشائرن الیہ نے نشے میں | دبوچی سگنیا ، اہلیہ کے دھوکا
وہ چلائی بھونکاری از حد زیادہ | ہوئے دست بستہ کہ للو کی اما
تمھیں آج کا ہو گیو بے سبب یہ | کہ کاٹن کو دوڑت ہو مثلِ کُتریا
پکڑ دُم کو کھوت ہیں چھٹوا گندھاؤ | کہاں رکھ دیے اپنے گوشن کے جھمکا

(بھانڈوں سے متعلق ایک شعر)

پُتریَن میں عمداً کرت ہیں شرارت | عقب اسپنی جیسے ہنسیَت ہیں گھوڑا

(مقطع)

بریلی کے مختار صادق نفس نے | عِلم کی قسم کیسو لکھو مسودا

نوٹ :- بریلی کے مختار (صادق نفس) صاحب کی یہ نظم مجھ تک نامکمل شکل میں پہنچی ہے۔ شراب نوشی اور بھانڈوں کی نقل سے متعلق اشعار کچھ باقی رہ گئے ہیں۔ مختار صاحب کا پتہ لگایا جائے تو ممکن ہے کہ موصوف سے کچھ مزید مسالہ مل سکے۔ (ا-م-خاں)

الفاظ و معنی

کرت ہوں۔ کرتا ہوں۔	کرّو فرّن۔ شان و شوکت۔	کجریا۔ چھوٹا کوزہ (کُجّا سے کجریاً)۔
برائت۔ بارات۔	زرد بھتیا۔ پیلی بھیت۔	سگنیا۔ کُتیا (سگ سے)۔
انشا۔ لکھنا۔	فیلن۔ ہتھنی (فیل سے)۔	کُتریا۔ کُتیا۔
للا۔ لڑکا۔ بیٹا۔	موزِموزوں۔ مناسب سَر۔	پُتریَن۔ لڑکیاں۔
دِدّو۔ بڑے بھائی۔	پگیا۔ پگڑی۔ دستار۔	عقب اسپنی۔ عقب بمعنی پیچھے
اوسط دوانے۔ نیم پاگل۔	چخِرَخ۔ سر بفلک (چرخ سے)۔	اسپنی یعنی گھوڑی (اسپ سے)
بٹھوائے ہیں۔ بھجوائے ہیں۔	ماہِ دوہفتا۔ چودھویں کا چاند۔	ہنسیَت ہیں۔ ہنستے ہیں۔ ہنہناتے
رُقّا۔ رقعہ۔ دعوت نامہ	مُذیّق۔ ذائقہ دار۔	ہیں۔ شوخی کرتے ہیں۔

پیام شاہجہاں پوری
پندرہ روزہ "تقاضے" لاہور

محمود کنور
راولپنڈی

غزلیں

کٹ کے گر جائے مگر سر نہ جھکایا جائے
ایسے سر کو تو سرِ دار سجایا جائے

دل کے آئینے میں تصویرِ بتاں رکھتے ہیں
ایسے دیوانوں پہ پتھر نہ اٹھایا جائے

جس کو دیکھو نظر آتا ہے دریدہ داماں
کس کو چاک اپنے گریباں کا دکھایا جائے

پو پھٹے گی تو فزوں ہوگا اندھیرا کچھ اور
آخرِ شب نہ چراغوں کو بجھایا جائے

اپنے کشکول کو الٹا کے صدا دیتا ہوں
اس نشانی سے پتہ میرا لگایا جائے

لوگ سڑکوں پہ نکل آئے ہیں اب سنگ بدست
اب محل کوئی نہ شیشہ کا بنایا جائے

حاکمِ شہر سے مانگے ہے نسب نامہ پیامؔ
ایسے گستاخ کو سولی پہ چڑھایا جائے

انقلابات کے سفیروں سے
شہر بھرنے لگے فقیروں سے

خوشبوئے دشتِ سرد آتی ہے
آپ کے ہاتھ کی لکیروں سے

تم نے بھی ظالموں کا ساتھ دیا
ہم بھی خائف رہے امیروں سے

اپنی ہی گھات میں لگے ہے دن رات
جسم زخمی ہے اپنے تیروں سے

لوگ انصاف مانگتے ہیں کنورؔ
شاہ شطرنج کے وزیروں سے

زاہدی کلینک
ملتان کینٹ، پاکستان

انور زاہدی

انتہائے شب

نیون لائٹس کے جلتے بجھتے رنگین اشتہارات رات کے جوبن کو ابھار رہے ہیں۔
ہوٹلوں کی فلک بوس عمارتیں روشنی میں نہا رہی ہیں۔
شہر کی بڑی سڑک پر کاروں اور ٹیکسیوں کا دریا بہہ رہا ہے۔
فٹ پاتھ پر خوبصورت جوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے محوِ خرام ہیں۔
خوشبوئیں اور ہوائیں آپس میں بغل گیر ہو کر ایک دوسرے کو چوم رہی ہیں۔ سڑک کے اطراف میں چمکتی وردیوں والے ٹہل رہے ہیں۔

"ہم کہاں ہیں؟" بچہ اپنے باپ سے سوال کر اٹھتا ہے۔

"زمین پر بیٹے!" باپ جواب دیتا ہے۔

"لیکن یہ زمین تو بہت خوبصورت ہے!"

"ہاں بیٹے!"

"پھر ہمارا گھر کہاں ہے؟" بچہ پھر سوال کرتا ہے۔

"وہ بھی زمین پر ہے بیٹے!" باپ تھکے ہوئے لہجہ میں جواب دیتا ہے۔

"لیکن ہمارے ٹوٹے ہوئے گھر اور ماں کی بیماری کے باوجود بھی، کیا زمین اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے؟"

"خوبصورت تو بس خواب ہوتے ہیں!"

لڑکا لڑکی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتا ہے۔

"تو کیا میں خواب" لڑکی بول اٹھتی ہے۔

"نہیں، تم خواب سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو!"

"مگر خواب تو حقیقت کے...." لڑکی کہنا چاہتی ہے۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم درحقیقت بے حد حسین ہو!"

جملے کی تکمیل کے ساتھ ہی لڑکا لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہے۔

رات عالم شباب پر ہے ـــــ

یہاں سے وہاں تک ہر طرف بکھری ہوئی زلفوں کی مہک پھیلی ہوتی ہے۔ اس کے جوان جسم کی کنواری خوشبو، مشامِ جاں میں اتری جا رہی ہے۔

پکچر ہاؤس کے احاطہ میں دھکم پیل کا سماں ہے۔ ٹکٹ گھر کے سامنے کوئی قطار نہیں۔ بس سروں کا ایک سمندر ہے جس نے ٹکٹ گھر مستقل طور پر چھپا رکھا ہے۔

پکچر ہاؤس پر لگے ہوئے لائف سائز بورڈ پر نیم عریاں ہیروئن اپنی چھاتیاں ہاتھوں میں تھامے مجمع کو دعوتِ عیش دے رہی ہے۔ کونے میں ایک ٹھگنا شخص پتلون کی ایک جیب سے ٹکٹ نکال کر اونے پونے لوگوں میں بیچ رہا ہے اور لوگوں سے لئے ہوئے نوٹوں کو دوسری جیب میں ٹھونستا ہے۔ لوگ گدھوں کی طرح اس پر ٹوٹ رہے ہیں۔ پکچر ہاؤس کے احاطے میں سگریٹ کے کھوکے کے پاس کھڑا ہوا چمکتی وردی والا کوکا کولا کے بورڈ سے ٹیک لگائے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا ہے وہ جنھیں ٹکٹ مل گئے ہیں عالم مستی میں پکچر ہاؤس میں غائب ہو رہے ہیں اور وہ جو ٹکٹ لینے میں ناکام رہے ہیروئن کی چھاتیاں دیکھ کر سکتے کی حالت میں ہیں

"آؤ کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔" لڑکا لڑکی کی کمر کو انتہائی پیار سے تھامے ہوئے ریستوراں میں داخل ہو جاتا ہے۔

ریستوران کے شیشے کے دروازہ کے کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا موسیقی کی لہروں کے ہمراہ باہر نکل کر فضا میں پھیلتا ہے ـــــ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

اب معلوم نہیں دروازہ کب کھلے گا۔

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔" کوئی جانے کب سے چیخے جا رہا ہے۔

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔"

"آج دروازہ نہیں کھلے گا، اتنی رات گئے گھر آنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دروازہ کھولو۔ باہر اندھیری رات ہے۔"

"وہیں باقی رات بھی گذار لو، جہاں اب تک رہ کر آ رہے ہو۔"

کھانسنے کی لگاتار آوازیں ـــــ
گالیوں کی تکرار
"سمجھتی نہیں کہ مردوں کے کچھ اور بھی مشاغل ہوتے ہیں"
وہ دروازے پر لات مارتا ہے اور غرا ہٹیں اندھیری رات کی تنہائی میں گونجتی ہیں۔ اور گلی میں بکھر جاتی ہیں ــ کتے بھونکنا شروع کر دیتے ہیں ـــ ایک کتے کے جواب میں دوسرا، دوسرے کے جواب میں تیسرا اور پھر چوتھا، بھونکنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔
"مال چاہیئے صاحب؛ بالکل تازہ نیا نکور"
ایک موٹا توندل شخص دور کھمبے کی پیلی روشنی میں کھڑی لڑکی کے جسم کا جائزہ لے کر اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہے ـ لڑکی کے پھیپھڑے جیسے احتجاج کرتے ہیں۔ وہ کھانستے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر کر اندھیرے میں خون تھوکتی ہے ـــ
ـــ شو ختم ہو چکا ہے
ـــ رات رینگ رہی ہے۔ اس کا جوان جسم ڈھلک گیا ہے۔ زلفوں کی مہک میں فضا کی کثافتیں اتر چکی ہیں۔
اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی جوان خوشبو میں ملی جلی بدبوئیں شامل ہو گئی ہیں، چمکتی وردیاں داغدار ہیں
فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے قدم کسی چیز سے ٹکراتے ہیں۔
گالیاں اور بھونکنے کی آوازیں، ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکنے پر پھیلتی ہوئی لہروں کی طرح ابھرتی ہیں۔
داغ دار وردی والا فٹ پاتھ پر اپنی ٹارچ سے روشنی کا دائرہ بناتا ہے۔
"حرامزادے فٹ پاتھ پر بھی نہیں چھوڑتے"
دائرے میں کئی انسان اور کتے منہ پھاڑے نظر آتے ہیں۔
داغ دار وردی والا ٹارچ پھینک کر اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔
ـــ نیون لائٹس کے رنگین اشتہارات بجھ چکے ہیں۔
اندھیرا زمین سے آسمان کی طرف لپک رہا ہے، بلند عمارت کی کسی کھڑکی سے ایک چیخ نیچے چھلانگ لگاتی ہے اور اندھیرے میں مدغم ہو جاتی ہے۔

"روشنی کا قتل ہو گیا" کوئی چیخا۔

سیڑھیوں پر اندھیرے میں ایک سایہ بھاگتا ہوا نیچے اترتا ہے اور سڑک پر دور تک بھاگتا ہوا اندھیرے میں چھپ جاتا ہے۔

چمکتی وردیوں والے رات کے اندھیرے غار میں اتر گئے ہیں۔ اب چاروں طرف سناٹے میں لپٹا ہوا اندھیرا اپنی بانہیں پھیلائے کھڑا ہے اور اندھیری رات کی مہک میں خون کی بو شامل ہو چکی ہے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ گیدڑوں کی ہاؤ ہو رات کو مزید بھیانک بنا رہی ہے۔

باپ آنکھوں پر اندھیرے کی عینک لگائے اپنے بچے کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن اندھیرے میں موجود ہر چیز کا وجود ختم ہو چکا ہے۔

دور سڑک کے موڑ پر ریستوران کا بند دروازہ کھلتا ہے ــــ اور مدقوق روشنی کے حلقہ میں ایک بوڑھا ایک بڑھیا کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا ہے۔

ــــ روشنی کو اندھیرا چاٹ جاتا ہے۔

"تمھاری زلفوں میں اب وہ مہک نہیں ــ" ایک آواز۔

"تمھاری آنکھوں کی چمک بھی تو دھندلا گئی ہے" کانپتی ہوئی دوسری آواز۔

"کون کہتا ہے خواب خوبصورت ہوتے ہیں" پہلی آواز۔

جواب میں سیاہ رات کے پھیلے سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی لگاتار آوازیں اور گیدڑوں کی ہاؤ ہو تاریک لینڈ اسکیپ کو مزید بھیانک بناتی ہے ــــ بہت دور کہیں گلیوں کے مکانوں میں کھانسنے کی مستقل آوازیں کھڑکیوں کو ہلاتی ہیں اور رات تاریکی کی انتہا کو چھوتی ہے۔ ☐
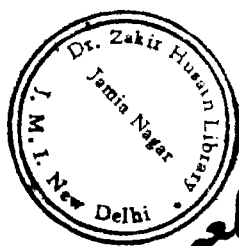
شاد عارفی

پرانا قلعہ

مقدر عداوت پہ جب ڈٹ پڑا ہے — زمیں ہل گئی آسماں پھٹ پڑا ہے
درِ قلعہ بے چارہ چوپٹ پڑا ہے — وہ کچرا، وہ کوڑا وہ کرکٹ پڑا ہے

ٹہلتے نہیں پانیئر کے سپاہی
تماشہ کرائے بندۂ تاج شاہی

کواڑوں پہ دھولوں کی پپڑی جمی ہے — گری ہے تو گل میخ پر آ تھمی ہے
پھپھوندی میں تھوڑی کسر ہے، کمی ہے — پلستر پہ نونی، زمیں پر نمی ہے

غلاموں کی گردش غلاموں سے خالی
نہ مہتر، نہ دھوبی نہ سقے نہ مالی

سرِ بام محراب، ڈنکا نہ نوبت — نفیری کی شامت نہ دھونسے کی درگت
نہ فرمانِ شوکت نہ اعلان عظمت — اجالے کی دشمن اندھیرے کی شدت

بجھے دن پہ ہوتی تھی روشن جو چوکی
وہ اب منتظر ہے ستاروں کی ضو کی

خزاں کا عمل خشک پیڑوں کے تھالے — بہاروں کا موسم خزاں کے حوالے
یہ سبزے پہ کیتے، وہ پتوں پہ جالے — بہا اشک، چشمِ بصیرت بہالے

اداسی کا منظر عمارت کے جنگلے
علاقے کے ویراں سے ڈاک بنگلے

یہ مچھی بھون جس پہ پردہ نہ اوٹے — ضیا تاب کلسوں کو پالش کے ٹوٹے
نہ مانجھے کوئی جیسے پیتل کے لوٹے — سیہ پڑ گئے مچھلیوں کے پپوٹے

زمانے کا ہر دار پڑتا ہے تگڑا
پھریرے نے جھنڈے کا دامن نہ پکڑا

نہیں اب وہ بانات کا لال پردہ   نکمّے محلات کا لال پردہ
گناہوں کے دن رات کا لال پردہ   سیہ کار حالات کا لال پردہ

نگہبان تھے جس کے بوڑھے پہاڑی
کھڑی ہے وہاں ایک گلے کی باڑی

پرندہ یہاں پر نہیں مارتا تھا   مگر بوالہوس ناگ پھنکارتا تھا
شبابوں کے دامن پہ منہ مارتا تھا   زمانہ یہاں عصمتیں ہارتا تھا

یہاں بھینٹ چڑھنے کو آتی تھیں بھیڑیں
مناسب نہیں ہے کہ یہ ذکر چھیڑیں

جواں سال خلّاصنوں کا عمل تھا   مگر ان سے مشروط قومی خلل تھا
بھٹیرن کتی ماں اور باوا مغل تھا   طلاکار نفسوں کو سب برمحل تھا

اگر عزم عصیاں پہ قدرت نہ ہوتی
حکیمانِ حاذق جگاتے تھے جوتی

اگر تھیں بھی شوہر زدہ خادمائیں   یہ قانون تھا ساتھ بچے نہ لائیں
سجیں خوب، اپنے کو دلکش بنائیں   تو ظلِّ الٰہی کے مسکی لگائیں

جنم لے بھی لیتی جو یہ روسیاہی
"پدم" سے وہ بنتا تھا اولادِ شاہی

شریفوں پہ اطلاق دار و رسن تھا   گدھوں کی حفاظت میں شیر دکابن تھا
رذیلوں کے ہاتھوں میں نظمِ وطن تھا   غرض جورتن جوت تھا، نورتن تھا

اگر قرۃ العین تحفے میں لاتا
کراؤن چچا، باپ جاگیر پاتا

بڑا چلبلا ہے تخیل کا گھوڑا   وہ بابو کا گڈھ تم نے دیکھا تو ہوگا
جو نقرہ بھیری تو مشکی بھیرا   نتیجے میں ہوتے تھے ابلق ہی پیدا

ہر اک مادیاں، میرجی کی سی گھوڑی
جو پٹھوں میں بھاری تو دانتوں میں تھوڑی

کئی بار یہ گھوڑیاں ہنہنائیں پچھاڑی اکھیڑی، لگامیں تڑائیں
کھیتے سے نکل کر طویلوں میں آئیں جو خر مل گیا اس سے آنکھیں لڑائیں

اولیلوں پہ آتی ہے جس وقت مادہ
یہاں استفادہ، وہاں استفادہ

جو اِن استفادوں سے تخلیق پائے وہ تحقیق زادوں میں خچر کہائے
یہ تازی کے ٹٹو یہ ویلر کے جائے مگر میر مفتی نے شجرے بتائے

حسب اور نسب پر بجے شادیانے
شعوروں پہ تانے گئے شامیانے

لگاتا ہوں پھندنے ادھر کے ادھر کے یہ انداز ہیں میری فکر و نظر کے
کہ لکھتا نہیں نظم خاکوں میں بھر کے ملیں تاکہ میدان عرض ہنر کے

یہ بابو کا گڈھ بھی یوں ہی آن دھمکا
نہ مقصود ابھرا نہ مضمون چمکا

نہیں گو ہمیں تاج شاہی گوارا نہ شاہوں کی عالم پناہی گوارا
نہ عالم پناہانِ واہی گوارا نہیں پھر بھی ایسی تباہی گوارا

کہ شاہی عصا گھٹ کے رہ جائے سونٹا
شہنشاہِ دوراں لگائے لنگوٹا

کسی کی تباہی پہ ہنسنا برا ہے مقامِ تامل ہے، عبرت کی جا ہے
ہرن ہو گیا نشہ، ہوش آگیا ہے یہ ہوتا رہے گا یہ ہوتا رہا ہے

تشدّد کا بدلہ چکاتی ہے قدرت
رعونت کا پرچم جھکاتی ہے قدرت

نوٹ — شاد عارفی مرحوم کی یہ نظم ہمیں مظفر حنفی صاحب نے بھیجی ہے جو ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کی جا سکی تھی اور جسے حال ہی میں انھوں نے جناب نازش پرتاب گڈھی کی عنایت سے حاصل کی ہے۔ یہ نظم ان دونوں حضرات کے شکریے کے ساتھ شایع کی جا رہی ہے۔ (ا۔ پ۔)

ولی محمد چودھری

حسبِ معمول

وہ جیسے ہی گھر سے باہر آیا، یہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا کہ آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا، پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے.....

نہ تو آسمان کی نیلاہٹ میں کوئی فرق ہے۔

نہ ہی شہر کے ہنگاموں میں کوئی فرق ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے ــــ؟

لوگ اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں ــــ؟

اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی لوگ خوشیاں منا رہے ہیں، کسی کو کسی کی فکر ہی نہیں ہے۔

کیوں ــــ؟

اس نے شہر کی چند شاہراہوں کو پار کیا اور پبلک ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا، اپنے دوست کے نمبر ڈائل کئے۔ ادھر سے رابطہ قایم ہو جانے پر اس نے سکہ ڈالا اور بولا....

"نوشاد، میں تمھارا دوست بول رہا ہوں"

"ہاں کہو، کیا بات ہے ــــ؟"

"یار آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا، پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے کیوں ــــ؟ لوگ اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں ــــ؟"

"دیکھو پیارے! آج میں بہت ہی رومانٹک موڈ میں ہوں۔ پھر کبھی بات کرنا، سوری ــــ"

اس کے ملک کے کثیرالاشاعت اخبار کے ایڈیٹر کے نمبر ڈائل کئے، رابطہ قایم ہوتے ہی اس نے دھیمی مگر پُر اعتماد آواز میں کہا۔

" سر! آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا۔ پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے، کیوں —؟"
ایڈیٹر نے ماؤتھ پیس میں کہا —
" مسٹر! اوور پاپولیشن ہو چکا ہے۔ ہر طرف حادثے ہی حادثے ہیں۔ تم یہ چکر چھوڑو اور عیش کرو۔"
وہ بوتھ سے باہر آیا اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کلبوں کے اندر سے مغربی دھنوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔
دوسری جانب بڑے سے خوبصورت پارک میں لوگ اپنی خوشیوں میں مست تھے۔
ایک طرف بنے بڑے سے ریسٹورینٹ میں ایک کھدر دھاری شخص چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار کی سرخیاں چاٹ رہا تھا۔ وہ سیدھا اس شخص کے پاس پہنچا اور بولا۔
" معاف کیجئے جناب! آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا، پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے — کیوں —؟"
اس شخص نے اخبار سے نظریں ہٹائیں اور اس حادثہ زدہ انسان کی طرف دیکھا — ایک لمبی سانس لی اور بولا۔
" سنو! میں آج گورنمنٹ کے فیور (FAVOUR) میں ایک پبلک میٹنگ میں تقریر کرنے والا ہوں۔ میرا موڈ خراب نہ کرو۔"
اس نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ پاس ہی کی ٹیبل پر ایک شخص مارکس کے فلسفے کی کتاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس شخص کو مخاطب کرکے بولا۔
" معاف کیجئے جناب! آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا۔ پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے۔"
اس شخص نے کتاب سے نظریں ہٹائیں، ایک نظر اس شخص پر ڈالی اور پھر مارکس کے فلسفے میں الجھ گیا۔
اب وہ پارک میں آیا اور اس آدمی کی طرف بڑھ گیا، جو پارک کے ایک کونے میں بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔
" معاف کیجئے بھائی صاحب! آج اتنا بڑا حادثہ ہوگیا پھر بھی سب لوگ خوش ہیں، ہر چیز حسب معمول ہے — کیوں —؟"
اس آدمی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بولا۔

" تم نے کبھی شراب پی ہے ۔۔۔ ؟"

" نہیں "

" کبھی جوا کھیلا ہے ۔۔۔ ؟"

" نہیں ۔۔۔"

" کبھی طوائفوں کے کوٹھوں پر گئے ہو ۔۔۔ ؟"

" نہیں ۔۔۔"

" سگریٹ پیا ہے کبھی ۔۔۔ ؟"

" نہیں ۔۔۔"

" تو سنو !" وہ آدمی نہایت رازدارانہ انداز میں بولا ۔" یہ سارے کام ابھی سے شروع کردو ۔۔۔ جلدی ۔۔۔"

" وہ بہت ہی مایوس ہو کر اٹھا اور وہاں سے چل دیا ۔ کچھ دیر یوں ہی سڑکوں پر گھومتا رہا ۔ پھر اس کی نظر ایک شراب خانہ پر پڑی ۔ جس پر لکھا تھا ۔

" تم جب نشہ کرتے ہو تو نشے میں دھت ہو جاتے ہو ، جب تم نشے میں دھت ہو جاتے ہو تو تمھیں نیند آنے لگتی ہے ۔ جب تم سو جاتے ہو تو کوئی گناہ نہیں کرتے ۔ جب کوئی گناہ نہیں کرتے تو تم جنت میں جاتے ہو ، لہٰذا خوب نشہ کرو اور جنت میں جاؤ ۔۔۔"

شراب خانے کے اندر لوگ نشے میں دھت طرح طرح کے گیت گا رہے تھے اور ناچ رہے تھے ۔ وہ شراب خانے کے اندر پہنچ گیا ۔ ایک ٹیبل پر صرف ایک شخص بیٹھا شراب کی کڑوی چسکیاں لے رہا تھا ۔ وہ اس شخص کے پاس گیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ۔

" معاف کیجئے جناب ! آج اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ، پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے "۔ اس شخص نے نووارد کی طرف دیکھا ، بہت غور سے دیکھا اور ایک قہقہہ لگایا ، جس کا پھپھڑوں سے کوئی تعلق نہ تھا ۔۔۔ وہ بولا ۔

" وہ سامنے دیکھو ، کافی فاصلے پر تم کو ایک مندر دکھائی دے گا اس مندر کے اندر ایک مورتی ہے ۔ جاؤ اس مورتی کو مندر کے اندر سے نکالو اور توڑ پھوڑ کر پھینک دو یا اس کے برابر میں ایک مسجد ہے اس میں سور کی گردن پھینک دو ۔ پھر تم کو کوئی چیز بھی حسب معمول دکھائی نہ دے گی ۔ جاؤ جلدی کرو ، وقت بہت کم ہے "۔

اب وہ بہت مایوس ہو چکا تھا اور اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔
تھوڑے وقفے کے بعد اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ سیدھا شہر کے سب سے بڑے سائیکلا جسٹ (نفسیاتی معالج) کے یہاں پہنچا۔

اس کے چہرے پر خوشی کی دھندلی سی لکیریں تھیں۔ سائیکلا جسٹ نے اس سے پوچھا۔

"ویل جنٹل مین! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے بہت سی امیدوں کے ساتھ سائیکلاجسٹ سے کہا۔

"سر! آج اتنا بڑا حادثہ ہو گیا پھر بھی ہر چیز حسب معمول ہے؟"

سائیکلا جسٹ کے چہرے پر کچھ لکیریں سی ابھریں۔ اس نے غور سے آنے والے کو دیکھا اور بولا۔

"حادثہ —— ہر چیز حسبِ معمول —— تم جلدی ہی کسی پاگل خانہ کے ڈاکٹر سے رابطہ قایم کرو"

وہ جیسے ہی سائیکلا جسٹ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سر سفید ہو گیا تھا۔ پاس ہی میں کھڑے ببول کے پیڑ کا سہارا لے کر وہ نیچے کی طرف جھکتا چلا گیا۔ اس کو اپنا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی ہر چیز حسبِ معمول تھی۔ □

پروفیسر عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم
(ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)

انیسویں صدی ہندوستان میں عظیم انقلابات کی صدی ہے۔ بالخصوص اس کے نصف آخر میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں انھوں نے ہندوستانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو متاثر کیا۔ سیاست وحکومت، مذہب وثقافت، تہذیب وتمدن، زبان وادب ــ غرض زندگی کا کوئی پہلو نہیں جس پر اس دور میں مغربی فکر کے گہرے اور دور رس اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں۔ حالانکہ مغایرت واجنبیت نیز مخصوص سیاسی حالات کے باعث ان افکار واحوال کی نہ صرف یہ کہ گرمجوش پذیرائی نہیں ہوئی بلکہ سخت ترین مخالفتیں ہوئیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کے پاس اپنی روایتیں ہوں، خواہ وہ کتنی ہی مضمحل اور فرسودہ کیوں نہ ہوں ایسا ہونا فطری امر تھا۔ مگر ان اثرات کی یلغار اس قوت وشدت کے ساتھ ہوئی کہ کوئی بھی مخالفت باقی نہ رہ سکی، جمود ٹوٹا، نئے کی بھڑک ختم ہوئی۔ ایک نسل جن چیزوں کو شک وشبہ بلکہ خوف وتردد سے دیکھ رہی تھی، دوسری نسل نے ان کو بلا پس وپیش قبول کر لیا۔ انیسویں صدی کے بہت سے منفورات بیسویں صدی کے معمولات بن گئے۔

اردو ادب بھی اس صورت حال سے متاثر ہوا ــ اندازِ فکر بدلا، موضوعات بدلے، اسلوبِ بیان میں تبدیلی آئی، نئی اصناف کا آغاز ہوا، پرانی اصناف نے نئی شکلیں اختیار کیں اور اسی سلسلے میں وجود میں آئی نظم معرا اور نظم آزاد۔ اسی کے ایک دور (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک) کا مطالعہ حنیف کیفی کی کتاب ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اس کتاب کو اولیت کا شرف حاصل نہیں کہ اس سے پہلے متعدد مضامین کے علاوہ کئی مستقل کتابیں (جدید اردو نظم اور یورپی اثرات؛ آزاد نظم اردو شاعری میں؛ اردو میں ہیئت کے تجربے اور نظم جدید کی کروٹیں وغیرہ) بھی شائع ہو چکی تھیں لیکن کتاب کی اس اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف نے جس شرح وبسط کے ساتھ موضوع پر گفتگو کی ہے اور تحقیق سے جو مواد ڈھونڈ نکالا ہے، وہ تصنیفات ماسبق پر اضافہ کا حکم رکھتا ہے۔ کیفی صاحب نے اس کتاب میں صرف دادِ تنقید

ہی نہیں دی بلکہ تحقیق و جستجو کا بھی ایک معیار قائم کیا ہے۔ انھوں نے یہ آسان راستہ اختیار نہیں کیا کہ پچھلے لوگوں کی دی ہوئی آرا کو دہرا دیں بلکہ انھوں نے خود اصل ماخذوں کو دیکھا اور ان کی روشنی میں ان آرا کو بھی جانچا پرکھا، ان پر تنقیحات قائم کیں اور ثابت کیا کہ بعض معروف تصورات مبنی بر خطا ہیں۔ مثلاً یہ کہ نظم معرا اور نظم آزاد کو بعض لوگ الگ نہیں سمجھتے؛ اسٹینزا فارم اردو میں استعمال کرنے میں نظم طباطبائی کو اولیت حاصل ہے۔ نظم معرا کی اختراع کا سہرا شرر کے سر ہے، شرر نے نظم معرا کو رواج دینے کی کوشش میں آزاد نظم کی بھی داغ بیل ڈالی؛ آزاد نظم کی بنیاد مستزاد پر رکھی گئی؛ اور ایسے ہی بعض دوسرے تصورات۔

چونکہ نظم معرا اور آزاد نظم کی اصناف مغربی اثرات کے تحت ہی وجود پذیر ہوئی ہیں، اس لئے انگریزی کی ان اصناف کا ذکر بھی ضروری تھا جو ان کی اساس نہیں اور اس طرح "تقابلی و تجزیاتی مطالعہ" کا طریق کار خود بخود ابھر آیا۔ اس طریق کار کی وضاحت میں مصنف نے لکھا ہے:
" پہلے میں نے انگریزی بلینک ورس اور فری ورس کے تمام فنی پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان کے ارتقائی مراحل کا بیان اختصار مگر جامعیت کے ساتھ کیا ہے تاکہ ان دونوں کی ایک واضح اور مکمل تصویر اپنے تمام خدوخال، نقوش و آثار، رنگ و آہنگ اور منازل و مراحل کے ساتھ نظر کے سامنے آجائے۔ نظم معرا اور آزاد نظم کے اس مغربی پس منظر کو نمایاں کرنے کے بعد اردو میں ان کی فنی خصوصیات اور اصل سے افتراق و امتیازات کو پیش کیا گیا ہے، نیز مختلف ادوار میں ان کی رفتار ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح مغربی بلینک ورس اور فری ورس کے تناظر میں جب اردو نظم معرا اور آزاد نظم کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو تقابل و موازنہ کی صورت خود بخود نکل آتی ہے"۔ یہ ایک مفید کوشش تھی لیکن اس ضمن میں انگریزی کی دو اصناف بلینک ورس اور فری ورس کا اس قدر تفصیلی بیان کہ دو ابواب اس کی نذر ہو گئے، کچھ نا متناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان دو ابواب میں کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزی شاعری کے فنی نکات پر مصنف کی نظر ہے لیکن یہ فنی نکات اردو معرا نظم اور آزاد نظم کے لئے کوئی خاص پس منظر فراہم نہیں کرتے نہ اردو نے انگریزی بلینک ورس کی طرح کسی خاص بحر کی پابندی کی، نہ انگریزی کا تاکیدی نظام اردو میں استعمال ہو سکتا ہے، نہ عروضی آہنگ اردو کے مزاج سے میل کھاتا ہے، مگر یہ مباحث اٹھائے کچھ اس طرح گئے ہیں جیسے ان سب نے اردو نظم کو متاثر کیا ہو۔ البتہ اسی ضمن میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی کہ آزاد نظم کا معاملہ مغربی اثرات کے تحت ہونے والے دیگر تجربوں سے مختلف

ہے۔ یعنی بیشتر اثرات یہاں اس وقت قابلِ اعتنا قرار پائے جب مغرب میں یہ قدیم یا مسترد ہو چکے تھے۔
"اردو شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا تجربہ تھا جو ہم عصر مغربی ادب کے اثرات سے وجود میں آیا تھا" اور "آزاد نظم جب اردو شعرا کی توجہ کا مرکز بنی تو خود انگریزی اور فرانسیسی شاعری میں بھی وہ کم سِنی کے دور اور تنازع للبقا کے عالم میں تھی جس سے اردو آزاد نظم کو اپنے ابتدائی دور میں دوچار ہونا پڑا۔"

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ انگریزی نے جو آزادی اس صنف کے سلسلے میں برتی، اردو کے شاعروں نے اس کو پوری طرح اختیار نہیں کیا۔ لیکن یہ امر متنازعہ فیہ رہا کہ آزادی کس قدر برتی جائے۔ مصنف نے ابتدا میں جو بات اصول موضوعہ کے طور پر کہی یعنی "آزاد نظم کا آہنگ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے وابستہ و پیوستہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ مکمل اکائی ہو۔ کوئی بھی مصرعہ دوسرے مصرعے میں نہ توضم ہو سکے اور نہ تقسیم ہو سکے" وہ عملی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکی مثلاً آزاد نظم کے بانی تصدق حسین خالد کی جو نظمیں مثال کے طور پر اور تبصرے کے لئے منتخب کی گئیں، ان میں مصرعوں کی شکست و ریخت کو یہ کہہ کر سراہا گیا کہ "استرافی کا آہنگ .... آزاد نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اور یہ خصوصیت خالد کی آزاد نظموں میں خاصی نمایاں ہے۔"

کیا موضوع و مواد اور خیال کا کوئی تعلق ہیئت، بحر اور آہنگ سے ہوتا ہے؟ کیا ان کے درمیان کوئی تطبیق ہوتی ہے؟ یہ سوال دلچسپ بھی ہے اور نہایت پیچیدہ بھی اور ایک طرح سے گرفت گریز بھی نظموں کے تجزیے میں کیفی صاحب نے اس بحث کو اٹھایا ہے اور بڑی چابکدستی سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اعلیٰ فن کار کے یہاں اور آہنگ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں اور خیال کا زیر و بم، اس کی روانی اور اس کی دیگر کیفیات خود بخود آہنگ کا تعین کرتی ہیں۔ خیال کی یہ لہریں ہی الفاظ اور مصرعوں کے قصر و طول کا سبب بنتی ہیں۔ اور اس لئے آزاد نظم میں ہیئت کی آزادی اظہار خیال کا بہترین وسیلہ فراہم کرتی ہے۔

اگرچہ "ادب میں تجربے کا تعلق ہیئت، تکنیک اور اسلوب سے ہوتا ہے" اور معرا و آزاد نظم کا معاملہ بھی ہیئت سے ہی متعلق ہے، لیکن نظموں کے تجزیوں میں متعلقہ شعرا کے کلام پر نہایت بصیرت افروز تبصرے بھی کئے گئے ہیں۔ اگر ابتدا کے چار ابواب تحقیق کی دقت نظری کا ثبوت ہیں تو آخری تین ابواب تحقیق و تنقید کا عمدہ امتزاج پیش کرتے ہیں۔ مصنف کا یہ دعویٰ کہ موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے اسے ایک دستاویزی شکل دینے اور تحقیق و تنقید کے ذریعے اسے ایک مکمل علمی کام اور قابلِ اعتماد حوالے کی کتاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے" نہ محض تعلّی ہے اور نہ محض دعوائے بے بنیاد! ☐
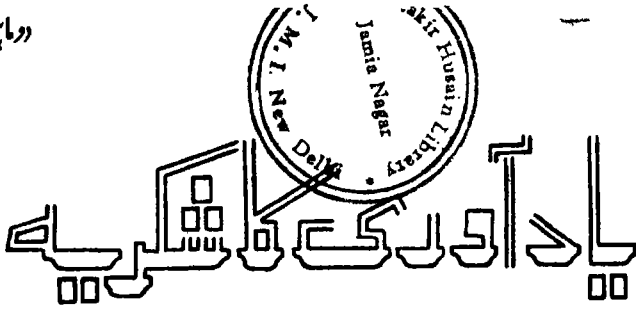
● الفاظ کے مارچ۔ جون ۸۲ء کے اداریہ میں آپ نے مرقوم فرمایا تھا "اردو رسم خط کو سہل بنانے کے لئے ایک عرصہ سے مختلف تجویزیں زیر غور آتی رہی ہیں۔" آگے چل کر آپ نے اس مفروضہ کو صحیح بتایا ہے کہ ہندی لکھنا جتنا سہل ہے اردو کا لکھنا اتنا ہی دشوار ہے اس لئے رومن دیوناگری میں لکھا جائے یا/ اور حروف تہجی کہ جن کی آوازیں تقریباً یکساں ہیں ان کے لئے ایک ہی علامت رکھی جائے وغیرہ وغیرہ — اور غلط فہمی کے تحت سمجھا جاتا ہے کہ اردو کی عدم مقبولیت کا سبب اس کا مشکل رسم خط ہے۔

آپ کو یاد ہی ہوگا کہ دو مرتبہ چیف جسٹس محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ نے بہ بانگ دہل کہا کہ اردو رسم خط بہت آسان ہے اور کچھ ہی گھنٹوں میں سیکھا اور سکھایا جاسکتا ہے۔ کسی نے بھی شاید اس بات پر کچھ دھیان نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کے عملاً صحیح ہونے پر غور کیا جائے۔ خیال آیا کہ ایسا کوئی اسکرپٹ تیار ہو تو میں ویڈیو کیسٹ (V.C.R.) کیوں نہ بنا ڈالوں کہ زمانہ AUDIO VISUAL MEDIA کا ہے اور آج کل گھر گھر ویڈیو ہیں۔ اس خیال کو اور تقویت اس وقت ہوئی جب میں نے امریکہ میں اس کا ڈیمانڈ ہر ہندوستانی پاکستانی گھر میں دیکھا۔ میں نے بعض دانشور ماہر لسانیات، صوتیات اور اردو کے جید فاضلوں سے درخواست کی تو انھوں نے دس ہزار پیشگی اور ۳۰/۳۵ ہزار جملہ معاوضہ محنتانہ مانگا۔ میں نے اس کو چیلنج سمجھ کر خود ہی ایک اسکیم بنا ڈالی ہے جس میں بتایا ہے کہ اردو رسم خط تو انگریزی/ رومن اور ہندی سے کہیں زیادہ آسان ہے، اس کی مثالیں بھی تیار کیں اور بالآخر ایک ویڈیو کیسٹ تیار ہے جس کو کمرشیل بنانے کے لئے بہت ساری چیزوں کا اضافہ کرنا ہے ورنہ دو تین گھنٹوں میں اردو جاننے والے لکھ پڑھ رہے ہیں۔ علی گڑھ آؤں گا تو ساتھ لاؤں گا۔ اسکرپٹ البتہ بھیج سکتا ہوں کہ ۳۶ حروف تہجی کو میں نے ۱۲ میں محبوس کرلیا ہے۔ نہ میں ماہر لسانیات ہوں نہ صوتیات اور نہ ہی جید ناقد، نہ میرا اسکرپٹ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہے اور نہ ہی ان کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ یہ عوام الناس کے لئے ہے۔

نائب صدر جمہوریہ نے بقلم خود لکھا ہے IT IS VERY INTERESTING AND HIGHLY ERUDITE

دیکھئے ان کے طریق عمل اور ہماری اسکیم سے اور بھی کوئی بہتر چیز بنتی ہے۔ بہت سی باتیں بالمشافہ ہوں گی تو لطف آئے گا۔

خواجہ عبدالغفور، بمبئی

● اس بار تو آپ نے اپنی تلوار اس بانکے کے ہاتھ میں تھما دی جس کے ٹیڑھے ترچھے واروں کی

کاٹ سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خط۔ انصاری صاحب نے اپنے تیکھے انداز میں غزل سے متعلق جو سوال اٹھائے ہیں وہ ذہن کو جھنجھوڑ دینے کے لئے کافی ہیں۔ غزل کے بارے میں گذشتہ سو سال میں معاندانہ اور موافقانہ ہر طرح کی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اس سے کبھی غزل کی سمت و رفتار پر کچھ اثر بھی پڑا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت بھی "کچھ" اور "کچھ" کی ہے، کیوں کہ خارجی ہیئت سے لے کر معنوی مزاج و منہاج تک میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ کئی مختلف النوع رجحانات کے تجربوں کے اردو شاعری پر اثر انداز ہونے کے باوجود غزل کی ڈگر نہیں بدلی، نہ ہمارے شاعر اس سے بیزار ہوئے، نہ غزل نے ان کو مایوس کیا لیکن بات وہی ہے کہ "زمانہ کی آویزش اور آمیزش" کی پرچھائیاں اس کی سیمیں تنی پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

ایک مجلس میں دوران گفتگو جب یہ سوال اٹھا کہ اردو شاعری بالخصوص غزل میں عصری حسیت کا کیا حصہ ہے تو اس کا دوٹوک اور واضح جواب بھائی لوگوں سے بن نہ آیا۔ تو کیا غزل کا شاعر عصری حسیت سے بالکل بے بہرہ ہے ؛ جواب یقیناً نفی میں ہے، لیکن غزل ان کو اس طرح اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکتی کہ جب دامن کھولا جائے تو وہی نظر آئے جو اس میں باندھا گیا تھا۔ یہ تو غزل کی "بازیگری" سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور معہود ذہنی صرف ذہن شاعر میں رہ جاتا ہے۔

کیا پتے کی بات کہی ہے انصاری صاحب نے: "جن عذابوں سے ہم گزرے اور گزر رہے ہیں وہ تو شاید تقسیم ہند سے پہلے کی کسی نسل کو، کسی حساس اور فن کار ذہن کو مقدر ہوئے ہوں!" مگر اس کے باوجود بھی شاعری کا کوئی عظیم کارنامہ وجود میں نہ آئے تو اسے کیا کہیں گے ؛ بے حسی ؛ ذہنی بے مائگی ؛ یا شاعری کے سانچوں کا نقص ؟
عتیق احمد صدیقی، علی گڑھ

● الفاظ کا تازہ شمارہ وقیع اور کارآمد مشتملات سے مزین ہے۔ مہمان اداریہ سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود دلچسپ ہے۔ مہمان تو یہ نو رحمتیں اور برکتیں لاتا ہے، اس کی قدر و منزلت خندہ پیشانی کے ساتھ کرنی چاہئے
راہی فدائی، ویلور

● یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت سے سنی جائے گی کہ کرناٹک نے برصغیر کے ممتاز اردو شاعر جناب حمید الماس کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۳ء کا راجیوتسوا اسٹیٹ ایوارڈ عطا کیا ہے۔ یہ اعزاز تاسیس کرناٹک کے موقع پر مختلف شعبوں سے وابستہ منتخب ممتاز حضرات کو حکومت کی طرف سے ہر سال یکم نومبر کو دیا جاتا ہے۔ اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ حمید "الماس" صاحب کے پانچ شعری مجموعے چھپ کر اردو حلقوں میں معروف و مقبول ہوئے۔
ماہر منصور، ٹمکور

● گو الفاظ تاخیر سے شائع ہوا ہے لیکن یہ آپ حضرات کی محنت، دشواریوں اور خلوص کا عین مظہر ہے۔ یہاں اسے ایک جامع اور نمائندہ ادبی جریدہ کے طور پر خاصی وقعت اور شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کے لئے آپ کی توجہ اور مساعی قابلِ قدر ہیں۔ خصوصی گوشوں کا سلسلہ تخلیق کے ساتھ ساتھ تحقیق کی ضرورتوں کے لئے بھی اہمیت اور افادیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے الفاظ کو جہاں ایک مستقل اہمیت حاصل ہوئی، اس کا ایک معیار بھی متعین ہوا، فکر انگیز مباحث کے باعث یہ ایک

نمائندہ اور منفرد ادبی مجلہ بن گیا ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت پر آپ حضرات تمام ادب دوستوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی

● اب تک الفاظ کے کئی شمارے نظر افروز ہو چکے ہیں۔ ہر پرچے کو مضامین کی انفرادیت، مباحث کی افادیت، شمولات کی جامعیت، فکر کے حسن، فن کار، ترتیب و تہذیب کا خوب آئینہ دار پایا۔ سوا سو صفحے کے اس مختصر پرچے میں ادب و تنقید، شخصیت و فن، شعر و افسانہ، تحقیق و تبصرہ غرضیکہ ایک ذوق آشنا قلب اور حسن پرست نظر کے لئے کیا کچھ نہیں ہے۔ دعا ہے خدا اس کی عمر دراز کرے اور خدمت لوح و قلم کے لئے آپ کی ہمتوں کو ہمیشہ جوان رکھے۔ ابو سلمان شاہجہانپوری، کراچی

● الفاظ مجھے بہت پسند ہے، بالخصوص کسی ادیب کے حضور آپ کا نذرانۂ عقیدت۔ ویسے کبھی کبھی آپ لوگ بے احتیاطی اور بدپرہیزی کر جاتے ہیں اور یہ حصہ تقریباتی تنقید سا بن جاتا ہے۔ اس سے میری مراد اُس تنقید سے ہے جو کتابوں کی تقاریب اجراء میں پیش کی جاتی ہے اور ادیب کا قلم بھی تیشۂ فرہاد کی طرح حیلۂ پرویز کا شکار بن جاتا ہے (اشارہ اطہر پرویز کی طرف نہیں کیوں کہ اس عہد کا حیلہ تو زر ہے۔)

حضرت اختر انصاری کو آپ لوگوں نے یاد کیا، یہ کرم تو نہیں، ادائے قرض ہے۔ میرے نزدیک دلّی اور علی گڑھ دو ہندوستانی شہروں کے نام نہیں بلکہ دو تہذیبی علامتیں ہیں — روشن اور رخشاں — مگر علی گڑھ کے دامن پر چند دھبے بھی ہیں۔ ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا پروفیسر نہ بننا اور اختر انصاری کا لکچرر کی حیثیت سے ملازمت سے سبک دوش ہونا بھی شامل ہیں۔ جواباً آپ کہہ سکتے ہیں کہ

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اور میں جواباً خاموش ہو جاؤں گا۔

بعض اور بزرگ اہل قلم آپ کے التفات کے مستحق ہیں۔ نقاد بھی اور تخلیقی فن کار بھی۔ پاکستانی اہل قلم پر آپ کے ہم نام الفاظ کراچی نے ایسا ہی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ابوالخیر کشفی، کراچی

● گزشتہ ہفتے یکے بعد دیگرے الفاظ کے دو شمارے ملے۔ شکریہ۔ فہرست اور عنوانات نے کافی متاثر کیا۔ ابھی صرف ظ۔ انصاری صاحب کا مضمون مہمان اداریہ پڑھا۔ بڑا ہی متنوع اور دل گردے کا مضمون ہے۔ ایک زمانہ کے بعد الفاظ دیکھنا نصیب ہوا۔ قاضی محی الدین، ڈھاکہ

● اس دفعہ الفاظ کا شمارہ اتنا خوبصورت اور بھرپور ہے کہ خود کو روک نہیں سکا۔ افتخار عارف کے متعلق اِدھر اُدھر جو کچھ چھپ رہا تھا اس کے پس منظر میں جی چاہتا تھا کہ انھیں تفصیل سے پڑھوں۔ تازہ شمارے نے یہ خواہش کسی حد تک پوری کر دی۔ دیگر مضامین نظم و نثر کے عمدہ اور معیاری ہونے سے انکار نہیں لیکن پورے شمارے میں خاص چیز ظ۔ انصاری صاحب کا اداریہ ہے۔ ظ۔ صاحب جب کسی موضوع پر لکھتے ہیں تو حق ادا کر دیتے ہیں اور بہت سے فکر انگیز سوال اٹھاتے ہیں جن کا جواب دینا بہت سے "خاص" لوگوں کو بھی مشکل پڑتا ہے۔ صحیح وقت پر صدائے احتجاج بلند کرنا جان لیوا ہونے کے ساتھ ساتھ ہوش مندی کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔ آپ اور ظ۔ صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی ایسی جرأت آمیز تحریریں الفاظ کے اوراق کو جگمگاتی رہیں گی۔ مرغوب علی خاں، نجیب آباد ۲۴۶۷۶۳

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شائع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

آدھی صدی کے بعد ○ ڈاکٹر وزیر آغا ○ مکتبہ اردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا ○ قیمت : ۲۰/..

وزیر آغا کے کئی ادبی رخ ہیں جن میں سے ایک ان کی شاعری کی جہت ہے۔ وہ بیک وقت نظم اور غزل کے بڑے کامیاب شاعر ہیں۔ اس بار انھوں نے ایک نیا تجربہ کیا ہے جو آزاد نظم میں طویل نظم کو آگے بڑھانے کا تجربہ ہے۔ طویل آزاد نظمیں اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہیں، مقبول بھی ہوئی ہیں، لیکن یہ تخلیقی کاوش زیادہ عام نہ ہوسکی کیوں کہ شاعر کو خاصے طویل عرصہ تک ایک ہی شعری موڈ کو قائم رکھنا پڑتا ہے جو خاصا دشوار گذار عمل ہوتا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" اسی نوعیت کا ایک مشکل اور بھرپور تجربہ ہے۔ یہ نظم آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی! یہ ایک آنکھ سے اپنے داخل میں دیکھتی ہے تو دوسری آنکھ سے اپنے خارج کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور اس کا خالق شاعر ان دونوں آنکھوں میں ایسا توافق و تطابق پیدا کر دیتا ہے کہ نظم میں جامعیت اور گٹھاؤ اس کا حسن بن جاتے ہیں۔

نظم چار بڑے حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر بڑا حصہ کئی چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک (آغا جی، ایسے بھی کیا آپ بوڑھے ہوگئے ہیں!) تجربات کو "جھرنے"، "ندی"، "دریا" اور "سمندر" تک گذار کر پہنچایا گیا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے اجزا روداد یے نہیں ہیں بلکہ وقوعات کی تاثراتی تفہیم ہیں۔ اس فنکارانہ برتاؤ کی وجہ سے نظم میں وسعتوں کے ساتھ عمق بھی پیدا ہوگیا ہے۔ فنی رچاؤ کے ساتھ فکری بالیدگی نظم کو لائقِ اعتراف ادبی اہمیت عطا کر دیتی ہے۔ وزیر آغا یونانی دیومالا

سے لے کر ہندو دیو مالا تک کی علامتیں استعمال کرتے ہیں لیکن لفظی و صنعی اغلاق سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ اتنا نرم، آہنگ رواں اور بیان سہل ہوتا ہے کہ نظم کی زیریں لہروں کو بھی گرفت میں لینا مشکل نہیں ہوتا۔ مجموعی تاثر کے زاویہ سے اس میں گداز کے ساتھ ساتھ جذباتی و تاثراتی ٹھہراؤ بھی ہے۔

"آدھی صدی کے بعد" طویل نظموں کے سرمایہ میں اضافہ ہے۔ یہ زندگی کا ایسا پنوراما ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے ذاتی و ماحولی سیاق میں کرتا ہے۔ اسی لئے جو شخص بھی اس نظم کو پڑھے گا اسے اپنی ذات اس کا مرکزی کردار نظر آئے گی۔ یہی اس نظم کی بڑی کامیابی ہے۔ وزیر آغا کو بحیثیت شاعر سمجھنے کے لئے بھی اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

SELECTED POEMS ○ ڈاکٹر وزیر آغا ○ مکتبہ اردو زبان، سرگودھا ○ قیمت: ۲۰/۰۰

یہ مجموعہ وزیر آغا کی منتخب نظموں کے انگریزی ترجموں پر محیط ہے۔ نظموں کے انگریزی ترجمے ڈیوڈ پال ڈگلس، رچرڈ رابنسن، محمد افضل ملک، سجاد شیخ، رعنا تقی، ایم۔ آئی۔ بھٹی، منور گل، بلراج کومل، جمیل آذر، مشتاق قمر، آزاد گلاٹی، گوپی چند نارنگ، راجندر سنگھ ورما، فاطمہ اطہر، سلیم آغا قزلباش اور ایس۔ اے۔ درانی نے کئے ہیں۔ یہ ترجمے وزیر آغا کی نمائندہ نظموں کے ہیں۔ انگریزی ترجمہ میں اردو نظموں کے مزاج و مفہوم کو منتقل کرنے کی کامیاب حد تک کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہمارے عہد کے نمائندہ فنکاروں کو عالمی زبانوں میں ترجمہ کے ذریعہ وسیع تر حلقہ میں متعارف کرایا جائے تو ان کا صحیح معروضی جائزہ زیادہ آسان ہو سکے گا اور اردو کے فن کاروں کے احساس کمتری میں بڑی حد تک کمی ہو گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ وزیر آغا کی نظموں کے ترجموں کو جمیل آذر اور مشتاق قمر نے حسن و سلیقہ سے مرتب کر کے مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنی اس توجہ کو قائم رکھیں گے۔

یہ ترجمے خاصی محنت سے کئے گئے ہیں۔ اس میں انگریزی زبان کی نزاکتوں اور ترسیل کی تہ داریوں کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمہ نہیں اصل نظم پڑھ رہے ہیں۔ یہی اس مجموعہ کا حسن ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی: شخصیت اور فن ○ مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا ○ مجلس ترقی ادب، لاہور ○ قیمت: ۵۵/۰۰

عبدالرحمٰن چغتائی جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، برصغیر کے ان مصوروں میں سے رہے ہیں جو خود اپنا مکتبۂ فن رکھتے ہیں۔ چغتائی آرٹ مشرق کا اتنا عظیم سرمایہ ہے کہ عالمی مصوری میں نہ صرف اسے غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے بلکہ تنقید فن میں اس سے بعض معیارات متعین کئے جاتے ہیں۔ چغتائی کے فن کے محاسن سے

متعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اہل نظر اس کے محاسن سے بخوبی آگاہ ہیں جنھیں چغتائی اور ان کے فن سے تعارف کی ضرورت ہے ان کے لئے وزیر آغا نے یہ یادگاری مجموعہ مرتب کرکے بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس مجموعہ میں چغتائی کے فن پر علامہ اقبال، جیمز کزن، بیزل گرے، یعقوب ذکی اور ٹمارا ٹالبوٹ رائس کے معیاری فنی مقالات ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، فیض احمد فیض، میرزا ادیب، غلام عباس، مالک رام، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر اور آغا بابر وغیرہ کے معلومات افزا مضامین شامل ہیں۔

اس مجموعہ کے دو اہم ترین مشمولات میں سے ایک چغتائی مرحوم کا مضمون ہے "میری تصویریں میری نظر میں" جو چوبیس صفحات پر محیط ہے۔ دوسرا وہ طویل مضمون ہے جو ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ان کی سوانح شخصیت اور فن پر لکھا ہے۔ ان دونوں مضامین سے چغتائی کے بارے میں نادر معلومات دستیاب ہوتی ہیں جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھیں۔

کتاب چغتائی کی مختلف اصناف مصوری سے مزین ہے۔ خود چغتائی مرحوم کی تصویر اور شجرہ بھی شریک اشاعت ہے۔ کتاب ٹائپ میں خوبصورت چھپی ہے۔ چغتائی جیسے عظیم مصور کو سمجھنے کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

دوسرا کنارا ○ وزیر آغا ○ مکتبہ اردو زبان، سرگودھا ○ قیمت: ۲۵/۰۰

انشائیہ کی صنف کو اردو میں نہ صرف وزیر آغا نے متعارف کرایا ہے بلکہ اس پر مستقلاً توجہ دے کر اسے مقبول بھی بنایا ہے۔ اب اس کے سلسلہ میں بہت سی متضاد باتیں کی جانے لگی ہیں۔ ان کا کریڈٹ بھی بالواسطہ وزیر آغا کے کھاتے میں جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک قد آور ادبی شخصیت نے اپنے پریس انٹرویو میں کہا کہ انشائیہ کی صنف ساٹھ سال پہلے بھی موجود تھی، اس وقت اسے انشائے لطیف کہا جاتا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار اور سجاد حیدر یلدرم انشائے لطیف لکھا کرتے تھے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ انشائیہ کسی شخص نے حال ہی میں ایجاد کیا ہے۔ ہمیں اس رائے سے کلیتہً اتفاق ہے کہ پہلے انشائے لطیف لکھی جاتی تھی اور اب انشائیہ لکھا جاتا ہے۔ اس انشائیہ کو حال ہی میں جس شخص نے ایجاد کیا ہے اس کا نام وزیر آغا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں وزیر آغا کے سترہ انشائیے شامل ہیں۔ شروع میں خود انھوں نے دس صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے جو صنف انشائیہ پر بعض اہم فنی بحثوں کا احاطہ کرتا ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ بہت RELAXED انداز میں موضوع کو چھیڑتے ہیں اور لمحہ فکریہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ صنف انشائیہ میں وزیر آغا کا اپنا مقام ہے اسی لئے یہ مجموعہ اس صنف میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اسی زاویۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ذکر اس پری وش کا ○ ڈاکٹر انور سدید ○ مکتبہ اردو زبان، سرگودھا

قیمت : ۱۵/۰۰

ڈاکٹر انور سدید نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا، مشہور ہوئے نقاد کی حیثیت سے، دل جمعی کے لئے شاعری کی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بے پناہ توانائیوں کے اظہار کے لئے انشائیے لکھے۔ "ذکر اس پری وش کا" ان کے دس انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں جمیل آذر نے متوازن و معلومات افزا دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے بعد ہی "اردو انشائیہ" کے عنوان سے فکری و جائزاتی مضمون پیش کیا ہے جس سے صنف انشائیہ کے سلسلہ میں خاصی رہنمائی میسر آتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے انشائیوں کی نمایاں خصوصیت ان کی شگفتگی ہے۔ وہ لبوں پر تبسم کی لہر تو لے آتے ہیں لیکن انشائیہ کو مزاحیہ مضمون نہیں بننے دیتے۔ ان کے موضوعات بھی عام طور سے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں لیکن ان کے ذریعہ احاطہ اہم مسائل کا کیا جاتا ہے۔

انور سدید انشائیہ نگاروں میں اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور زیر تبصرہ مجموعہ میں ان کے نمائندہ انشائیے شامل ہیں۔ انشائیہ کے ایک نئے انداز سے متعارف ہونے کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

غالب کے نئے خطوط ○ ڈاکٹر انور سدید ○ مکتبہ اردو زبان، سرگودھا ○ قیمت : ۲۰/۰۰

انور سدید افسانہ نگار، نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار تو تھے ہی۔ غالب کے نئے خطوط لکھ کر انھوں نے مزاح نگاروں کی صف میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے۔ عام طور سے ان خطوط کو مزاحیہ تصور کیا جاتا ہے لیکن میں ان کا شمار پیروڈی میں کروں گا۔ انور سدید نے بڑی کامیابی کے ساتھ غالب کے اسلوب کا چربہ اتارا ہے۔ اکثر ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں دلّی والے ہیں۔ اگر پنجابی زبان کے بعض محاوراتی استعمالات چغلی نہ کھاتے تو انھیں "غالب نژاد" کہنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ ان خطوط میں بعض عصری چپقلش بھی آگئی ہے لیکن ان میں شگفتگی ہے اور خوش دلی! تمام خطوط میں ایسی بہت سی باتیں بکھری ہوئی ملیں گی جو آئندہ ادبی تاریخ کے حوالے کے کام آئیں گی۔ انور سدید نے بالکل نئی صنف کو ہاتھ لگایا ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ خطوط دلچسپ تو ہیں ہی، شگفتہ ادب میں اضافہ بھی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

سرگوشیاں ○ سلیم آغا قزلباش ○ مکتبہ اردو زبان، سرگودھا ○ قیمت : ۱۲/۰۰

سلیم آغا نہ صرف خود نوجوان ہیں بلکہ ادبی دنیا میں نو وارد بھی ہیں ہمیں مسرت انگیز حیرت اس پر ہے کہ انھوں نے ایوان ادب میں قدم رکھتے ہی اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ بھی کر لیا ہے۔ "سرگوشیاں" میں ان کے بارہ انشائیے شامل ہیں جن کے شروع میں مشتاق قمر کا حرف اوّل اور ڈاکٹر انور سدید کا حرف آخر شائع کیا گیا ہے۔ ان دونوں تعارفی مضامین میں سلیم آغا کے انشائیوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلیم آغا کا ذہن منطقی ہے۔ وہ سبب و مسبب کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اسی لئے آخر

تک انشائیہ کا سرا قاری کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ سوچنے اور غور کرنے کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اگر اس رویہ میں پختگی آگئی تو انشائیوں میں بردباری کو برقرار رکھنے والے انشائیہ نگاروں کی صف میں سلیم آغا اپنا خصوصی مقام بنالیں گے۔ اس وقت بھی ان کے انشائیوں میں تازگی اور ندرت ہے، کچاپن نہیں!

بحیثیت انشائیہ نگار ہم سلیم آغا کا استقبال کرتے ہیں۔

اوراق

○ مدیران: وزیر آغا، سجاد نقوی ○ چوک اردو بازار، لاہور ○ چندہ سالانہ ۶۰/۰۰، فی شمارہ: ۲۰/۰۰

"اوراق" اردو کے معیاری رسائل کی صف اول میں اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے ہر اس کونے میں متعارف ہے جہاں اردو جاننے والے موجود ہیں۔ اس وقت تبصرہ کے لئے ہمارے سامنے نومبر دسمبر ۱۹۸۳ء کا خاص نمبر ہے۔ "اوراق" کا یہ خاص نمبر اپنی روایت کے مطابق بے حد اہم تحریروں کا حامل ہے۔ انشائیوں میں وزیر آغا، احمد جمال پاشا، جمیل آذر، محمد اسد اللہ اور سلیم آغا قزلباش خصوصی طور پر متوجہ کرتے ہیں۔ طویل نظموں میں تخت سنگھ، احمد ظفر اور سعید احمد اختر خاصے کامیاب ہیں۔ افسانے ممتاز مفتی، رشید امجد، جیلانی بانو، رفعت نواز اور سلیم آغا کے منفرد ہیں۔ نظموں میں بلراج کومل، غالب احمد، حیدر قریشی، فرحت نواز، حفیظ صدیقی، زاہدہ صدیقی، آذر حفیظ اور غزلوں میں جگن ناتھ آزاد، شیر افضل جعفری، آزاد گلاٹی، سید ضمیر جعفری، ذکاء الدین شایاں، اسعد بدایونی، منظور ہاشمی اور زہیر کنجاہی کے یہاں شعری ندرت ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے فراق پر حسب معمول اختلافی مضمون لکھا ہے۔ جمیل آذر نے منٹو پر اور نجیب جمال نے مسجد قرطبہ کے مطالعہ میں فکر انگیز نکات پیش کئے ہیں۔ اس خاص نمبر کا خصوصی حصہ "گوشۂ انور سدید" ہے۔ اس واسطے سے ہم ایک عصری شخصیت سے بڑے اچھے انداز میں متعارف ہوتے ہیں۔ اس خاص نمبر کا سرورق موجد نے اس بار خاصا پرکشش بنایا ہے۔ اس میں METALIC EFFECT نے بے پناہ تاثر انگیزی پیدا کردی ہے۔

یہ خاص نمبر خاصے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

اردو زبان۔ انشائیہ نمبر

○ مدیر مسئول: عصمت اللہ ○ ریلوے روڈ، سرگودھا ○ زر سالانہ: ۳۵/۰۰، فی شمارہ: ۶/۰۰

"اردو زبان" سرگودھا کے احباب ادب کے تعاون سے مختصر ضخامت میں پابندی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس بار اس نے خاصے طویل عرصہ کے بعد انشائیہ پر خصوصی شمارہ شائع کیا ہے اور حق ادا کردیا ہے۔ شروع میں وزیر آغا، انور سدید اور رابرٹ لنڈ کا ایک ایک انشائیہ بطور انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ تازہ انشائیوں کے حصہ میں سارے ہی نامور انشائیہ نگاروں کی تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ مقالات

کے حصہ میں سات مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ہر مضمون انشائیہ کے کسی نہ کسی پہلو کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔ "ایک گفتگو" کے تحت وزیر آغا سے لطیف ساحل کا انٹرویو شریک اشاعت کیا گیا ہے۔

"انشائیہ نمبر" بھرپور اور پُرتنوع ہے۔ اس نے ایک ایسی صنف سے متعلق لٹریچر پیش کیا ہے جس پر ابھی بہت کچھ لکھا جانا ہے۔ اس خاص نمبر میں وزیر آغا، انور سدید، غلام جیلانی اصغر، رشید امجد، احمد جمال پاشا، محمد اسداللہ خاں، اکبر حمیدی، مسعود انور، راغب شکیب اور سلیم آغا جیسے معتبر لکھنے والوں نے شرکت کی ہے۔

یہ نمبر آئندہ بھی حوالے کے کام آتا رہے گا۔

اردو انٹرنیشنل

9-35th STREET, SUITE 2, ○ مدیر: اشفاق حسین ○
سالانہ: ۲۰ ڈالر، فی شمارہ ۵ ڈالر ○ TORANTO, ONTARIO, M8W 3J8, CANADA

"اردو انٹرنیشنل" سہ ماہی اردو جریدہ ہے جو بہت ہی خوبصورت کتابت، طباعت، گٹ اپ اور سٹنگ کے ساتھ ٹورنٹو (کینیڈا) سے شائع ہو رہا ہے۔ میرے پیش نظر شمارہ ۳ و ۴ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر جریدہ ترتیب و تزئین کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے بڑی سعی و جہد سے اسے مغرب کے ادبی جرائد کا ہم معیار بنانے کی کوشش کی ہے۔

ان دونوں شماروں میں یادرفتگاں کے تحت جوش، فراق اور غلام عباس کو خراج عقیدت پیش کی گئی ہے۔ ان کی تخلیقات کے علاوہ احسان دانش اور خدیجہ مستور کو بھی ان کی تحریروں کے ذریعہ نمائندگی دی گئی ہے کیوں کہ یہ بھی متوفین میں شمار ہو گئے۔ لکھنے والوں میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، وزیر آغا، محمد علی صدیقی اور فارغ بخاری جیسے ممتاز و معروف شاعر و نقاد اور رشید امجد، جوگیندر پال، رام لعل، مرزا حامد بیگ، علی حیدر ملک، آغا سہیل اور احمد داؤد جیسے افسانہ نگار شریکِ اشاعت ہیں۔ ناموں کی یہ فہرست خود "اردو انٹرنیشنل" کے مطالعہ کی آتش شوق کو بھڑکاتی ہے، لیکن ان ناموں سے اور ان کی تحریروں سے تو ہمارا رابطہ ہند و پاک کے جرائد کے ذریعہ قائم ہوتا ہی رہتا ہے۔ "اردو انٹرنیشنل" کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم ان شاعروں اور ادیبوں سے بھی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو اب دنیا کے تمام ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ان میں افتخار عارف، ہرچرن چاولہ، نزہت صدیقی، حمیرا رحمان، ڈاکٹر عبدالقیوم لودھی، اشفاق حسین، منیرالدین احمد اور اکبر حیدرآبادی وغیرہ مغربی ممالک میں ہمارے ادب کی لائق اعتراف نمائندگی کر رہے ہیں۔ شمارہ ۴ میں اشفاق حسین نے بڑا فکر انگیز اداریہ لکھا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ جرنل ممالک غیر میں اردو کی پُراعتماد نمائندگی کرتا ہے۔

——— ابن فرید

Regd. No. L. ALG/270 Nov. Dec. 198

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/7

جلد ۹ | جنوری تا دسمبر ۱۹۸۴ء | شمارہ ۱-۶

زرِ سالانہ ---- ۱۶ روپے
قیمت ---- ۳ روپے

پرنٹر و پبلشر ---- اسفندیار خاں
مطبوعہ ---- جواہر آفسیٹ پریس نئی دہلی
کتابت ---- ز۔ رشید، الہ آباد

مقامِ اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس

پتہ: دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

آئینہ

گوشۂ مجتبیٰ حسین

تنقید

انشائیہ

غزلیں

نظمیں

افسانے

○

ڈاکٹر اطہر پرویز

آہ اطہر پرویز صاحب

۱۰ مارچ ۱۹۸۴ء کو ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب ہم سے رخصت ہو گئے۔ الفاظ کی ادارت کا زیادہ بار انہی کے کاندھوں پر تھا۔ جب بھی رسالہ میں کوئی کمی نظر آئے گی وہ بے اختیار یاد آئیں گے۔ الفاظ اور مکتبہ الفاظ کو جب کسی رہنمائی کی ضرورت ہوگی اسد صاحب کی نظریں انہی کو ڈھونڈیں گی۔

پرویز صاحب مصنف تھے معلم تھے، قوم کے خدمت گزار تھے کسی زمانے میں انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا اور وہاں بھی سرفراز رہے تھے۔ اس خارزار سے دامن سلامت لے کر نکل آنا آسان نہیں لیکن جن لوگوں نے اس میدان میں ان کے ساتھ کام کیا تھا وہ آج بھی ان کی راست گفتاری، کردار کی پختگی اور جذبۂ ایثار کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں اور سننے والے حیران ہوتے ہیں کہ سیاست میں ان چیزوں کا کیا کام! پھر سیاست سے کنارہ کر کے وہ تعلیمی اور سماجی کاموں میں لگ گئے۔ علی گڑھ میں تعلیم بالغان کی ذمہ داری سنبھالی تو یونیورسٹی کے اساتذہ کو ساتھ لئے کبھی شہر کے گلی کوچوں میں نظر آتے کبھی گرد و نواح کے دیہات میں اور یہ کام فی سبیل اللہ تھا۔ اس تعلیمی مہم سے یونیورسٹی کا وقار بلند ہوا اور یونیورسٹی سے غیر متعلق لوگوں کے دلوں میں اس ادارے کا احترام پیدا ہوا۔ اب سے دس گیارہ برس پہلے یہ خیال آیا کہ علی گڑھ میں ایک اچھے اسکول کی ضرورت ہے تو دوستوں کے تعاون سے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کی ترقی کے لئے جان کھپا دی۔ وہ جس ذمہ داری کو قبول کر لیتے اس کے ساتھ پورا انصاف کرتے تھے۔ کام ہی ان کی عبادت تھا اس لئے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں کامیاب ہوئے۔

پرویز صاحب نے کم و بیش پچیس برس پہلے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے جنرل ایجوکیشن میں استاد رہے پھر شعبۂ اردو میں۔ استاد کی حیثیت سے بھی وہ بہت کامیاب تھے۔ اونچی آواز میں بولنے کے عادی تھے۔ کہا کرتے تھے ایک زمانے تک مزدوروں کے مجمعوں کو خطاب کیا ہے اس لئے بلند آواز میں گفتگو کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ان کو کامیاب استاد بنانے میں یہ عادت بھی کام آئی۔ انھوں نے عام جلسوں میں تقریریں کیں، بچوں کے لئے کتابیں لکھیں۔ ان دونوں کاموں کا یہ فائدہ ہوا کہ مشکل بات کو سہل کر کے پیش کرنے کی مہارت ہو گئی۔ اس لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی سمجھائی ہوئی کوئی بات شاگردوں کے سر پر سے گزر گئی ہو۔

کامیاب اور شفیق استادوں کی آج بھی کمی نہیں لیکن پڑھنے اور پڑھانے کا جیسا شوق پرویز صاحب کو تھا وہ کمیاب ہے۔ کوئی کلاس ہو اور کوئی مضمون، وہ پڑھانے کے لئے ہمیشہ کمربستہ نظر آتے۔ بڑی خود اعتمادی سے کہتے ہیں یہ مضمون نہیں جانتا تو کیا ہوا تیاری کر کے تو پڑھا سکتا ہوں اور اس تیاری کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ اردو اور فارسی کے ایم اے تھے مگر جنرل ایجوکیشن میں سائنس بھی پڑھائی اور اس محنت سے پڑھائی کہ ان کے کئی شاگرد جو آج سائنس کے شعبوں میں استاد ہیں، ان کے اس کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔

وہ اپنے شاگردوں کو دل سے چاہتے اور ان کی ہر مدد کو تیار رہتے تھے۔ کسی طالب علم کو ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو ان کے پاس نہیں تو کسی سے مانگ کر لا دیں گے چاہے بعد کو پچھتانا ہی پڑے۔ ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جس میں سے دس بیس کتابیں ہر سال ضرور کم ہو جاتی تھیں پھر بھی وہ اپنی کتابیں مستعار دیتے کبھی نہ ہچکچائے۔ کسی دانشور نے کہہ دیا کہ میں کسی کو کتاب قرض نہیں دیتا کیونکہ مانگے کی کتابوں سے ہی تو میری لائبریری وجود میں آئی ہے۔ کسی ظریف نے کہہ دیا کہ دل اور کتاب دونوں کی چوری جائز ہے تو لوگ کتابیں لے کر مکرنے لگے اور یہ بھول گئے کہ علمی دنیا میں بے اعتباری کی جو فضا وہ پیدا کر رہے ہیں اس میں ضرورت مندوں کو بھی کوئی کتاب اُدھار نہ دے گا۔ کتنوں نے تو اپنے ذخیرے محفوظ رکھنے کے لئے چور کمرے بنا بھی لئے مگر وہ چیز جسے دنیوی عقل کہتے ہیں نہ تو وہ مرحوم کو آتی تھی نہ وہ اسے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ وہ فطرتاً بھولے بھالے اور نیک تھے۔ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔

پرویز صاحب کی زندگی میں تصنیف و تالیف کی حیثیت پہلے پیار کی سی تھی۔ کوئی عالم ہو وہ اس سے غافل نہ ہوتے تھے۔ دنیا بھر کے کام کرتے تھے مگر دل سب سے زیادہ اسی کام میں لگتا تھا۔ تحقیق و تنقید میں بھی وہ پیچھے نہ رہے اور بچوں کا ادب تو اُن کا خاص میدان تھا لیکن ان کے لکھے ہوئے خاکے مجھے سب سے زیادہ پسند تھے۔ انھوں نے پہلا خاکہ پڑھ کے سنایا تو بہت اچھا لگا۔ پھر میں نے فرمائش کر کے، اصرار کر کے ان سے کئی خاکے لکھوائے۔ درجن بھر خاکے جمع ہو گئے تو انھوں نے کتاب کی شکل میں ان خاکوں کو یکجا کر دیا۔

ان کے لڑنے، روٹھنے اور منفے کے انداز بالکل بچوں کے سے تھے۔ کبھی ذرا سی بات پر روٹھ جاتے کبھی بڑی سے بڑی غلطی کو نظر انداز کر دیتے۔ ان کا روٹھنا بھی ذرا سی دیر کا ہوتا تھا۔ کہا کرتے تھے میں بنیوں کی طرح ہر بات ہی کھاتے میں نہیں ٹانکتا ذرا دیر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ زبان کے سخت ضرور تھے جو کچھ دل میں ہوتا وہی زبان پر آجاتا مگر جیسے ہی غلطی کا احساس ہوتا فوراً معذرت کرتے بلکہ معافی مانگ لیتے اور اس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ دوستوں پر اعتبار کرتے تھے مکمل اعتماد! دوست کی رائے پر اکثر اپنی رائے کو قربان کر دیتے۔ کئی بار دیکھا میٹنگ میں کسی مسئلے پر اظہار خیال کر رہے ہیں، دوست نے کان میں کہہ دیا "مگر میری رائے اس کے برخلاف ہے" یہ سنتے ہی کانٹا بدل دیا اور اس کی حمایت میں تقریر کر ڈالی۔ کہتے تھے جس دوست پر بھروسا کرتا ہوں وہ کہے کہ میں نے اس مسئلے پر خوب سوچ لیا ہے تو پھر میں اپنے ذہن پر کیوں زور ڈالوں۔

کام ان کی زندگی تھا۔ اس کام ہی نے ان کی جان لے لی۔ طویل بے مقصد زندگی سے وہ مختصر زندگی کہیں بہتر جس کا ایک ایک پل مفید کاموں میں صَرف ہو۔ پرویز صاحب عمر کے ۵۹ برس پورے کرنے سے بھی پہلے رخصت ہو گئے لیکن ان برسوں سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی عمر کا بڑا حصہ قومی بھلائی کے کاموں میں لگا دیا۔ خوب جانتے تھے کہ جس مرض نے انھیں گھیر لیا ہے وہ جان لئے بنا ٹلتا نہیں مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر کاموں میں لگے رہے۔ ۱۰ / مارچ کو شام کا وقت ملاقات کے لئے مقرر تھا۔ وہ ذرا دیر سے پہنچے معلوم ہوا طبیعت خراب تھی۔ ہمت کر کے آئے کہنے لگے اگر میں نہ اٹھ پاتا اور ابدی نیند سو جاتا تو تم اور عالم صاحب تھوڑی دیر انتظار کرتے پھر جھنجھلا کر تشویش میں مبتلا ہو جاتے یہاں تک کہ کوئی آ کے ہمارے کوچ کی خبر دیتا۔ اور واقعی وہ کچھ دن بعد کوچ کر گئے۔

ن. الحسن نقوی

مہمان اداریہ

طنز و مزاح کے حق میں فقط ایک کلمۂ تحسین یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے ادب عالیہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ایک نقاد نے نجانے اپنی موزونیٔ طبع کے کامپلیکس (complex) میں ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا "اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو میں رعایتاً اسے ادب مان لیتا ہوں مگر ادب عالیہ، چیزے دیگر است۔" (اس کے بعد اس حضرت نقاد نے کوئی تردیدی بیان شائع نہیں کروایا یا شائع نہیں کیا گیا۔)

ادب اور ادب عالیہ دونوں کا المیہ یہ ہے کہ نقاد کو ضد ہے کہ اسے ادبی خضر مانا جائے۔ چنانچہ ادیبوں کے غول کے غول آب حیات کے دیوتا کا پیچھا کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ دیوتا بچارا خود آب حیات کا محتاج اور آب حیات سے محروم ہے۔

مگر طنز و مزاح نگار کا طرۂ یہ ہے کہ اس کی تخلیقات کا ناطہ براہ راست قاری سے بنا رہا۔ درمیان میں نقاد کو نکال دیا گیا۔ طنز قاری کو اور قاری طنز کو بھلی پر کار سمجھتے تھے کیونکہ سمجھنے سمجھانے میں کوئی تجریت نہیں تھی جس کے لئے نقاد کو تہ در تہ معنی دریافت کرنے کی زحمت دی جاتی۔ اور پھر قاری طنز کو ادب عالیہ گردان کر پڑھتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کو وہ ایک پیچیدہ کوفت سمجھتا ہے اور نظر انداز کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ طنز و مزاح سے اپنی مطلوبہ طمانیت اخذ کر لیتا ہے ــ اور یہی اس کا چشمۂ آب حیات ہے۔

اور نقاد شاید قاری کی اسی بے نیازانہ طمانیت سے چڑ کر طنز کو ادب عالیہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

یہ طنز و مزاح کی برتری ہے یا کمتری کہ ہر ملک میں، ہر زبان میں، ہر عہد میں معدودے چند طنز و مزاح نگار پیدائش کی زحمت فرماتے ہیں۔ دو چار صف اول کے طنز و مزاح نگار ابھرتے ہیں اور پھر جیسے پوری صدی ان پر گذر جاتی ہے۔ یہ کنجوسی قانون قدرت کا تقاضا ہے یا خالق کا یہ خوف کہ میری مخلوق تیکھے نشتروں کی آب و تاب نہیں رکھتی۔ اسے ان سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھا جائے۔ یا شاید اللہ تعالیٰ کی یہ دور اندیشی بھی بے معنی نہیں کہ طنز کا ایک تیر اگر ایک نسل کو چھید کرے تو آنے

والی دو تین نسلیں آ کر جعفر کو کلاسک کا مرتبہ دیتی رہتی ہے۔

کیا آسکر وائلڈ کے تیکھے فقرے آج تک ہمارا تعاقب نہیں کر رہے ؟

کیا ایک نیا برنارڈ شا پیدا کرنے کے لئے آئندہ تین چار نسلوں تک ہمارے دست دعا اٹھیں گے ؟

نجانے اس امر پہ کیوں منافق اور موافق ، متفق ہو گئے ہیں کہ تواریخ کا ہر انسانی سماج ناہموار (بھی) ہوتا ہے ۔ ناہمواری کو مناسب اور معتدل رویہ اختیار کرنے کے لئے واحد کارگر اسلوب طنز و مزاح کا ہے کہ مضحکہ خیزی کے دشمن پر تیر و تفنگ کا حملہ باتبسم کیا جائے ۔ تو اسے نہ صرف دشمن جارحانہ حملہ قرار دیتا ہے بلکہ دوست اور خدا رکھے غیر جانب دار حضرات تک یہ دیکھ کر بڑا اطمینان تب محسوس کرتے ہیں کہ ناہمواری کبھی چاہے ہنستے ہنستے ہی سہی ، پیچھے ہٹ گئی اور اس ناہمواری کے بڑھتے چڑھتے لشکر سے بڑھتی چڑھتی تہذیب کی جو شکل مسخ ہونے لگی تھی اس کی تنسیخ رک گئی ۔

انسانی تہذیب آج جس قدر اعلیٰ منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اسے بڑھانے میں طنز و مزاح کا رول ، سنوارنے اور سجانے والا رول ہے ۔ طنز و مزاح نگار جب سماج کی مضحکہ خیزی پر ہنستا ہے ، تو ہنس ہنس کر خود بھی روتا ہے اور آپ کو بھی رلاتا ہے ۔ اور رونے سے جو آنسو طلوع ہوتے ہیں وہ تاریخ و تہذیب کے آنے والے دور کے موتی بن کر آبداری کرتے ہیں ۔

طنز اگر تلوار ہے تو اس کی دھاریں دو ہیں ۔ نازک اور نوکیلی ۔ اس کے استعمال میں خطرہ بھی دوہرا ہے اور ذرا سا بھی اوچھا پڑا تو ناہمواری کی گردن تو کٹی نہیں ، طنز نگار کی گردن انا للہ و انا الیہ راجعون

اور پھر بیان کی نازکی یوں بھی خطرناک ، کہ ہم ہندوستانی ٹریجک قسم کے سنجیدہ مزاج کے مالک ہیں ۔ ہنسی اور چوٹ کو گناہ اور عیب کی قدر سمجھتے ہیں ۔ بلکہ ہندوستانی قوم ہی کیوں ؟ پاکستانی قوم بھی طنز و مزاح کے لئے فروغ قلب سے الگ زندگی گذارنے کو مقام رفعت دینے میں یقین رکھتی ہے ۔ کوئی برا مانے یا ... بلکہ برا ہی مانے تو مانے ، کہ دونوں قوموں کی مٹی ہی علیحدہ کر دی گئی ، مگر مزاج کی جڑیں نکلا تھوں میں جا کر ابھی تک جڑی کھڑی ہیں ۔

ایسی نازک مزاج قوموں میں ناہمواریوں کی بہار تو اللہ کے فضل سے نہ صرف اپنا ایک قدر رکھتی ہے ۔ بلکہ روز بروز قد آور کو طرۂ امتیاز جا ہے نہ جانے مگر طرہ تو ہمارے ہر فعل ، ہر سوچ اور ہر عمل میں لہراتا ہوا طنز نگار کو واضح طور پر نظر آ رہا ہے ۔ ایسے میں بدقسمتی سے جو طنز نگار ہے ، ناہمواری کو ہموار کرنے پر تلا ہوا ہے ، اسے اپنے افکار کے لئے کیسے کیسے نازک تکنیکی مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے ۔ آپ نہ جانے میں تو اچھا اور نہ

ہل قلم خوش نصیب ہیں جو جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے کہ انھوں نے کون سی چیز جان لی ہے۔

ایسی سوسائٹی جو پرانی غلامی سے آزاد ہو کر نئی غلامیوں پر اپنے آپ کو استوار کر رہی ہے۔ جو اعلیٰ اقدار کی توڑ پھوڑ کرنے کے باوجود اعلیٰ اقدار کی مدعی بنی پھرتی ہے۔ سائنس کو قاتل کہنے کے باوجود اپنے آپ کو سرا بھار کر مقتل کی طرف لے جا رہی ہے۔ سماجی، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، ادبی تک کی ناہمواریوں کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے طنز و تبسم کے کون سے نشتروں سے طنز نگار احساس ناہمواری دلوائے۔ یہ ایک بہت مشکل وقت آن پڑا ہے۔ اہلِ ظرف قسم کے طنز نگاروں کے لئے۔ جنھیں بیک وقت تضاد و نشاط پر وار کرنے ہیں۔ بگڑا ہوا تضاد اور بگڑا ہوا نشاط کہ دورِ حاضر کی ناہمواری کہیں جسے۔ اور ناہمواری بھی تہذیب کی۔ جسے مضحکہ خیزیوں سے محفوظ کرنے کے لئے طنز نگار کو مثبت رول ادا کرنا ہے۔

نام نہیں لوں گا ان طنز و مزاح نگاروں کا۔ جو اس قافلے میں شریک ہیں کہ وہ برا مان جائیں گے۔ کیوں کہ وہ بھی اسی سماج کا حصہ ہیں جو بے حد سنجیدہ ہے، ہنسنے اور چوٹ سہنے کا یارا نہیں رکھتی لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ برادران! قلم اٹھانے سے پہلے سماجی ہمواری اور ناہمواری کا تواریخی شعور اپنے اندر ضرور کھوجئے، ورنہ یہ طنز کا میدانِ رزم ہے اور اس میں بہت سخت مقام آتے ہیں۔

ایک اور بحث جو ہمیشہ لاحاصل رہی ہے اور کنفیوژن ہی پیدا کرتی رہی ہے کہ طنز کیا چیز ہے اور مزاح کیا ہے۔ چند لطیفوں اور فقرے بازیوں کے اجتماع کو مزاحیہ یا طنزیہ مضمون قرار دینا، اشاعت کے لئے ممکن ہے موزوں سمجھا جائے۔ مگر طنز و مزاح کے آرٹ کے لئے موزوں سمجھنا، اپنی مضحکہ خیزی کا اعتراف کرنا ہے۔ کسی واقعہ کو طنز نگار اپنا ہی ایک الگ زاویۂ نگاہ دے سکتا ہے تو دے، ورنہ قلم رکھ دے۔ اور لطیفے پر داد کی تالیاں وصول کر کے سکھ کی نیند سو جائے کہ ایسی تالیاں ہی کامپوز کی گولیوں کا اثر رکھتی ہیں۔

کچھ معزز حضرات مزاح کو، خوشحال سماج کو چند قہقہوں سے مزید خوشحال بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ایسی خوشحالی جس میں کسی کو ہلکا سا گزند بھی نہ پہنچے۔ مجھے اس ذریعے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن پہلے خوشحال سماج کے خواب کی تعبیر تو لاؤ۔ اگر ایک کروڑ انسانوں میں فقط دو انسان خوشحالی کے مرتبے تک پہنچ چکے ہوں تو خدارا! یہ نسبت لگا کر پورے سماج کو تو گزند نہ پہنچاؤ اور مزاح کے لطیفے میں مرغ مسلم کھا کر یہ تو مت کہو کہ گلا سڑا کیلا کھانے والے بھی ہنس رہے ہیں۔ لہٰذا خوشحال ہیں۔

میری بات چھوڑ دیں تو صرف طنز کو ہی تیکھا آرٹ سمجھتا ہوں کہ یہی اور صرف یہی سماجی شعور کے ساتھ سماجی ناہمواریوں کو ہموار کرنے والا آلہ ہے۔ البتہ اگر تیکھا پن کہیں کچھ زیادہ تیکھا اور ضرب آلود نہ بننے پائے۔ اس کو باتبسم حملہ ضرور بنانا چاہئے۔ اور مزاح کو ہر تیکھے پن میں خوشگوار رنگ کی صورت شامل کر لیا جائے، تاکہ ہمارا سماج جو بیحد سنجیدہ ہے گالی سن کر یہ کہنے پر مجبور کر دیا جائے، کہ اس طنز نگار نے مجھے گالی تو دی مگر اس خوبصورت ہنر سے کہ گالی سن کر خود مجھے بھی لطف آ گیا۔

— فکر تونسوی

سخی حسن صدیقی

مجتبیٰ حسین مختصر حالات

مجتبیٰ حسین ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو ریاست کرناٹک کے ضلع گل برگہ کی تحصیل چنچولی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب مولوی احمد حسین مرحوم گلبرگہ کے تحصیلدار تھے اور ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ مجتبیٰ حسین کو ادب سے یہ لگاؤ ورثے میں ملا ہے۔ ان کے دو بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد اور جناب ابراہیم جلیس مرحوم اردو کی دنیا میں ممتاز حیثیتوں کے حامل ہیں۔ محبوب حسین جگر نے افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا لیکن ان کی ساری دلچسپی اردو صحافت سے وابستہ ہوگئی ہے۔ وہ حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کرشن چندر کے مشہور رپورتاژ "پودے" کے ہیرو یہی محبوب حسین جگر ہیں۔ ابراہیم جلیس مرحوم نے برصغیر ہند و پاک کے صفِ اول کے افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اخبار "مساوات" کے ایڈیٹر تھے۔

مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ۱۹۵۵ء میں گریجویشن کی تکمیل کی۔ بعد ازاں وہ حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" سے بحیثیت "سب ایڈیٹر" وابستہ ہو گئے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد جب روزنامہ "سیاست" حیدرآباد نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" کے لئے ایک نئے کالم نگار کی تلاش شروع کی تو قرعۂ فال مجتبیٰ حسین کے نام نکلا اور یہی مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی وجہ تسمیہ بھی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے مزاح نگاری شروع کی اور "کوہ پیما" کا فرضی نام اختیار کر لیا۔ اس نام سے وہ یہ کالم سترہ برس تک لکھتے رہے۔

کالم نگاری سے قطع نظر انھوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم

نہیں" ۱۹۶۴ء میں اپنے اصلی نام کے ساتھ لکھا۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے اردو کے مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد کی جس کے وہ جنرل سکریٹری رہے۔ اس کانفرنس کی صدارت کرشن چندر نے کی اور افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا۔ مجتبیٰ حسین سات برس تک "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے جنرل سکریٹری رہے اور وہ اس انجمن کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا جو کامیاب تجربہ کیا تھا، ہندوستان بھر میں اس کی پذیرائی ہوئی اور اس کی تقلید میں نہ صرف ہندوستان کے دیگر شہروں میں طنز و مزاح کی محفلیں منعقد ہونے لگیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی طنز و مزاح کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات وتعلقاتِ عامہ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومتِ ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کی خاطر "گجرال کمیٹی" تشکیل دی تو نومبر ۱۹۷۲ء میں مجتبیٰ حسین اس کمیٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے لئے حیدرآباد سے دہلی آگئے۔ ستمبر ۱۹۷۴ء سے وہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہیں اور ان دنوں کونسل کے پبلیکیشنز ڈپارٹمنٹ میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں وہ یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی دعوت پر جاپان گئے جہاں ان کا جاپان کے اردو حلقوں میں گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء ہی میں اڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم "سرس ساہتیہ سمیتی" نے ہندوستانی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لئے مجتبیٰ حسین کی خدمات کے اعتراف کے طور پر "ہاسیہ رتن" کا اعزاز دیا اور اس موقع پر اڑیا زبان میں ان کے مزاحیہ مضامین کے ایک مجموعہ کی بھی رسم اجرا انجام دی گئی جس کو اڑیا زبان کے مشہور مزاح نگار جناب فتورانند نے ترجمہ کیا تھا۔ مجتبیٰ حسین کی تخلیقات ہندوستان کی تقریباً ساری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ انھوں نے خود بھی کئی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور اس کے علاوہ بعض کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف

ا۔ تکلف برطرف	پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۶۹ء، ناشر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد
	دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۷۴ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
۲۔ قطع کلام	پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۶۹ء، ناشر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد

دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۴ء، ناشر حسامی بکڈپو، حیدرآباد

۳۔ قصہ مختصر — پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۷۲ء، ناشر نیشنل بکڈپو، حیدرآباد

دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۴ء، ناشر حسامی بکڈپو، حیدرآباد

۴۔ بہرحال — سال اشاعت ۱۹۷۴ء، ناشر نیشنل بکڈپو، حیدرآباد

۵۔ آدمی نامہ — سال اشاعت ۱۹۸۱ء، ناشر حسامی بکڈپو حیدرآباد

۶۔ بالآخر — سال اشاعت ۱۹۸۲ء، ناشر حسامی بکڈپو، حیدرآباد

۷۔ جاپان چلو جاپان چلو — سال اشاعت ۱۹۸۳ء، ناشر حسامی بکڈپو، حیدرآباد

زیرِ طبع

۱۔ مزید آدمی نامہ (خاکے)

۲۔ الغرض (مزاحیہ مضامین)

۳۔ مجتبیٰ حسین کے کالم ۔ مرتبہ: انیس احمد خاں

۴۔ مجتبیٰ حسین کا طنز و مزاح ۔ مرتبہ حسن صدیقی ◻

شمس الرحمٰن فاروقی

مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح نگاری

مزاح نگار کو ہمارے یہاں عام طور پر درجۂ دوم کا فن کار اور مزاح نگاری کو درجۂ دوم کی چیز سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری زبان یا ہمارے ملک میں مزاح کی صلاحیت نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے بولنے والوں میں مزاح کی صلاحیت عام جدید ہندوستانی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان جن عناصر سے مرکب ہے، یعنی سنسکرت اور فارسی، دونوں میں اعلیٰ مزاح کی روایت بہت قدیم اور بہت وسیع رہی ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی طرح سنسکرت، فارسی اور پھر اردو میں بڑے ادیبوں نے مزاح کو نام نہاد سنجیدگی سے الگ کوئی چیز نہیں سمجھا۔ موجودہ زمانے میں بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں صرف ہلکی پھلکی تحریریں ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی گہرائی یا وزن نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اس درجہ نہیں جس درجہ کسی سنجیدہ تحریر میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کے بعض غلط نتائج نکلے، کیوں کہ زیادہ تر لوگ انگریزی یا مغربی ادب سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ان کا مبلغ علم سنی سنائی باتوں یا ادھر ادھر کی باتوں تک محدود تھا۔ پھر انگریزی تنقید کے بعض اہم نمائندوں کی ایک آدھ تحریر پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا گیا۔ مثلاً آرنلڈ نے سو برس پہلے لکھا کہ ڈرائڈن اور پوپ انگریزی شاعری کے نہیں بلکہ انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ پھر کیا تھا، لوگ فوراً ایمان لے آئے کہ جب آرنلڈ جیسا نقاد ڈرائڈن اور پوپ جیسے بڑے طنز و مزاح نگار شعرا کو شاعروں کی فہرست سے ہی خارج کر رہا ہے تو اردو کے چھٹ بھیوں کی کیا اوقات ہے؟ لوگ یہ بھول گئے کہ آرنلڈ کا قول غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لوگ یہ بھی بھول گئے کہ آرنلڈ کی اس رائے کو اس کے زمانے میں بھی بہت سے لوگوں نے قبول نہیں کیا اور اس کے پچیس ہی تیس برس بعد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ان شاعروں کی تعریف کی بلکہ بڑی شاعری کی ایک صفت یہ بھی بتائی کہ اس کو پڑھ کر پوری طرح نہیں کھلتا کہ شاعر سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے یا سنجیدہ بھی ہے یا مذاق بھی کر رہا ہے۔ غالب اور میر کے یہاں یہ صفت

واضح ہے، لیکن ہم لوگوں نے ان کے یہاں بھی ایسے شعروں کو نظر انداز کر دیا بلکہ اکثر ان پر شرمندہ بھی
ہوئے کہ صاحب یہ پرانے زمانے کے نیم مہذب لوگ تھے، ان کی عمر کا لحاظ کر کے انھیں معاف کر دیجئے۔
لیکن سارا قصور انگریزی تعلیم کا نہیں ہے کیوں کہ اسی انگریزی تعلیم کے دور دورے کے زمانے میں
ہمارے یہاں اکبر الہ آبادی جیسا عظیم طنز و مزاح نگار پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال تک نے ظریفانہ
شعر کہے اور ان لوگوں کے فوراً بعد ہمارے یہاں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ہمارے ادب
کو مالا مال کیا۔ اسی زمانے میں ظریف لکھنوی بھی تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ ظریفانہ ادب اور ادیب
کی تقلیل قدر یعنی DEVALUATION کی کچھ ذمہ داری ہمارے ظریفانہ ادیبوں پر بھی ہے، جنھوں نے
بھونڈے پن کو ظرافت اور کھردرے جھنجھلائے ہوئے انداز بیان کو طنز نگاری سمجھا۔ طنزیہ مزاحیہ
ادیب کی پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو دنیا والوں اور رسم و رواج سے بندھی ہوئی ان کی ذہنیت سے
برتر اور الگ سمجھتا ہے یعنی طنز و مزاح قائم اسی وقت ہوتے ہیں جب ہم طنز نگار یا مزاح نگار کی ذہنی
برتری یا اخلاقی برتری کو قبول کریں۔ طنز و مزاح نگار اگر دنیا اور اہلِ دنیا کو حقیر یا بے وقوف یا ناسمجھ
نہ سمجھے تو اس کی تحریر کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ لیکن ذہنی اور اخلاقی برتری کا یہ رویہ لطیفہ بازی،
جملہ بازی، دانت پیس پیس کر کوسنے، گلا پھاڑ کر چلانے سے نہیں قائم ہوتا۔ ہمارے زمانے کے ظریفانہ
ادیبوں نے خود کو مسخرا یا جھگڑالو بنا کر پیش کرنا پسند کیا۔ ذہنی اور اخلاقی برتری نصیب نہیں تھی،
ان میں سے اکثر میں وہ MALICE یا کینہ توزی بھی نہ تھی جس نے سودا سے شاہ ولی اللہ جیسے
محترم اور مقدس اور مفکر بزرگ اور مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے مرنجاں مرنج اور فرشتہ صفت صوفی
کی ہجویں لکھوائیں۔ لہٰذا انھوں نے خود کو بھانڈ یا محفل کی وقت گزاری کو آسان کرنے والے لطیفہ گو
یا فقرہ باز یا بات بات پر گالیاں سنانے والے سٹھیائے ہوئے بڈھے کے روپ میں پیش کرنے میں
عافیت سمجھی۔ ہمارے زمانے کے اکثر طنز و مزاح نگار اپنے لئے "میں" کے بجائے "ہم" کا استعمال
کرتے ہیں، کیوں کہ "ہم" میں ایک طرح کی گم نامیت ANONYMITY، ایک طرح کی مسکینی اور عاجزی
ہے۔ یہ وہ "ہم" نہیں ہے جو غزل کا شاعر استعمال کرتا ہے، بلکہ یہ وہ "ہم" ہے جسے لوگ عام بول چال
میں گھریلو انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر طنزیہ مزاحیہ مضامین میں "ہم" ایک سادہ لوح
شخص کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ سادہ لوح شخص بیوی سے ڈرتا ہے، دوست اس کی شرافت
اور سیدھے پن کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دفتر میں یا کاروبار میں اسے ترقی نہیں ملتی۔ اس کی خوبی صرف
یہ ہے کہ وہ موقع بے موقع بھونڈے یا سپاٹ لطیفوں سے اپنی باتوں کو قابل برداشت بناتا ہے۔ مثلاً

مظہر جانِ جاناں اور میر کے بارے میں سودا کے اشعار، خواجہ سرا کی ہجو میں میر کے اشعار، ظہور اللہ نوا کی ہجو میں جرأت کا مخمس، انگریزی تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں اکبر کی نظمیں پڑھ کر جس شخصیت کے خدوخال سامنے آتے ہیں اس کو آپ ناپسندیدہ کہہ سکتے ہیں، اس سے دوستی کرنا آپ شاید پسند نہ کریں، لیکن آپ اسے گھر گھسنا، نکھٹو، زن مرید، دوستوں اور ساتھیوں کے فقروں کا ہدف نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی آپ اسے کٹ کھنا، چڑچڑے بوڑھے کی طرح بڑبڑاتا ہوا کوئی مجہول الحال لفظوں کا بھاڑ جھونکنے والا کہہ سکتے ہیں۔ آج کل ہمارے زیادہ تر مزاح و طنز نگار جس شخصیت اور ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انھیں دو خانوں میں سے ایک میں فٹ ہو سکتی ہے۔

مزاح میں گہرائی طنز کے بغیر نہیں آسکتی اور طنز کی پہلی شرط غصہ نہیں بلکہ فکر ہے۔ یہ سمجھنا کہ طنز نگار کا میلان مفکرانہ نہیں ہوتا طنز نگاری اور کالم نگاری کو خلط ملط کرنا ہے۔ مفکرانہ میلان سے میری مراد یہ نہیں کہ طنز نگار کسی فلسفے کی تلقین کرتا ہے یا وہ افلاطون اور ارسطو کی کتابیں پڑھ کر ان کے خیالات کو بیان کرتا ہے۔ مفکرانہ میلان سے مراد یہ ہے کہ طنز نگار خود کو دنیا اور اہل دنیا کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے اوپر سمجھتا ہے لیکن وہ ان کمزوریوں اور مجبوریوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود بھی ان برائیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس میں کھلنڈرا پن نہیں ہوتا لیکن ایک طرح کی IRREVERENCE اس میں ضرور ہوتی ہے جیسا کہ S.J. PERELMAN نے کہا ہے، لوگوں کے کولھوں میں کبھی کبھی سوئی چبھوتے رہنا چاہئے۔ لیکن یہ IRREVERENCE سرکس کے مسخرے والی حرکت نہیں ہوتی جو ہیرو ئن کو چپت لگا کر خود چاروں شانے چت گر جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کے اکثر ظریفانہ ادیبوں نے خود کو میر کے شیخ کا مصداق بنا لیا ہے

شہرہ رکھے ہے تیری خیریت جہاں میں شیخ — مجلس ہو یا کہ دخت اچھل کود ہر جگہ

بہت دن پہلے جب میں نے مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھی تھیں تو ان کی نثر کی چستی اور بھونڈے اچھل کود والے لطیفوں اور فقروں سے ان کے اجتناب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اعلیٰ مزاحیہ تحریروں کا گھر جو ایک عرصے سے اردو میں بند پڑا تھا آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ میں نے اس وقت بھی ان کا خیر مقدم کیا تھا جب وہ حیدر آباد کے ایک بالکل نو آمدہ لیکن چلبلے اور کسی طائر نو پر کی طرح نئی نئی اڑانیں بھرنے کے شائق مزاح نگار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے۔ پچھلے بیس برسوں میں میں نے بہت سے نئے ادیبوں سے توقعات وابستہ کیں، اور ان میں سے اکثر نے بعد میں

مایوس کیا۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ لوگوں کے شعلے بہت جلد بجھ جاتے ہیں یا شاید اب کے لوگ کاروبار ادب میں روحانی اور داخلی منفعت کے بجائے شہرت اور مالی منفعت زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ بات جو بھی ہو، میری کتابوں کی الماریاں ایسے مجموعوں سے بھری پڑی ہیں جن میں شامل تحریروں کے لکھنے والے آج یا تو خاموش ہیں یا پہلے سے بہت خراب لکھ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں مجھے یہ خوف کئی سال تک رہا کہ یہ چمک دمک یہ آن بان کہیں چار دن کی چاندنی نہ ہو۔ میں نے ان کی ہر تحریر کو اور بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتیں ہونے لگیں تو خود ان کو اسی غور اور شوق اور تشویش سے دیکھا جس غور اور شوق اور تشویش سے کوئی ماہر نباتات کسی ایسے پودے کو دیکھتا ہو جس کا دنیا میں صرف ایک نمونہ ہو اور جس پر اس پودے کی تمام نسل کے قیام و استقلال کا دارومدار ہو۔ وہ جس طرح ہر ہر پتی، ڈال کی ہر نوک اور پھننگی کو توجہ سے دیکھتا ہے کہ کہیں مرجھا تو نہیں رہی ہے، کمزور تو نہیں پڑ رہی ہے، اسی طرح مجتبیٰ حسین اور ان کی تحریروں کو دیکھتا تھا کیوں کہ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسا طرحدار مزاح نگار دس پانچ برس کے بعد بھی ترقی کرتا رہے گا کیا معلوم ہمارے بزرگ مزاح و طنز نگاروں کا بھونڈا پن، ان کا مسخرا پن، ان کی تلملاتی ہوئی جھنجھلاہٹ اس پر کب اثرانداز ہو جائے لیکن مجتبیٰ حسین نے میں ہی کیا مجھ سے بہتر لوگوں کو بھی حیرت میں مبتلا رکھا۔ اور اب جب کہ ہم ان کے سفرنامہ جاپان کا خیر مقدم کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تو اس اطمینان اور یقین کے ساتھ کہ ابھی اس کنوئیں میں کئی ڈول پانی ہے۔

معاصر ظریفانہ ادیبوں میں دو ہی چار ایسے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کی ادبی حیثیت کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں مجتبیٰ حسین کا نام بہت نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، ظاہر ہے اس گروہ کے سردار ہیں۔ کوئی اور اصطلاح میسر نہ ہونے پر میں ان لوگوں کو ادبی مزاح و طنز نگار کہتا ہوں اس وجہ سے نہیں کہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی اردو کے ادب عالیہ کی روایت اور اس کے کارناموں سے گہری واقفیت کا اظہار ہوا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے طنز و مزاح کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سوداؔ اور میرؔ سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے مجتبیٰ حسین ابھی "ہم" کے جال سے اور لطیفہ گوئی کے گورکھ دھندے سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ شاید وہ وقت نزدیک ہی ہے جب وہ ان بیساکھیوں کو بالکل ترک کر دیں گے لیکن جو چیز ان کی سب سے بڑی قوت ہے وہ یہ کہ انھیں زبان کو مزاحیہ طریقے سے برتنے کا سلیقہ آتا ہے جیمس تھربر JAMES THURBER نے NEW YORKER کے ایڈیٹر ہیرالڈ راس HAROLD ROSS کے بارے میں لکھا

ہے کہ وہ جس مزاح نگار کو کم تر درجے کا قرار دیتا تھا اس کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ HE IS NOT FUNNY. HE DOES NOT KNOW ENGLISH یعنی اس کی ظرافت مزے دار نہیں ہے اس کو زبان نہیں آتی۔ تھربر کہتا ہے کہ جب راس سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی اور تھربر نے اس کو اپنی لیاقتوں کی فہرست بتائی تو راس نے پوچھا: "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم کو انگریزی آتی ہے کہ نہیں؟" تھربر نے جواب دیا کہ "کیوں نہیں آتی؟" تو راس نے کہا "خدا غارت کرے، انگریزی کسی کو نہیں آتی۔" اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مزاح نگار کو زبان کی قوت کا اندازہ ہونا کس قدر ضروری ہے۔ ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو بہا شا سب نکال لیتے ہیں لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد، تناسب، توازن کے ذریعے ہنسی والی بات بن جائے ہر ایک کا کام نہیں۔ مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں: "ہمارے معاشرے کی خرابی یہ ہے کہ جب بھی زمین پر کوئی آفت آتی ہے تو آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔" "کپڑے بنانے والی کمپنیاں ہمیشہ اپنے کیلنڈروں پر ایسی حسیناؤں کی قد آدم تصویر چھاپتی ہیں جن کے بدن پر گھڑی اور انگوٹھی کے سوائے کوئی لباس نہیں ہوتا۔" مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔" "کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔" ان جملوں میں وہ باریکیاں ہیں جو تخلیقی زبان میں ہوتی ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ مجتبیٰ حسین کو غیر متوقع CONNECTIONS ملانا خوب آتا ہے۔ یہ صفت بھی زبان کے خلاقانہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے: "قدرت اللہ مجھ سے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ درست بھی تھا کیوں کہ ایک بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں سوکھی روٹی کا ٹکڑا چٹنی کی مدد سے کھاتے اور بعد میں پانی پیتے دیکھا تھا۔" ایک زمانے میں انگریزی تعلیم کے زیر اثر لوگوں کا خیال تھا کہ INCONGRUITY مزاح کا جوہر ہے۔ بات صحیح ہے لیکن INCONGRUITY کا مطلب بے تکا پن نہیں، بلکہ غیر متوقع چیزوں کو یک جا کرنا ہے۔ مجتبیٰ حسین اس کے ذریعے طنز کا بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی کو دیکھ کر بعض لوگ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ معاصر دنیا سے خاصے ناراض بھی ہیں اور ان کا مزاح ان کے طنز سے الگ نہیں ہے۔ "جاپان چلو جاپان چلو" میں ان کی ناراضگی ذرا کم جھلکتی ہے۔ ویسے یہ ٹھیک بھی ہے، کیوں کہ میں انھیں سفر نامہ نگار یا نامہ نگار نہیں سمجھتا بلکہ میں انھیں پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ □

عتیق حنفی

جاپان چلو جاپان چلو

ایسا نہیں ہے کہ ستمبر ۱۹۸۰ کے پہلے جاپان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اردو والے جاپان کو جاننے کے لئے مجتبیٰ حسین کے منتظر رہے ہوں کہ کب وہ جاپان کا سفر اختیار کریں اور لوٹ کر سفرنامہ لکھیں اور جاپان اردو والوں کے فرضی افق پر طلوع ہو۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے سفرنامے سے بہت بہت پہلے اردو کے مفکر اور سنجیدہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنے ایک مزاحیہ شعر میں جاپان کا ذکر کیا تھا۔

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

طلوع آفتاب کا ملک جاپان، مکاڈو، ہیروہیتو کا اور دوسری عالمی جنگ کا مارشل ٹوجو کا دیس جاپان، ٹین، سیلولائڈ اور چابی کے کھلونوں اور پیاری پیاری گڑیوں کا بنانے والا جاپان؛ ایٹم بم کی صورت میں سامراج اور سرمایہ داری کے جنون کا عذاب جھیلنے والا جاپان اور مشرق کی ہمت، حوصلے اور زندہ دلی کی مثال قائم کرنے والا اور فینکس کی طرح اپنی خاکستر سے پھر اٹھ آنے والا جاپان اردو والوں کی معلومات اور واقفیت کے دائرے سے باہر نہ تھا۔ اردو والوں کو بھی کتابوں، رسالوں، فلموں، اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے جاپان کی تقریب چائے نوشی کی سن گن تھی؛ امراؤ جان ادا کو مات کرنے والی گیشاؤں کی مبالغہ آمیز امیج ان کے ذہن میں بھی رقصاں تھی؛ ہائیکو کے تین مصرعوں کا جادو ان کے سر چڑھ کر بھی بول چکا تھا؛ دھیان کا زین بن کر بدھ مت کے ایک فرقے کا نام بن جانے کا چرچہ انھوں نے بھی سن رکھا تھا؛ نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے کابکی تھیٹر کے تجربات کئے تھے جنھیں چاہے دیکھا نہ ہو ان کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ پڑھ رکھا تھا۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے علامہ اقبال کے اندیشۂ کفن کے بجائے بہت ہی ولآ ویز بکھوتو پیش کیا ہے۔ ان کا جو حق ہے ہم اسے مارنا نہیں چاہتے۔

ابن انشاء نے اپنی سیر پرستی کی رو میں اپنے سفرنامۂ چین کا عنوان "چلتے ہو تو چین کو چلئے" رکھا تھا۔ ٹوکیو کے سفر کا تفصیلی ذکر بیگم اختر ریاض نے ایک مضمون کی صورت میں کیا تھا۔ بہر حال

مجتبیٰ حسین کو سفر جاپان سے گدگدیاں، چائے کی چسکیاں اور اٹھ کھیلیاں بٹور کر لانے اور ہمیں بھی ان لذتوں اور ذائقوں میں شریک کرنے کے لئے داد تو دینی ہی پڑے گی۔ اردو کے حوالے سے جاپان کی دریافت کرنے اور جاپان اور جاپانیوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنائے بغیر اور بنا ان کی تضحیک و تمسخر کئے ہنسانے کے لئے ہمیں ان کا شکر گزار ہونا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے۔

آج کل سیاسی طنز کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کا چلن ہے اور کیوں نہ ہو کہ سیاست یا تو رلاتی ہے یا ہنساتی ہے۔ مجتبیٰ حسین سیاست کی بیساکھی کے بغیر کامیابی اور کامرانی کے ساتھ ہنساتے ہیں اور ہنسی کے دھاروں سے بجلی کی ایک رو پیدا ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی دماغ میں پہنچتی ہے جہاں کئی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے مزاح کا سفر تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، بالآخر اور آدمی نامہ سے جاپان چلو جاپان چلو تک پھیلا ہوا ہے۔ کوئی شے ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی خبر ہو، کوئی شخص ہو یا کوئی ملک ہو انھیں ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کر ہی دیتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور کڑوے سے کڑوے نکتوں میں انھیں ایسے شوشے نظر آجاتے ہیں جن میں خوش مزاجی اور زندہ دلی بھری ہوئی مل جاتی ہے اور وہ چٹکی بجاتے ہیں تو گدگدیاں اڑنے لگتی ہیں۔ تلخ سے تلخ حقیقت بھی مزاح کی شکر کے خول میں لپٹ کر اندر اتر جاتی ہے اور کام و دہن بھی تلخ نہیں ہوتے مرمن کی الماری ہو، ہائیہ رتن کا خطاب پانے کی تقریب ہو، عمیق حنفی ہو یا ملک جاپان ہو، مجتبیٰ حسین کو جعفر زٹلی، ملا دو پیازہ اور دادا لال بجھکڑ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے عمیق حنفی کا خاکہ اڑاتے ہوئے اپنے مطمح نظر کو اس طرح واضح کیا تھا: "رفتہ رفتہ مجھے ان سے مل کر خوشی ہونے لگی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں بھی آج کی دنیا میں خوشی کے معاملے میں آدمی کو خود غرض ہونا چاہئے۔ دوسرے کی خوشی جائے بھاڑ میں، مجھے کیا لینا دینا۔"

مجتبیٰ حسین نے رواروی اور جذ کے بھاڑ میں ایک ایسی بات کہہ دی جو درست نہیں ہے انھیں اپنی خوشی کے علاوہ دوسروں کی خوشی سے بھی لینا دینا رہتا ہے کیوں کہ ہنسانا ان کا مذاق ہی نہیں ان کا پیشہ بھی ہے۔

جاپان حسین ملک تو ہے ہی بڑا عجیب و غریب ملک ہے۔ بہت پرانی اور جاندار تہذیب کا ملک۔ اس کی اپنی معاشرت ہے، اپنی قدریں ہیں، اپنی معاشیات ہے۔ اس کا اپنا صنعتی اور تجارتی نظام ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے اپنے آداب ہیں۔ مغربی لباس، مغربی سائنس اور ٹکنولوجی وغیرہ میں

منتہیٰ کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہر جاپانی وطن، قوم اور اس کی تہذیب پر نازاں ہے۔ جاپان کے رہنے والے بلا کے محنتی، نہایت ذہین اور بہت ہی کاروباری لوگ ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا قیام جاپان میں ۲۵ دنوں کا ہی رہا۔ پھر بھی ان کے حساس دل اور بیدار دماغ نے جاپان اور جاپانیوں کی خوبیوں اور ہنرمندیوں کو چھانٹ چھانٹ کر ابھارا اور مشاہدات اور تجربات کو اپنی زبان میں آتارا۔ اردو کی سباحت دکنی لہجے کی ملاحت اور اپنے مزاج کی ظرافت سے جاپان کو آشنا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

کرنل محمد خاں نے بجنگ آمد میں ایک فوجی کی زندگی کے تجربات اور اس کے اسفار کا بڑا ہی دلچسپ اور زندہ دلانہ خاکہ پیش کیا ہے۔ اپنی آپ بیتی ظریفانہ رنگ میں لکھی ہے۔ فوجیوں کے مخصوص مزاح کا نمونہ پیش کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے سفر اندلس کا ذکر پُر لطف انداز میں کیا ہے لیکن مزاح کے دائرے میں نہیں۔ ہر چند کہ شفیق الرحمٰن اردو کے صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین بھی اپنے پیچھے آنے والوں کے لئے اگلی صف میں جگہ بناتے بناتے، بھیڑ کے دھکے کھاتے کھاتے ہمارے مزاح نگاروں کی پہلی صف میں آ پہنچے ہیں۔ ان کا ایک اپنا اندازِ نظر ہے اپنا طرز ہے۔ انھوں نے چٹکیاں لے لے کر، گدگدی کر کر کے اور شگوفے چھوڑ چھوڑ کر اپنی انفرادیت بنا لی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی قربت ہمیں اس انفرادیت کا احساس نہ ہونے دے معلوم نہیں اپنے حیدرآبادی لہجے اور تلفظ کو انگریزی الفاظ پر انھوں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے جان بوجھ کر آزمایا ہے یا عادتاً۔ مثلاً BAG ان کے یہاں بیاگ ہے اور CALCULATOR ان کے لئے کیا لکیولیٹر۔

جاپان کے لئے رخت سفر باندھنے سے پہلے جاپان کے بارے میں اپنی قیمتی معلومات سے اپنے افسر بالا کو مجتبیٰ حسین نے یوں مطلع کیا تھا:

سنا ہے جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کب کدھر کو نکل جائیں۔ یوں بھی براعظم ایشیا ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ہمیں غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایسے براعظم میں جاپان کا کیا کام؟ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے پچھواڑے میں واقع ہے۔ ہمیں ہر دم بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔ جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنے جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا۔

بہترین طنز وہ ہے جس کا ہدف طنز کرنے والا خود ہو۔ بہترین مزاح وہ ہے جس میں مزاح گو یا مزاح نگار اپنا مذاق آپ اڑائے۔

مجتبیٰ نہایت ہلکے پھلکے ذہن سے اپنے وطن، اپنی سرزمین، اس کے لوگوں اور اس کے مناظر فطرت سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہیں جو چند دنوں کے لئے ولایت کیا ہو آتے ہیں، اپنے چاند سورج سے بھی انھیں نفرت ہو جاتی ہے۔

ہم نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دس دن کے لئے ہی سہی باہر کے کسی ملک میں جا کر آ جاتے ہیں تو زندگی بھر اس ملک کے قصے اور وہ بھی من گھڑت قصے سنا کر اپنا اور اہل وطن کا وقت برباد کرتے ہیں.... خدانخواستہ جاپان کے دورے کے لئے ہمارا انتخاب ہو گیا تو اس ملک میں بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گے!

مجتبیٰ حسین ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک کوئی دیکھ نہیں پا رہا ہے۔ اور بے چارے مسافروں کو کیا خبر کہ ان کے درمیان کوئی ایسا بھی ہے جسے تہقے تہہ کرنے کی 'لت' پڑ گئی ہے۔ وہ ان کے عادات و اطوار، ہاؤ بھاؤ، حرکات و سکنات کو بھانپ رہا ہے۔ اگر کوئی غور کرتا تو مجتبیٰ حسین کو یا تو جاسوس سمجھ لیتا یا کسی بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ کا ایجنٹ۔ بہرحال مجتبیٰ کی آنکھیں اور ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے لئے دیئے رہنے والے، اپنی کھال میں مست، کم خود پرست انگریز ہم سفر کی چپی میں مزاحیہ گوشے ڈھونڈ ہی لئے:

قدرت کی کتاب کھل گئی تو ہم نے اپنی کتاب بند کر دی اور لگے کھڑکی سے باہر جھانکنے۔ مگر انگریز بدستور اپنی کتاب میں ڈوبا رہا۔ جی میں آئی کہ اس سے کہیں کہ میاں ایک نظر ادھر بھی ڈالو۔ کیا حسین منظر ہے۔ تمھارا ایک شاعر گزرا ہے، ورڈسورتھ، وہ اگر آج ہمارا ہمسفر ہوتا تو ہمیں کھڑکی سے ہٹا کر ہماری جگہ خود بیٹھ جاتا۔ انجینیرنگ کی کتاب ہرگز نہ پڑھتا۔ تم ورڈسورتھ کو بھول گئے مگر ہم نہیں بھولے۔

آخری فقرہ نہ صرف اس واقعے پر طنز ہے بلکہ اس کی بلاغت کا رشتہ ہماری غلامانہ ذہنیت سے ہے۔ مجتبیٰ حسین ایسے کئی پرتوں والے فقروں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

مزاح نگار غزل گو کی طرح صرف اجمال پر طائرانہ نگاہ ڈال کر خوش نہیں ہوتا تفصیلات اور جزئیات کا احاطہ اس کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مزاح ترتیب کی تبدیلی سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ کسی بات کے واقعات یا کرداروں کے منطقی رشتے بدل دیجئے یا سیدھی لکیر کو توڑ موڑ دیجئے۔ باتوں

کو اوپر نیچے ، تہ و بالا کر دیجئے ، لفظوں کے تعلق کو الٹ پلٹ دیجئے مزاح پیدا ہو جائے گا۔ دراصل کسی خلاف عادت بات یا تصویر پر یا تو ہنسی آتی ہے یا غصہ ۔ دونوں اضطراری اعمال ہیں ۔ دونوں فوری ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ہنسنے یا غصہ ہونے کے لئے کسی تیاری کی شرط نہیں ۔

جاپانیوں کی زبان میں مہذب اور غیر مہذب کی تخصیص کا صیغہ ہماری عادت اور [illegible] مطابق نہیں ہے ۔ مہذب پانی اور غیر مہذب پانی میں تمیز کرنا ہمارے بس میں نہیں ۔ جاپانیوں کے آداب بھی ہمارے لئے خلاف عادت ہیں ۔ مثلاً مصافحے کے بجائے جھکتے چلے جانا ۔ جتنی بار شکریہ ادا کرنا ہو اتنی ہی بار رکوع کرتے رہیئے ۔ چائے پینا کوئی معمولی کام نہیں ہے ، ایک تہذیبی فریضہ ہے ، ایک باقاعدہ رسم ہے ۔ جاپانیوں کے آداب ، رسم و رواج ، تکلفات ، لطافت ، نزاکت اور ثقافت کے تصورات سے مجتبیٰ حسین نے بغیر ان کا مذاق اڑائے مزاحیہ انداز میں ہمیں روشناس کرایا ہے ۔ ان واقعات اور حالات کی سنجیدگی اور بردباری کو وہ خود جھیل گئے اور ان کے ہلکے پھلکے کو ہمارے سپرد کر دیا ۔ ایک اضطراری عمل کو منصوبہ بند صورت دے کر بھی ان کی انگلیوں سے گدگدی پیدا کرنے کا ان کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے ۔

مجتبیٰ حسین نے توازن کے علاوہ تقابل کے طریقے سے بھی مزاح پیدا کیا ہے ۔ کیسے کیسے تیر ان کے ترکش میں تھے ۔ شکار کرنے کی ادا کی دلکشی ایسی کہ

خونِ زخم آہواں رہبر کند صیاد را

مجتبیٰ کا انداز کچھ اتنا پیارا ہے کہ ان کا ہدف بھی آہ آہ کے بجائے واہ واہ کرتا ہے ۔

گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا

اب دیکھئے ایک جاپانی کسٹمس کلرک سے سابقہ پڑا ہے ۔ کسٹمس والا کسی بیدری ورک کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے ۔ آخر وہ کالی سی چیز کس دھات سے بنی ہوئی ہے ؟

ہم نے اپنا سینہ پھلا کر کہا " ایسی چیزیں بنانا تو ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا یہ ہمارا " ٹریڈ سیکریٹ " ہے ۔ اگر آپ کو بتا دیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی ۔ ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا ۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے یہاں کسٹم آفیسر ان کو تحفہ پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ بھی لیجئے ، وہ بولا جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے "

یہ بات بار بار جگہ جگہ متاثر کرتی ہے کہ مجتبیٰ حسین ایسے سینکڑوں مواقع ضائع کر دیتے ہیں جن سے زبردست قہقہے برآمد کئے جا سکتے تھے لیکن جاپان یا جاپانیوں کی قیمت پر۔ وہ اپنے موضوع کی عزت آبرو اور ناموس پر حرف نہیں آنے دیتے بلکہ طنزِ معکوس سے کام لے کر اپنے آپ کو ہدف اور سرچشمہ بناتے ہیں :

جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں خود اس کا حال سن لیجئے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت حاصل ہے۔ ٹیلی ویژن ہے۔ ٹیلی فون ہے، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے۔ پھر پورا کمرہ ایئرکنڈیشنڈ بھی ہے۔ اس میں لکھنے پڑھنے کے لئے ایک چھوٹی میز بھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کرسی بھی موجود ہے۔ بس تکلیف یہ ہے کہ جب ہم صبح اٹھ کر اپنے بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی ویژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اس انگڑائی میں ٹیلی فون اٹک جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے مزاج کی ہندوستانیت ان کی وہم پرستی کی شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجتبیٰ توہم پرست نہیں ہیں لیکن ڈرامہ پیدا کرنے کے لئے انھوں نے توہم پرست ہونے کا کردار اپنے لئے پسند کیا ہے۔

مسز آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ مسٹر حسین عجیب بات ہے کہ ابن انشا بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اردو میں مزاح نگاری کرنے کے لئے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے؟ ہم نے کہا۔ مسز آسانو! کہاں ابن انشا اور کہاں ہم۔ میں اور ان میں ایک قدرِ مشترک یہی ہے کہ ان کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ابن انشا اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے وہ گُر ہمیں نہیں آتا۔ مسز آسانو پھر یادوں میں کھو گئیں اور بولیں۔ شاید آپ کو پتہ نہیں۔ ابن انشا پہلے پہل ٹوکیو ہی میں بیمار ہوئے تھے۔ یہیں ان کا میڈیکل چیک اپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے کہ کبھی نہیں آئے۔ مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب بھی ہمارے سامنے سنگترے کا رس آیا تو اس میں کبھی نمک نہیں ملایا۔

ہندوستانی اور جاپانی مزاجوں اور کرداروں کے تقابل و توازن سے مجتبیٰ حسین نے بہت کام لیا ہے لیکن ہر جگہ ان کی نیت پر خلوص اور تعمیری رہی ہے۔ ایک جگہ قدیم عمارتوں پر اپنا نام لکھ یا کھود آنے والوں پر

بڑا بھرپور طنز ہے جو مزاح کی چاشنی سے بھرا ہوا ہے۔

ہم نے کہا۔ بی بی حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم چار مینار پر نہ جا سکے۔ اب آپ کی خاطر جائیں گے۔ مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔ اب ہم بھی اپنا نام جواباً اپنا نام آپ کے ٹوکیو ٹاور پر اردو رسم خط میں لکھ کر جائیں گے۔ بولیں۔ جاپان میں یہ آپ نہ کرسکیں گے کیوں کہ ہمارے ہاں تاریخی عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ آپ کے ہاں تو یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام اس لئے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔

جاپانی اپنی کاٹھی اور چہرے مہرے کی وجہ سے سدا بہار لگتے ہیں۔ ان کی عمر بری طرح چھپی رہتی ہے۔ لکھتے ہیں:

جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہم اپنی مترجم ساکو راد اکے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہوں گی۔ جب شناسائی بڑھی تو پہلے یہ پتہ چلا کہ موصوفہ دوسری جنگ عظیم میں ٹوکیو میں موجود تھیں۔ بعد میں ایک بار وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں تو دیکھا کہ گھر میں ان ہی کی عمر کی ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے موجود ہیں۔ جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لئے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔

مجتبیٰ حسین کو جاپان میں جاپانیوں سے زیادہ سابقہ پڑا اور انھیں ان کی عمر کے بارے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اسی لئے انھوں نے آنے والی نسلوں اور پس آوردگاں کے لئے نقوش قدم چھوڑ دیئے کہ وہ دھوکا نہ کھائیں۔

مجتبیٰ حسین نے جاپان میں اردو ہندی جاننے والوں کے حقیقت پسندانہ اور افادی نقطۂ نظر کو سراہا ہے۔ بظاہر جاپانیوں کا رویہ اردو اور ہندی کے لئے بہت فراخدلی اور وسیع المشربی کا لگتا ہے۔

مسٹر انا ہارا بولے۔ قبلہ۔ یہ ہندی اردو کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ ان دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی عربی کو سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں

پر ہاتھ صاف کر لیتے ہیں ۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے ۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے ۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اردو بھی جانتا ہے اور جو اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے ۔

مجتبیٰ حسین کی شوخیٔ مزاج نے جاپان کی YEN-CURRENCY کی قدر و قیمت کا اندازہ جس طرح پیش کیا ہے وہ بھی انھیں کا حق ہے ۔ پھر اپنے آپ کو ہدف بنایا ہے ۔

غرض لکھ پتی بننے کی خوشی میں پہلی ہی رات کو ہم نے ایک دوست کو کھانے پر بلایا ۔ ہم نے ایک جاپانی ریستوراں میں ذرا جم کے کھانا کھایا ۔ جم کے کھانے سے مراد یہ ہے کہ مرغ کا گوشت منگوایا اور ساتھ میں مچھلیاں بھی منگوائیں سنگترے کا رس تو ہر کوئی منگواتا ہی ہے ۔ بل آیا تو پتہ چلا کہ ہم پانچ ہزار YEN کی بھاری رقم سے محروم ہو گئے ہیں ۔ بھتہ چونکہ پندرہ دنوں کا تھا اس لیے ہم نے مستقبل کے سارے ناشتوں ، لنچوں اور ڈنروں کا متوقع حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ اگر اسی رفتار سے ہم ٹوکیو میں کھانا کھاتے رہے تو جملہ ۲۵ دنوں کے قیام میں ہمیں آخری سات دن بھوکوں مرنا پڑے گا ۔

جاپان کی بلیٹ ٹرین میں سفر کرنے سے بھی مجتبیٰ باز نہ آئے ۔ اس سفر کے دوران میں وہ خاص طور سے عالم محو ہی میں رہے ہیں ۔ اس سفر کے تجربے کے جبر کا اندازہ لگائیے جس نے مزاح نگار کو فلسفی بنا دیا ۔

انسان جب از سر نو جینے کا اہتمام کرتا ہے تو بربادیوں کے نشان خود بخود مٹ جاتے ہیں ۔

ایسے جملے پڑھ کر مزاح نگار کی امیج بدلنے لگتی ہے ۔ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی انگلیاں گدگدانے کے بجائے سر کھجانے لگیں اور کسی جوگی نے بھبھوت ملے ہوئے چہرے پر دو آنکھیں جھٹکے کے ساتھ کھولیں اور دھیان کے سمندر سے سیپیاں نکال کر شیر یا ہرن کی کھال پر سجادیں ۔ جاپان میں مجتبیٰ حسین ہندوستان کے خیال سے غافل نہ ہوئے ۔ بلٹ ٹرین کے سفر کے اختتام پر مسٹر تاجما سے ان کا مکالمہ سنئے ۔

مسٹر تاجما ۔ آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں ۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں ۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکے نہ لگیں ۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر

نہیں گر ا کسی مسافر نے نشست کے لئے دوسرے مسافر سے لڑائی نہ لڑی اور پھر وہ اسٹیشن پر جائے لوجائے" "پان بیڑی سگریٹ" والی مانوس آوازیں سنائی نہیں دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔ تاجما نے شرم کے مارے نظریں نیچی کرلیں، بولے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں آپ سے بہت سیکھنا ہے۔ یوں بھی جاپان سے ہندوستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم۔ اور تاجما کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔

مجتبیٰ حسین نے باتوں باتوں میں بتایا کہ جاپانی ہنسی مذاق میں اور فقرہ بازی میں وقت ضائع نہیں کرتے وہ کام کرتے رہتے ہیں یا کتابیں پڑھتے رہتے ہیں یا ناٹک، فلم یا ٹی وی دیکھتے ہیں۔ مجتبیٰ نے کسی جاپانی مزاح نگار کا ذکر بھی نہیں کیا۔ جاپانیوں میں شئے لطیف یا حسِ مزاح ہوتی بھی ہے۔ اس کا اندازہ بھی مجتبیٰ حسین کی تحریر و تقریر سے نہیں ہوا۔

جاپان کی تقریب چائے نوشی سارے عالم میں مشہور ہے۔ اس تقریب کی تفصیل اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو وہ کہے گا کہ چائے پارٹی جیسی کوئی چیز ہوگی۔ TEA-CEREMONY جاپان کی ایک تہذیبی تقریب ہے، بڑی سنجیدہ، بڑی مقدس۔ مجتبیٰ بھی اس تقریب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے:

اس تقریب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اک دوسرے کی عزت کرنا سیکھیں۔ ایک خاتون نے چائے بنانے اور اسے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چائے پیش کرنے والی ایک خاص ادا سے آپ کے سامنے چائے کا پیالہ رکھتی ہے اور زمیں بوس ہوجاتی ہے۔ جس کو چائے پیش کی جارہی ہو اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مؤدبانہ بیٹھا رہے اور چائے پیش کرنے والی کے سامنے تعظیماً جھکتا رہے۔ چائے کی تقریب میں شرکت کرنے اور چائے پینے کے خاص آداب ہوتے ہیں جس سے ٹانگوں میں خاصا درد ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے جاپان کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھا۔ اپنے اس قیام سے نکالے ہوئے نتائج خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔

جاپان بڑا غریب اور مفلوک الحال ملک ہے۔ جاپانیوں کے پاس نہ وسائل ہیں نہ معدنیات کے ذخائر۔ کوئی خام مال ان کے پاس نہیں۔ زراعت بھی ایسی ہے کہ اپنا پیٹ بھرسکیں بیچارے کے غریب باشندے سارا خام مال دوسرے ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔ ان کا کمال صرف اتنا ہے کہ اس خام مال سے دنیا جہان کی چیزیں بناتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے پاس ایک ہی قابلِ قدر شے ہے اور وہ ہے ان کا کردار۔ ہم اکثر سوچتے

ہیں کہ یہ جرم جاپانی کمپنیوں، ٹرانزسٹروں، موٹروں، کیمروں اور ٹیلی وژن سیٹوں کو اپنے ملک میں قانونی اور غیر قانونی طور پر درآمد کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو یہ غلط بات ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح جاپانیوں کے کردار کو درآمد کریں۔

مجتبیٰ حسین کا طنز یہاں مزاح کی چاشنی میں تار پیدا نہیں کرتا ہمارے کردار کی خامیوں پر وار کرتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی شوخیٔ طبع، شرارت اور لطیفہ بازیوں نے تھائی لینڈ کی مندوبہ مس پرینیا کا برا حال کر رکھا تھا۔ وہ بھی اس قدر گھل مل گئی تھیں کہ سنجیدہ مذاکروں کے دوران میں بھی پرزوں پر فقرے بازی کرنے سے باز نہیں آتی تھیں اور ہمارا مزاح نگار بھی اپنی ظرافت کی انگلیوں سے گدگدائے بغیر چین نہیں پاتا تھا مس پرینیا نے بڑا اٹھلاتا ہوا اعتراف کیا ہے۔

YOU NAUGHTY MAN, YOU MAKE ME GO TO TOILET TO LAUGH AT YOUR FUNNY REMARKS.

ہم نہیں جانتے کہ مس پرینیا سے ہمارے مزاح نگار کا ربط ضبط کتنا تھا اور نہ یہ کہ ان کے بار بار TOILET میں جانے کا سبب ہنسی ضبط نہ کر پانا تھا یا اور کچھ۔ لیکن اتنا خوف ضرور ہوتا ہے کہ اگر کسی اردو کے محقق کے ہاتھ یہ سفر نامہ پڑ گیا تو وہ مزاح اور TOILET کے حصے کو ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔ بہرحال ہم مجتبیٰ حسین کی فقرے بازی اور مزاح نگاری سے محظوظ ہونے کے لئے TOILET کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مجتبیٰ حسین کے سفر نامے میں فن اردو اور انگریزی دونوں کے ہجوں میں موجود ہے۔ جاپان جیسے نستعلیق ملک کو نسخ میں تبدیل کر دینا اور اس کا سفر نامہ خط شکست میں لکھنا کوئی معمولی بات نہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بے نقط نہ ہو پائے۔ جاپان کو گافان بھی نہیں بنایا اور اس کی آن بان اور شان پر حرف بھی نہ آنے دیا۔

سفر نامہ پڑھ کر یہی دعا لب پر آتی ہے کہ اللہ ہم سب کو NCERT میں ایڈیٹر بنادے تاکہ ہم بھی جاپان سے لوٹ کر نعرہ لگا سکیں۔ جاپان چلو جاپان چلو۔ کسی غیر ملک کی دوست داری کا یہی تقاضہ تھا کہ اس کی تہذیب، اس کی قدریں اور اس کا کردار ترغیبی انداز سے سامنے آئے۔ کتاب کی اشاعت ہم سب کو مبارک۔ □

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

اشعار

(۱)

سطحِ دریا پہ چمک، تابِ گہر سے پیدا
نقش بے آب ہوا، آب گہر سے پیدا

رنگِ رخسار مرے خونِ جگر سے پیدا
مطلعِ نیم شبی، زلفِ کمر سے پیدا

گردِ وحشت ہے نظر خانۂ ہستی کی اساس
تیشۂ خندہ لبی، عرضِ ہنر سے پیدا

روشنی، تیرگی، ہستی سے عدم تک کا سفر
رنگِ ادراک ہوا رقصِ شرر سے پیدا

گرمیٔ شہرِ سخن، میری نوا کی تعبیر
سایۂ زلفِ دوتا، ان کے ہنر سے پیدا

(۲)

ترے خیال کے سائے نے شاداں رکھا
دیارِ ہجر میں کاٹیں مسافتیں ہم نے

مزاجِ یار کا ہر گوشہ سامنے آیا
حقیقتوں میں جو پائیں حکایتیں ہم نے

غضب کی نیند ازل سے وہ ساتھ لائی تھیں
سلائیں خاک میں جادو سی صورتیں ہم نے

صداقتوں کو علامت کا دے دیا پیکر
غزل کو کیسی عطا کی ہیں وسعتیں ہم نے

(۳)

(نذرِ مشفق خواجہ)

کاشانۂ عشرت کے چراغوں کی لویں تیز
مظلوم کی آنکھوں کا دھواں دیکھ کے چپ ہوں

میزانِ زر و سیم میں تول گئی نکہت
میں مرتبۂ لالہ رخاں دیکھ کے چپ ہوں

تخلیق کے منظر میں نہیں کوئی بھی چہرہ
میں سلسلۂ عکسِ رواں دیکھ کے چپ ہوں

صلاح الدین پرویز

کنفیشن

صلاح الدین،
تم جدیدت سے بنے بہت اتراتے پھرتے تھے
بن سوچے اور بن سفر کیے
اپنے گھروں میں بیٹھ کر بڑی بڑی جنتیں
اور بڑے بڑے ہوائی جہاز بناتے تھے
صلاح الدین،
کافی ہاؤس اور چائے کی دکان میں بیٹھ کر
وجودیت اور بین الاقوامیت کو سیڈیوس کرکے
تمہیں کیا ملتا تھا
صلاح الدین،
تم نے اپنے علم کی گونگی پوٹلی میں
کیوں وہ سارے شبد اکٹھے کر لیے تھے
جن سے تم ناواقف تھے لیکن معصوموں کو
تجرید کے جنگل میں ضرور پھانس لیتے تھے
صلاح الدین،
تم جدید منافق بستی کے کون سے نمبر کے آدمی ہو
تم گوجرانوالہ، اعظم گڈھ، سلطانپور، لکھنؤ اور احمدآباد میں قدیم تھے
ماسکو، کراچی، بمبئی، لاہور، دلی اور علی گڑھ میں ترقی پسند ہو گئے
اور جب کچھ سرور ملا

تو تم امریکہ، لندن، کینیڈا اور ایران جاکر جدید بن گئے
ایڈیٹروں نے تمھاری مغلظات کو صحیفوں کی طرح چھاپنا شروع کر دیا
لوگوں نے تمھیں مٹی دینی چاہی
اور تم نے اپنے آپ کو چتا کے سپرد کر دیا
صلاح الدین،
تم سے کس نے کہا تھا
اپنی جہالت کی زمین پر جدیدیت کا آسمان بننے کو
تم سے کس نے کہا تھا
استعارہ، علامت اور امیجنیشن کی کوکھ میں
جدید غزل، جدید نظم، جدید نثری نظم، جدید افسانہ اور نئی ناول کا
ناجائز بچہ جننے کو
صلاح الدین،
تم سے کس نے کہا تھا
اپنے پرکھوں کے کندھوں پر
اپنے بے سبق، ناسمجھ اور ناخلف شبدوں کا
لعاب دھرنے کو
تم سے کس نے کہا تھا
بینائی کھوتے ہوئے سارتر اور قلب بگڑتے ہوئے
ہیڈیگر کی باتیں کرنے کو اور محمد بھولنے کو
صلاح الدین،
دراصل تمھیں اپنی ماں سے شدید نفرت تھی
جس نے تمھیں جنم دیا تھا اور الف سے اللہ
اور میم سے محمد سکھایا تھا
لیکن تمھارے نقاد شاید تمھارے باپ تھے۔
جنھوں نے اردو میں اترے ہوئے غلط ترجموں سے

سارتر اور ہیڈیگر کا نام صحیح پڑھ لیا تھا
اور تم ان کے اصولوں کی ڈکشنری سے
نظم، افسانہ غزل اور ناول گھڑ لی تھی
صلاح الدین،
اب تمھارا سارا بھانڈا پھوٹ چکا ہے
اور تم بڑے بازار میں تنہا ڈگڈگی بجاتے ہوئے
پکڑ لیے گئے ہو
کوئی،
تمھارے سارے بندر چرا کر بھاگ گیا ہے
صلاح الدین،
تم نے کبھی اپنے سے نہیں کہا
تم نے کیوں نہیں کہا
اے مدھر چاپ سوگندھی
اے کامنی کدم
اے کھلے نینَ میں جادو کے بڑے بڑے دردتج والی
اے شیتل چھاؤں میں لسن پرے پرواہ
اے ترل ترل دیوانی
اے سگھن بھبی مستانی
اے نگن رات کی طرح کالے کالے دراز بالوں والی
کہاں گیا
کہاں گیا
کہاں گیا تیرا سارا جل
تیرے دھان دھان بھرے کھیت اور کھلیان
تیرے سارے نمازی کسان
ناریل کی جٹاؤں سے گونجتی ہوئی اذان

خواب کی بتیوں سے سجے چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان
کہاں گئے سب
کہاں گئے سب
کس لڑائی میں یہ سب کام آگئے
صلاح الدین،
تم پر کس بد ذات حکمراں کی حکومت تھی
صلاح الدین،
دراصل تم بھی ترقی پسند کرنے والوں کی طرح تھے
وہ سُرخ ہنسیا سے سورج طلوع کرتے تھے
اور تم زرد پاجامے میں سورج غروب کرتے تھے
تم اپنی ذات کے پاگل خانے میں
چھتیس سال تک اعتکاف میں ٹھنسے رہے
اور اپنی ہی سانسوں کے ابھرے ہوئے مصنوعی پہاڑوں کو
چوسنے کے افتخار میں مست بنے رہے
اور اپنی نقادوں کے نقلی پسینے کے
چھوٹی موٹی قطروں سے خراج وصول کرتے رہے
چھتیس آخرتیں!
چھتیس آخرتیں تم پر اتریں
اور شرما کر واپس لوٹ گئیں
صلاح الدین،
تمھیں بتانے میں اب کوئی پرہیز نہیں
کہ ساری جدیدیت اپنا سارا فراڈ ظاہر کر چکی ہے
ساری جدیدیت
چاہے وہ شاعری، ادب یا حکومت ہو
لغو، بے معنی اور بے ہودہ تاثر کی شکل میں ظاہر ہو چکی ہے

اس کا نگیٹو دھل چکا ہے
اور یہ پازیٹیو پرنٹنگ کے ٹیسٹ میں
امتیازی زوالوں کے ساتھ ناکامیاب ہو چکی ہے
اور اس کے جنگل کے کئی درخت بھی
کاٹ ڈالے گئے ہیں
صلاح الدین،
تم بہت پہلے کے لوگ نہیں ہو
جو اب بھی دعا مانگتے وقت دونوں ہاتھ
سینے پر پھیلا لیتے ہیں
صلاح الدین،
اب بھی وقت ہے
وہ دیکھو سامنے ایک دعا ابھی تلک
تمھارے انتظار میں زندہ ہے
صرف ایک دعا
جو شاید تمھارے اور سب کے درمیان
اب بھی کہیں دیئے کی طرح جھلملا رہی ہے
یا جگنو کی طرح ٹمٹما رہی ہے
یا آنسو کی طرح مسکرا رہی ہے
چھتیس سال!
چھتیس سال کی آخرتوں کو بھول جاؤ
ورنہ یہ کہنے میں کوئی بھی اعتراض نہیں
کہ تم سارے جدیدیوں یعنی پاکھنڈوں کے بیچ سے
ایک اکیلا، تنہا، اداس خدا
اور دوسرا یعنی محمد غائب ہو گیا ہے
صلاح الدین،
بس تم چلاؤ، زور زور سے چلاؤ
مت بلاؤ وہاں سے یہاں
اور مت جاؤ یہاں سے وہاں
پیشہ ور رنڈیوں کی طرح کمانے
اور اوارڈ س سینے پر [illegible]

صلاح الدین،
بس تم چلاؤ، زور زور سے چلاؤ
مت کرو سیمینار
کرائیسس، آگہی، ذات، ریت، دھوپ
سمندر، سورج، خلا، تنہائی اور
ایسی دوسری چیزوں پر
تمھیں علم نہیں کہ یہ چیزیں
تمھیں اسٹیج پر کتنا مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں
کبھی تم بھوت نظر آتے ہو کبھی بھوت
کبھی تم چھوت نظر آتے ہو کبھی اچھوت
(اور کبھی کبھی تو تم ہندوستان میں مہدی علیہ السلام
اور پاکستان میں خاتم النبیین ہونے کا
دعویٰ بھی دائر کر دیتے ہو)
صلاح الدین،
بس تم چلاؤ، زور زور سے چلاؤ
تمھارا افسانہ: مری ہوئی چھپکلی کا دیوانہ
تمھاری نظم: نفیس جلیبی کا لامرکزی سجادہ
تمھاری غزل: میر اور غالب کی ڈاڑھی سے نکلی ہوئی جوں کا استعارہ
تمھاری ناول: آگ میں ٹھنڈی ہوتی ہوئی عورت کا شمیانہ
اور تمھاری تنقید: یورپ اور امریکہ کی ویشیاؤں کی
اترنوں کا گہوارہ
صلاح الدین،
بس تم چلاؤ، زور زور سے چلاؤ

I CONFESS

MY NAME IS SALAHUDDIN

AND I AM DEAD FROM BOTH THE ENDS

BUT MY VOICE LIVES

THE END

• [illegible] صلاح الدین پرویز کے مجموعوں کے نام۔

ممتاز احمد خان

کراچی

گرگِ شب ۔ واقفیت کے عذاب کی کہانی

اکرام اللہ کے ناول "گرگ شب" کا ہیرو شفیع جو اپنے شعور کے ہاتھوں تباہ و برباد ہے انتہائی پرکاری سے کہتا ہے۔

"میرے بھائی، معاف کیجیے، میرے بھائی نے اگر اپنی سوتیلی ماں سے مل کر مجھے پیدا کیا تو پرانے، نہایت پرانے دستور کے مطابق وہ اچھا کیا یا برا کیا لیکن آج کے زمانے میں مجھے بدترین قسم کے حرامی ہونے کی لعنت ہے کیونکہ [illegible] ابھی اقدار ابھی پیدا نہیں ہوئیں، خدا کہیں گم ہے۔ میں ابتدائے آفرینش سے اپنی ذات کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ ان حالات میں مجھے ناواقفیت کی دیوار کے پیچھے چلے جانا چاہیے۔"

(صفحہ ۱۴۲)

ان الفاظ میں ناول کی پوری کہانی پنہاں ہے۔ شفیع ایک جذباتی بلکہ نفسیاتی شبہ میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے بوڑھے والد میاں جی کی دوسری بیوی کے اپنے سوتیلے بھائی غلام احمد سے ناجائز تعلقات کی پیداوار ہے۔ یہ الزام شفیع کی سوتیلی نانی کی بیٹی یعنی شفیع کے سوتیلے بھائی غلام احمد (میاں جی کا پہلی بیوی سے بیٹا) کی بیوی نے بارہا خود لگایا اور بات اس قدر پھیلی کہ ایک دن گاؤں کی لڑکی حمیدہ نے بھی محلے میں یہ کہہ کر شفیع کے حواس معطل کر دیے کہ وہ اپنے باپ کے بجائے اپنے سوتیلے بھائی غلام احمد سے ہے۔

میاں جی کے لیے یہ کوئی روگ نہیں ہے کہ ان کا پہلی بیوی سے بیٹا ان کی دوسری نوجوان بیوی سے تعلقات استوار کیے ہوئے تھا کہ جس کے نتیجے کے طور پر شفیع تولد ہوا، لیکن شفیع کے لیے یہ انکشاف دھماکے سے کم نہیں۔ جب سے اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کا شعور اس کے لیے عذاب بن گیا۔ اس کی حسیات نے اس کی قوت ارادی چھین لی اور نتیجے کے طور پر وہ جنسی طور پر ناکارہ ہو گیا۔ حالانکہ [illegible] میں بیٹھنے اٹھنے کے بعد آزادانہ اختلاط کے دروازے اس پر وا ہو گئے۔ جب وہ گاؤں چھوڑ کر شہر میں آیا تو اس نے کوشش کر کے آمد کرنے والے اداروں کا [illegible]

حاصل کرلی۔ شام کو کلب میں آمد و رفت کی بنا پر شہر کے بڑے بڑے لوگوں کی بیگمات سے اس نے قربت حاصل کرلی ان میں بیگم ریحانہ تھی، جو بھاری مشینری بنانے والی ایک فرم کے پاکستانی سربراہ تھے، سے تو وہ سانحوں سے بھی زیادہ قریب آگیا اور عین کے سر پڑ گیا۔

مصنف نے ناول کی کہانی کا تعلق اونچے معاشرے میں ہونے والے ان واقعات سے نہیں جوڑا ہے کہ جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کا بیان محض ضمنی ہے۔ چونکہ شفیع کی شخصیت ریزہ ریزہ ہے اس لئے وہ ہر اس صورت کے قرب کا متلاشی ہے جو اسے ذہنی سکون عطا کر سکے، جو اس کے حافظے یا شعور کو نوچ پھینکے تاکہ وہ ناواقفیت کی فضا میں زندگی بسر کر سکے۔ یہاں کہانی کا سلسلہ ایک مشہور مقولے کی بازیافت کرتا ہے ـــ "لاعلمی یا ناواقفیت نعمت ہے!" ناواقفیت کا تعلق تحت الشعور یا ایک حد تک لاشعور سے بھی ہوتا ہے اور واقفیت شعور ہے یا عذاب ہے۔ فرائیڈ نے انسان کی نفسیاتی گتھیاں سلجھانے کے لئے تحلیل نفسی کا طریقہ کار وضع کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان لاشعوری طور پر الجھنوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی ان الجھنوں، اس کے عذابوں اور اس کی ذہنی بیماریوں کا سراغ اس کے ماضی میں دفن ہوتا ہے۔ اور اگر نفسیاتی معالج کسی نفسیاتی مریض کے ان تمام عوارض کا سراغ ماضی سے حاصل کرلے تو وہ نفسیاتی بیمار اپنے عارضے کی وجوہات کو اپنے شعور میں حاصل کر کے صحت یاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص سانپ کے تصور سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر کبھی اس کی کسی سانپ سے مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ اسے کاٹ کھائے گا۔ لہٰذا اسی تاثر کے تحت وہ برسہا برس اس قسم کے خواب دیکھتا رہا جیسے کہ کوئی سانپ اسے کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ جب اس کی نفسیاتی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ بچپن میں دو تین بار اس کا پیر سانپ پر پڑا لیکن سانپ بھاگ کھڑا ہوا اور اسے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ جب اس کے تحت الشعور سے یہ واقعات کھوج نکالے گئے تو وہ شخص بھلا چنگا ہو گیا اور اس میں یہ قوت ارادی پیدا ہو گئی کہ اگر کبھی اس نے سانپ دیکھا تو وہ اسے ضرور مار ڈالے گا۔ پھر اس نے ایسے خواب دیکھنا شروع کئے جس میں اس نے سانپ کو مار ڈالا ہوتا ہے۔ یوں نہ صرف اس کا نفسیاتی ہیجان دور ہوا بلکہ اس میں مصائب کے وقت اعتماد کے ساتھ ڈٹ جانے کی قوت بھی بحال ہو گئی۔

لیکن "گرل سب" میں جب شفیع کو یہ علم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوتیلے بڑے بھائی کی کمائی کا نتیجہ ہے اور اس کا تعلق بھی اپنی ماں کی بجائے یا باپ کی بجائے اپنی سوتیلی ماں سے مل جاتا ہے تو اس کی شخصیت ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ یہاں ماضی میں اس کی اصلیت کا سراغ ملنا اس کو بجائے ایک مطمئن

یا نارمل شخصیت بنانے کے ایسے نفسیاتی خلجان میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ اپنی جان ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ ثابت ہوا کہ نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہونے کے بعد ماضی کی تحلیل ایک شخص کو اس کے عارضے سے نجات دلاتی ہے لیکن نارمل شخصیت پر اگر اس کا داغدار ماضی یا گندا ماضی آشکار ہو جائے تو وہ ایک ایسے عارضے میں مبتلا ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنی مذہبی اقدار کو چیلنج کرنے لگتا ہے تاکہ زندہ رہنے کا جواز تلاش کر سکے۔

> "میں دراصل عبوری دور میں پھنس گیا ہوں۔ پرانی اقدار مردہ ہو چکی ہیں۔ نئی اگرچہ پیدا ہو رہی ہیں لیکن ابھی وجود میں نہیں آئیں۔ دنیا اس وقت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور شاید چند صدیوں میں نئی اقدار تولد ہو جائیں"
>
> (صفحہ ۱۸۲)

یہ معاملہ بھی شفیع کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ "شاید چند صدیوں میں نئی اقدار تولد ہو جائیں" سے اس کی مراد کیا ہے؟ کیا وہ یہ الفاظ سنجیدگی سے ادا کر رہا ہے اور اسے ا[illegible] پیشگوئی پر یقین ہے یا یہ کہ وہ محض طنز کر رہا ہے؟ چند صدیوں میں ان اقدار کا سورج طلوع ہو، کہ [illegible] لے خواہش ہے کیا ایک طویل عرصہ نہیں؟ یہاں ہمارے سماج پر گہرا طنز کیا گیا ہے کہ اس میں [illegible] دیں کے ظہور کے لئے صدیوں انتظار کرنا پڑے گا جب کہ یورپ میں یہ تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو گئیں۔ وہاں کسی شخص کا اپنے حرامی یا ناجائز ہونے کا اعتراف کسی گناہ یا اعتراض کے ساتھ منسلک نہیں۔ وہاں اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ماں باپ کی جنسی داستان یا بے راہ روی کو بڑی شان سے بیان کیا ہے لیکن لوگ ناک بھوں نہیں چڑھاتے! آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہاں مذہب کے اثرات انسان کی شخصیت پر حاوی نہیں رہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ انسان کے ناجائز ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ان دو شخصیتوں کا ہے جو نکاح، شادی یا کورٹ شپ کے بکھیڑے میں پڑے بغیر اسے وجود میں لے آتے ہیں۔ لہذا قابلِ مذمت بھی یہی دونوں ہونا چاہئیں۔ اور جو "وجود" ایک شہری کی حیثیت سے اس دنیا میں وارد ہو گیا اسے ہر قسم کا احترام اور سماجی و اقتصادی فوائد حاصل ہونا چاہئیں۔ شاید اسی لئے انگلینڈ اور چند دوسرے یورپی ممالک میں ریاست کو ناجائز بچوں کا باپ یا سرپرست گردانا جاتا ہے! اب رہی یہ بات کہ "برگ شب" پاکستان میں تخلیق کیا گیا ہے کہ جس کا سرکاری مذہب اسلام ہے اس لئے یہاں اس کا ردِ عمل کیا ہو؟ اگر ذرا باریک بینی سے اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ مذہب

بھی شدت کے ساتھ زانی اور زانیہ کی مذمت کرتا ہے۔ قرآن شریف میں کئی جگہوں پر زنا کے فعل کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے کیوں کہ ناجائز اولاد کی اصل وجہ ہی زنا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ ناجائز اولاد نہ تولد ہو تاکہ اسے ذلت و خفت اور رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور نہ ایسی اقدار کا وجود ... ہے جس میں ناجائز اولاد ہونے کو قابلِ فخر تصور کیا جائے۔ اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ... کے آخر کے مکالمے یا خود کلامی ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی ہذیانی کیفیت کے تحت برآمد ہوئے ... بات ہیں۔ ایک ایسے شخص کے جذبات کہ جس کو بار بار یہ واقف کرایا جاتا ہے کہ وہ ناجائز اولاد ... یہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی قانون شفیع کی والدہ اور اس کے سوتیلے بھائی کو سولی پر چڑھا دیتا یا انھیں سنگسار کر دیتا تو شاید شفیع کو ذہنی قرار آجاتا اور وہ نارمل انسان بن جاتا ۔۔۔ لیکن ناول کی کہانی میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لہٰذا اس مفروضے کو ذہن میں لانا ہی غلط ہے، تاہم اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شفیع کی سوچ معاشرے سے زبردست احتجاج کرتی ہے۔ اب خواہ یہ احتجاج رائیگاں جائے لیکن پاکستانی معاشرے میں قانون بنانے والوں کو اس چیلنج کا سامنا ہے آیا کہ وہ زنا اور حرام کی اولادوں کی بندش کی خاطر سماجی، معاشرتی اور مذہبی تبدیلیاں لانے کو تیار ہیں۔ غالباً اکرام اللہ بھی ناول کے ذریعے یہی سوال کرتے نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ اکرام اللہ نے ایک دوسری سطح پر انسیسٹ (INCEST) کے اس مسئلے کو رستا ہے۔ یعنی یہ کہ ناجائز ہونے کے احساس کے تحت انسان کے منفی رویے اور اس کے معاشرے پر گندے اثرات اور ایسے اثرات جن کے تحت مختلف قسم کی سماجی برائیوں کا پھیلنا۔ مثال کے طور پر شفیع کا ہر وقت نشے میں مدہوش رہنا اور ان اونچی حیثیت کی حامل عورتوں میں گھرا رہنا جو اپنے اپنے شوہروں کی آمدنی میں توسیع یا کاروبار میں بڑھوتری کی خاطر جسم فروشی کو جائز تصور کرتی ہیں اور عزت دار یا شریف طوائفوں کا لیبل لگائے پھرتی ہیں۔ یہاں پر بھی اکرام اللہ نے ہماری فرسودہ اور گھناؤنی اقدار پر طنز کیا ہے کہ ہم ایک عام طوائف کے وجود سے کس قدر نفرت کرتے ہیں لیکن اونچے طبقے کی اسی قسم کی عورتوں کو اپنے سماج میں اونچا مقام عطا کرتے ہیں۔ اس سے قبل سماجی برائیوں کے پھیلاؤ کا جو تذکرہ کیا گیا تھا اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ مادیت پرستی، عورتوں مردوں کا آزادانہ اختلاط، میری (MARY) جیسی کسبی کا وجود، پیٹر (PETER) جیسے بھائی کا وجود جو بہنوں کو عصمت فروشی کے جوہڑ میں پھنسا کر روپے کماتا ہے اور اسی قسم کے دوسرے

؎ INCEST یعنی محرمات سے جنسی تعلقات۔

کرداروں مثلاً غلام احمد، اے۔ بی۔ شیخ، مسٹر بل (BILL)، رستم علی، بیگم ریحانہ شیخ، بیگم نرگس لطیف اور حکیم شمیم رستم علی کا وجود ایک ایسا دائرہ بناتا ہے کہ جس کے اندر کا نقطہ ناجائز تعلقات کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے اور جسے اگر ہم اپنے ذہن میں پھیلا کر دیکھیں تو یہی نقطہ ہر بڑی برائی کی جڑ نظر آئے گا۔ اسی نقطے کو مٹانے کے لئے اکرام اللہ کا ہیرو نئی اقدار کا سائبان تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش میں وہ کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں؟ اس کا جواب ناول میں نہیں ہے۔ ناول اس کا جواب وقت پر چھوڑ دیتا ہے اور مصنف اس بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کرتا۔

اس ناول پر فحش مواد کی تشہیر کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں خاصی متضاد آراء ملتی ہیں ان میں عدالتوں کے فیصلے بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں کسی حتمی رائے پر پہنچنا دشوار گزار مسئلہ ہے لیکن اتنا ضرور پوچھا جا سکتا ہے کہ آیا مصنف کا مقصد قاری کے سفلی جذبات کو بھڑکانا تھا؟ یہاں پر بھی ایک الجھن ہے۔ قاری قاری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کوئی قاری اتنے کمزور سفلی جذبات رکھتا ہے کہ ذرا سے "تذکرے" سے "پسینے پسینے" ہو جاتا ہے اور کوئی قاری اپنے جذبات پر اس قدر کنٹرول رکھتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایسے "تذکرے" کے زیر اثر اپنی ذات کے ارتعاش کو اپنے سفلی جذبات پر حاوی آنے دے۔ وہ اس قسم کی منظر نگاری کے پس منظر میں جا کر اس حقیقت کو دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے جو کسی کردار کے جنسی رویئے کا محرک ہے۔ ویسے اس ناول میں جنس کے بارے میں کئی واقعات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر گاؤں کی اوباش لڑکی حمیدہ کا شفیع کو یہ بتانا کہ وہ کس کے نطفے سے ہے، حمیدہ کا اوباش لڑکے قدیر سے جنسی تعلق ہونا، اور آخر میں مسز ریحانہ شیخ کا شفیع کے سامنے مادر زاد برہنہ ہو جانا اور مصنف کا اس کے جسمانی خطوط کو مزے لے کر بیان کرنا اور شفیع کا اپنے آپ کو نامرد محسوس کرنا سب سے زیادہ اعتراض کا منظر ہے۔ اس منظر میں اکرام اللہ نے جس طرح مسز ریحانہ شیخ کے جسمانی خطوط کو ان کے مختلف رنگوں کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ایک طرف تو ان کے زبردست مشاہدے کو ظاہر کرتا ہے جس کا تعلق جنس سے ہے تو دوسری طرف ان کے طرز بیان کی قوت کا بھی ہے۔ اب یہی منظر ایسا ہے کہ جس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد قاری کے سفلی جذبات کو بھڑکانا تھا؟ کیا یہ منظر ناگزیر تھا اور اس کا جس طرح بیان ہوا وہ بھی ناگزیر تھا؟ ورنہ یہ کہ شفیع اور مسز ریحانہ شیخ کی قربت کی اہمیت (SIGNIFICANCE) ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مسز ریحانہ شیخ کی برہنگی اور اس کے جسمانی خطوط کا بیان تھا کہ اکرام اللہ نے اس لئے پیش کیا تا کہ یہ دکھایا جا سکے کہ شفیع ایسی سچوایشن (SITUATION) میں بھی اپنے آپ کو عورت کے

قابلِ اعتنا ہے لیکن فحش نگاری کا سوال اپنی جگہ موجود ہے۔ دراصل جس انداز سے [illegible] سو اٹھائیس سے ایک سو انتالیس تک اس منظر کو پیش کیا گیا ہے وہ مذکورہ ہر دو قسم کے قارئین کے جنسی جذبات بھڑکانے کا کام تو یقیناً انجام دیتا ہے ویسے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف کو ایسا کرنے کا قطعی کوئی حق حاصل نہ تھا تاہم اتنی بات [illegible] ایک ایسے انداز سے بیان کیا جا سکتا تھا کہ جس میں اس کی معنی خیزی (SIGNIFICANCE) کسی طور بھی متاثر نہ ہوتی اور جو بات کہی جانا تھی اس کا حق بھی ادا ہو جاتا۔ بہر صورت اس رائے سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس منظر کو پورنو گرافی کے جنس نگاروں کی طرح قاری کے لئے "جاندار" بنانے کا عمل اکرام اللہ نے جان بوجھ کر یا شعوری طور پر انجام دیا ہے۔

"گرگِ شب" اگست ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی اور ناول بھی آئے جن میں بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ"، انتظار حسین کا "بستی"، [illegible] کا "کاروانِ وجود"، انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ"، انیس ناگی کا "دیوار کے پیچھے"، غلام الثقلین نقوی کا "میرا گاؤں"، عبداللہ حسین کا "باگھ"، فاروق خالد کا "سیاہ آئینے" اور خدیجہ مستور مرحومہ کا آخری ناول "زمین" شامل ہیں جو اپنی اپنی حیثیت میں چھوٹے بڑے، اہم اور محض ادبی ناول ہیں۔ یہاں ان سب ناولوں کا گرگِ شب سے موازنہ مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ گرگِ شب بھی اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنا پر ایک قابلِ ذکر ناول ہے اور جب ہم گزشتہ کئی سالوں کے دوران آنے والے ناولوں کا جائزہ لیں گے تو اس ناول کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔ □

رشید امجد
۱۸۵-اے، نانک پورہ، راولپنڈی

بانجھ لمحہ میں مہکتی لذت

سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے دفعتاً اسے یاد آیا کہ پچھلی رات ٹیکسی سے اترتے ہوئے وہ خود کو پچھلی سیٹ پر بھول آیا ہے۔

اس کی بیوی اور تینوں بچے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کرتے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ چھری ہاتھ میں پکڑے بوکھلائی نظروں سے انھیں دیکھے جا رہا تھا۔ تالیاں بجاتے بجاتے اس کی بیوی کو دفعتاً اس کی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا تو اس نے پوچھا — "کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہونا؟"

وہ منہ کھولے ٹپ ٹپ دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے، کیا بات ہے؟" اب بچے بھی متوجہ ہو گئے۔

اس نے بغیر کیک کاٹے چھری میز پر رکھ دی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" بیوی اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "خیریت تو ہے نا؟ تم ٹھیک ہونا؟"

وہ ایک لمحہ خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا — "کل رات میں خود کو ٹیکسی میں بھول آیا ہوں"

بیوی نے لمحہ بھر کے لئے حیرت سے دیکھا، لیکن اگلے ہی لمحہ جھنجھلاہٹ اس کے سارے چہرے پر رینگنے لگی — "کیا؟"

"ہاں" وہ رک رک کر بولا "ٹیکسی جب گلی کی نکڑ پر رکی تو بے خیالی میں میں خود کو پچھلی سیٹ پر ہی بھول گیا"

بیوی نے سر پر ہاتھ مارا اور بولی — "میرے خدایا اگر تم خود کو بھول آئے ہو تو یہ کون ہے؟"

اس نے اس کے بازوؤں کو دبایا — "یہ کون ہے؟"

"ارے واقعی یہ کون ہے؟" اس نے اپنے آپ کو اور پھر بیوی کو دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے

ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"واقعی یہ کون ہے؟"

لمحہ بھر خاموشی رہی پھر وہ ا "ہو سکتا ہے یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور ہو جس کی ٹیکسی میں میں گھر آرہا تھا، یا پھر کوئی اور ہو۔۔۔ کوئی بھی۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔" بیوی غصہ سے بولی ۔۔۔ "اٹھو کیک کاٹو، بچوں کو بھی پریشان کر دیا ہے۔"

"نہیں یہ میں نہیں ہوں۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"تو پھر یہ کون ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا ۔۔۔ "اس کے وجود میں یہ کون ہے ۔۔۔؟ کوئی اجنبی ۔۔۔ لیکن کون؟"

"اٹھو کیک کاٹو۔" بیوی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا ۔۔۔ "دیکھو بچے پریشان ہو رہے ہیں۔"

اس نے ویران نظروں سے بچوں کو دیکھا جو منہ کھولے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ "تو ان کو بھی معلوم نہیں کہ یہ میں نہیں ہوں۔ عجیب بات ہے یہ میری خوشبو بھی نہیں پہچانتے۔ بالکل اپنی ماں کی طرح ہیں اور یہ عورت یہ جان کر بھی کہ یہ میں نہیں ہوں کیک کاٹنے کی ضد کئے جا رہی ہے۔"

بے دلی سے اٹھا اور کیک کاٹنے لگا۔

بچوں اور بیوی نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کا کورس شروع کیا لیکن اب ان کی آواز میں پہلے کی سی کھنک نہیں تھی۔

کیک کاٹتے ہوئے وہ مسلسل سوچتا رہا کہ وہ کہاں اپنے آپ کو بھولا تھا۔ ٹیکسی مورس تھی اور ڈرائیور چھوٹے قد کا جس نے کالی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اترنے کے بعد شاید ڈرائیور کی نظر پچھلی نشست پر پڑی ہو اور اسے معلوم ہو گیا ہو کہ وہ وہیں رہ گیا ہے۔ یا کیا معلوم ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور اسی طرح ٹیکسی بند کر دی ہو ۔۔۔ یا ۔۔۔؟؟

ساری رات اسی بے چینی میں گزری۔ بار بار خیال آتا کہ کیا معلوم ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور اسی طرح پچھلی نشست پر ہی پڑا ہو۔ پھر خیال آتا کہ شاید ڈرائیور نے مڑ کر دیکھ لیا ہو لیکن کس لئے ... یہ بھی ہو سکتا ہے ڈرائیور نے غیر اہم سمجھ کر کہیں پھینک دیا ہو اور ابھی تک کسی ویران سڑک کے کنارے پڑا ہو۔ سردی اور ویرانی اس کے بدن پر رینگنے لگیں۔ اس [illegible]
[illegible] عورت کتنی عجیب ہے، یہ جان کر بھی کہ وہ میں [illegible] سے سو گئی

شہریار

غزلیں

۱

آہٹ جو سنائی دی ہے ہجر کی شب کی ہے
یہ رائے اکیلی میری نہیں ہے سب کی ہے

سنسان سڑک، سناٹے اور لمبے سائے
یہ ساری فضا اے دل تیرے مطلب کی ہے

تیری دید سے آنکھیں جی بھر کے سیراب ہوئیں
کس روز ہوا تھا ایسا بات یہ کب کی ہے

تجھے بھول گیا کبھی یاد نہیں کرتا تجھ کو
جو بات بہت پہلے کرنی تھی اب کی ہے

مرے سورج آ مرے جسم پہ اپنا سایہ کر
بڑی تیز ہوا ہے سردی آج غضب کی ہے

۲

دل دھڑکنے سے خفا ہے اور آنکھیں نم نہیں
پیچھے مڑ کے دیکھنے کی یہ سزا کچھ کم نہیں

ہاں انھیں میں کل برستے پانیوں کے عکس تھے
ہاں یہی آنکھیں کہ جن میں قطرۂ شبنم نہیں

ہے بہت مسرور مخلوقِ خدا اس بات پر
آنے والے موسموں میں ہجر کے موسم نہیں

اک ہوس آباد کوچے کی طرف جاتا ہوں میں
کیا چراغِ یادِ جاناں تیری لو مدھم نہیں!

ایک موڑ آئے گا جب سمتیں بھنور بن جائیں گی
اس کے آگے اس سفر میں کوئی پیچ و خم نہیں

شبنم مناروی

راستے

دت کے سب راستے مسدود ہیں !!
دکشی کرنا حرام !
ر شہادت زندگی لا انتہار
رکے پھر جینا ـــــ
زائیں اور عذاب !!
الہ کی صورت بکھر جانے کے بعد
ھر جنم سا اذیت ناک ہے
دت سے پہلے ، گناہوں کی غلاظت ڈھیر کر دینا
راسر پاپ ہے !
یت مادّہ کبھی فنا ہوتا نہیں
ت کے سب راستے مسدود ہیں
ز! جینے کی اداکاری کریں

سوھن راھی

میرے بارے میں سوچو

میرے بارے میں سوچو
میں ابھی زندہ ہوں
انسان کی صورت زندہ۔
امن اور جنگ کے کھیل میں
تم مجھے کیوں دھکیل رہے ہو
میرے ننگے بدن کے بارے میں سوچو
میرے لباس کے بارے میں سوچو
میں ابھی زندہ ہوں
انسان کی صورت زندہ۔
چاند اور تاروں تک کی ، کوئی بھی پرواز
گندم کا ایک دانہ بھی نہیں اگا سکی۔
میرا بریک فاسٹ ، میرا لنچ ، میرا ڈنر
تو زمین کی کوکھ میں دھرا ہے۔
میری بھوک کے بارے میں سوچو
میں صدیوں کا پیاسا ہوں

محسوس ہو۔ وزیر آغا کی شخصیت میں ایک غیر ملوث، سادہ، معصوم اور محبت کے پہلے خمیر سے تیار کیا ہوا انسان سانس لیتا ہے۔ یہ انسان میرے ناول "نرتا" کا نیل کنٹھ ہے اور اس انسان کا دوسرا نام وزیر آغا ہے۔

پھر وزیر آغا اور میں دونوں ایک دوسرے سے انجان رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ہم سفر بن گئے۔ ایک بار میں نے ان کی ایک نظم پڑھی اور اس کا اقتباس اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس وقت ڈائری کا وہ صفحہ میرے سامنے ہے۔

میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سو
جھنکار تھی پتوں کی
اڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی
اور مجھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی

(جب آنکھ کھلی میری)

وزیر آغا نے انسان اور فطرت کے رشتے کو جس گہرے زمانی شعور کے ساتھ اس نظم میں بیان کیا تھا، مجھے بے حد پسند تھا ان کا یہ انداز۔ میں خود، اپنے خمیر اور اپنے ضمیر میں گندھا ہوا، اپنی مٹی اپنے موسم، اپنے اساطیر اور اپنی فطرت سے گہری وابستگی رکھتا ہوں۔ لمحوں کی زنجیر، مجھے بھی، ایک بوجھ، ایک بندش محسوس ہوتی ہے۔ وزیر آغا کی نظم میں، میں نے شاید اپنے احساس کا پرتو دیکھا تھا، اور دوستوں سے کہا تھا کہ میرا شعری اسلوب وزیر آغا کے اسلوب سے مماثلت رکھتا ہے۔

"اردو شاعری کا مزاج" میں ایک پُر وقار اور ہمہ گیر وزیر آغا سے روشناس ہوا تھا۔ ان کی دوسری کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" مجھے شاید اس لئے زیادہ پسند نہیں آئی تھی کہ اس میں نظم گو شعرا کی شناخت کے لئے کچھ مثالیں قائم کی گئی تھیں۔ اور مضامین میں جو ابہام تھی وہ پرانے وزیر آغا کی کشادہ روی میں حائل نظر آ رہی تھی ___ انہی دنوں ایک آزاده رو وزیر آغا مجھ سے ہم کلام ہوئے

اپنے مجموعے "دن کا زرد پہاڑ" کے روپ میں ان کے بعض مضامین پڑھنے کے بعد میں نے کم از کم اپنی بساط بھر آزادی کے تصور کو جس طرح مجروح ہوتا ہوا دیکھا تھا، اس کی تمام خلش اس مجموعے کے مطالعہ سے دور ہوئی۔ "دن کا زرد پہاڑ" اس فطری معصوم انسان کا ذہنی منظر نامہ ہے، جو زندگی کی پیچیدگیوں کے مقابل ایک سوال بن کر نمودار ہوتا ہے۔

"کہاں ہوں، یہ کیسا جہاں ہے؟ یہ لیلا رچائی ہے کس نے؟" وزیر آغا کی نظموں کا یہ معصوم اور استعجابی لہجہ — خود میرے تخلیقی ذہن کا ہم نوا تھا — اس مجموعہ کی نظموں نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ کئی ماہ تک میں نے اس مجموعہ کی نظمیں اپنے چند عزیز دوستوں کو بار بار سنائیں۔

علی گڑھ میں رہتے ہوئے کسی بیرونی فن کار کا مداح بن جانا بڑا خطرناک کام ہے۔ ان دنوں علی گڑھ کی فضاؤں میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر وحید اختر اور شہر یار کا طوطی بولتا تھا ہم جیسے طالب علموں پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کی جاتی تھی کہ ادب میں سب سے پہلے فن کارانِ علی گڑھ کی مداحی لازمی ہے، اس کے بعد ان لوگوں کی جن سے ان حضرات کی خط وکتابت ہے۔ وزیر آغا سے ان حضرات کی خط وکتابت تو تھی، لیکن ان علما کا ایک دعویٰ یہ بھی تھا کہ وزیر آغا نقاد تو اچھے ہیں لیکن شاعری کے لئے پیمانہ سازی کرتے ہیں۔ ہم تو اس وقت نوآموز اور تازہ وارد تھے — بھلا ان بزرگوں کی بحث سے کیسے دامن بچاتے —! میرے لئے یہ کام آسان ہوا کہ میں نے علمی آرا اور زبانی گفتگو کی جگہ اپنے مطالعے کو اپنا راہبر بنایا تھا — وزیر آغا، مجھ جیسے ایک آزادہ رو فن کار کی طرح میرے نادیدہ دوست بنے رہے حالانکہ میں نے انھیں کبھی مخاطب نہ کیا نہ ان کے رسالوں میں چھپنے کا آرزومند ہوا۔ — تاہم وزیر آغا، میرے دوست، میرے ہم قدم، میرے بزرگ، میرے راہبر بنے میرے ساتھ رہے۔ میں نے شمشاد مارکیٹ کے چائے خانوں سے شعبہ اردو کی علمی فضا تک، وزیر آغا کو اپنے ہمراہ رکھا۔ اور ان کے مطالعہ کو ہی ان کی شخصیت کا شناخت نامہ تصور کئے رہا — وزیر آغا کا ایک اور شعری مجموعہ "نردبان" میرے ایک دوست لاہور سے اپنے ساتھ لائے۔ یوں محسوس ہوا، جیسے وزیر آغا خود میرے پاس آگئے ہوں — اور میں ان سے نظمیں سن رہا ہوں۔ ان سے کبھی بے تکلفی سے، اور کبھی ان کے علمی تبحر کے دبدبے سے خوفزدہ ہو کر ان سے باتیں کر رہا ہوں — "نردبان" کی نظموں میں انسانی فطرت کی معصومیت، کچھ نئے سوالوں سے اور نئے سرابوں سے معرکہ آرا نظر آئی —

اپنے تن کی کہنہ عمارت سے چمٹا ہوں
لانبے پتلے سانپوں ایسے ہاتھوں سے میں

دیواروں پر رینگ رہا ہوں

(موجود کے بھاری در پر)

اوس کی طرح سبک، پھول کی طرح جسم
اڑتے بادل کی طرح صبح کہیں شام کہیں
ایک نغمہ، جسے اب تک کوئی سمجھا ہی نہیں

(انسان)

ہوا کہتی رہی آؤ
یہ بندھن توڑ دو پیارے
مگر میں ہاتھ کی ابھری رگوں میں قید
اپنی آنکھ کی تپتی ہوئی خاک سیاہ میں جذب کیا کرتا
کہاں جاتا

(ہوا کہتی رہی آؤ)

وزیر آغا کی تخلیقات کے ساتھ گزرے ہوئے علی گڑھ کے وہ شب وروز وہ تھے، جب تک میں نے بیرونی دنیا کا سفر نہیں کیا تھا، لیکن مطالعے نے مجھے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ مشرقی شاعری کے بارے میں مغرب والے اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ہماری شاعری، ایک ایسے غیر ترقی یافتہ قدامت پسند معاشرے اور دنیا کی شاعری ہے جس نے ابھی تک آزاد اور نئی دنیا کی پیچیدہ صورت حال اور انسان کی تہذیبی صورت حال پر کوئی نظر نہیں کی۔ ان دنوں شعبۂ انگریزی کے میرے استاد ڈاکٹر سلامت اللہ علی گڑھ میں ایسے واحد شخص تھے جو عالمی ادب پر تقابلی نظر ڈال سکتے تھے۔ جدید امریکی شاعری کا مطالعہ سلامت اللہ صاحب کا خاص امتیاز تھا اور استاد نیز میرے بزرگ ہونے کے باوجود مجھ ہم جولیوں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ کو میں نے وزیر آغا کی بعض نظمیں سنائیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اگر کبھی موقع ملے تو ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا، تاکہ بیرونی دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس برصغیر میں ایک ایسا شاعر بھی موجود ہے، جو صرف اپنی زبان اور اپنے ملک کی کیفیت کو ہی نہیں، بلکہ آج کے جدید بین الاقوامی شعور کو بھی اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اس تاکید پر میں نے بہت بعد میں عمل کیا، اور وزیر آغا کی کچھ نظموں کے انگریزی ترجمے کیے۔ اپنے بعض امریکی دوستوں کو سنائے اور یہ کہہ کر سنائے کہ اگر تمھیں HART CRANE یا اس قبیل کے امریکی شعرا کو پڑھنے کا موقع

ملا ہو تو ہمارے اس شاعر کا مقابلہ کر دیکھو ـــــ

وزیر آغا سے مانوسیت بڑھتی گئی ۔ میں نے ان کی دیگر کتابیں پڑھیں ـــ ان کی تنقید، ان کے انشائیے ، ان کی نظمیں ـــ وزیر آغا کی کتاب "تصورات عشق و خرد ـــ اقبال کی نظر میں" کے مطالعہ تک پہنچ کر مجھ پر وزیر آغا کے علم ، فکر ، اسلوب اور طرز گفتار کا ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ ابتدائی دور کی مانوسیت عقیدت میں بدلنے لگی ۔ اب وزیر آغا میرے لئے میرے عہد کے ایک ادیب اور شاعر ہی نہیں ، ایک مفکر بھی ہیں ـــ ایک بزرگ ـــ ایسے بزرگ ، جو ابتدا میں مجھے اپنے ہم سفر لگتے تھے ۔

۱۹۸۱ء میں ، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دلی) میں ہونے والے بین الاقوامی فکشن سیمنار میں میں نے پہلی بار وزیر آغا کو گوشت پوست کے انسان کے روپ میں دیکھا ۔ ان کے سر پر وہی کیپ تھی جو ان کی تصاویر میں انھیں ادب سے زیادہ پولو کا کھلاڑی ظاہر کرتی ہے ۔ فکشن سیمنار کے ہجوم میں وزیر آغا اپنے مداحوں کے درمیان ، اس طرح کھوئے رہے کہ میں انھیں ، اپنی اور ان کی دوستی کا پورا قصہ بھی سنا نہ سکا ـــ انھیں دیکھا ، انھیں سنا ، ان سے کچھ باتیں کیں ـــ اور برسوں کی رفاقت ایک نکتہ پر مرکوز ہو گئی ـــ اس ایک مختصر اور چند روزہ ملاقات کے علاوہ میرے پاس تو وزیر آغا کی ہمرہی کا ایک طویل روحانی اور ذہنی عرصہ ہے ـــ برسوں پر محیط ـــ بلکہ شعور کی کئی زندگیوں پر پھیلا ہوا ـــ سوچتا ہوں ، کون سا عرصہ ، کون سی ملاقات زیادہ مستحکم ہے ـــ وہ ، جو تصوف کی واردات کی طرح اجنبیت زدہ مانوسیت کی حامل ہے ـــ یا وہ جو چند روز کی سیمناری رفاقت کی ملاقات ہے ! ☐

مظہر امام
ڈائرکٹر دور درشن کیندر
سری نگر

غزلیں

بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دنیا بہت اداس تھی، جب ہم اداس تھے

سارے خیال و خواب دریدہ لباس تھے
جتنے بھی آفتاب تھے، وہم و قیاس تھے

یہ راہِ سنگ و خشت مرا انتخاب تھی
جتنے بھی مرحلے تھے، وہ حسبِ قیاس تھے

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

یوں اس کے طرزِ خاص سے روشن تھا ماہِ شوق
لیکن وہ دوسرے جو مرے آس پاس تھے!

ہم نے امید باندھی تو کس کا قصور تھا
آخر وہ میرے کون تھے، بس روشناس تھے

اس رہ گذر پہ ہم کو تو رونق فزوں لگی
لیکن ہمارے دوست بہت بدحواس تھے

جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے
یہ کون میری طرح بدحواس لگتا ہے

ہر ایک شخص کا چہرہ اداس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے

بہت ہی سادہ، مگر رنگ زار میرے لئے
وہ عام سا ہے، مگر دل کو خاص لگتا ہے

میں اپنے حسن نگہ کو بٹھالوں آنکھوں پر
وہ بے لباس مجھے خوش لباس لگتا ہے

اسے کہو کہ ذرا دیر کو [illegible] جائے
وہ پاس ہے، یہ بعید از قیاس لگتا ہے

بڑا غرور تھا کل تک، مگر یہ اب کیا ہے
وہ سر سے پاؤں تلک التماس لگتا ہے

قصور جاگتی آنکھوں کا ہے یہ، ورنہ امامؔ!
وہ شخص اب بھی مرے آس پاس لگتا ہے

غزلیں

مغیث الدین فریدی
بی۔۱۳۔ ریڈرس لائنس، دہلی یونیورسٹی

پھر درد نے کروٹ سی بدلی جذبات کے شعلے لہرائے
کل یاد میں ایسا کیف نہ تھا کیا آج تمھیں ہم یاد آئے

آغوش میں دل کے یاد تری یوں آئی کہ جیسے کوئی کلی
خود اپنی مہک پر وجد کرے اور جھوم کے خود ہی کھل جائے

آزاد مزاجوں پر اتنا ہوتا ہے غمِ دوراں کا اثر
جیسے کوئی تازہ شاخِ چمن آندھی میں لچک کر رہ جائے

محویتِ کامل کے صدقے وہ حالِ غمِ دوراں کا ہوا
ٹکرا کے پہاڑوں سے جیسے طوفان کا دھارا مڑ جائے

ہم جن کی توجہ کی خاطر شعلوں میں شگفتہ رہتے ہیں
اللہ کرے دل رکھنے کا ان کو بھی سلیقہ آجائے

رونا تو یہی ہے وہ گلچیں کی نظروں میں کھٹکے گا
شبنم سے جو گل مرجھا جائے بجلی سے شگفتہ ہو جائے

ڈاکٹر اظہار مسرت
بھارتیہ ہاسپٹل، فتح پور شیخاوتی ۳۳۲۳۰۱

چونک پڑنے کی ادا دے کوئی
گالیاں کھا کے دعا دے کوئی

انکشافات ہوئے جاتے ہیں
ڈال دے مجھ پہ لبادے کوئی

ایک اُمّی کی اطاعت کر لوں
علم ایسا تو خدا دے کوئی

اب "من و تو" میں گھٹن ہوتی ہے
اب تو دیوار گرا دے کوئی

اور کچھ دور ہی ہے منزل
اور کچھ دیر صدا دے کوئی

نقش ہو جاؤں گا دیواروں پر
اشتہارات لگا دے کوئی

نیند سے بھی بڑی ہے اک نعمت
بس علی الصبح جگا دے کوئی

احتسابات کی توفیق تو ہو
کاش نظروں سے گرا دے کوئی

مجھ سے احساسِ مسرت لے کر
غم کا اعجاز بڑھا دے کوئی

حمید سہروردی
صدر شعبۂ اردو
شری یتی کے۔ ایس۔ کے۔ کالج
بیٹر ۴۳۱۱۲۲

انجانی دعائیں

ہم لوگ ایک ایسے سفر سے گزر رہے ہیں
کہ اب راستے گمان کی نظروں سے بے اختیار ہوگئے
زمین اور آسمان کے درمیان
انجانی دعائیں پھر رہی ہیں
کچھ خبر نہیں
خبر نہیں کہ اختیار
منسوب وعدوں سے کٹ کر
ہاتھ ہمارے قلم ہوگئے

مگر تو میرے لئے

میرے جذبوں میں تو کس قدر شامل رہا
میں رات کے گمبھیر سناٹے میں ٹوٹتا رہا
مگر میں تیرے لمس کے بے پایاں شہر سے گزرتا رہا
کہیں مجھے ٹوٹتے گھروندے ملے
کہیں میرے قدموں سے زمین کھسکتی رہی
مگر میں تیرے وجود سے بدگماں نہ ہوا
تو میرے لئے رات نہیں
مگر تو رات کا ایک منظر ہے
میں تیرے لئے شہر کی اداسی نہیں
مگر میں تیرے شہر کی دھڑکن ہوں

پھر افق تنہا رہا

چھوڑ منظر پرانا، دیکھ نیا
اب خفا ہونے کا زمانہ ہی گیا
دیکھ آنکھیں پھیر نہ لے
پھر اب افق تنہا رہا
کیوں کسی کے ساتھ شل داستان
پھرتا رہا تنہا کبھی، کبھی ٹوٹتا
پانیوں کے نام تونے کیا لکھا
اڑتا بادل کس کے قابو میں رہا
جان کر انجان ہونا معشوقانہ فعل ہے
تو مگر معشوق لیکن پھر نیا
خوبصورت تیرا بدن
انگلیاں لمس کے اندر رہیں
تو بھی نیا
میں بھی نیا
چھوڑ سارے پرانے منظروں کو

صبیحہ ناز لاری
اقبال منزل، سٹی اسٹیشن، لکھنؤ

خوشبوئیں اداس ہیں

دور تا حدِ نظر پھیلے نیلگوں سمندر پر تیرتے مچھیروں کی چھوٹی کشتیاں، لہروں کے زیر و بم پر اچھلتی کودتی، ابھرتی ڈوبتی اس کی متجسس نظروں کا مرکز بنی تھیں ـــــ سورج کا سونا افق کی سفید لکیر پر پگھل جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ ہوا پراسرار سرگوشیاں کرتی اونچے لانبے درختوں کے درمیان محو رقص تھی۔ ایسی پُرنور صبحیں انسانی زندگی کے لئے ایک نعمتِ عظمیٰ بن کر روز طلوع ہوتی ہیں ـــــ اور ان صبحوں میں جاگنے والے لوگ قیامت کے مناظر کا تصور بھی نہیں کرسکتے ـــ!!

وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ قیامت کیا ہے؟ زوال کیا ہے؟ لیکن سامنے کا دلنواز منظر اس کی سوچ کے لئے کوئی جواز نہیں پیدا کرسکا۔ کیوں کہ سورج تو روز ہی طلوع ہوتا آرہا ہے! وہ ٹیرس کی جالیاں چھوڑکر اپنے پوشیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ باہر صرف ایک ہی منظر تھا ـــ ایک ہی وقت تھا ـــ ایک ہی فضا تھی لیکن اندر اس نے عالم ہستی کی تمام فضاؤں کو قید کرلیا تھا۔ دنیا کی ابتدا، انسان کا آغاز بتدریج ترقی اور زوال کی کیفیت اس گمنام کمرے کے اندر ذرے ذرے میں بکھری پڑی تھی ـــ!

برف ہی برف ـــ افق کے پار تک سفیدی، کرختگی، اندھیرا ـــ وہی ایک برف کی دبیز تہہ ـــ اور اسی برف کے عہد میں دیو ہیکل حیوانات کے کالے عکس متحرک تھے۔ کسی میوزیم کے ARCHA-EOLOGY سیکشن کا ڈائنا سار (DINO SAUR) اپنے بنجر پر گوشت اور چمڑے کا ملمع چڑھا کر برف کی دنیا کا جزو بنا کھڑا تھا۔ زمین کا عہد شاید چھ ارب سال کا قصہ ہے۔ انسان برسوں سے زمین کی وسعت پر پھیلا کھڑا ہے۔

دوسری تصویر کسی بڑے پہاڑ کی ہے جس پر نو فٹ لمبے انسانی پیر کا نشان ہے اور ایک کونے میں دو انسانی جسموں کا عکس ـــ ایک لاش کی صورت میں، دوسرا ایک کسے کو زمین کھودتے ہوئے گھور رہا ہے۔ انسانی لاش کے پاس ایک کالے کتے کا مردہ جسم زیرِ زمین ہونے کا منتظر پڑا ہے ـــ یہ دنیا کی پہلی جنگ کا ردِعمل ہے پہلی رقابت کا گھنونا پن ـــ!

تیسری تصویر میں پوری دنیا کا نقشہ ایک وسیع کینوس کی طرح پھیلا تھا — کہیں زمین ہری تھی، کہیں بھوری تھی — کہیں صرف حرکت آمیز پانی کی جھلملاتی لہریں — اور پورے نقشہ کا رنگ کچھ اس طرح سے اجاگر ہو رہا تھا گویا پوری تصویر کے ماحول پر ایک کالی بدلی چھائی ہو — روشنی کہیں نہیں تھی اور پورے نقشے میں صرف ایک انسان تھا، تصویر کا ہیرو — ابو عمار — جو اکیلا تن تنہا ایک پرچم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ پورا نقشہ اس کے قدموں کے نشانوں سے بھرا تھا لیکن تمام بستیاں سو رہی تھیں —!

تصویروں کے اس کمرے میں ہر طرف جنگ تھی، خاتمہ تھا، انتشار تھا، زوال تھا! یہ کیسی دنیا اس نے اپنے گرد تعمیر کر لی تھی — ستارہ نے سوچا — باہر کا سا سماں ہر جگہ کیوں نہیں؟ یہاں کیوں نہیں —؟ لیکن — لیکن ہے تو — ہاں ہاں! ہے — یہاں بھی ہے —! سامنے کمرے کے بیچوں بیچ ایک آبنوسی اسٹینڈ پر سنہرے GILTED فریم میں سے وہ گلاب جھانک رہا تھا اور مسکرا رہا تھا پرانے پیلے (PAPYRUS) جیسے کاغذ پر لال، گلابی اور ہرے CRAYON سے بنا گلاب کا پھول جو بظاہر بے حد معمولی اور بے معنی سا تھا، اس کے لئے ایک نئی کیفیت کا حامل تھا۔ وہ روز اس گلاب کو عبادت بھری نگاہوں سے نہارتی اور کمرے کے کونوں میں خوشبوئیں پھیل جاتیں۔ یہ تصویر جو اس کے لئے زندگی کا محرک تھی — جو جنگ و جدل کے درمیان نیا شگوفہ بن کے پھوٹ پڑی تھی — جو ننھے ہاتھوں کے لمس کی پاکی سے شرابور تھی — جو دنیا کی ہر شے سے افضل تھی — ستارہ نے ماضی کے تاروں کو باندھنا شروع کیا —!!

— ابو ایک بڑی ڈگری لینے بیرون ملک جا رہے تھے۔ اس ملک جا رہے تھے جہاں چاند انسانوں کی پیشانیوں پر روشنی بکھیرتا تھا، جہاں کے انسانوں نے خلا میں اپنے گھر معلق کرنے کے منصوبے بنائے تھے — اس ملک جانا تھا انھیں جہاں ترقی کا نیا باب ہر لمحے کھلتا ہے، جیسے کسی نے کہا کھل جا سم سم اور وہ کھل گیا — ابو کی پانچ سال بیٹی ستارہ ایک معصوم بچی اس ملک کی فضاؤں میں مدغم ہو گئی۔ وہ جس گھر میں بطور پینگ گیسٹ مقیم تھے وہاں ایک دس سال کے بلانڈ بالوں اور نیلی آنکھوں والے لڑکے نے ICE RINK پر رولر اسکیٹنگ کے مضحکہ خیز مظاہرے کرکے اسے ہنسا ہنسا دیا تھا۔ ایک دن جب وہ دونوں گھر میں تنہا تھے ایرک کے ساتھ مل کر اس نے شکر کے دانے چپکا GINGER BREAD BOY بنایا اور محلے کے تمام بچوں کو دعوت دی تھی — اور سمندر کی ریت پر SAND CASTLES تعمیر کئے تھے — ایرک نے ایرپورٹ پر وداع کرتے وقت ستارہ کو اپنا بنایا ہوا CRAYON کا گلاب پیش کیا تھا — اس نے اجنبی زبان، غیر دلیس اور رنگ و نسل کے امتیاز کے حدود پھلانگ کر ایک

بین الاقوامی جذبے کی نشوونما کا بیج بویا تھا جو ننھی ستارہ کے لئے زندگی کا پیغام ثابت ہوا تھا!
سرخ گلاب کی وہ تصویر جو دنیاوی گردوغبار سے دور کسی رنگین، پرامن اور خوبصورت زندگی کی علامت
تھی ستارہ کا مرکزِ حیات بنی، اسے پرپیچ راہوں کے ہر ہر قدم پر ایک مستقل مزاجی، ایک لطیف جذبے
کے ساتھ جینے کی ترغیب دیتی رہی۔ اب تو نہ اسے ایرک کی شکل یاد تھی نہ آواز — وہ اس کے لئے
کسی وجود کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو صرف ایک جذبہ تھا جو اسے بار بار باور کراتا رہا کہ جذبوں
کی آنچ انسانی مشینری کو حدت اور قوت بخشنے کا واحد ذریعہ ہے اور جذبۂ لطیف رشتے، عمر، وجود، شکل،
زبان اور رنگ سے مبرا صرف ایک قوتِ احساس کا نام ہے۔
تو وہی سرخ گلاب کمرے کی فضا میں وائٹ فلیگ کی مانند ایستادہ رہا اور ستارہ اس وائٹ
فلیگ کی افادیت ثابت کرنے کے لئے روز کسی لال اور ہرے انقلاب کے رنگ دیواروں کے کینوس پر
بکھیرتی رہی۔!!

سائنٹفک اینڈ اسپیس ریسرچ سینٹر (SASRC) میں مسٹر وکمر کی آمد اور خیر مقدم کے سلسلے
میں سارا عملہ حرکت آمیز تھا۔ مسٹر وکمر نے اسی سال NUCLEAR PHYSICS میں اپنا معرکۃ الآرا پیپر
تیار کیا تھا اور جدید سائنس کے نئے باب کو انسانی تمدن کے لئے وا کر دیا تھا۔ انھوں نے ایک طاقت ور
نیوکلیائی بم کی ایجاد کر کے دنیا کو سب سے زیادہ POWERFUL NUCLEAR DEVICE کا تحفہ دیا تھا۔
خاص اور معتبر طبقوں میں یہ بھی چرچا تھا کہ شاید ڈاکٹر وکمر نوبل پرائز کے حقدار قرار دیئے جائیں۔ یہ
کوئی معمولی بات تو نہیں تھی نا اور ڈاکٹر وکمر کی ہر دلعزیزی کی ایک اور خاص وجہ ان کی عمر تھی۔ پہلی دفعہ
دیکھنے والا انھیں اتنے بلند پایے کا سائنسداں سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ ان کی عمر محض ۳۴ سال
تھی۔

SASRC کا لاؤنج اگنت چہروں سے بھرا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب باہر پورٹکو میں بے چین سے
کھڑے تھے۔ نوجوان ڈاکٹر وکمر کے خیر مقدم کو بوڑھے ڈائریکٹر صاحب کا انتظار ثابت کرتا تھا کہ علم عمر
کی قیدی نہیں! باٹل پام کے گملوں کی قطار کے بیچ سلیٹی سڑک سے ہوتی ہوئی نیلی فورڈ سیڑھیوں کے
سامنے رکی۔ دربان نے تپاک کے ساتھ بڑھ کر دروازہ کھولا — SASRC میں موجود تمام نامور اشخاص
میں وکمر سب سے زیادہ نوجوان لگا — باقی سب بوڑھے تجربوں کی دھوپ میں تپے کھڑے تھے —!
وکمر ڈائریکٹر کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھ کے داخلی دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے باہر دو چھوٹی بچیاں

ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لیے، گوٹے کے گھاگھرے پہنے، کالی کالی دو چوٹیوں میں ستارے ٹانکے اس کی طرف بڑھیں — اور وہ وہیں ٹھہر گیا —

پھر وہی منظر — !

یہ گھاگھرہ پہنے، کالی چوٹیوں میں ستارے پروئے ہوا وجود اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ کبھی ایک ایسا ہی وجود اس کی نظروں میں پہلے بھی سمایا تھا — اسی طرح کالی چوٹیاں لہراتی تھیں — ستارہ! O! SITARA ! THIS IS YOUR COUNTRY — O! MY !! — ایرک ولمر تم کتنے بڑے بیوقوف ہو — یہاں آتے ہوئے تمھیں یہ بھی نہیں یاد رہا کہ تمھاری زندگی میں غیر ملکی پہلی ہستی ستارہ تھی۔ وہ تمھاری اجنبی گفتار والی اولیں ساتھی تھی — تمھارے بچپن کی یادوں کا امتیازی ورق تھی وہ... اور آج جب کہ تم اس کی زمین پر کھڑے ہو تو تمھیں اس کا خیال تک نہ آیا — !؟

"بی بی، باہر کوئی صاحب آئے ہیں۔ یہ ڈبہ اور کارڈ دیا ہے"۔ ستارہ چونکی۔ ٹیرس کی جالیوں میں سے چاندنی چھننے لگی تھی

FOR SITARA — FROM ME, I AM ERIC ! — کارڈ پر لکھا تھا۔ ڈبے کے اندر سے نکلا GINGER BREAD BOY اپنی گلیزڈ چیری والی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا —

ایرک! ایرک — ستارہ بھاگتی ہوئی سٹنگ روم میں پہنچی لیکن دروازے پر ہی ٹھٹھک گئی —

DR. ERIC WILMER — تو یہ تم ہو! آہ! تم یہ کیوں ہو؟ اس نے سوچا۔ میں بھلا تمھیں کیا پہچانتی۔ NEWS SPLASHES تمھاری تصاویر سے بھرے رہتے ہیں لیکن مجھے تمھاری شکل یاد ہی کہاں تھی؟

ایرک اس وقت صرف ایرک تھا اور سامنے وہ لڑکی تھی جس کی بھنورا سی آنکھیں آج بھی اسی طرح متبسم تھیں۔ برسوں پہلے کی مانند جب کہ وہ صرف ایک بچی تھی! آج بھی اس کی معصومیت ویسی ہی ان چھوئی ہے — ڈاکٹر ایرک ولمر! یہ تمھاری زندگی کا دوسرا بے غرض لمحہ ہے ورنہ تم تو مفاد کے شکنجوں کے قیدی ہو —

"SITARA, I'VE COME TO SEE YOU" ایرک نے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے،

آہ! اس کے تو ہاتھوں کی نرمی بھی ویسی کی ویسی ہی ہے ورنہ تمھارے ملک کی فضائیں تو جسموں کے احساس بدلنے کی ماہر ہیں ڈاکٹر

یہ میرا اسٹوڈیو ہے۔ پہلی بار میرے علاوہ اس کمرے میں تم داخل ہوئے ہو۔ میں نے تمھارے

ساتھ مل کے SAND CASTLES بناتے تھے، اس لئے آج تمھیں یہ بھی دکھادوں کہ میں نے کتنے ریت کے
محل تمھارے واسطے سے تعمیر کر ڈالے ہیں ـــ ستارہ اسے حیرت زدہ ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ گھوم گھوم کر
دیواروں پر آویزاں ہزاروں سال کی دنیا کو دیکھ رہا تھا ـــ اس کی نظریں گلاب کے پھول میں الجھ گئیں! اسے
اپنی زندگی کا ہر تجربہ بیکار نظر آیا۔ اپنے ریسرچ پیپر کے آخر میں اس نے لکھا تھا

NUCLEAR DEVICES ARE NOT BEING INVENTED FOR THE REASON OF SADISM OR REVENGE, BUT BECAUSE SCIENCE IS MAKING US RUN ON AND ON.

اس نے کتنا غلط لکھا تھا۔ ورنہ یہ گلاب کا معمولی سا پھول کیا انسانی زندگی کا محرک نہیں ہو سکتا؟ لیکن
اب کہاں؟ INVENTIONS کو DISINVENT کرنے کی کوئی ترکیب اس کے پاس نہیں تھی اور
وقت اس کی دسترس سے باہر تھا۔ وہ اپنے ایجاد کردہ بم کو اپنے ملک کی سرکار کے ہاتھوں سونپ آیا تھا۔
راستے سب بند اور اداس ہو چکے تھے۔ وہ ستارہ سے کچھ کہہ کر اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اب
بھی کچھ تو باقی تھا۔ وہ ستارہ سے اس سرخ گلاب کی تصویر کے واسطے سے جڑا رہنا چاہتا تھا۔ ایک تصویر
ہی سہی کیوں کہ سچے گلاب کھلانا اب اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

برصغیر کی وسعت میں پھیلے ننھے ملکوں کی آبادیوں میں کشیدگی کے اثرات پھیلنے لگے۔ بھاری
بوٹوں کی دھمک سڑکوں کے سلیٹی فرش کو روندنے لگی۔ ایک نئی جنگ کا خطرہ چاروں طرف پھیل گیا۔
چاند نما پیشانیوں والے ملک کی نظر سنہری بالیوں کے کھیتوں والے ملک پر تھی۔ دونوں کمربستہ تھے اور
ننھے ملکوں میں خوف و ہراس کی وحشت سما گئی تھی۔ چاندنا دیش کا بیٹا ایرک اپنی گلاب کے پھولوں
والی ستارہ کی حفاظت کے منصوبے بنانے لگا لیکن کون سی ایسی جگہ تھی جہاں وہ اپنے گلاب کو زوال
سے بچا پاتا ـــ !؟ ایرک نے ستارہ کو وائرلیس کیا تاکہ اسے آگاہ کر سکے لیکن وہ تو جنگ کے آغاز سے
پہلے ہی سنہری بالیوں اور گیہوں کے کھیتوں والے دیس جا چکی تھی ـــ اپنی تصاویر کے ذخیرے کی پذیرائی
کی خاطر ـــ اور اب جنگ چھڑتے ہی وہاں سے نکلنے کے تمام راستے بند ہو چکے ـــ وہ سنہرے رنگ
میں قید کر دی گئی۔

سنہری گیہوں کی بالیوں کا دیس جو کھیتوں میں گاتے ہوئے مزدوروں کے گیتوں سے گونجتا

تھا۔ اب وہاں دن کی روشنی اور رات کے اندھیروں میں خطرے کا سائرن متواتر بجتا ہے۔ بچے خاموش اپنی ماؤں کے سینوں سے دبکے پڑے رہتے ہیں ــــ نوجوان امنگیں گلی کوچوں میں سو رہی ہیں۔ ہر طرف سکوت کا ملبع ڈول رہا ہے ــــ

ستارہ کھڑکی میں باہر کے سکوت کی طرح ساکت بیٹھی ہے۔

ایرک! میں، تم اور وہ گلاب ــــ صرف ایک سوال ہی تو ہیں؟

اب وہ اسی طرح سوچنے لگی ہے۔ سائرن بجنے لگا ہے۔ لوگ گھروں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بچے رونے لگے ــــ عورتیں چیخنے لگیں ــــ

رُووُوں ــــ رُووُوں ــــ جنگی جہازوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔

تڑاک ــــ تڑاک ــــ تڑاک ــــ! کوئی چیز فضا سے نکل کر گری اور سنہری بالیوں والے شہر ایک سفید روشنی سے بھر گئے اور پھر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی پیلی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ مٹیلے بادلوں نے فضا کو ڈھک لیا ہے اور ان میں لگی آگ آسمان کو نگلنے کے لئے بیقرار ہے ــــ پہاڑوں کے جنگل جھک گئے ہیں۔ انسانی جسم گوشت پوست سے آزاد بیتجربے کھڑے ہیں۔ سنہرے کھیت زہریلی راکھ سے ڈھکے ہیں۔ برسوں تک اناج نہیں اگے گا۔ ترقی اور تمدن کی زمین، لاشوں، ملبے، اور گرد کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ بستیاں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی ہیں۔ پانی عدم وجود ہو گیا۔ لوگ اندھے اور گنجے ہو گئے۔ چہرے اور ہاتھوں کے زخم بڑھتے جاتے ہیں، رستے جاتے ہیں۔ بچے مفلوج ہو گئے اور نہ جانے کب تک اسی طرح پیدا ہوں گے۔ دوائیں لا اثر ثابت ہو رہی ہیں۔ چند جو زندہ ہیں ان کی زندگی ایک جگہ ٹھہر گئی ہے۔ نسل کی ترقی ایک خواب ہو جائے گی اب۔! ساری فضا ایک یخ بستہ ٹھنڈک کی گرفت میں آچکی ہے۔

ایرک نے اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ وہ پاگل ہونے لگا۔ اس نے کیبنیٹ کھولا اور نوبل پرائز کی سند کے پرخچے اڑا دیئے۔ وہ چیخنے لگا ــــ اے کنبہ توڑ انسان! اے مفاد پرست انسان! اے اذیت پسند انسان! اے صفحۂ ہستی کو مٹانے والے انسان ــــ! تو تو پھول کھلانے چلا تھا ــــ تجھے تو ستاروں کی تلاش تھی ــــ! ستارہ! ستارہ! وہ چلّاتا رہا ــــ!

وہ بڑا خود غرض تھا ــــ اپنے لئے اس نے ایک نیوکلیر پروف لباس اور AIR CRAFT بنا رکھا تھا جس میں بیٹھ کر شاید ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا تھی اسے۔ وہ اسی میں نکل پڑا سنہری بالیوں

کا دیس راکھ اور دھوئیں کے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ انسانیت کراہ رہی تھی۔ اس نے AIR CRAFT راکھ اور لاشوں کے ڈھیر پر آتارا ـــ دنیا میں زندگی کا خاتمہ کیسا ہیبت ناک تھا! وہ سسکتے جسموں میں ستارہ کو تلاش کرتا رہا ـــ آخر وہ اسے مل گئی۔ ساکت جامد سی ـــ تودہ بنی ـــ اس کی بھنورا سی آنکھیں زندگی کے نور سے خالی تھیں۔ اس کی لانبی کالی چوٹیوں کی جگہ ایک زخم آلود SCALP تھا اور وہ ملبے میں پڑے نوکدار کانٹوں پر اس طرح ٹکی تھی جیسے وہ بے احساس ہوگئی ہو ـــ ستارہ! وہ دیکھتا رہا ـــ سوچتا رہا ـــ میں کیا کروں ـــ؟ کیا کروں ـــ؟ کہاں جاؤں؟ تمھیں کیا دوں اب ـــ؟ اب باغوں میں گلاب کہاں تھے جو وہ اسے دیتا ـــ؟ باغ تو سارے جل چکے تھے۔ !!! □

FORM IV *(See Rule 8)*

1 Place of publication — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
2 Periodicity of its publication — دو ماہی
3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
5 Editor's Name — اطہر پرویز
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or shareholders holding more than one percent of the total capital.

اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-84 — *Signature of Publisher*
Asad Yar Khan

ڈاکٹر فضل امام
شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی
جے پور

فراق کی تنقید نگاری

فراق کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا تھا لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ بلکہ تنقید کی دنیا میں بھی دخل دینا واجبات میں سمجھتے تھے۔ یہی نہیں وہ تخلیقی اور زندہ تنقید کے نقیب بھی بننا چاہتے تھے اور مختلف انداز سے اس پر مصر تھے کہ انھیں بحیثیت تنقید نگار تسلیم کیا جائے۔ اس کا وقتاً فوقتاً وہ لفظی اور تحریری طور پر اظہار و اعلان بھی فرماتے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اندازے" پیش نظر ہے جس کے پیش لفظ میں وہ اس کتاب کی غرض و غایت سے گفتگو کرتے ہوئے عجیب و غریب انکشافات کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

"ہاں تو میری غرض و غایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی ہے کہ جو جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور عملی اثرات قدما کے کلام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں انھیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچا دوں کہ ان کے اثرات میں حرارت و تازگی قائم رہے۔ میں اسی کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں[1]۔"

اس کتاب کا پیش لفظ اسی طرح کے بے جوڑ اور بے ربط طمطراقانہ فقروں اور جملوں سے بھرا ہے۔ اصل میں فراق قدما کا ذکر اکثر بہت زور و شور سے اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں پر رعب ڈالا جا سکے کہ وہ قدیم ادبیات اردو سے بھی واقف ہیں۔ حالانکہ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں سے قطعاً نابلد تھے۔ صرف زبانی دعوے ہی دعوے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ابتدا میں اردو شاعروں پر کچھ انگریزی میں مضامین لکھے تھے پھر ان مضامین کے ترجمے ہندی رسائل میں بھی شائع ہوئے اس لئے اردو والے ان سے متاثر تھے۔ فراق نام و نمود کے بڑے متوالے تھے۔ اردو کا قاری بڑا معصوم تھا اور ہے۔ وہ ادبیات عالم کے چند بڑے بڑے موٹے موٹے ناموں اور چند نامانوس لفظوں اور اصطلاحات کے آگے ہی جھکتا ہے۔ فراق کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ اردو والوں کے سامنے چند سنسکرت اور انگریزی ادبا و شعرا اور

[1] اندازے۔ فراق گورکھپوری۔ ص ۹

کی تصنیفات کا ذکر کرتے اور ہندی و انگریزی والوں کی موجودگی میں فارسی، عربی اور اردو کے شعراء و ادباء کا تذکرہ کرتے۔ چنانچہ اس کتاب کا پیش لفظ وہ امریکی ادیب ایمرسن کے قول سے شروع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"مشہور امریکی ادیب و مفکر ایمرسن کہتا ہے کہ جب کوئی نئی کتاب مشہور ہوتی ہے، اس وقت اپنے مطالعہ کے لئے میں ایک پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ جس وقت امرسن نے یہ فقرہ لکھا تھا اس وقت وہ ادھیڑ عمر کا ایک آسودہ دماغ اور پختہ کار ادیب بن چکا ہوگا۔ نئی عمر والے نئی کتابوں پر زیادہ لوٹتے ہیں اور امرسن کے بیان کے باوجود کوئی معقول وجہ نہیں کہ ادھیڑ عمر والے بھی شوق سے نئی کتابیں کیوں نہ پڑھیں، نئی کتابیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جنھیں نوعمر لکھیں، دوسرے وہ جنھیں ادھیڑ عمر والے لکھیں۔ ملٹن کی "فردوس گمشدہ"، "دیوان غالب"، سعدی کی "گلستان" "تلسی داس کی "رامائن"، "ٹیگور کی "گیتانجلی"، اقبال کی "ضرب کلیم" یہ کتابیں جب نئی نئی نکلی تھیں تو ان کے مصنف سفر زندگی کی آدھی سے زیادہ منزلیں طے کر چکے تھے[1]"

فراق کے مندرجہ بالا بیان سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ:۔ (۱) وہ نئی عمر والوں کے یہاں وزن و وقار نہیں پاتے۔ (۲) جدید کے مقابلے میں قدیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ (۳) نئی عمر والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ کوئی تصنیف پیش کر سکیں۔ (۴) نئی عمر والوں کی جب بھی کوئی کتاب آئے تو اس سے لازمی طور پر بے اعتنائی برتی جائے اور پرانی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھی جائیں۔ (۵) ملٹن کی "فردوس گمشدہ"، "دیوان غالب"، سعدی کی "گلستاں"، "تلسی داس کی "رامائن"، "ٹیگور کی "گیتانجلی"، اقبال کی "ضرب کلیم" صرف اس لئے مرکز کشش و جاذبیت ہے کہ ان کے مصنف ادھیڑ عمر کے تھے یا اس سے زیادہ عمر طے کر چکے تھے

حالانکہ انگریزی ادب میں جان کیٹس کی ادبی اہمیت کا کون منکر ہو سکتا ہے اگرچہ اس نے بہت ہی کم عمر پائی اور اس کم عمری میں اس نے لافانی شہرت حاصل کی۔ علامہ اقبال کی بہترین شاعری "بانگ درا" میں ہے نہ کہ ضرب کلیم میں، اور بانگ درا اس کی ابتدائی زندگی کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ عالمی ادب سے بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فکر و نظر کے حاصل ہونے کے لئے عمر کی قید نہیں ہوتی۔ خود اردو ادب سے بھی بہت سی مثالیں ایسی دی جا سکتی ہیں جو زیادہ دور کی نہیں اور ان کی بلندیوں سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے مقدمہ کلام آتش

---

[1] اعترافات۔ فراق ص ۵

اس وقت تحریر کیا تھا جب وہ بی۔اے۔ کے طالب علم تھے۔ مقدمہ اس قدر وقیع تھا کہ بوڑھے مضمون نگاروں نے بھی خلوص دل سے تعریف کی۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کا مضمون شبلیؔ پر علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا تو پوری اردو دنیا میں دھوم مچ گئی۔ پروفیسر احتشام حسین کے مضامین کی قدر و قیمت ان کے عہد طالب علمی میں ہی محسوس کی جانے لگی تھی۔ اگرچہ یہ کاوشیں نوجوان طالب علموں کی تھیں مگر طالب علمانہ نہیں۔ مجاز ردولوی نے اپنی جوانی میں ہی اجل کو گلے لگایا مگر اس مختصر عمر میں ہی انھوں نے لافانی شہرت پائی۔

فراقؔ دراصل اول و آخر بنیادی طور پر شاعر ہیں لہٰذا ان کی جذباتیت کا جذباتی مغالطہ ان کی تنقیدوں میں بھی کارفرما ہے۔ وہ نئی شاعری کے چند شاعروں کے متعلق تو یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ ان کا قدیم ادب کا مطالعہ ہے مگر نئی نسل کے نثر نگاروں سے ان کو چڑھ ہے۔ وہ اپنی بات اور جذباتی ابال کو اس انداز سے پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے کہ پہلی بار لوگ چونک پڑیں اور جب غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو بالکل بے مغز بات نکلے۔ اکثر وہ قدیم شاعروں کا دم بھرتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، حالیؔ، ریاضؔ اور حسرتؔ وغیرہ کی تعریف تو کرتے ہیں مگر ان کی تقلید کی کوشش بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھار یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میرا شعر ان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے اور اس طرح اپنی استادی تسلیم کرانا چاہتے ہیں لیکن جس ریاضت، مشق، مہارت، دل سوزی اور تفحص علمی کی ضرورت۔ ان شعرا کے تقلید کے لئے درکار ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔ ہاں فراقؔ موزوں طبع واقع ہوئے تھے اور ذہانت بدرجۂ معیاری تھی اس لئے شہرت کے بہتیرے ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ علم عروض سے بھی مایوسی کی حد تک ناواقف تھے۔ ان کی شاعری میں یہ خامی مزید کھٹکتی ہے مضامین کی یکسانیت اور تکرار سے دل اوب جاتا ہے بقول پروفیسر گیان چند جین:

"فراقؔ پرگو بلکہ زیادہ گو اور حشو گو شاعر ہیں۔ کسی زمین میں غزل کہتے ہیں تو چالیس پچاس اشعار کہہ ڈالتے ہیں۔ دو غزلہ، سہ غزلہ بلکہ چہار غزلہ تک ان کے یہاں عام ہے "تلاش حیات" اور "دھرتی کی کروٹ"، جیسی نظمیں لکھیں گے تو طول کلام کا ریکارڈ توڑ دیں گے۔ بار بار ایک سے مضمون کی تکرار ہوگی۔ رباعیوں کی فراوانی میں بھی صرف ردیف کی تکرار ہے بلکہ موضوع اور خیال کی بھی .... فراقؔ کی عروضی حس جتنی کمزور تھی مشاہیر شعراء میں اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہندی بحر (بحر متقارب اور متدارک) اور رباعی میں وہ خاص طور سے ٹھوکریں کھاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کو انھیں میں طبع آزمائی کا شوق ہے"[1]

---

[1] فراقؔ نمبر نیا دور۔ لکھنؤ۔

فراق کو جن زمینوں میں شعر کہنے کا شوق تھا، جسے میر جیسا شاعر تو نبھا لیتا تھا یا یوں کہئے کہ جھیل لیتا تھا مگر فراق کی کم مائگی بھلا یہاں کہاں تک ساتھ دیتی جس پر ان کی شاعری اور ان کا یہ شعر خود صادق آتا ہے :-

ہے کلامِ فراق وہ جنگل جو ہے قانون و قاعدے سے بری (چراغاں ص)

ظاہر ہے جو شاعر خود اپنی شاعری کو قانون و قاعدہ میں نہیں پیش کر سکتا وہ دوسروں کی شاعری کے متعلق کیا رائے دے سکتا ہے، اور کیا تنقیدی اصول وضع کر سکتا ہے ۔ اوزان و بحور کے ساتھ کلام کی خصوصیات یعنی محسناتِ شعری اور معائبِ شعری کے بارے میں بھی فراق کا مطالعہ محض سرسری تھا۔

تنقیدِ شعر و ادب کے لئے سخن فہمی اور نکتہ سنجی بھی لازمی ہے ۔ اگر تفہیمِ شعر یا تفہیمِ ادب ہی نہ ہو تو پھر تنقید کاہے کی ہوگی ؟ کس لئے ہوگی اور کس کے لئے ہوگی ؟ اس ضمن میں یہ عرض کرتا چلوں کہ فراق کی سخن فہمی بھی بڑی حد تک مشکوک اور مشتبہ رہی ہے ۔ اس کے لئے بیخود موہانی کے درج ذیل شعر پر فراق کا اعتراض ملاحظہ ہو :-

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے کبھی رو دیے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اس خوبصورت اور اثر آفریں شعر پر فراق کا اعتراض ملاحظہ ہو :-

" موصوف (بیخود) نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخابِ الفاظ، سلاستِ بیان، سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں مگر یہی جزئی خوبیاں اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں ۔ غزل میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک ذمہ داری لینا ہے جس کی کامیاب مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست کہ ما دو عاشقِ زاریم کارِ ما زاریست

رونے چلے اور عشق میں بے باک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

مگر حضرت بیخود کے شعر میں تو رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک اور منہ سے گرتی ہوئی رال ، ناک کی سرخی اور تھرتھراہٹ ، آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے اور مظلوم کے غم کا احترام یاس کے ساتھ ہمدردی ہونے کے بجائے اس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے ۔ یہ رونا یہ اظہارِ غم نہیں ، جھک مارنا ہے اور یہ ابتذال لب و لہجے سے پیدا ہو جاتا ہے ۱ "

۱ نگار لکھنؤ ۱۹۳۶ء

اب فراق کے اعتراض پر جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا اعتراض ملاحظہ فرمائیے :-

"ان (فراق) کی عبارت کا ابتدائی حصہ بتاتا ہے کہ شعر کے ابتذال کا دارومدار گھونی حیا پر ہے مگر خاتمے پر فرماتے ہیں کہ شعر کا لب ولہجہ ابتذال پیدا کر دیتا ہے۔ حالانکہ لب ولہجے کے متعلق خود ہی ابتدا میں ارشاد فرما چکے ہیں کہ شعر میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، سلاست بیان اور سادگی و ترنم کی صفا موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں لب ولہجے سے ابتذال ہونا ممکن ہی نہیں۔

اس شعر میں رونے اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے، بیان واقعہ ہے نہ کہ صورت حال جس شخص کا نشیمن پھونک دیا گیا ہے وہ نشیمن پھونکنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے بے خانماں کرنے والے کیوں حال پوچھ کر جلے ہوؤں کو اور جلاتا ہے۔ اب ہماری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ کبھی خاک نشیمن پر روتے ہیں کبھی انتہائے غم وجوش محبت میں اس خاک پر سجدے کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قائل اس وقت نہ تو رو رہا ہے اور نہ سجدے کر رہا ہے۔ متخیلہ کہنے والے کی تصویر حزن و یاس پیش نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدے کرنے کی" [1]

بیخود موہانی کے اس شعر پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ۱۹۲۶ء میں اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں نتیجہ خیز اور دلکش بحث کی تھی۔ فراق نے اس شعر پر اعتراض ۱۹۳۶ء میں کیا ہے۔ یعنی دس برس پہلے شائع ہونے والی کتاب اور اہم کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری تھی ورنہ وہ اس طرح کا بھونڈا اور مضحکہ خیز اعتراض نہ کرتے۔ یہ تو فراق کے افسوس ناک مطالعہ کا عالم تھا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اس شعر کی توضیح وتشریح اور تفہیم اس طرح پیش کی ہے ملاحظہ ہو :-

"جن لوگوں نے ہمارے ادبیات کی سیر کی ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو کا ایک ایک شعر کہاں کہاں نقل کیا جاتا ہے اور ہر جگہ ایسا ٹھیک بیٹھتا ہے گویا وہ اسی جگہ کے لئے ہے۔ یہ خوبی انھیں تمثیلی الفاظ کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ جس شعر میں کوئی بات گل وبلبل کے پردے میں یعنی تمثیلی پیرائے میں کہی جاتی ہے اس کے مفہوم میں بڑی وسعت آجاتی ہے۔ وہ شعر کسی ایک مخصوص واقعہ کا بیان ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ ایک طرح سے کئی واقعات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ مولوی محمد احمد بیخود کا ایک شعر ہے ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاک نشیمن پر

جن لوگوں کے نزدیک اردو شاعری میں گل وبلبل کے سوا کچھ نہیں ہے ان کا ذہن تو نشیمن پھونکنے کا ذکر سن کر بلبل اور صیاد کی طرف منتقل ہو گیا ہوگا۔ ان کو اس شعر میں کوئی خوبی نظر نہ آئی ہوگی۔ بلکہ دوسر

[1] کلیم دہلی ۱۹۳۶ء۔

مصرعے کا یہ ٹکڑا " کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاک نشیمن پر" کچھ بے محل اور بے جوڑ سا معلوم ہوا ہوگا۔ مگر جو لوگ انسانی فطرت کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں، شاعرانہ انداز بیان سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے شاعر انسانی زندگی کے واقعات تمثیل کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں وہ اس فقرے کو معنوی حیثیت سے شعر کی جان اور اس شعر کو فطرت کا ترجمان کہیں گے۔

ذیل میں چند باتیں پیش کی جاتی ہیں جو اس شعر کے سمجھنے میں مقدمات کا کام دیں گی اور جو گویا اس زینے کی سیڑھیاں ہیں جو ذہن کو شعر کے الفاظ سے شاعر کے دل تک پہنچا سکتا ہے۔ شاعر کی نگاہ میں نشیمن اور اہل نشیمن کی کل کائنات ان کی دنیا ان کا سب کچھ ہوتا ہے۔

..... انسان کو اپنے گذشتہ عیش و آرام کی یادگاروں سے ایک خاص محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنی تباہی اور بربادی کی نشانیوں سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے اور جس مقام پر وہ تباہ و برباد ہوتا ہے اس سے بھی دل کو خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ خاک نشیمن میں رہنے والوں کے لئے اپنی گذشتہ عیش و آرام کی یادگار بھی ہے، اپنی بربادی کی داستان بھی ہے اور اپنی تباہی کا مقام بھی۔

اس شعر میں سجدے کرنا محض تعبیر شاعرانہ ہے۔ جب کسی حسرت نصیب دکھیاری ماں سے اس کا لاڈلا بیٹا ہمیشہ کے لئے چھٹ رہا ہو اس وقت یہ جگر خراش منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ فرط اضطراب و شدتِ غم سے وہ کبھی مرنے والے کے منہ پر منہ رکھ دیتی ہے کبھی اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتی ہے۔"

اس ذیل میں میر انیس کا ایک بند، مومن کا ایک شعر بھی بطور ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مزید رقم طراز ہیں :۔

" شعر کے جس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسے ذہن میں رکھئے اور دیکھئے کہ اردو شاعری کی جو خصوصیت زیر بحث ہے اسے یہ شعر کہاں تک واضح کرتا ہے۔ مجھے دکھانا یہ ہے کہ اس شعر میں شاعر نے انسانی زندگی کا ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک طرح کے کل واقعات بیان کر دیئے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ انسانی فطرت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ جب کبھی اس طرح کے سامان جمع ہو جائیں گے تو انسان کے دل پر کیا گزرے گی اور جذبات کا اظہار کیوں کر ہوگا۔"[1]

اس کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے تین ایسے واقعات تحریر کئے ہیں جن سے متاثر ہو کر انھیں مندرجہ بالا شعر بار بار اور بے اختیار یاد آیا تھا۔ واقعات نقل کرنے کی گنجائش نہیں لیکن "ہماری شاعری" میں یہ واقعات درج ہیں جو پڑھے جا سکتے ہیں۔

---

[1] ہماری شاعری پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔

اس قدر تفصیل پیش کرنے کا سبب اور مقصد یہ تھا کہ فراق کی سخن فہمی کا اندازہ ہوسکے بغیر تفہیم شعر وادب کے تنقید وتبصرہ کی اہم ذمہ داری لے لینا کیا معنی رکھتا ہے؟

"اندازے" کے علاوہ فراق کی دوسری کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" ہے جس کا پیش لفظ احمد سعید نامی ایک شخص نے لکھا ہے جو انتہائی بھونڈی اور غیر مدلل مداحی کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کے اقتباس پیش کرنے سے درگزر کرتا ہوں۔ اصل کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں فراق نے اردو شاعری پر ہونے والے اعتراضات کا جواب بھی اپنی علمی بساط کے مطابق دیا ہے۔ اردو شاعری پر یہ اعتراض ہے کہ یہ فارسی شاعری کی تقلید کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں فراق لکھتے ہیں:-

"اردو کی نظموں میں مثنوی اور رباعی، قصائد اور کچھ اور اصناف کو چھوڑ کر جہاں تک مرثیہ اور مسدس، اور حالی کی نظموں کا تعلق ہے ان کا تو پتہ بھی فارسی میں نہیں"[1]

فراق کا یہ تحریر کرنا کہ فارسی میں مرثیہ نگاری کا پتہ نہیں" اس سے فراق کے عبرتناک مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو مرثیے کی تعمیر وتشکیل میں فارسی مرثیہ نگاری کا گراں قدر تعاون واشتراک رہا ہے۔ فردوسی، فرخی، شیخ سعدی، امیر خسرو، سنائی، نظیری، عرفی، محتشم کاشی، قاآنی، محمد جان قدسی ظہوری اور مقبل وغیرہ فارسی مرثیہ نگاروں نے اردو مرثیے کو فنی حیثیت سے بہت حد تک آراستہ و پیراستہ کیا ہے"

مشرقی ادبیات کی تنقید میں علم معانی، علم بیان اور علم بدیع پر مرکزی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ جو نقاد، ان علوم سے عاری ہوگا وہ تنقید نگاری کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اس کے ساتھ ہی علم العروض اور علم القوافی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ بقول پروفیسر عابد علی عابد:-

"معانی، بیان اور بدیع کا معاملہ دوسرا ہے۔ جب تک نقاد کو ان تینوں پر عبور نہیں ہوگا قدم اسلوب انتقاد کے مطابق وہ ادبی تخلیقات کی قدر وقیمت متعین نہ کرسکے گا"[2]

افسوس ہے کہ فراق معانی، بیان، بدیع اور عروض سے اس قدر ناواقف تھے کہ تمام عمر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ہاں ان کا نعرہ ضرور انھیں بے اعتدالیوں کے باوجود مشہور بنائے رہا اور غریب اردو والوں کی معصومیت اور بھولے پن کے باعث وہ تنقید نگاری کے میدان میں بھی کود پڑے۔ لیکن خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ وہ سنجیدہ، متوازن علمی وادبی مسائل پر اظہار خیال کرنے کی صلاحیت

---

[1] اردو کی عشقیہ شاعری۔ فراق

[2] اصول انتقاد ادبیات۔ پروفیسر سید عابد علی عابد۔ ص ۱۴۰

ہی نہیں رکھتے تھے۔تنقید نگاری ایک مقدس سنجیدگی کا نام ہے۔بیہودہ گوئی، فقرے بازیاں اور پھبتیاں کسنے کا نہیں۔ان کی تنقیدی رائے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔داغ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

یہ (داغ) شخص ہماری شاعری کی بدقسمتی ہو کر بھی ہماری شاعری کی ایک بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ہمیں اپنی تہذیب میں مناسب موقعوں پر شرارتوں کو بھی جگہ دینا چاہئے۔داغ شرارت کے انھیں موقعوں کا شاعر ہے۔اس شخص نے حرم زدگی کو GENIUS کا مقام عطا کر دیا ہے[1]۔"

ظاہر ہے کہ فراق کی یہ رائے خود بہت بڑی..... زدگی کی دلیل ہے۔اس سے GENIUS کی ... بے حرمتی ہوتی ہے۔لیکن فراق کا GENIUS کے متعلق نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔دراصل فراق استقادی اقدار کو برت سکنے کے اہل نہیں تھے۔مندرجہ بالا مثالوں سے ان کی تنقیدی دلالتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

فراق ردیف و قافیہ کو زبردستی کی چیز سمجھتے تھے مگر خود ردیف و قافیہ کی شاعری بھی کرتے تھے۔وہ نہ تو تنقید نگاری کے باب میں غور و فکر سے کام لے سکتے تھے اور نہ اپنی شاعری کے ذریعہ کوئی معیار بنا سکے بلکہ تنقید کو بھی اپنے جذباتی اور ہنگامی کاروبار شوق کے طور پر اپنایا۔انھوں نے اردو ادب کا بھی تفصیل سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین:۔

"اگرچہ انھوں نے بہت سے نئے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف نہیں پڑھی ہیں یا ادھر ادھر سے پڑھی ہیں مگر وہ ان کا ذکر ہمیشہ سننا چاہتے ہیں اور اس "نہ پڑھنے" کی کمی کو وہ دوسروں سے بحث کر کے پوری کر لیتے ہیں[2]۔"

سن کر اور بحث کر کے سمجھنا اور بات ہے لیکن ٹھنڈے دل سے پڑھ کر سمجھنا الگ اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔علم و ادب میں صرف سننا اور بغیر پڑھے ہوئے یوں ہی زبانی بحث کرنا جرم ہے۔فراق نے صرف شعراء و ادباء کا ہی نہیں مطالعہ کیا تھا بلکہ قدیم شعراء و ادباء کا بھی انھوں نے ذمہ داری سے بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا۔بس وہی سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے تنقید کے ہوائی قلعے تیار کرتے رہتے تھے۔یہی سبب ہے کہ ایک ہی مضمون میں دو چار جملوں کے تقدیم و تاخیر سے وہ جو باتیں کہہ چکے ہیں ان کی دھڑلے سے تردید بھی کرتے جاتے ہیں۔ایک مقام پر حسرت موہانی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] اندازے۔فراق گورکھپوری

[2] بحوالہ نیا دور۔فراق نمبر حصہ اول

"بحیثیت مجموعی اور نفس شاعری کے لحاظ سے اگر وہ کسی سے کم ہیں تو میر، آتش اور غالب ہی سے کم ہیں اور کسی سے نہیں۔"[1]

اور اس کے فوراً بعد ہی اس انداز سے اپنی تنقیدی بے بضاعتی کا اعلان کرنے لگتے ہیں:۔

"میں نے حسرت کے منتخب اشعار کا انتخاب دینے سے پہلے ان کے معاصرین کے منتخب اشعار دیئے ہیں۔ ان میں بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں، جو جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے حسرت کے اشعار سے بہتر، زیادہ حقیقی اور کہیں پُر تاثیر ہیں۔"

فراق کے ان تنقیدی چٹکلوں سے بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ آخر کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو وہ حسرت موہانی کو بحیثیت مجموعی میر، غالب اور آتش کے بعد بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف حسرت کے معاصرین شعراء کے حوالے سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ معاصر شعراء حسرت سے زیادہ بہتر اور حقیقی اور پر تاثیر شعر کہتے ہیں۔

تنقیدِ فراق کی یہ ہرزہ سرائی، ریزہ خیالی، علمی کم مائگی اور فنی بے بضاعتی مشتے نمونہ از خروارے پیش کر دی گئی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی ہر تحریر اسی طرح کی ناہمواریوں اور غیر سنجیدہ رویوں سے بھری پڑی ہے، یہ سب خامیاں اس لئے ہیں کہ فراق اول و آخر شعر کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شاعری میں تو شکست ناروا کی دلیلیں بھی چل جاتی ہیں۔ مگر نثر اور خاص طور سے تنقید کی نثر میں مضحکہ خیز بن جاتی ہیں۔ □

---

[1] نگار حسرت نمبر ص ۲۳

مصور سبزواری

P.O. NUH

DISTT. GURGAON, HARYANA

غزلیں

کئی زمانوں کے دریائے نیل جیسے لگے
تو وقت تھا جو مجھے لاکھوں میل چھوڑ گیا

نہ بھیگے ہونٹ ابھی کم ظرف دشت و دریا کے
کوئی حسین لہر کی سبیل چھوڑ گیا

سب ایک سے تھے طلوع و غروب جاں اس کے
جدائیوں میں بھی نقشِ جمیل چھوڑ گیا

میں مردہ پانیوں میں چاند سا رواں دیکھوں
وہ ورثے میں مجھے خواہش کی جھیل چھوڑ گیا

میں زندہ سچ تھا سمندر کی گونج کی صورت
گواہی نے نہیں پایا دلیل چھوڑ گیا

تھے اس کے ساتھ زوال سفر کے سب منظر
وہ دکھتے دل کے بہت سنگ میل چھوڑ گیا

دہلیز کا بھی آخری پتھر اکھڑ گیا
لوٹے ہوا اب کیسے جب گھر اجڑ گیا

مٹھی میں جس کی بند تھا اس عہد کا سکوں
وہ برکتوں کا ہاتھ تو آندھی میں جھڑ گیا

اذنِ سفر کو دینے سے پہلے ہی سوچتے
بچھڑے گا وہ سدا کے لئے گر بچھڑ گیا

پھنکارتی ہے وعدہ کی شام اژدہا صفت
لگتا ہے اس کے رستے میں سیلاب پڑ گیا

مصلوب اس خلوص سے اس نے کیا مجھے
سر میں وہ اپنی یاد کے ناخن بھی جڑ گیا

اب صرف رینگنا ہے منزل نہیں ہے تو
اک نیزہ تیرے نیزے سے آگے بھی گڑ گیا

رؤف خیر

۹-۱۰-۲۰۷/۱۴، دلاور شاہ نگر
رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد
۵۰۰۰۰۸

غزلیں

عجیب درد اٹھالائے داغ کے بدلے
نیا چراغ پرانے چراغ کے بدلے

پتہ نہیں یہ اسیری ہے یا غریبی ہے
اسے نصیب ہے سب کچھ فراغ کے بدلے

ہمیں یہ علم ہے کس حرف کو کہاں برتیں
دماغ رکھ نہیں دیتے ایاغ کے بدلے

یہ مانا ہوگا پہاڑوں کے اس طرف سب کچھ
برا ہی کیا ہے یہ گھر سبز باغ کے بدلے

ہر ایک بات مدلل نہیں ہوا کرتی
کبھی تو دل کی بھی سن لو دماغ کے بدلے

وہ رات کٹ گئی اس کو تو خیر کٹنا تھا
اب آفتاب سنبھالو چراغ کے بدلے

اب اس قدر بھی تو خانہ خراب ہم نہ ہوئے
ملال یہ ہے تمھیں دستیاب ہم نہ ہوئے

کتاب ہم نہ ہوئے انتساب ہم نہ ہوئے
ترے لئے نگہِ انتخاب ہم نہ ہوئے

ہمیں قریب سے دیکھو کہ دور سے دیکھو
کبھی کسی کے لئے بھی سراب ہم نہ ہوئے

ہمارا عشق تو سچا تھا عمر کچی تھی
ہزار سیل تھا، غرق چناب ہم نہ ہوئے

ہماری راہ میں روڑے خرد نے اٹکائے
جنوں کا سلسلۂ اکتساب ہم نہ ہوئے

اسی ملال میں آنکھوں بھر برستے ہیں
اس ایک دشت کے حق میں سحاب ہم نہ ہوئے

ہنر ہی ایسا ہے چمگادڑوں پہ کیا کھلت
رؤف خیر چلو آفتاب ہم نہ ہوئے

طارق جامی
ص۔ب۔ ۵۹۹۵،
الریاض، سعودی عربیہ

غزلیں

روز جو کچھ لوگ کہتے ہیں کہانی ہی نہ ہو
رات بھر پھنکارتا ہے جو وہ پانی ہی نہ ہو

بیٹیاں دے کر بہت خوش ہیں، چلا جائے گا وہ
کیا خبر اس نے ہماری بھینٹ مانی ہی نہ ہو

اس کے استقبال کو، اپنے سروں کو کاٹ کر
یوں نہ ہو، وہ آئے اور کوئی نشانی ہی نہ ہو

جو بھی آتا ہے، وہ پانی میں اگاتا ہے محل
اس کی بھی رنگین بیانی، لن ترانی ہی نہ ہو

وہ ذہانت سے مری مرعوب ہے بے شک مگر
کیا پتہ کہ اس نے میرے دل کی جانی ہی نہ ہو

ہیں ابھی پردیس کے کتنے برس، کس کو خبر
پھر کبھی لوٹوں تو یہ پاگل جوانی ہی نہ ہو

کہاں جا اترے ہیں ہائے پرندے
مرے بچپن کے ہمسائے پرندے

سماعت میں ترنم گھل رہا ہے
یہ کس نے لب پہ مہکائے پرندے

اندھیروں میں رہے شمعوں سے غافل
مرے بھائی، وہ ماں جائے پرندے

منڈیروں پر اداسی لکھ گئے ہیں
اسیروں نے یوں پھترائے پرندے

ضرور آنے کو ہے طوفان کوئی
کیوں پھرتے ہیں یوں بھنورائے پرندے

گلوں پر تتلیاں مرجھا گئی ہیں
درختوں پر ہیں کمھلائے پرندے

امرھاڈے

اس دھرتی کا انسان

دھرتی پیاسی پیاسی ہے
امبر بھی ہے اب آس لگائے
دھند میں لپٹی لالی ہے
جھیل کی گہری آنکھوں میں
جب چندا نے چہرہ دیکھا
کچھ داغ بھی اپنے دل کے تھے
کچھ جھیل کی اندھی آنکھیں تھیں
سورج کی کرن روشن روشن
اتری پھولوں کی شبنم پر
سب آنسو اس کے خشک ہوئے
پھولوں کی نمی بھی دفن ہوئی

تب دھوپ صحن میں پنکھ پسارے
بچوں کو چمکاتی تھی
گورے گورے ان مکھڑوں پر
کالے سائے رقص کرتے تھے
ہر گام پہ دھوکا قطروں کا
جم گھٹ ہے بےحال بے سدھوں کا
کچھ دیوانے کا خواب بھی تھا
کوئی فرزانہ فرقاب بھی تھا

کوئی انجانا ـــ کوئی بیگانہ
کوئی بھولا بسرا افسانہ
اجلے کالے ان سایوں میں
سب کھیلیں آنکھ مچولی
کچھ ہنسنے کی
کچھ رونے کی
آواز بھی آنے لگتی تھی
ہر سمت انھیں پرچھائیں تب
اک رقص کرانے لگتی تھی

جیون کی سونی راہوں پر
اک بھیڑ سی تب لگ جاتی تھی
کچھ آنکھ ملاتے ڈرتے تھے
کچھ آنکھ دکھا کر ہنستے تھے
کچھ آنکھوں کی چنگاری سے
بے گور و کفن ان لاشوں کی
شمشان کی اس ویرانی میں
اندھوں کی طرح اندھیاروں میں
اپنی ہی چتائیں جلاتے تھے ـــــ!

شفیع جاوید

منزل

حضرت داتا شاہ قلندر کے عرس پر اس سال بھی دیارے کے یادو اور باون ٹولے کے راجپوت
ل ندی سے اپنی کشتیاں اتار کر اور انھیں گنگا کے تیز پوربی دھارے سے بچا کر آئے تھے۔ لہروں سے
ن آلود گنگا کے کنارے مضبوط جڑوں والے برگد اور پیپل سے اپنی کشتیوں کو ایال والے گھوڑوں کی طرح
رہ کر پہلے تو ان سبھوں نے گنگا اشنان کیا پھر پیلی دھوتیاں پہنیں اور گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر شو مندر
، جل چڑھایا اور تب سرخ ساٹن پر طبق کی چھاپ والی چادریں اپنے اپنے کاندھوں پر لئے جاپ
تے ہوئے دھوپ دان میں سلگی ہوئی کوئلے کی ٹکیاں رکھ کر مزار کے احاطہ میں داخل ہوئے۔ نوبت خانہ
نکوں کی چوٹ پڑی اور ڈنکے اس وقت تک بجتے رہے جب تک وہ چادر چڑھاتے اور دھوپ دان
اتے رہے۔ پھر گرم گرم جلیبیوں سے بھرے دونے گھونگھٹ کاڑھے ان کی عورتوں نے سید صاحب
نشین کے آگے تازہ بنائے ہوئے رنگولیوں پر رکھ دیئے۔ حسب دستور سید صاحب نے ان کے فاتحے
اور آنچل کے کھونٹ سے نکلے ہوئے چاندی کے روپئے انھیں رنگولیوں پر رکھ دیئے گئے۔ جہاں سے
بوں کے دونے اٹھائے گئے تھے۔ گھمن گھیری شام اگر بتی، دھوپ اور لوبان کے دھوئیں سے بھر کر خوشبو
ؤں کی طرح بھول بھلیاں بن گئی اور گنگا تٹ پر سب کچھ کھویا کھویا سا لگنے لگا۔ مزار کے احاطہ میں پہلے
وہ دیئے جلے جن کی بتیاں تیسی کے تیل میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر سماع خانہ کی وہ قندیلیں روشن
میں آلام باغ کے موم کی بتیاں عرس کے لئے خاص طور سے بنوائی جاتی تھیں۔ دوکاندار اور
خوانچے والے دن بھر کی ہما ہمی کے بعد سست پڑ گئے۔ رات ایک گھڑی گذری تو محفل سماع کے
ندوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سماع خانہ کے صحن میں باون ٹولے کی سرخ دری بچھا
سے ایک طرف پیتل کا پنج دیا رکھ دیا گیا جو ہر سال ان کی کشتی میں ساتھ آتا تھا اور
۔ ساون کی چڑھی ہوئی گنگا کی کروٹ میں داتا کا مزار جو خاصی بلندی پر تھا نہ جانے کیوں پر اسرار
ن بھی لگتا تھا اور پر اسرار بھی۔ یہ اسرار اس وقت اور بھی گہرا ہو جاتا تھا جب کبھی آنے

والی کی نگاہ ملگجی چاندنی میں مزار سے ملحق چھوٹی سی مسجد پر پڑ جاتی تھی جو فاطمہ کی مسجد کے نام سے مشہور تھی اور ہمیشہ بند رہتی تھی یہاں تک کہ سید صاحب بھی اس میں داخل نہ ہوتے تھے۔

تاریکی اور خاموشی گہری ہوئی تو نوچندی جمعرات کی وہ رات پہلے تو خوشبو بنی پھر کچھ اور بھیگ کر جادو بن گئی لیکن غضب تب ہوا کہ جب چار گھڑی رات بیت جانے کے بعد سارنگی، طبلے اور ہارمونیم کی سنگت میں ککن قوال اور ہمنوا نے خسرو کا پرسوز دوہا چھیڑا اور ے گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس ـــــ والے بول پر الاپ لیا تو اچانک خان بہادر سید شاہ کمال حسن صاحب پر حال کا ایسا دورہ پڑا کا انھوں نے یا حق کہہ کر ایک جست لگائی اور جب زمین پر واپس آئے تو ان کی روح مقدسہ اوپر چلی گئی ـــــ سارنگی کے تار خاموش ہو گئے کہ اب جنازہ کا معاملہ درپیش تھا اور داتا کے قل کا وقت بھی قریب تھا۔ محفل سماع اکھڑ گئی اور لوگ گھبرائے گھبرائے مزار کے احاطہ میں جمع ہونے لگے کہ مزار کو غسل دینے میں ثواب پا دیں اور صندل کا تبرک حاصل کر سکیں۔

ایسے سوگوار اور سحر آفریں لمحے میں سماع خانہ کے ایک گوشہ میں اپنے جوان بیٹے کے ساتھ بیٹھے ہوئے فراز احمد کو مزار کے بائیں جانب کا بند حجرہ نظر آیا اور یہ یاد آیا کہ برسوں قبل وہ یہاں اندھیرے شاہ کی خدمت میں چار گھڑی رات بیت جانے کے بعد ہی حاضر ہوا تھا، انھیں کسی نے روشنی میں نہ دیکھا تھا، یہاں تک کہ حضرت داتا کے مزار کے مجاور نے بھی صرف آواز ہی سنی تھی، اس سے آگے اور کچھ نہیں ـــــ وہ رات بڑی سرد اور پُراسرار تھی جب اس نے گاڑی کا اگنیشن آف کیا، اپنے پائپ کی راکھ جھاڑ کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا، اوور کوٹ اور فلیٹ کیپ پہنا، فاطمہ احمد علی (جس سے وہ شادی کا ارادہ رکھتا تھا) کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ناہموار زمین پر اتر گیا۔ فاطمہ مزار کے احاطہ میں ہی کھڑی رہ گئی اور فراز نے سیڑھیاں چڑھ کر حجرہ کے بند دروازہ پر دستک دی تو اندر سے تلاوت کی آواز آنی بند ہو گئی ـــــ وقفہ کے بعد اس نے دوسری بار نہایت ہی باادب دستک دی

"کون ہے؟"

"ایک عقیدت مند"

کیل دار کواڑ ڈراؤنی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ حجرہ کے اندر تاریکی باہر کے مقابلہ میں دونی تھی۔

"سلام علیکم، فرمائیے"

"جی۔ وہ ذرا کچھ روشنی ہوتی تو"

"اگر تاریکی کے لئے تمھارے پاس روشن آنکھیں نہیں تو پھر کبھی آنا۔ فی الحال رحیم پور کے لکڑہارے کے پاس چلے جاؤ" سیل دار کواڑ ڈراما ئی آواز کے ساتھ جس طرح کھلا تھا ویسے ہی بند ہوگیا اور اس کے باہر اندھیرے شاہ کی گونجدار آواز اور سرد رات رہ گئی۔ جب فراز احمد واپس لوٹا تو فاطمہ دہشت اور سردی سے لرز رہی تھی۔ اس نے رکتی ہوئی آواز میں صرف اتنا پوچھا "اب رحیم پور بھی جاؤ گے؟"

"ہاں"

"پتہ نہیں تمھارا کیا چکر ہے؟" وہ خاموش رہا۔

"کبوتر شاہ، غوث شاہ، بھول شاہ اور یہاں اندھیرے شاہ اس کے بعد اب لکڑہارے کے پاس" ـــ اداسی کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ فراز نے خاموشی سے اگنیشن کی کنجی گھمائی، ہیڈلائٹس آن کئے تو دبیز کہرے میں روشنی کی لکیریں بنتی چلی گئیں۔

دھول میں اٹی ہوئی شیورلے جب تین پہاڑی کے بیچوں بیچ پہنچی تو لوگوں نے بتایا کہ رحیم پور وہاں سے پورے ایک کوس پر واقع ہے۔ سیٹ کی پشت سے سر لگائے فاطمہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے کچھ سینڈوچز ساتھ لائے ہیں، وقت نصف النہار ہے، کھالو تو کافی پی جائے" تب اس نے سڑک کے کنارے چھتنار درخت کے نیچے بریک لگائے اور بولا۔

"کل رات ہم نے پوچھا تھا، یہ کیا چکر ہے؟"

"ہاں، لیکن اب میرا خیال بدل گیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کہ یہ چکر نہیں بلکہ گھن چکر ہے۔"

"بہر کیف! اسے تم جو کہو لیکن میں تمھیں بتا دوں کہ یہ میرے قلب کی درستگی کا چارہ ہے جس کے بغیر نہ تو سکون ممکن ہے اور نہ خود شناسی۔ میں برسوں سے ایک بیکار میں مصروف ہوں۔ تمھیں جو پریشانی ہو رہی ہے اس کے لئے معافی چاہتا ہوں، لیکن تم جب بھی مجھ سے اور میرے معاملات سے اوب جاؤ، مجھے الوداع کہہ دینا۔ مجھے قطعی کوئی ملال نہ ہوگا کیوں کہ آگے بھی بہتوں نے مجھے چھوڑ کر اپنی راہ لی۔"

"میں ایک بات کہوں مسٹر سید فراز احمد کہ یہ معاملہ تلاش رائیگاں کہلاتا ہے آخر کو ـــ کہ جناب عالی اب تو سکون کے نام پر خواب آور گولیاں ہیں اور قلب کے نام پہ وہ بیٹریاں ہیں جو اپنی مدت تک قلب کو درست رکھتی ہیں اور پھر آگے کی رفتار کے لئے انھیں بدل دیا جاتا ہے ـــ یہ تمھارا چکر بڑا ہی

آؤٹ آف ڈیٹ لگتا ہے مائی ڈیئر ۔۔۔ اس وقت مزار کے چاروں اور بڑے زور کا بین ہوا کہ کمال حسن صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا اور حضرت کے قل کا وقت قریب آگیا تھا اور مریدوں پر زار و قطار رونے کی کیفیت طاری تھی، مزار کو غسل دیا جا چکا تھا اور صندل کے تبرک کے لئے بین کرتے ہوئے لوگ بھی ایک دوسرے کو آگے پیچھے ڈھکیلنے پر تلے ہوئے تھے ۔۔۔ فراز کے پختہ جوان بیٹے کے لئے یہ بالکل ہی نیا تجربہ تھا، اس نے حیرانی سے چاروں طرف کے سوگوار اور گنگا کے کنارے دنیا کے اس یکتا منظر کو دیکھا اور پھر اپنے باپ کو جو گرد و پیش سے بے خبر اپنی گردن نہوڑائے جانے کیا سوچے جا رہا تھا۔ اس نے کھنکھار کر آہستہ سے پوچھا: "آگے کیا ہوگا بابا؟"

"تلاوت، قل اور فاتحہ پھر دعائیں، دل کی مرادوں اور تمناؤں کے لئے"۔۔۔ اس جواب کے باوجود ساری دنیا گھوم آنے والے بیٹے نے صاف محسوس کیا کہ اس وقت اس کا باپ وہاں نہیں کہیں اور تھا۔۔۔ اس سے اور اس گرد و پیش سے بہت دور۔

فاطمہ سے فراز کی ملاقات بھی عجیب تھی۔ وہ اتوار کا دن تھا، کافی ہاؤس کی نشست کے بعد اپنا پائپ جھاڑتا ہوا وہ باہر نکلا تو اس کی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا اور بے حد غلیظ جین، گھسے ہوئے جوتے اور گرد آلود بالوں سمیت وہ پچھلی سیٹ پر لمبی تانے سو رہی تھی۔ پہلے تو وہ بہت گھبرایا پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے تو سامنے اونچی بلڈنگ کی اونچی سیڑھیوں میں سے ایک پر ایک اس سے بھی زیادہ غلیظ ہپّی گانجا کے چلم پر پھونک مار مار کر ٹکیاں سلگانے کی کوشش میں مصروف نظر آیا۔ فراز نے اپنے طور سے سلسلہ جوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"SHE IS YOUR CHICK?"

"YES, BUT SHE'S COMPLETELY PASSED OUT"

"اسے میری گاڑی سے نکال تو لو"۔۔۔ اس نے اشارہ سے بھی اس ہپّی کو سمجھایا۔

"DON'T WORRY, TAKE HER, SHE'LL COME BACK" یہ کہہ کر اس ہپّی نے اپنے گندے دانت نکوس دیئے۔۔۔ جب وہ ہوش میں آئی تو فراز نے اسے باتھ روم کا راستہ بتا دیا۔ پھر اپنا ایک سلیپنگ سوٹ دیا۔۔۔ پرسکون ہونے کے بعد اس نے بڑی لمبی جماہی لی اور پوچھا: "تمہارے پاس کوئی شراب ہوگی؟"

"نہیں مجھے شراب کا کوئی شوق نہیں"۔ فراز نے نہایت خشک جواب دیا۔

"دیکھنے میں تو بڑے رئیس معلوم ہوتے ہو"۔

"میں ہوٹیس ہوں تو کیا شراب رکھنا بھی ضروری ہے ۔"

"THEN LET'S ABOUT IT TORGET" کاندھے اچکاتے ہوئے اس نے ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے مکھی اڑائی جاتی ہے ۔

۔ جیسے چوہتک کے گرد آلود راستے پر چھتنار برگد کے نیچے فاطمہ نے دوبارہ کہا " اور جانتے ہو پرانی بیٹریاں جو قلب کے لئے لگائی جاتی ہیں ، جب ان کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو کوڑے دان میں پھینک دی جاتی ہیں ۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے ہوسٹن (HUSTON) میں دیکھا ہے ۔"

" تمھارا جدید ترین فلسفۂ حیات تمھیں مبارک ہو ، میرے من کا راستہ ان پہاڑیوں اور ان گرد آلود سڑکوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے ۔" اس کے بعد کافی کے تلخ گھونٹ سرکتے لمحوں سے مصافحہ کر کے معدوم ہو گئے ۔

جب فراز نے گاڑی روکی تو رحیم پور کا لکڑہارا چمکتی دھوپ میں خشک ببول کی ٹہنیوں کو کاٹنے میں اس قدر غلطاں تھا کہ نہ اسے گاڑی کے آنے کی خبر ہوئی نہ اس کے رکنے کی اور نہ اس کا احساس کہ اس کا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا ۔ قریب پہنچ کر فراز نے ہلکے سے سلام علیکم کہا ۔ لکڑہارے نے ایسی نگاہوں سے پلٹ کر اسے دیکھا کہ فراز فوراً دوزانو ہو گیا ، پھر لکڑہارا بھی بیٹھ گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ دیر تک اپنے ہاتھوں میں رکھے ۔

" تمھارے آنے کی خبر ملی تھی ۔"

" جی ہاں ، ہدایت پاتے ہی میں چل پڑا ۔" فراز نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا ۔ پیچھے فاطمہ کھڑی تھی ۔ فراز نے گاڑی کی چابی اسے دیتے ہوئے کہا " تم اب جاؤ ، گاڑی لیتی جاؤ میں آجاؤں گا " فاطمہ نے ان دونوں کو حیرانی سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے واپس ہو گئی ۔ دن ، ہفتے ، مہینے ، سال ، کئی سال پھر ایک دن اچانک اس کی بہنوں نے فراز کو پاؤں پیدل بے حد تبدیل حلئے کے ساتھ فراز مینشن کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ۔۔۔ نہ وہ کسی سے کچھ بولا ، نہ کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت کی ۔ جب وہ اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو میز کے کونے پر کئی ایروگرام کئی سال قبل کی پوسٹل مہروں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے ۔ اس نے یکے بعد دیگرے انہیں کھول کر پڑھنا شروع کیا ۔

پہلا خط :

" میں بھی تمھاری ہی طرح نکل تھی لیکن نئی دنیا کی چکا چوند میں راحت ہی نہ ملا ، پھر میرا اعتماد اٹھ گیا ان باتوں سے ، جو کچھ سامنے نہیں ہے اب سکھ لئے کیوں آج کی عورتیں کو برباد کیا گیا ۔"

دوسرا خط :

"نطشے میں درشن اور جلوہ کی تلقین نے مجھے اور تباہ کیا۔ مجھے یہ بات بہت اچھی لگی کہ تم شراب نہیں رکھتے ہو۔"

تیسرا خط :

"جب میں شکاگو سے انقرہ جا رہی تھی تو مجھے ایک عجیب و غریب فقیر نظر آیا جو ہارورڈ سے فارغ التحصیل تھا، برسوں یو۔ این۔ او۔ کا نمائندہ رہ چکا تھا، ویسٹ ایشیا کے مسائل کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن ایک دن جانے کس نے اس کو کس نظر سے دیکھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بہار شریف چلا گیا اور برسوں اس غیر ترقی یافتہ علاقے کی خانقاہ میں رہ کر حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کا انگریزی ترجمہ کرتا رہا اور اب اس نے حضرت شہباز علیہ الرحمہ کے ملفوظات کا ترجمہ شروع کیا ہے۔ تمھاری طرح وہ بھی قلب کے لئے بیڑیوں کے استعمال پر اعتماد نہیں کرتا اور نہ خواب آور گولیوں کا عادی ہے۔ میں ان دنوں ان کے ساتھ بڑے آرام سے ہوں۔"

چوتھا خط :

"میری بے خوابی بڑھتی جا رہی ہے اور ساتھ ساتھ گولیوں کی تعداد بھی، دیکھو کہاں ٹھہرے ہے رخشِ عمر۔ شاید میرا سفر منزل کے لئے نہیں بلکہ صرف راستہ کے لئے ہے۔ میں ان دنوں اسپین کے اہم مقامات کو دیکھ رہی ہوں۔ کچھ تصویریں تمھیں بھیج چکی ہوں۔ مسجد قرطبہ کے ستونوں سے جب اس نے معانقہ کیا تو میری آنکھوں میں سیلاب آگیا۔ ان دنوں میں تاریخ کے ایک پروفیسر کے ساتھ ہوں۔"

پانچواں خط :

"میں نے پھر بڑی غلطی کی فراز ایک تو تمھارا ساتھ چھوڑ دیا، دوسرے یہ کہ قلب کا معاملہ یورپ اور امریکہ میں طے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں صرف دماغ کے معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ قلب کا معاملہ تو خالص ایشیائی ہے۔ لہٰذا میں اگلا خط تمھیں ایران سے لکھوں گی اور اس کے بعد ملتان سے۔"

ان ایروگراموں کے ساتھ دو لوکل خط بھی تھے۔

"آخر کار پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا، معلوم ہوا کہ تم اب تک واپس نہیں لوٹے ہو، اس لئے گزشتہ شب میں تنہا اندھیرے شاہ سے ملی۔ کرشمۂ قدرت کہ انھوں نے مجھ پر ترس کھایا اور

خود آشکار کیا۔ انکشاف کا یہ تجربہ عجیب تھا۔ اب اور کہیں نہیں جانا ہے۔"

"جانے تم کہاں ہو، میں نے سارا جگ ڈھونڈ لیا، کل داتا قلندر شاہ کا عرس تھا محفل سمع شباب پر تھی کہ اندھیرے شاہ کو اپنے حجرہ میں ہی ایسا حال آیا کہ وہ اپنے خالق سے جا ملے۔ اب میں اپنے کو بڑا بے سہارا محسوس کر رہی ہوں۔ کاش! تم ساتھ ہوتے۔"

رات کے آخری پہر کی باؤلی پروائی گنگا تٹ پر سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی، باون ٹولے کے راجپوت اور دیارے یادواب اپنی کشتیوں کو واپسی کے لئے کھولنے کی تیاری کر رہے تھے اور ان کی عورتیں صندل کا تبرک اور پیتل کے چمکتے ہوئے کلس میں گنگا جل لئے دھیرے دھیرے گھاٹ کی سیڑھیاں اترنے لگیں تو فراز نے اپنے بیٹے سے گلوگیر آواز میں کہا: "فجر کا وقت قریب ہے، نماز کے بعد چلیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ملحقہ مسجد کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا — تھوڑی دیر کے بعد داتا شاہ کے مزار کا مجاور ادھر سے گزرتا ہوا اس سے بولا: "سب لوگ تو چلے گئے، آپ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"صبح کی اذان ہو جائے تو نماز پڑھ لوں۔"

"تو آگے کی مسجد میں چلے جائیں۔ یہاں نہ تو اذان ہوتی ہے اور نہ نماز۔"

"کیوں؟

"دراصل یہ مسجد ایک ایسی خاتون کی بنوائی ہوئی ہے جو میں نے سنا ہے، دروغ برگردن راوی کہ وہ نیک چلن نہ تھی۔"

"ارے بھائی یہ تو خدا کا گھر ہے، کس نے بنائی اس سے کیا بحث۔"

"مجھے جو معلوم تھا میں نے بتا دیا، آگے آپ جانیں۔ ویسے آپ اس خاتون کی قبر پر بیٹھے ہوئے ہیں — دیکھئے یہ بھی گنہگاری کی بات ہوئی تاکہ اس نے مرتے وقت وصیت کر دی کہ اس کی قبر مسجد کی سیڑھیوں میں بنائی جائے۔"

فراز نے ہڑبڑا کر سیڑھی نما قبر سے اٹھتے ہوئے پوچھا: "کون تھی وہ؟"

"ادھر دائیں طرف سرہانے میں کتبہ لگا ہے، آپ پڑھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے مجاور آگے بڑھ گیا۔ ابھی مطلع صاف نہ ہوا تھا۔ فراز نے اوورکوٹ کی جیب سے گیس لائٹر نکال کر کتبۂ مزار کو پڑھنا شروع کیا۔ "فاطمہ احمد علی، وفات تاریخ —" یخ بستہ صبح کاذب کے باوجود اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور لائٹر بجھاتے وقت آگ اس کی انگلیوں کو چاٹ گئی۔ پھر وہ شکست خوردہ سا اٹھا جو تو

کو اتارا اور مسجد کے دروازے کی زنگ آلود زنجیر کو کھولتے ہوئے گھوم کر اس نے حیران پریشان کھڑے ہوئے اپنے بیٹے کو کہا۔

"بیٹا خدا حافظ، اب تم جاؤ۔"

"اور آپ؟"

"میں اب، اب، کہاں جاؤں گا؟"

"گھر پاپا، اور کہاں؟"

"اب کہیں نہیں جانا ہے بیٹا۔"

"جی؟" بیٹا تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں اب کہیں نہیں۔"

"پاپ اور فیلٹ کیپ پاپا؟"

"نہیں اب ان کی کوئی ضرورت نہیں، تم جاؤ۔"—— ایرکنڈیشنڈ مرسیڈیز میں بیٹھتے ہوئے بیٹے نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بوڑھے باپ کو برسوں کی ویران بند مسجد کے دروازہ میں داخل ہوتے دیکھا اور جب گلی کا موڑ کاٹ کر وہ کار بڑی سڑک پر پہنچی تو فاطمہ کی مسجد سے فجر کی پہلی اذان بھرائی ہوئی آواز میں بلند ہو رہی تھی۔ ☐

رفیعہ شبنم عابدی
لکچرر شعبۂ اردو
مہاراشٹر کالج، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بے بسی

چیختی، چنگھاڑتی بسوں کا اژدحام ہے
چیونٹیاں سی رینگتی ہیں ہر طرف
موٹے تازے کیکڑے
کار کے چکنے خول میں چھپے ہیں
جن کے بھاری بوجھ سے
دبی ہوئی کراہ میں
ننھی ننھی مچھلیوں کا غول ہے
سبز اور سرخ
نیلی، پیلی، دودھیا
پھسلتے جسم کی
حسیں، جوان مچھلیاں
نیلگوں و بیکراں سمندروں
کے
خواب دیکھتی ہوئی
جزیرہ ہائے پرسکوں کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ریت کی تلاش میں
نہ جانے کب سے منتظر ہیں
دور
ساحلوں پہ
سیپیوں سے کھیلتی ہوئی
شوخ انگلیوں کی
پھول سی ہتھیلیوں کے لمس کی
مگر —
وہ اپنا سر گھمائیں کس طرح
کہ ہر طرف
تو
نرم نرم
ریشمیں
رنگ برنگ
ڈوریوں کا
اک حسین جال ان کے
آس پاس ہے!!

عزیز قیسی

۹۔ موہن کرافٹ آف کارٹر روڈ
باندرہ، بمبئی ۵۰

تری مری عمر کا سمندر

کنویں کی سنگین منڈیر سے متصل
اداس پیاسا اکیلا سوکھا ببول
کب سے
اٹھا کے دو ہاتھ لکڑیوں کے
سمندروں کو پکارتا ہے
اور اس کا سایہ تمام دن دھوپ سے پریشاں
کنویں کے پانی میں چھپتا پھرتا ہے ——
سورج،
یہ سوچتا ہے ——
نہ سائے کی پیاس ہی بجھے گی
نہ پیڑ سیراب ہو سکے گا
کنویں کا پتھر
خود اپنی بے مائگی پہ نادم،
یہ کہہ رہا ہے ——
تری مری پیاس —— زندگانی
تری مری آرزو —— یہ پانی
یہی کمی ہے یہی ہے اتمام تیرا میرا
تری مری عمر کا سمندر کہیں نہیں ہے
تری مری عمر کا سمندر یہیں کہیں ہے۔

خدا سے ڈرنے والے

مال و اسباب پر
آل اولاد پر
ہاتھ آئی ہوئی عورتوں پر
وہ ہر روز اپنی وراثت میں پایا ہوا
تالا جب ڈال دیتے ہیں۔
چابی کو جب جیب میں اپنی محفوظ کر لیتے ہیں
تب ٹھکانوں سے باہر نکلتے ہیں
سب کے پاس ایسا ایک تالا ہے
سب کو اس کا یقیں ہے
کہ اس تالے کی دوسری کوئی چابی نہیں ہے
(لیکن یہاں جسم و جاں ذہن و ایماں، جنون و خرد کے
بندھے ان بندھے دام پر
سبھی تالوں کی چھوٹی بڑی چابیاں
کھلے بازار میں روز بکتی ہیں)
اور پھر جس طرح بن پڑے
دوسروں کے ٹھکانوں کے تالوں کو سب کھول لیتے ہیں
اور جس قدر بن پڑے
اپنی جیبوں کو بھر کر، ٹھکانوں پہ اپنے پلٹ آتے ہیں
اور جب دیکھتے ہیں
مال و اسباب، محفوظ و مقبوض ہے
آل و اولاد مامون و مقفول ہے
عورتیں پاک و مستور ہیں
شکر کرتے ہیں اپنے خداؤں کا
اور یہ دعا مانگتے ہیں —— کہ یونہی سدا
ساتھ ایمان اور آبرو کے سلامت رہیں

شکیل اعجاز

(انشائیہ)

ریڈیو

ریڈیو عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے آواز نکلتی ہیں اور دوسرے وہ جو خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔

بولنے والے ریڈیو کی دل شکنی یوں کی جاتی ہے کہ اس کے بولتے ہی لوگ بھی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک کلاس ٹیچر کی بے عزتی یہ ہے کہ اس کے بولتے وقت بچے باتیں کریں۔ ایک مقرر کے لئے یہ باعثِ ذلت ہے کہ وہ تقریر کرے اور لوگ گفتگو کریں۔ پھر ریڈیو کیسے گوارہ کرے کہ اس کے بولتے وقت سامعین بھی بولتے رہیں۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے اکثر ایسے منظر دیکھے ہیں کہ چند اشخاص روم میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ باتوں کا ذخیرہ ختم ہوا، محفل میں سناٹا چھایا اور کسی نے ریڈیو آن کر دیا۔ واہیات قسم کے گیت خاموشی سے سنے جا رہے ہیں اور جیسے ہی کوئی پسندیدہ گیت بجا ہر شخص نے باری باری اس کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ یہ قصیدہ خوانی گیت بجنے تک جاری رہتی ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر افسوس کیا جاتا ہے کہ اُف ـــ اتنا اچھا گیت باتوں میں نکل گیا۔ اس کے بعد طویل خاموشی اس وقت تک چھائی رہتی ہے جب تک دوسرا اچھا گیت شروع نہیں ہوتا۔

ہر شخص اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کسی چیز کا استعمال کرتا ہے، اس لئے ایک ہی چیز کے کئی استعمالات ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کا گنجا سر موسم کا حال معلوم کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جوتے، پیر میں پہننے کے علاوہ سبق سکھانے کے لئے، ٹوپی، سر چھپانے کے علاوہ چندہ مانگنے کے لئے۔ کھڑکی کے پردے، راہگیروں کی نظروں سے بچنے کے علاوہ تاک جھانک کرنے کے کام بھی آتے ہیں۔ کتاب کو لے لیجئے۔ بظاہر یہ علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہے ہزاروں میں تین چار ایسے بھی نکل آئیں گے جو واقعی اس سے علم حاصل کرتے ہوں گے لیکن عموماً یہ کثیر الاستعمال پائی جاتی ہے۔ امی اسے ادھر ادھر پھینک کر غصہ کا اظہار کرتی ہیں۔ بچے ورق ورق الگ کر کے شرارتوں کی ابتدا کرتے ہیں۔ دوکاندار اس میں شکر،

دال، نمک وغیرہ باندھ کر پیسہ کماتے ہیں۔ اور تو اور بلّی اپنے بچّوں کو شکار کرنے اور جھپٹنے کی تربیت دینے کے لئے بھی اس کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ بالکل اسی طرح ریڈیو کے بھی کئی استعمال ہیں۔ نوجوان فلم گیت سنتے ہیں اور ان لوگوں کی عقل پر سخت حیرت کرتے ہیں جنھیں سنگیت سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ جوانی اور بڑھاپے کے بیچ لٹکنے والے لوگ اپنے کانوں پر زیورات کی طرح عالمی خبریں سجاکر گھومتے ہیں۔ سائنسی ایجادات اور تحقیقی انکشافات پر آنکھیں لگائے رہتے ہیں (یہ لوگ خبریں سنتے وقت ریڈیو کو غور سے دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔) عمر رسیدہ افراد کے لئے اس کا کچھ الگ مصرف ہوتا ہے۔ گھر میں متفرق خیالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی پروگرام تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ابھی دادی اماں نے تلاوت لگائی اور منّے میاں نے جو ٹیبل کے نیچے چھپے بیٹھے تھے، چپکے سے لطیفے لگا دیئے۔ آبا جان کا گذر کمرے میں ہوا تو انھوں نے خبروں کی طرف سرکا دیا۔ اب ادھر سے دادی اماں خفا ہو رہی ہیں کہ اس گھر میں سارے شیطان بھرے ہوئے ہیں، نہ خود روزہ نماز کرتے ہیں، نہ مجھے آخرت سدھارنے دیتے ہیں۔ ابھی تلاوت لگائی تھی میں نے۔ یہ کس نے سرکا دیا؟ ابا جان اور منّے میاں جو دادی اماں کے مجرم ہیں ان کی نظریں بچاکر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ منّے میاں آنکھیں پھیلاکر اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ نے ہمارا نام بتا دیا تو ہم بھی آپ کا نام بتا دیں گے۔

ریڈیو سے کئی فائدے ہیں۔ مختلف زبانیں سیکھئے۔ ساری دنیا کے سنگیت کا مزا لیجئے۔ مشاعرے، ڈرامے، فلموں کے ساؤنڈ ٹریک سنئے۔ جی چاہے تو ایک ہی جگہ دو اسٹیشن لگاکر نیا لطف اٹھائیے۔ ریڈیو دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات خصوصاً ماہر نفسیات سمجھداری سے کام لیں تو یوں بھی نسخے لکھے جا سکتے ہیں۔

۱۔ صبح چھ بجے ہلکی سی چہل قدمی، ایک چمچہ شہد بھیگے ہوئے چنے اور

۲۔ دوپہر میں معمولی سا کھانا، ایک گھنٹے کی نیند اور ساڑھے تین سے چار بجے تک "آپ کی پسند"۔

۳۔ رات میں پرانے دوستوں سے اجتناب، نئے دوستوں سے آدھ گھنٹہ گفتگو جس میں بات بات پر قہقہے، ہلکا پھلکا کھانا اور نو بجے "ہوا محل"۔

ممکن ہے بعض ماہر نفسیات ریڈیو کے ذریعہ بھی امراض کا علاج کرتے ہوں۔ ریڈیو ہمیں خوشی اور غم سے ہم کنار کرتا ہے۔ عمر کو کم زیادہ کرتا ہے۔ وہ یوں کہ بیس برس پرانا گیت سنائی دے تو لگتا ہے ہم بیس برس چھوٹے ہوگئے ہیں۔ ہم عمر بچّوں کے ساتھ سج دھج کر اسکول جا رہے ہیں۔ سردیوں

کا موسم ہے۔ اسکول کے میدان میں کہرچھایا ہے۔ بچوں کے جسموں پر رنگ برنگے سوئیٹر پھولوں جیسے لگ رہے ہیں اور وہ ! لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھڑی دھیرے دھیرے ہی گیت گنگنا رہی ہے۔ ہم اس کے قریب سے گذرتے ہیں۔ وہ مسکرا کر کانچ جیسی شفاف آنکھوں سے دیکھتی ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ اسکول خالی ہو جائے ہم دونوں اسکول گارڈن میں ایک دوسرے کو تکتے بیٹھے رہیں۔ ہم کہیں "آپ بہت خوبصورت ہیں"

اور وہ کہے کہ آپ تو ہم سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔

کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ آپ خوش ہیں۔ ریڈیو پر خوشی کا گیت بجتا ہے لیکن آپ کا جی گھبرانے لگتا ہے اس لئے کہ فلیش بیک میں کوئی پریشان کن یاد ابھر رہی ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ دادی اماں سے فلم کی اجازت مانگی۔ انھوں نے خبردار کیا۔ پھر بھی ہم چلے گئے۔ ساری فلم میں دادی اماں کی لکڑی ابا جان کے تھپڑ اور امی کی جھڑکیاں ڈراتی رہیں۔ اب بھی اس فلم کے گانے کانوں میں پڑتے ہیں تو دم بھر کے لئے گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔

اب تو دیہاتوں میں بھی گھر گھر ریڈیو ہو گئے ہیں ورنہ اب سے چند برس پہلے وہاں ریڈیو کی وہی حیثیت تھی جو شہروں میں ٹیلی فون کی ہوتی ہے کہ اور سب تو اسے استعمال کر لیتے ہیں صرف خریدنے والا نہیں کر سکتا۔ صبح شام پڑوسیوں کا تانتا بندھا ہے۔ ہر آدمی اپنی فرمائش کا اسٹیشن لگانا چاہتا ہے۔ رات ہو چکی ہے۔ بچوں کو سونے کے لئے جگہ نہیں مگر سامعین تشریف فرما ہیں۔

امپورٹڈ ریڈیو عموماً پریشان کن ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست کی آپ بیتی بھی سنتے چلیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہمارے گھر ایک غیر ملکی ریڈیو خراب پڑا ہے۔ اس کا صرف ایک پارٹ خراب تھا اور کہیں نہ ملتا تھا۔ کاریگر نے کہا کہ اسی ماڈل کا دوسرا ریڈیو کوئی بیچے تو یہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ کافی دنوں بعد ایک صاحب کا پتہ چلا۔ وہ بھی ہماری تلاش میں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا ریڈیو خریدنے پر زور لگاتے رہے تنگ آکر اپنے اپنے ریڈیو ایک دوسرے کو بیچ ڈالے۔ اس سے صرف تسلی ہوئی ریڈیو ویسے ہی رہے۔ ایک اور صاحب نے وعدہ کیا کہ پچاس روپے معاوضہ دو تو وہ ریڈیو چرا کر لاتے ہیں۔ آپ اس کے پارٹس نکال کر اپنا ریڈیو ٹھیک کر لیں۔ ہم راضی ہو گئے اور وہ ریڈیو ہمارے گھر پہنچ گیا۔ لیکن اگلی رات ہم پر یہ سانحہ گذرا کہ ہمارا ریڈیو چوری ہو گیا۔ یعنی بات جہاں سے نکلی تھی وہیں ختم ہو گئی۔ □

غزلیں

شفیع اللہ خان رازؔ اٹاوی
ایس۔ این۔ کالج، کٹرہ پردل خاں، اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱

اتنی گہری نیند پتھر سو گئے
شیش محلوں کے مقدر سو گئے

رات، امرت بانٹنے آئے تھے لوگ
خود مگر زہراب پی کر سو گئے

لوریاں دینے لگے رنگیں سراب
ریت پر پیاسے سمندر سو گئے

رات، اک اندھا پجاری آئے گا
گر صنم خانے کے پتھر سو گئے

کس قدر رنگین تھے کانٹوں کے خواب
خوشنما پھولوں کے بستر سو گئے

تھک گئے فصلِ بہاراں کے نقیب
اوڑھ کر کانٹوں کی چادر سو گئے

جاگ اٹھے گا تلاطم کا شباب
تم اگر ساحل پہ تھک کر سو گئے

وقت نے صولت کے پھائے رکھ دیئے
زخم بیچارے سہم کر سو گئے

غالباً تاریکیوں کے سیج پر
نورزادوں کے مقدر سو گئے

زندگی کی دھوپ میں اٹھے تھے رازؔ
موت کے سائے میں لشکر سو گئے

محسن بھوپالی
۴ ایف ۵/۳ اے، ناظم آباد، کراچی ۱۸

بچھڑ کے تجھ سے میسر ہوئے وصال کے دن
ہیں تیرے خواب کی راتیں ترے خیال کے دن

فراقِ جاں کا زمانہ گذارنا ہوگا
فغاں سے کم تو نہ ہوں گے یہ ماہ و سال کے دن

ہر اک عمل کا وہ کیا کیا جواز رکھتا ہے
نہ بن پڑے گا جواب ایک بھی سوال کے دن

عروجِ بخت مبارک، مگر یہ دھیان رہے
انھی دنوں کے تعاقب میں ہیں زوال کے دن

گذر رہے ہیں کچھ اس طرح روز و شب اپنے
کہ جس طرح سے کٹیں شاخِ بے نہال کے دن

شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
گذر نہ جائیں یوں ہی عہدِ بے مثال کے دن

وہ زندگی کو نیا موڑ دے گیا محسنؔ
یہی زوال کے دن ہیں مرے کمال کے دن

محمد الیاس شوقی
۷۔ باپو کھوٹے اسٹریٹ بمبئی ۳

ٹوٹے ہوئے فریم کی تصویر

بات اتنی عجیب بھی نہ تھی جتنا کہ اس پر حیرت کا اظہار کیا جارہا تھا۔ پھر بھی کچھ انہونی سی ضرور تھی اور یہی وجہ تھی کہ بے اعتباری ان کی آنکھوں سے مترشح تھی۔

"یقین نہیں آتا۔" بوڑھے نے پرتفکر انداز میں کہا۔

"بھلا اس زمانے میں ایسا ممکن ہے؟"

"اور کیا، آج تو وہ وقت ہے کہ سب نفسی نفسی میں گرفتار ہیں۔ ہر کوئی اپنے بوجھ سے دب کر چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں بھلا اپنی ذات سے باہر کون دیکھے اور کیوں کر دیکھے۔"

"بے وقوف۔"

سبھوں نے نووارد کو گھورتے ہوئے سوچا کہ گھورنے سے سوچ زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

"کوئی اور وجہ ہوگی۔"

"ہاں! الیکشن نزدیک ہے نا، فساد کرانے کی سازش کی گئی ہے لیکن بات زیادہ آگے بڑھ نہ سکی اور معاملہ دب گیا۔"

"سب بڑے لوگوں کے پالتو جانور ہیں۔"

"اور ایسے پالتو جانور روزانہ کے لڑائی جھگڑوں میں نجانے کتنے اجڑتے اور قتل ہوتے رہتے ہیں۔"

"ویسے بھی لڑنا تو آدمی کی سرشت میں داخل ہے۔ بس ایک بہانہ چاہئے۔"

"لیکن ـــــ یہ لڑائی وہ نہیں تھی ـــــ میرا مطلب ہے بہانے والی نہیں تھی۔"

نووارد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

سب کی آنکھوں نے سوالات کے نیزے اس کے چہرے پر گاڑ دیئے۔ اس نے انھیں بتلایا کہ تمام جانور باوجود جبلیاتی اختلافات کے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں۔

اور ایک دوسرے سے خائف بھی، ایک ساتھ ہی رہتے ہیں کہ ساتھ میں رہنا انکی عادت بن گئی ہے، ان کی فطرت کا جز ہو گیا ہے اور یہی عادت انھیں ایک دوسرے کا معاون و مددگار بھی بنا دیتی ہے۔

"لیکن کوئی آوارہ کتا کسی بلی کی مدد صرف اس لیے نہیں کرسکتا کہ بلی بندروں کے درمیان گھر گئی ہے۔"

"اور کتے کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ بندروں سے لڑائی مول لے۔ بلی سے اس کا تعلق ہی کیا ہے کہ بس دونوں پالتو جانور ہیں۔"

"یہ کیا قصہ تم لوگ لے بیٹھے کہ آدمی اور جانور کو بالکل خلط ملط کر دیا۔"

"واہ یہ بھی خوب رہی کہ گویا آدمی اور جانور میں اب بھی کوئی امتیاز باقی ہے۔"

"تمھارے خیالات فرسٹریٹیڈ (FRUSTRATED) ہیں۔"

"نہیں یہ سچائی ہے۔ پچھلے وقتوں کی باتیں بھول جاؤ کہ اب راجہ ہریش چندر پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ یگ ختم ہو گیا۔"

"بحث فضول ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک آوارہ کتا ہے۔ گلی گلی کتیوں کے پیچھے پھرنے والا۔ اس سے یہ توقع کہ ــــــ!"

"نہیں، اس لڑائی کا کوئی اور ہی سبب ہو گا۔"

"ارے، اس کی ایک وارد کی بھٹی بھی ہے اسی کا کچھ جھگڑا ہو گا۔"

لیکن نووارد اپنے بیان کردہ واقعے کی صداقت پر بضد تھا کہ وہ اس کا چشم دید گواہ تھا اور واقعہ اس سے مختلف تھا جس پر وہ سب مصر تھے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تفکرات کا دھواں ان کے ذہنوں میں کثیف ہوتا رہا اور خالی خالی آنکھوں میں سوالات سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"تم لوگ واقعے کو ایک ہی پہلو سے کیوں دیکھتے ہو۔ کیا انسانی ہمدردی اور نیک نیتی کوئی چیز نہیں، زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"ہے! لیکن آج اس کے معنی مختلف ہیں۔ بے مطلب کون آج کل اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔" نوجوان نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے اس کا اس سے کوئی ــــــ!"

نو وارد کے چہرے پر حقارت کا ایک رنگ آکر گزر گیا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب وہ غنڈے اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ بچاؤ کے لئے چلائی تھی، تو وہ اکیلا ہی ایک لاٹھی لے کر ان سے بھڑ گیا تھا۔ وہ کئی تھے اس لئے اسے بُری طرح پیٹ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ وہ بھی بڑی جی داری سے لڑا تھا۔"

"تم انھیں غنڈہ کہتے ہو؟ ـــــ وہ تو محلے کے ہر سماجی اور مذہبی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اور ان میں کا وہ گورا لمبا جوان جو ہر جلسے میں سب سے آگے آگے رہتا ہے۔ اس کے لیڈروں اور وزیروں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ اس کا باپ بھی بڑا بارسوخ آدمی ہے۔"

"ہاں خدمت ہی تو کر رہے تھے اس کی اور ـــــ!" نو وارد نے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم کون ہو؟ اور تمھارا اس واقعے سے کیا تعلق ہے؟"

"ہاں! شاید اب میری شناخت بھی ضروری ہو گئی ہے۔ اور گو کہ اس وقت میں تم لوگوں کے درمیان ہوں لیکن خود کو تم سے مختلف محسوس کرتا ہوں۔ اور میں نے سارا واقعہ اپنی بالکونی سے خود دیکھا تھا۔"

وہ سب بڑے شش و پنج میں مبتلا تھے کہ نو وارد نے واقعہ بڑی سنجیدگی سے بیان کیا تھا۔ اور واقعہ جس سے متعلق تھا اسے بھی وہ سب جانتے تھے کہ وہ محلے کا کوئی شریف یا نیک نام آدمی نہیں تھا پھر کوئی اچھا اور نیک کام اس کی ذات سے کیسے منسوب کر دیا جائے کہ نیکی کرنا تو نیک اور شریف لوگوں کا شیوہ ہے اور وہ سب محلے کے شریف اور معزز لوگ تھے۔

"لیکن والمیکی کا پرائشچت ـــــ وہ تو کسی بھی یگ میں ہو سکتا ہے۔" نو وارد نے کسی قدر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ کل یگ ہے اور اس یگ میں ستیہ یگ نہیں آسکتا۔"

"ویسے بھی ستیہ یگ آئے گا، بس ایک نعرہ ہے، ایک دلچسپ فریب ہے۔ اور کچھ نہیں۔"

"سب اپنے آپ کو بہلانے کا ایک دھوکا ہے کہ سچائی کو ہم نے خود اپنے اندر اپنی غرض اور واسناؤں کے نیچے دبا دیا ہے۔"

"وہ آگ جس نے غلاظتوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا اور جس کی تپش و روشنی میں انسان کندن

کی طرح پوتر ہوکر نکھرتا ہے۔ کہیں دور، اس آدمیوں کی بستی سے دور بجھ چکی ہے۔ بس احساس میں کہیں کچھ گرمی باقی ہے جس سے وہ خود کو بہلاتا رہتا ہے۔"

"نہیں! آگ بجھی نہیں ہے، کہیں تہہ میں سلگ رہی ہے اور اس کی آنچ کبھی کبھی ایسی لگ جاتی ہے کہ سب کچھ تپ جاتا ہے۔ ایک چنگاری ایسی بھڑکتی ہے کہ بہت کچھ آس پاس کا جلا ڈالتی ہے۔"

"لیکن ——؟"

اور یقین و بے یقینی کے درمیان پنڈولم کی طرح دیر تک وہ جھولتے رہے کہ کوئی سرا ان کے ہاتھ آجاتا جس پر وہ مطمئن ہو رہتے۔ عجیب الجھن تھی۔ اضطراب ان کے چہروں سے نمایاں تھا کہ اب یقین رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں جڑ پکڑنے لگا تھا۔

"ہم لوگ دراصل فریم میں جڑی تصویریں ہیں۔"

"اور ہمیں اپنی جگہ پر ہی رہنا ہے کہ فریم بے حد مضبوط ہے۔"

"لیکن اس سے باہر نکلنے کی ایک شدید خواہش ہم سب کے اندر موجود ہے کہ ہم اپنی اصلیت دیکھنا چاہتے ہیں پر ہم مجبور ہیں۔"

"تو کیا ہم جو نظر آتے ہیں وہ نہیں ہیں؟"

اور اس سوال پر وہ بہت جز بز ہوگئے اور اپنے اندر ٹٹول کر دیکھنے لگے لیکن کسی خاطر خواہ نتیجے تک نہ پہنچ سکے اور آخر کار جو نظر آتے ہیں اسی پر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ سوسائٹی نے انھیں شریف اور معزز تسلیم کیا تھا۔

لیکن جب وہ سچائی کی کھوج میں نو وارد کے ساتھ چلے تو دیکھا گلی کے ایک کنارے بدنام آدمی چارپائی پر پڑا کراہ رہا تھا اور اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور مظلوم عورت جگہ جگہ سے پھٹے لباس میں گھر کے ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی —! انھوں نے سوچا — یہ لباس جگہ جگہ سے حادثہ میں پھٹا یا گھر والوں کی سرزنش میں اور — ان کے خیالات کی انگلیاں بھٹکتے بھٹکتے اس کے پھٹے ہوئے لباس سے گزر کر اس کے خوبصورت جسم پر تیر رہی تھیں —!! □

غنی اعجاز
مومن پورہ، اکولہ ۴۴۴۰۰۱

غزلیں

قتل و خوں کا ابھی رواج تو ہے
حال و ماضی میں امتزاج تو ہے

وقت کے زخم کا علاج تو ہے
کل نہیں بس میں اپنے آج تو ہے

دل مقید دماغ زندانی
اس پہ طرّہ کہ سر پہ تاج تو ہے

کیوں نہ دشمن عزیز ہو ہم کو
ہم سے ملتا ہوا مزاج تو ہے

بھوک جانے کہاں سے اگتی ہے
کھیت کھلیان میں اناج تو ہے

ظلم کو ہم لہو پلائیں گے
دستِ جابر کا یہ خراج تو ہے

پھر اپنی کشتیوں کو چلو ہم جلائیں گے
یوں حوصلوں کی تاب و تواں آزمائیں گے

اتنا تو سوچئے کہ یہ جنگل کی آگ ہے
شعلوں میں گھر چکے ہیں تو کیا کیا بچائیں گے

کوئی بھی آشیاں میں ملے گا نہ دن کے وقت
ڈھلنے لگے جو شام تو سب لوٹ آئیں گے

الجھے ہوئے ہیں تار تو سلجھائیے مگر
تانیں گے بے حساب تو یہ ٹوٹ جائیں گے

زندوں میں اب تو ایک بھی باقی نہیں رہا
آؤ کہ اپنی لاش یہاں خود اٹھائیں گے

سینے دو، دستِ جبر نے گر ہونٹ سی دیئے
خود اپنے زخم ظلم کے قصّے سنائیں گے

اپنے پُلوں کو دیکھ لو کمزور تو نہیں
بادل تو گھر کے آئے ہیں دریا بہائیں گے

ایم فخر الدین
۱۲۰- لائرس چیمبرز
سپریم کورٹ، نئی دلّی ۱۱۰۰۰۱

غزلیں

کیا فرق ہے یارو بتلاؤ، اک بوند ہیں یا سیلاب ہیں ہم
اوروں کے لئے تو امرت ہیں، اپنوں کے لئے زہراب ہیں ہم
کچھ ایسے ہی اسباب تھے وہ، جن سے ہم باقی ہیں اب تک
اور جن سے آپ ہی مٹ جائیں، کچھ ایسے ہی اسباب ہیں ہم
"ہم خوش پوشوں" کی محفل میں، اکثر یہی ثابت ہوتا ہے
انسان بلا سے ہوں کہ نہ ہوں، بس ریشم اور کمخاب ہیں ہم
چند ایک برہنہ لفظوں کا، ہر دم یہ تقاضا ہے مجھ سے
ہم کو بھی سمو لو شعروں میں، اک مدّت سے بیتاب ہیں ہم
ہر شب کو روشن کرنے میں، اپنا حصہ بھی کم تو نہ تھا
لیکن جو نظر سے اوجھل تھے، وہ کم قسمت مہتاب ہیں ہم
نکلے کاغذ کے پھول فقط، نزدیک سے جب دیکھا ان کو
ہر لحظہ رہا جن کا دعویٰ: "شاداب تھے ہم شاداب ہیں ہم"

یہی محفل، جو کہیں ایک بیاباں ہوتی
بیشک اس میں بھی کوئی چیز غزل خواں ہوتی
ایک بار ایسی بھی ہستی سے ملا ہوں یارو!
کہ جو کچھ اور بھی ہوتی تو دبستاں ہوتی
مری آنکھیں نہ کھلیں ورنہ مری راتوں میں
ایک جگنو کی چمک ایک چراغاں ہوتی
زندگی اپنی پریشاں ہے، تمنا ہے مگر
زندگی اپنی ذرا اور پریشاں ہوتی
ایک ہی شکل نظر آتی ہے آئینے میں
کاش ہر شکل مری اس میں نمایاں ہوتی

● آج صبح الفاظ کا تازہ شمارہ ملا۔ ابھی دیکھ نہیں پایا ہوں۔ افتخار عارف کا گوشہ بہت اچھا رہا۔ معین الدین شاہ کی رپورٹ یقیناً سب سے اچھی تھی۔ ہر تازہ شمارے میں گزشتہ شمارے پر قارئین کی جو رائے شائع ہوتی ہے خطوں کی شکل میں، اس کا اگر یوں اہتمام ہو جائے کہ فوری کے فوری چھپ جائیں تو بہت اچھا ہو۔ یعنی ہر تازہ شمارے میں گزشتہ شمارے پر رائے ہو۔ اس طرح یہ تبصرے قدیم نہیں ہونے پائیں گے جب کہ پچھلے شمارے کی تصویر ذہن میں تازہ ہوگی۔ چونکہ الفاظ ہر دو ماہ بعد شائع ہوتا ہے اس لئے وقت کی تنگی بھی حائل نہ ہونی چاہئے۔ خطوط کے صفحے سب سے آخر میں ترتیب دیئے جائیں تاکہ ان میں تازہ ترین تبصرے شامل ہو سکیں۔ مجھے احساس ہے کہ اس کام میں دقتیں ہوں گی مگر یوں ہو جائے تو اچھا ہو۔

آج کل یہاں قدرت اللہ شہاب صاحب آئے ہوئے ہیں۔ کل اردو مرکز میں انھوں نے اپنی زیر طبع کتاب "شہاب نامہ" کے کچھ ورق پڑھ کر سنائے۔ بہت دلچسپ کتاب ثابت ہوگی۔

عنقریب مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم آنے والے ہیں، دلچسپ نشستیں رہیں گی۔ "ایک شام مزاح" کی تقریب کا امکان ہے جس میں مشتاق احمد یوسفی صاحب صدارت کریں گے۔

رضا علی عابدی، بی۔ بی۔ سی لندن

● "الفاظ" کا تازہ شمارہ ملا۔

مہمان اداریہ اس بار ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے لکھا ہے۔ لگتا ہے اردو کے شاعروں اور قاری کو دعوت فکر دینے کی بہترین کوشش کر رہے ہیں، خدا کرے آپ کی محبت یار آور ثابت ہو۔ اداریے میں وحید اختر صاحب نے جن باتوں کا اظہار خیال کیا ہے وہ یقیناً قابل توجہ ہیں اور ان کی بہت ساری باتوں کا اعتراف بھی اختلاف کم۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کا ادب "نمائش کا ادب" بن کر رہ گیا ہے۔ ہاں، اتنی بات ضرور ہے کہ اس تجربے کے دور میں بھی کچھ ادیبوں نے یقیناً قابل قدر تخلیقات پیش کئے لیکن بیشتر نے تجربے کو اس لئے اپنایا کہ اس سے نئے لکھنے والے کو آگے بڑھنے کا سہارا ملا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ان زمانے میں کچھ ناقدین ادب بھی سامنے آئے، جن کی تنقید نے اردو تنقید نگاری کے لئے نئی راہ نکالی اور اس کے بہتر نتائج برآمد ہوئے، بندھے ٹکے انداز میں تنقید کا سلسلہ ختم ہوا جسے ہم کبھی مدرسی اور مکتبی تنقید کا نام دیتے تھے، جدید شاعری کے متعلق وحید اختر نے سلیم احمد کے حوالے سے یہ بات کہی تھی کہ...

"جدیدیت کے ذہن بستہ تصور اور تصور بستہ اظہار نے سب کو یک قلم القط کر کے جس شاعری کو سراہا اور اسے مشتہر کیا وہ نہ ہمارے تخلیقی تجربۂ اظہار سے کوئی مناسبت رکھتی ہے نہ ہمارے موجودہ مسائل اور زندگی کی ترجمان تھی، نتیجے میں صرف غزل وہ بھی یکساں، یک رنگ اہمال زدہ غزل کی ارزانی ہوئی، جس کا تعلق نہ عصری شعور سے ہے نہ روایت سے!"

کیا ادب اور شاعر کو صرف عصری تقاضے اور عصری حسیت کا ترجمان ہونا چاہئے فن کار کو اپنی داخلیت کے متعلق کچھ کہنا گناہ ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر ہمارے سامنے کمٹ منٹ کا مسئلہ کیوں کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والا ادب سکہ بند ادب کا حامل قرار دیا جاتا ہے اس لئے تجربے کے ساتھ ادب اور شاعری میں فن کار کی داخلی قدروں (INNER VALUE) کا ہونا لازمی ہے اور اس کے ساتھ تجربے کا فن کارانہ اظہار بھی۔ اس کے علاوہ وحید اختر کی اس بات سے اتفاق کرنا آج کے ادیبوں اور شاعروں کو لازمی ہے کہ "کلاسیکیت کی طرف واپسی کہ ابھی ہماری قدیم اصناف ادب میں توسیع اور اظہار کے بے پناہ امکانات ہیں، اپنی ادبی قدروں کی بازآفرینی کے بغیر ہمارا ادب بے تہذیب خلا کا ادب بنا رہے گا۔"

قیصر زماں، گریڈیہ (بہار)

● آپ کا عنایت نامہ اور الفاظ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنے ادارے ایجوکیشنل بک ہاؤس اور رسالہ "الفاظ" کے بارے میں مختصر تعارف لکھا ہے۔ دراصل آپ کو یہ زحمت اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ کوئی بھی اردو داں خواہ وہ بھارت کا ہو یا جاپان کا رہنے والا ہو آپ کے ادارے اور "الفاظ" سے ناواقف ہو سکتا ہے؟

آپ نے جاپان میں اردو کے بارے میں کئی سوالات بھی لکھے ہیں۔ اتفاق سے حال ہی میں "جاپان میں اردو تعلیم کی تاریخ" کے عنوان سے ایک چھوٹا مضمون لکھ رہا ہوں۔ جب یہ مکمل ہو جائے گا تو ایک کاپی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ ہمارے ملک میں اردو پڑھانے کے لئے صرف دو یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو موجود ہیں۔ ایک تو ہمارا جامعہ اور دوسرے اوساکا میں ہے۔ اسی طرح کی تمام باتیں میرے مضمون میں تفصیل سے ملیں گی۔ تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔

افسوس ہے کہ اب تک اردو کا کوئی ادبی رسالہ جاپان سے جاری نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ہم "ہندوستانی ادب" کے نام سے ہر سال ایک رسالہ شائع کرتے ہیں جس میں آپ کے زیادہ تر اردو اور ہندی کے افسانوں اور نظموں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کے "اردو کے تیرہ افسانے" میں سے نصف افسانے تو جاپانی زبان میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اچھا اب میں پھر لکھوں گا۔ اجازت چاہتا ہوں۔ جناب اسد یار خاں صاحب کو میرا سلام پہنچایئے۔ خدا حافظ!

(پروفیسر) سوزوکی تاکیشی، ٹوکیو (جاپان)

● میں "الفاظ" کا دو برس سے خریدار ہوں۔ اس قدر دور دراز اور دنیا کے سب سے

جنوبی ملک آسٹریلیا میں اس رسالے کا مل جانا بڑی مسرت اور حیرت کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں بھارت کے لوگ خاصی تعداد میں ہیں اور اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں جن کی مادری زبان اگرچہ اردو ہے لیکن مجھے یہ جان کر تعجب اور بے حد دکھ ہوا ہے کہ نئی نسل کے یہ نوجوان اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے اور اردو رسم الخط سے نابلد ہیں۔ ادب اور شاعری کے ذوق کی بات تو الگ رہی۔ مجھے نہ صرف بھارت میں اردو رسم الخط اور اردو ادب کے مستقبل کی طرف سے گونہ مایوسی ہے بلکہ پاکستان میں بھی اس کا مستقبل بعید درخشاں تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں بھی صوبہ واریت عروج پر ہے اور پتہ نہیں کب اسے صوبوں سے دیس نکالا مل جائے۔ میرے خیال میں اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ کسی خاص ملک یا صوبے کی واحد علاقائی زبان نہ بن سکی اور شمالی ہند اور جنوب میں حیدرآباد اور دوسرے شہروں تک محدود رہی اور صحیح معنوں میں عوامی زبان نہ بن سکی۔ سرکاری سرپرستی کے اٹھ جانے اور سرکاری مدرسوں میں اردو کے اساتذہ مقرر اور مہیا نہ ہونے اور سرکاری دفاتر اور مقابلے کے امتحانوں میں صرف ہندی کی اہمیت کی وجہ سے اس کی تعلیم بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ہم لوگ بھارت میں اردو کی بقا اور ترقی کے بے حد آرزومند ہیں لیکن وہاں کے موجودہ حالات سے بہت زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ شاید آپ کچھ روشنی ڈال سکیں۔ اردو تو شاید اپنی جنم بھومی اتر پردیش میں ابھی تک دوسری سرکاری زبان کے طور پر بھی تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ پچھلی نسل کے نامور ادیب آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ نسل کے مسلمان ہی اردو ادب سے نابلد ہو گئے تو دوسروں کے متعلق کیا کہا جائے۔ حالانکہ یہ گنگا جمنی زبان بھارت میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہ صریحاً غلط ہے کہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس کا رسم خط فارسی سے ماخوذ ہے جو ایران میں اسلام سے قبل بھی مروج تھا۔ یہ صحیح معنوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔

ان حوصلہ شکن حالات میں اپنا پرچہ خدا جانے آپ کیسے نکال پاتے ہیں۔ اس جدوجہد کے لئے سب صاحبان ستائش کے مستحق ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مناسب تبدیلی کے ساتھ اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے سے اس کے بقا اور ترقی میں مدد ملے گی؟ کیا اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ حالانکہ یہ اندیشہ ہے۔ اس طرح لوگ اس کے شاندار ماضی، ادب اور شاعری سے محروم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر محمود علی، بلیک ٹاؤن آسٹریلیا

● الفاظ میں امین اشرف کی غزل "سب اداشناس رہِ سفر ترے امتحاں سے گزر گئے" بہت پسند آئی۔ غزل کا اسلوب اتنا جاندار ہے اور تخلیقی توانائی لئے بھرپور احساس کے ساتھ یوں سامنے آئی ہے کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

مختار شمیم - اندور

● تازہ الفاظ میں امین اشرف کی دونوں غزلیں بڑی پیاری ہیں۔ آپ نے انھیں ایک طویل خواب سے جگا دیا یہ بڑا مستحسن فعل ہے۔ وحید اختر کا اعلان افکار یہ جن حقائق کی نشاندہی کرتا ہے وہ قابل تسلیم ہیں۔ گوشۂ وزیر آغا کے لئے آپ قابل ستائش ہیں۔ ابن فرید کے تبصرے اختصار کے باوجود جامع [illegible]

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

۱۔ اترپردیش اردو اکادمی کی چند اہم مطبوعات ، ۲۔ اردو کے منتخب گیت ، ۳۔ انتخاب ریختی ، ۴۔ قائم چاندپوری اور ان کا کلام ، ۵۔ مثنوی آسمانی خطوط ، ۶۔ کاروانِ وطن ، ۷۔ زبان اور قواعد ، ۸۔ دستِ زلیخا ، ۹۔ سورج کی صلیب ، ۱۰۔ قوس حمزہ پوری : ایک تعارف ، ۱۱۔ نشانِ منزل ، ۱۲۔ شرارِ جستجو ، ۱۳۔ دو نیم ، ۱۴۔ انگاروں کا شہر ، ۱۵۔ جمالیات شرق و غرب ، ۱۶۔ قامت و قیمت ، ۱۷۔ ریت ریت لفظ ، ۱۸۔ اسلام کیا کہتا ہے ؟ ۱۹۔ نئی تسلیس

اترپردیش اردو اکادمی کی چند اہم مطبوعات

پچھلے دنوں اترپردیش اردو اکادمی نے اردو زبان وادب کی ایک نہایت اہم خدمت انجام
ی ہے اور اپنے اشاعتی پروگرام کو زیادہ جامع اور بامعنی بناکر وقت کے ایک بڑے تقاضے کو پورا کیا ہے۔
ادمی نے اپنے منصوبے میں یونیورسٹی اور کالج سطح کے نصابات کی تیاری وطباعت کو سب سے زیادہ اہمیت
ی اور اس طرح اردو طلباء کی دشواریوں کو بڑی حد تک دور کر دیا۔ نصاب کی ان کتابوں کے سلسلے میں البتہ
نا عرض کرنا ضروری ہے کہ ان کی طباعت اور بہتر ہوتی تو یہ کارنامہ زیادہ قابل قدر ہوتا۔ امید ہے کہ
ہ کتابوں کی آئندہ اشاعت موجودہ سے بہتر ہوگی۔

اردو کی بہت سی ضروری اور بنیادی کتابیں ایک عرصے سے ناپید تھیں۔ شعرائے اردو کے بہت
تذکرے نایاب ہوگئے تھے۔ اکادمی نے انھیں فوٹو آفسٹ سے شایع کرکے بلا تاخیر اس خلا کو پُر
دیا۔ اگر انتظار کیا جاتا کہ ہمارے محققین اس کلاسیکی سرمایے کو نئے اصول کے مطابق مرتب کرنے کے لئے
ربستہ ہوں اس کے بعد ان کی اشاعت کی نوبت آئے تو اس انتظار میں بڑا قیمتی وقت برباد ہو جاتا۔ کچھ
یہ کام بڑے صبر طلب ہیں اور کچھ ہم بھی سست رفتار واقع ہوئے ہیں، اس لئے جو طریقہ اختیار کیا
وہی مناسب تھا۔ اس کام کو اور وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ بعض تذکرے ، دواوین اور کتابیں
نوز غیر مطبوعہ ہیں ان کو بھی بلا تامل فوٹو آفسیٹ سے شائع کر دینا چاہئے۔ اگر ایڈیٹنگ ضروری
ہے تو یہ کام بعد کو ہوتا رہے گا۔

اس وقت اکادمی کا جو سیٹ پیش نظر ہے ان میں پہلی کتاب بچوں کے لئے لکھا گیا ایک ناول ہے۔ نام ہے "غار سے جھونپڑی تک"۔ جناب غلام حیدر اس کے مصنف ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا پہلا ورق اور اس وقت کی کہانی ہے جب انسانی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور غار اس کا مسکن تھے، شکار پر اس کی گزر بسر تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر غار سے نکل کے جھونپڑی میں رہنے لگا۔ یہ سارا ارتقا ایک دلچسپ ناول کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان آسان ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ بھی ہے۔ البتہ محل نظر یہ بات ہے کہ بچوں کے لئے ڈھائی سو صفحوں کی کتاب پڑھ لینا ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ بچوں کی نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ چھوٹی عمر کے بچے دیر تک کسی موضوع پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتے۔ بہر حال یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ اردو اکادمی کو بچوں کے ادب پر اور زیادہ توجہ دینی چاہئے تاکہ اردو کی جڑیں مضبوط ہوں۔ اعلیٰ سطح پر کام کرنا اور بچوں کو نظر انداز کر دینا بے حد مضر ہوگا۔

اردو اکادمی نے حسرت موہانی کے منتخب اداریوں کو انتخاب مستقل کے نام سے شایع کر دیا ہے۔ ۱۰۸ صفحات کی یہ کتاب جسے محمد حامد علی صاحب نے مرتب کیا ہے حسرت شناسی میں بہت مددگار ہوگی۔ ملک کی قومی تحریک اور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں حسرت کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ ایک انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی ایسی تجویزیں پیش کیں جسے ان کے رفقا نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن وقت نے بتا دیا کہ اکثر معاملات میں ان کا انداز فکر درست تھا۔ حسرت کے ان اداریوں سے حسرت کے ذہن اور ساتھ ہی حسرت کے عہد کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کی قیمت صرف چار روپے ہے۔

کشن پرشاد شاد کی مختصر کتاب "ضلع جگت" جو اب تک نایاب تھی اکادمی نے فوٹو آفسٹ سے شایع کر دی ہے۔ یہ تصنیف اس زمانے کی یادگار ہے جب ہمارے ادب میں لفظوں کی شعبدہ گری کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ آج اس کتاب کی حیثیت تاریخ ادب کے ایک بھولے ہوئے ورق کی سی ہے۔ ۸۴ صفحوں کی اس کتاب کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔

کالی داس کا ڈراما "مالویکا اگنی متر" شائع کر کے اردو اکادمی نے ایک نہایت ضروری کام کی طرف توجہ کی ہے۔ کالی داس سنسکرت کے مشہور ڈراما نگار گزرے ہیں۔ دنیا کے مشہور ترین ڈراما نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا سب سے مقبول ڈراما شکنتلا کئی بار اردو میں منتقل ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ جناب عرفان صدیقی نے اس ڈرامے کو بڑے سلیقے سے اردو میں منتقل کیا ہے اور ترجمے کے فن میں مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح اور اسی سلیقے سے منتخب عالمی ادب کو اردو میں پیش کیا جائے۔ ۸۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت تین روپے ساٹھ پیسے ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس گرانی کے زمانے میں کتابوں کی قیمت اتنی کم رکھ کے ایک قابل تقلید روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

اردو کے منتخب گیت

○ مرتبہ : قیصر جہاں ○ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ○ ۵/۰۰

انسانی زندگی میں گیتوں کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ جذبات انسانی کا والہانہ غنائی اظہار ہیں اور بلاشبہ یہ وہ شعری صنف ہے جو سب سے پہلے ادب بے اختیار وجود میں آئی۔ گیتوں کی سادگی اور شدت جذبات آج بھی ہر دل کو مسحور کرتی ہے۔ ہمارے ادب میں اس اہم صنف شاعری کی طرف جس کی رسائی ہر خاص و عام تک ہے، اتنی توجہ نہیں کی گئی جس کی یہ مستحق ہے۔ ڈاکٹر قیصر جہاں نے تو اکثر یت کے لئے اسی موضوع پر کام کر کے اس بے توجہی کی بڑی حد تک تلافی کر دی تھی۔ انھوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے کہ یہ گیت مانگے کا اجالا ہیں اور ہماری اپنی زبان سے ان کا کوئی تعلق نہیں گیتوں کا ایک عظیم الشان سرمایہ ہے جو سارے ملک میں بکھرا ہوا ہے۔ اسے جمع کر کے محفوظ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اردو اکیڈمی کی یہ مختصر کتاب اسی سمت میں پہلا قدم ہے۔ یقین ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔

۱۱۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے۔ کم قیمت کتابیں مہیا کر کے اردو اکیڈمی اردو کی بڑی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ورنہ اس زمانے میں تو عام رجحان یہ ہے کہ پچیس صفحوں کی کتاب کی پچاس روپے قیمت مقرر کر لو تاکہ سفارت خانوں اور لائبریریوں کے ہاتھ سو پچاس کتابیں فروخت کرنے سے لاگت مع منافع وصول ہو جائے۔

انتخاب ریختی

○ سید سبط محمد نقوی ○ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ○ ۴/۵۰

ریختی واقعی ہمارے ادب کی ایک بدنصیب و بدنام صنف شاعری رہی ہے کہ اس کا نام آیا اور سنجیدہ حضرات کی پیشانیوں پر بل پڑے لیکن پچھلے چند برسوں میں سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کی گئی اور اس کے مثبت پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی۔ ریختی خواتین کے جذبات کا ان کی اپنی مخصوص زبان میں اظہار ہے۔ اس طرح اس صنف کی اہمیت بھی دوگنی ہے۔ اس کا ایک عمدہ انتخاب بہر حال ضروری تھا لیکن یہ کام بہت نازک کہ ذرا قلم بہکا اور انتخاب کرنے والے پر پست مذاقی کا الزام لگا لیکن مقام مسرت ہے کہ جناب سبط محمد نقوی اس منزل سے سلامت گزر گئے۔ اس مختصر انتخاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

کتاب کم قیمت ہے لیکن کتابت و طباعت ناقص۔ گیارہ سو کی تعداد میں چھاپی جانے والی یہ کتاب فوٹو آفسٹ پر چھاپی جاتی تو یہ اردو ادب کی ایک بڑی خدمت ہوتی۔

قائم چاندپوری اور ان کا کلام

○ ڈاکٹر محمد امین ○ تقسیم کار ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ ۲۰/۰۰

میر و سودا کے ہمعصر قائم چاندپوری رتبے میں کسی طرح ان سے کم نہ تھے۔ محمد حسین آزاد کو بھی ان کی اہمیت کا احساس تھا اور انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ قائم کے دیوان کو میر و سودا کے

دواوین سے کسی بھی طرح نیچے نہیں رکھ سکتے لیکن ان کے شاعرانہ کمال کا قرار واقعی اعتراف ابھی تک بھی نہیں کیا گیا۔ ایک عرصے تک تو ان کا غیر مطبوعہ کلیات کتاب خانوں کی الماریوں میں مقفل رہا۔ آخر پروفیسر خورشید الاسلام اور ان کے بعد ڈاکٹر اقتدار حسین نے اس طرف توجہ کی لیکن ایک مختصر سی کتاب کی بہرحال ضرورت محسوس کی جاتی رہی جس میں ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے اور منتخب کلام بھی شامل ہو۔ ڈاکٹر امین نے زیر نظر کتاب تصنیف کر کے یہ کمی پوری کر دی ہے۔ انھوں نے قائم کے عہد کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد کلام قائم کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اور اردو شاعری میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں قائم کا مختصر انتخاب کلام بھی شامل ہے۔ امید ہے ڈاکٹر امین کی کوشش کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

مثنوی آسمانی خطوط

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر ○ دارالاشاعت ترقی، شاہدرہ، دہلی ○ ۲۰/۰۰

اٹھاسی صفحات پر مشتمل اس مثنوی کو ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کی خود نوشت سوانح کا ایک باب کہا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگی کے ایک المیے کو انھوں نے مرحوم بیوی کی زبانی آٹھ منظوم خطوط کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور ان خطوط کے ذریعے گویا آپ اپنے کو تسلی دی ہے۔ انداز بیان پُراثر ہے اور مثنوی کو بے چشم پُرآب پڑھنا سہل نہیں۔ ہمارا خیال ہے یہ مثنوی بہت سے زخمی دلوں پر مرہم لگے گی۔

——— نورالحسن نقوی

کاروانِ وطن

تلوک چند محروم ○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ○ ۷/۵۰

تلوک چند محروم کا شمار اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے تقسیم ہند سے پہلے محروم صاحب نے ادب میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

"کاروان وطن" تلوک چند محروم کی سیاسی نظموں پر مشتمل ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ابتدا سے لکھ رہے تھے حالانکہ ملازمت کی مجبوری کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ اس کی اشاعت نہ کر سکے اس مجموعے میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں۔ اس میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کی نظمیں شامل ہیں جو ایک صحت مند دل و دماغ کی غمازی کرتی ہیں۔ جناب محروم کے کلام میں ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ نیاز فتحپوری نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے صحیح فرمایا ہے کہ "اس میں نہ اقبال کے فلسفے کی گونج ہے نہ اکبر کے طنز یا تی نشتر کی تیزی، نہ اسمٰعیل و سرور کی سی سادی یا تنزیہی لقاشی بلکہ ایک مجروح احساس کی سی درد انگیزی، ایک اجتماعی درد و غم کی سی کسک اور ایک ٹھہرا ہوا شعور مداوا جو صلائے جنوں دگر بیاں چاکی نہ تھا بلکہ ایک نوع کی دعوت بخیہ گری تھی۔

محروم کا زمانہ ایک طرف غزل کی عشقیہ شاعری کا تھا اور دوسری طرف نظموں میں حب الوطنی

اور انسان دوستی موضوع سخن بنا ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ محروم روایتی غزلیں نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک وقوم کے مسائل نے ان کو متاثر کیا تھا کہ یہ موضوعات ان کی شاعری میں در آئے تھے۔

محروم کی زبان سادہ اور صاف ستھری ہے۔ ہر چند سیاسی موضوعات جذبات سے پُر ہوتے ہیں لیکن محروم کے لہجے میں ایک طرح کی متانت اور سنجیدگی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مجموعے سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

۴۱۴ صفحات کے اس مجموعے کی قیمت صرف ساڑھے سات روپے ہے اور یہ بات اپنی جگہ حیرت انگیز ہے۔

زبان اور قواعد ○ رشید حسن خاں ○ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ○ ۱۸/۷۵

رشید حسن خاں کا نام زبان وادب کے حلقے میں جانا پہچانا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے محقق ہیں اور ان کی گنتی اردو کے صف اوّل کے ممتاز محققین میں ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ان کی انفرادیت مسلم ہے کہ ان کی شہرت کا آغاز ایک تبصرے سے ہوتا ہے۔ وہ باریک بین ہیں جو تحقیق کی شرط اوّل ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کو چھوتے ہوئے انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہے اور اپنے موضوع پر اس وقت نظر اٹھاتے ہیں جب ان کی نظر تمام گوشوں پر پڑ جاتی ہے۔ "اردو املا" پہلے ہی شائع ہو چکی تھی اور اب تو اردو زبان کے بیشتر رسالے اور کتابیں ان کے املا کی پیروی کر رہی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں رشید حسن خاں نے صحت الفاظ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کہیں لغت اور استعمال عام پر بحث کی ہے تو کہیں ترکیب مہند اور سقوط حرف علت پر ـــ یہ مضامین گرچہ زبان اور قواعد کے مختلف مسائل سے متعلق ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ رشید حسن خاں نے زبان اور قواعد کے بعض موضوعات پر سیر حاصل بحثیں بھی کی ہیں جن سے ان مباحث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ کتاب اردو کی ہر لائبریری کے لئے از بس ضروری ہے۔ عام اردو پڑھنے اور لکھنے والے یقیناً اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت پونے انیس روپے یقیناً کم ہے۔

دستِ زلیخا ○ سلمیٰ جاوید ○ زیور پبلی کیشنز ○ ۱۲/۰۰

زیر نظر کتاب سلمیٰ جاوید کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ان کی ۷۰ نظموں پر مشتمل ہے۔ یوں تو سلمیٰ جاوید کسی جماعت یا گروہ سے تعلق نہیں رکھتیں لیکن انسان دوستی ان کا مشرب ہے اور اس کی لہر ان تمام نظموں میں جاری وساری ہے۔ ان کا کلام ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی۔ یہ تمام نظمیں ایک ہونہار ذہن کی نشاندہی کرتی ہیں

تشنگی زدہ کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں :

ساری دنیا سمٹ کر پردوں میں مرے / بے حقیقت خس و خار کی طرح تھی / سر اٹھائے پہاڑوں کے یہ سلسلے / جیسے کاغذ کے نقشے پہ پھیلے ہوئے / کنکروں کے نشان / سرسراتی ہوئی ناگنوں کی طرح / ندیاں خم بہ خم تھیں رواں / کھیت میدان کھلیان سب / جگنوؤں کی طرح / بند مٹھی میں تھے کلبلاتے ہوئے

اردو افسانے کے میدان میں تو برس ہا برس سے خواتین کا بول بالا رہا ہے لیکن شعر و شاعری میں خواتین نے نہ جانے کیوں دلچسپی نہ لی۔ پچھلے چند برسوں سے ان خواتین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے جو شعر کہتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ریاست بہار جہاں نقادوں، تحقیق کرنے والوں اور افسانہ نگاروں میں کسی سے پیچھے نہیں ایسا لگتا ہے کہ اب شعر و شاعری میں خواتین آگے بڑھ رہی ہیں سلمیٰ جاوید اس کی واضح مثال ہیں امید ہے کہ دست زلیخا شوق سے پڑھا جائے گا اور سلمیٰ جاوید کا اگلا مجموعۂ کلام ان کے پڑھنے والوں کی مزید توقعات کو پورا کرے گا۔

سورج کی صلیب ○ صبا اکرام ○ دبستان جدید کراچی ۳۲ ○ ۴۰/۔

صبا اکرام کا کلام رسائل میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ سورج کی صلیب ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ان کی ۴۸ نظمیں اور ۳۲ غزلیں شامل ہیں شمس الرحمٰن فاروقی کو صبا کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں میں روشن نکات کا پتہ ملتا ہے۔ دراصل ہماری غزل نے شعرا کو ایسا گھیر لیا ہے کہ "ثواب طاعت و زہد" کے جاننے کے باوصف وہ کیا کریں طبیعت ہی ادھر مائل نہیں ہوتی۔ غزل ذہنی آسانی فراہم کرتی ہے۔ شاید ہمارے معاشرے کے اکھڑے پن کی علامت ہے۔ بہرحال یہ وقت اس بحث کا نہیں۔ میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ صبا اکرام کی شاعری (چاہے وہ غزل لکھیں یا نظم) اپنی اور اپنے عہد کی ذات کا انکشاف کرتی نظر آتی ہے۔ ہجرتوں کا احساس ان کی ذات کا حصہ بن گیا ہے۔ جہاں ماضی کا نستالجیا بھی ہے اور اس سے پیدا ہونے والا کرب بھی ہے جو کبھی یادوں سے کبھی امیجز سے ابھرتا ہے۔ "آئینے کا آدمی" کیسے بنتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں :

مرے چھوٹے بھائی نے / مجھ کو لکھا / کہ آنگن میں جو نیم کا پیڑ تھا / اب کے طوفان میں گر چکا ہے / ہاں ٹھنڈی چھاؤں نہیں / دھوپ کا سلسلہ ہے / مگر کھوج میں نان و نفقہ کی / نکلا ہوا / ایک کمزور آدمی / اپنے خوابوں کی / بیساکھیوں پر ٹنگا / زندگی بھر جو / سوکھے ہوئے ہونٹ کی پٹریوں پر سے اکھڑیں تنک کی / بے انت رستوں پہ چلتا رہا / آج بھی وہ مرے سامنے آئینے میں کھڑا۔

میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ آئینہ صبا اکرام کا ایک خاص امیج ہے کہ آئینہ ہاتھ بڑھا کر اشیا کو نہیں چھوتا بلکہ اردگرد کی اشیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ صبا نے اپنی ذات کا دریافت کے عمل میں اپنی علامتیں بنائی ہیں۔

صبا حساس شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں بھی اس داخلی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو انھیں باہر کی دنیا کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اک روز اٹھا جنگ کا اک شور نگر میں — پھر چاند نکلتے ہوئے چھت پر نہیں دیکھا
نکلا کوئی بچہ نہ صبا آج مکاں سے — اسکول کی گاڑی گئی رستے سے گزر بھی
چھپ جائیں کہیں آ کہ بہت تیز ہے بارش — یہ میرے ترے جسم تو مٹی کے بنے ہیں
اس گھر میں کسے دیتے ہو اب جا کے صدائیں — وہ ہارے تھکے لوگ تو اب سو بھی چکے ہیں

"سورج کی صلیب" کے طباعتی حسن نے مجموعے کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

قوس حمزہ پوری ○ ایک تعارف ○ ناوک حمزہ پوری ○ ناشر: سید احمد شکیل، حمزہ پور، شیر گھاٹی، گیا ○ ۵۰/۰۰

علامہ قوس حمزہ پوری کی سوانح جو ان کے انتقال کے بیس سال کے بعد ان کے اپنے بیٹے ناوک حمزہ پوری نے لکھی ہے۔ قوس قادر الکلام شاعر تھے۔ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ انھوں نے بس بھر اردو کی شعری روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ قوس قزح ان کی منتخب فارسی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ناوک حمزہ پوری نے قوس کی سوانح بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہے جو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور ان کی شخصیت کو قاری کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ باپ بیٹے کے رشتے میں عقیدت اور احترام کے جذبے کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تاہم اس کے باوصف انھوں نے خارجی حقائق کو پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا اور محقق کا انداز قائم رکھا ہے۔ طباعت معمولی ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے قیمت کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

نشان منزل ○ جگن ناتھ آزاد ○ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ○ ۴۰/۰۰

جگن ناتھ آزاد جتنے پُرگو شاعر ہیں اتنے ہی پُرگو نثر نگار بھی۔ "نشان منزل" آزاد کا دوسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے اقبال اور اس کا عہد شائع ہو چکا ہے۔ اقبال کے مطالعہ اور تنقید نے اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔ انھوں نے شعر و شاعری کی بدولت ہندوستان اور پاکستان کے کونے کونے کی سیر کی ہے۔ گویا بڑے جہاں دیدہ ہیں لیکن باتیں کھری اور سچی کہتے ہیں۔ اقبال سے عقیدت اور جوش کی رفاقت نے ان کی شخصیت کو خاصا متاثر کیا ہے اور ان کی شخصیت کے مثبت پہلو سامنے آئے ہیں۔ وہ تخلیقی فن کار ہیں اس لئے ان کی تنقید میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے والا انداز نہیں ہے۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں، بے ساختہ کہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے دلچسپی انھیں اس پر تنقید کرنے سے نہیں روکتی۔

اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے ادب کی [illegible] اور ادیبوں کی

بھی۔ تہذیبی مسائل کو بھی اٹھایا ہے اور فکر و فن پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین میں تنقید کا انداز واعظانہ نہیں ہے جو ہمارے اکثر تنقید نگاروں کا شیوہ بن گیا ہے۔ ان کا طریقہ تجزیاتی اور کسی حد تک تاثراتی بھی ہے۔ "نشانِ منزل" ایک ایسے ادیب کا پتہ دیتی ہے جس نے ادب کو سمجھا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کو دیکھا بھالا ہے اور ادبی تحریکات سے متاثر ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی۔

شرارِ جستجو ○ قیصر ضحیٰ عالم ○ ناشر: ناہید عالم، کانکے بوریا روڈ، رانچی ○ ۳۰/۰۰

قیصر ضحیٰ عالم اردو تنقید میں ایک نیا نام ہے۔ حالانکہ یہ مضامین پندرہ سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں، اور مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین لسانیات، ادب اور عملی تنقید سے متعلق ہیں اور ایک سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والے نقاد کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی قابلِ رشک ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی ادب کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ادب کے بارے میں ان کے واضح خیالات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر گنجلک نہیں۔ جیسا ہمارے بعض لکھنے والوں کے یہاں ہیں، شاید اپنے تنقید کے فن کو تنقید کے چھپانے میں ہی سمجھتے ہیں اور اسی لئے قاری کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں بعض نقاد غیر ملکی تنقیدی مضامین کو اردو میں منتقل کرتے رہتے ہیں اور ترجمے کے الزام سے بچنے کے لئے زبان کو مبہم کر دیتے ہیں اور شاید یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا انداز بھی فلسفیانہ سا لگے گا لیکن یہ سب طریقے ان کو اپنے پڑھنے والوں سے علیحدہ کرتے ہیں میں نے یہ اضافی سی بات صرف قیصر ضحیٰ عالم کا الفاظ کے قارئین سے تعارف کرانے کے لئے کی ہے۔ قیصر صاف ستھرے نقاد ہیں انھوں نے جو کچھ پڑھا ہے اسے ہضم کیا اور اس طرح ان کا مطالعہ بھاری بھرکم ناموں اور دور از کار اقتباسات سے نہیں معلوم ہوتا بلکہ ان کی واضح اور دو ٹوک رایوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "شرارِ جستجو" ایک متوازن نقاد کی آمد کی بشارت ہے۔ اس مجموعے کے اہم مضامین میں ادب اور اخلاقیات، کچھ لسانیات کے متعلق، قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار، جدید شاعری کے چند پہلو شمار کئے جا سکتے ہیں میں قیصر ضحیٰ عالم کو اتنے اچھے مضامین لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ان کا اگلا مجموعہ نقشِ ثانی کی حیثیت رکھے گا۔

دو نیم ○ ڈاکٹر مسعود حسین ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ ۱۰/۰۰

اردو کے عام لوگ پروفیسر مسعود حسین خاں سے ایک ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے واقف ہیں۔ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "مقدمہ تاریخ زبان اردو" اردو لسانیات میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے

اور اس کا شمار اردو کی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ لیکن شعر و شاعری مسعود صاحب کا کبھی کبھار کا مشغلہ ہے۔ گویا جب شعر خود خواہش کرتا ہے کہ مجھے کہا جائے ــ لیکن اس عمل میں بھی ان کے یہاں جابجا فنی تجربے ملتے ہیں مسعود صاحب ایک ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری کا بڑا اچھا تجزیہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"آج اردو شاعری کا ذہن سیاسی، نفسیاتی اور لسانیاتی ہر دو سطح پر دونیم ہے۔ اس لئے میری شاعری کا سفر بھی گیت سے غزل، فرد سے سماج اور دل سے ذہن کی طرف ہو رہا ہے لیکن اس سفر کی ہر منزل پر شعر ابلا اور پھوٹا ہے اور رد و قبول کی تمام تر ذمہ داری میری ذات پر ہے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے میں نے اس لسانیاتی گنگا جمنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے جس سے اردو کا شاعر دوچار ہے۔ ہندی شاعری سے متاثر ہو کر میں نے پہلے پہل گیت کو اپنایا اور کوشش اس بات کی کی کہ ہندوستانی پریم کی ریت کو ٹھیٹھ زبان کے ٹھاٹھ میں پیش کیا جائے۔"

یہ حقیقت ہے کہ مسعود صاحب نے شاعری میں اولین شہرت اپنے گیتوں سے پائی اور ان کے اشعار کو پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ عظمت اللہ خاں کی روایت میں توسیع ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ لیکن شاید مدرسی اور تحقیق کے گھنے جنگل میں وہ کھو جاتے ہیں۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی اور گیت بھی۔ اور ہر جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔

دونیم پہلے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا اور اب نئے روپ اور ترمیم کے بعد پھر منظر عام پر آیا ہے۔ انھوں نے غزل کی روایات کا پورے طور پر پاس رکھتے ہوئے بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

مدتوں گہرے خیالوں میں جہاں کھویا رہا — آج اس سایۂ دیوار سے جی ڈرتا رہا

مجھے تلاش نہیں ہے کہ ابن مریم ہو — مگر جہان میں کوئی تو ابن آدم ہو

قتل آدم کا میں الزام صنم کس کو دوں — تیرے ابرو پہ بھی خم برسر محراب بھی ہے

گدا شناسیِ اہلِ کرم مسلّم ہے — ہم اٹھ کے جس کے قدم لیں وہ پاسبانہ ملا

امید ہے کہ "دونیم" شوق سے پڑھا جائے گا۔

انگاروں کا شہر ○ ظہیر انور کے تین خوبصورت ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جس کے لکھنے والے صحیح معنوں میں "انگری ینگ مین" کی صف میں آتے ہیں۔ یہ تینوں ڈرامے اس غصے کا اظہار ہیں جس نے ظہیر انور کو فنکار بنایا ہے ــ وہ ہر چیز کو توڑنا پھوڑنا نہیں چاہتے لیکن کبھی کبھی نئی تعمیر کے لئے تخریب کی ضرورت ہوتی ہے ــ گویا یہاں نہ صرف ایک نئی دنیا بنانا ہے بلکہ ایک نئے انسان کی بھی ضرورت ہے ــ کہ یہ دنیا اگر ظلم پروردہ ہے تو اس ظلم کو مٹانے کے لئے ایک نئے آدم کی ضرورت ہے۔ ظہیر انور کے تمام کردار اس ظلم کے خلاف ایک مثبت آواز ہیں۔

میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ ظہیر انور نے اردو میں نئے ڈراموں کی خشت اول رکھ دی ہے اور اس پر ایک شاندار عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔

ظہیر انور کے یہاں ایک نیا موضوع ہے جس میں روح عصر کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے یہاں اپنے عہد کے تصورات دکھائی دے رہے ہیں۔ دراصل ڈرامے کا فن زبان و بیان کا سب سے مشکل فن ہے۔ اس کے لئے ڈراما نگار کو بیک وقت کئی سطح پر کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ ذہنی، جذباتی اور تخیلی دنیا میں نہیں رہتا کیوں کہ ڈراما محض خیالی بھی نہیں ہوتا کیوں کہ گوشت پوست کے انسان اسے اسٹیج پر کھیلتے ہیں۔ یہاں بات چیت ہوتی ہے اور صرف بات چیت ہی نہ ہوگی، اس بات سے بات آگے بڑھے گی پھر یہ بات متنازع فیہ پر بحث کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ڈراما بہت آڑے ترچھے راستے سے چلتا ہوا آج تک آیا ہے۔ ہنرک ابسن نے ڈرامے میں بحث کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے مسائل تو ہوتے تھے لیکن ان پر بحث و مباحثہ ڈرامے سے خارج از موضوع تھا۔ ابسن اور اس کے بعد جارج برنارڈ شا نے اسے اور آگے بڑھایا۔

اردو میں اسٹیج نہ ہونے کی وجہ سے ڈرامے کی اپنی کوئی روایت نہیں ہے۔ ہم نے مغربی اسٹیج سے فیض حاصل کیا ہے۔

ظہیر انور نے اپنے ڈراموں میں روح عصر کے مسائل کو اپنایا اور آج کی زندگی اور اس کی حقیقتوں کو ڈرامے کا روپ دیا ــــ اور اس روپ کو اسٹیج پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ظہیر انور نے اسٹیج اور سامعین سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ دیا ہے اور یہیں وہ ڈرامے کے فن سے اپنے کو قریب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ــ ان کے ڈراموں میں تکنیک کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ یہی تکنیک ان کے ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کرنے میں مدد کرتی ہے۔

ہمارے اپنے عہد کے مسائل ــــ جہاں قدروں کا استحصال ہو رہا ہے، جہاں فرد ایک مجمع میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

ظہیر انور نے اردو کے ڈرامائی ادب کو ایک انقلابی موڑ دیا ہے۔ اگر ان ڈراموں کو غور سے پڑھا بھی جائے تو ترقی پسند اور جدید ادب کی بحث بے معنی ہوگی کہ ہر نیا ادب جدید بھی ہوتا ہے اور ترقی پسند بھی اور اس اعتبار سے ظہیر انور قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے عہد حاضر کے مسائل کو ایک صحت مند زاویئے سے دیکھا اور ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔

میں امید کرتا ہوں کہ ظہیر انور آئندہ ان سے بھی اچھے ڈرامے لکھیں گے اور ڈرامائی ادب میں اپنا مقام پائیں گے۔

جمالیات شرق و غرب ○ پروفیسر ثریا حسین ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ ۲۰/۰۰

جمالیات کا موضوع بڑا ہمہ گیر ہے کہ فنون لطیفہ سے متعلق اس کی تمام شاخیں اس کے دسترس

میں ہیں اور جب بھی ہم ان کا مطالعہ یا مشاہدہ کریں گے ہمیں جمالیات کی وادی سے گزرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہماری زبان میں اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے مجنوں گورکھپوری کی تصنیف "تاریخ جمالیات" کے بعد تو سناٹا ہے۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ اب پھر ہمارے نقادوں اور دانشوروں نے ادھر توجہ دینی شروع کی ہے۔ پروفیسر ثریا حسین اس سے پہلے بھی 'جمالیات' پر لکھ چکی ہیں اور اب انھوں نے مشرق اور مغرب کی جمالیات پر بحث کی ہے اور شاعری سے لے کر مصوری تک غرض ہر ایک کا جائزہ لیا ہے۔

گرچہ یہ موضوع عالمانہ ہونے کی بنا پر خشک ہے لیکن موصوفہ نے مثالوں کے ذریعے اس کو دلچسپ بنایا ہے جہاں انھوں نے بنیادی مسائل پر مفکرانہ انداز سے قلم اٹھایا ہے وہیں انھوں نے شاعری اور مصوری اور مجسموں میں اس کی نشاندہی کی ہے۔

کتاب موضوع کے اعتبار سے مختصر ہے اور پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر ثریا حسین آئندہ بھی اس موضوع پر لکھیں گی۔

— اطہر پرویز

قامت وقیمت ○ وہاب عندلیب

خاکہ نگاری کوئی نیا فن نہیں تاہم اس صنف کا آغاز اس صدی کی دین ہے۔ یہ صنف مختلف فنون کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔

خاکہ نگار کا غیر جانبدار ہونا پہلی شرط ہے۔ اس کے برعکس یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر خاکہ نگار کو کسی سے ذاتی لگاؤ ہے تو وہ اس کی توصیف و تعریف بیان کرے اور ذاتی پرخاش کی بنا پر وہ شخصیت کی شکل بگاڑنے میں کوئی کسر نہ رکھے۔ دراصل ہونا یہ چاہئے کہ جس کی جو تصویر ہے وہ تحریر کے پیکر میں ہو بہو ابھر کر سامنے آئے۔ خاکہ نگاری میں تضحیک نہیں بلکہ مزاح کا ہلکا سا رنگ، بیان میں شگفتگی اور لہجے میں ٹھہراؤ ہونا ضروری ہے۔

وہاب عندلیب کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ ہم عصر ادیب خاکہ نگار سے بلاوجہ متاثر نظر آتے ہیں اور زبان و بیان میں سب سے مختلف رویہ اپناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک خاکے کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> "سلیمان خطیب ایک وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ موصوف دوستی اور تعلقات کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ ان کے دوست بے شمار اور دشمن کوئی بھی نہیں۔ مگر بعض معترضین کا ادعا ہے کہ وہ حکومتی ترجمان ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انھیں لن ترانی عزیز ہے۔ مشاعروں میں زیادہ وقت لیتے ہیں۔ زیب داستان کے لئے کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں۔ باقاعدگی کا فقدان ہے۔ غیر ادبی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

وہاب عندلیب اک طرف سلیمان خطیب کی پوری شخصیت کو ابھار کر سامنے لاتے ہیں تو دوسری طرف اپنی بیباکانہ شخصیت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں عقیدت کے

پیمانے سے لبریز نظر آتے ہیں۔

اس کتاب میں مجتبیٰ حسین "مختصر آدمی" کے عنوان سے خاکہ نگار کی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہوئے کہیں کہیں زبان کی بھول چوک کر جاتے ہیں۔ بحیثیت قاری مجھے ان کے کئی جملے کھٹکتے ہیں جن کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے اور پتھروں سے سر ٹکرانا تو اہلِ جنوں کا پرانا شیوہ ہے۔ مثال کے طور پر "اس میں قصور وہاب عندلیب کا نہیں ان کے صبر کے پیمانے کا ہے جس میں شاید سوراخ پڑ گیا ہے۔ سوراخ پڑ جانا عجیب سا لگتا ہے جب کہ نشان یا دراڑ پڑ جانا محاورہ ہے سوراخ کے لئے "ہونا" استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال یہ خاکہ بھی بہت خوب ہے اور مجتبیٰ حسین صاحب کی ... سے بھی حقیقت پسندانہ ..."

کل ملا کر وہاب عندلیب کی "قامت و قیمت" گونا گوں خصوصیات کی حامل ہے جو ایک باشعور قاری کو لطف و انبساط فراہم کرتی ہے۔

سبطین اخگر

ریت ریت لفظ ○ حمید سہروردی ○ اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ○ ۱۵/۰۰

میں سمجھتا ہوں فکشن کسی نہ کسی سطح پر فرد اور سماج کے باہمی رشتوں اور بھرپور انسانی زندگی کی مختلف جہتوں اور تہذیبی و تمدنی قدروں کا ہی منظر نامہ ہے۔ فکشن کے تخلیقی عمل میں وقت کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

حمید سہروردی نے بھی اردو فکشن میں افسانے کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر فن کار اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

حمید سہروردی کا پہلا افسانوی مجموعہ "ریت ریت لفظ" میں نئے افسانے کے تخلیقی تناظر میں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ مجموعے کا عنوان زندگی کی بے معنویت کا نوحہ خواں ہے۔ زندگی کی بے معنویت سے میری مراد اقدار کی شکستگی سے ہے۔ عصری زندگی کی پیچیدگی بالخصوص نئی نسل کی بے جہتی اور پریشاں حالی سے ماخوذ ہے۔

حمید سہروردی کے یہاں وقت ایک اکائی کی صورت میں روبہ عمل آتا ہے۔ ان کا تخیل بیک وقت تینوں زمانوں میں جیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فکر کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ان کے یہاں تکنیک کے مختلف تجربے بھی ملتے ہیں۔ زبان چوں کہ ان کے یہاں شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہے اور ایک منفرد اور مخصوص آہنگ اختیار کرتی ہے، کہیں کہیں بے ربطگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے افسانے میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ داستانی اسلوب اور طرزِ فکر ان کے افسانوی رویے پر غالب ہے۔ افسانہ "کہانی در کہانی" لمحہ لمحہ درد میں فلم کی تکنیک کا بھی احساس ہوتا ہے۔

"سمندر اور کشتیاں" افسانے سماج میں زبردست و زیردست قوتوں کے مابین ٹکراؤ کی صورت حال کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر جو استحصالی قوتوں کی علامت کے طور پر استعمال ہوا

ہے اور مچھلیاں مظلوم اور کمزور طبقے کی علامت بن جاتی ہیں۔ سمندر کا گندہ ذہن پورے معاشرہ کی تباہ کن صورت حال اور آلودگیوں کا اشاریہ ہے۔

"دشت ہو کی صدائیں" اور "کھوئے ہوئے راستوں کی شب" اور "لمحہ لمحہ درد" زندگی کی بے معنویت، نامعلوم سفر، عدم یقینی اور نئی نسل کی قابل رحم صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ اور پھر نئی نسل کے پاس اپنے اسلاف کا ایسا کوئی ورثہ بھی نہیں ہے جس کے سہارے وہ مثبت سمتوں میں آگے بڑھ سکے۔ حال اور مستقبل کی بھی کوئی راہیں متعین نہیں ہیں۔ "سفید کوا" اور "نہیں کا سلسلہ ہاں ہے" افسانوں میں ماضی کی اقدار اور روایات کے منہدم ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ چاند کے ساتھ محبوب کا تصور سائنس کی اس ایجاد کے ساتھ چکنا چور ہو گیا کہ چاند میں تو سوائے مٹی اور کھنڈروں کے اور کچھ بھی نہیں۔ بابا جو پرانی نسل کا اشاریہ ہیں، جو ماضی کی روایتی اقدار پر اعتقاد رکھتی ہے، ان کے لئے سائنس کا یہ انکشاف ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

"سفید کوا" میں افسانہ نگار کی ایسی منطق کام کرتی ہے جس کو انسانی ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ سائنس اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ بچے بھی پیدا کئے جا رہے ہیں۔ لہذا خالق اور مخلوق کا ازلی تصور باطل ٹھہرتا ہے۔ کیا خدا معزول ہو جائے گا؟ پروفیسر را کے لئے یہ صورت حال سوہان روح ہے۔

حمید سہروردی کے افسانوں میں عورت فعال کردار کے روپ میں نہیں آتی بلکہ وہ قنوطیت پرستی اور فرسودہ ذہنی کی نمائندگی کرتی ہے۔ "نہیں کا سلسلہ ہاں ہے" اور "واقعہ" میں وہ خواب کے آئینے میں اپنے مستقبل اور مسائل کو دیکھتی ہے۔

اردو فکشن کی افسانوی روایت میں اور پھر نئے افسانے میں حمید سہروردی کا کیا مقام ہے اس کا تعین ادب کے ایماندار، باشعور اور سنجیدہ قاری کو کرنا ہوگا۔

اس مجموعے کی کتابت خوبصورت اور صاف طور سے ہوئی ہے۔ رؤف صادق کا فکر خیز سرورق اور مہدی جعفر کے پیش لفظ کے ساتھ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور رشید امجد کی آراء سے یہ مجموعہ مزین ہے۔

— صدیق محی الدین

اسلام کیا کہتا ہے

○ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی ○ نور محمد کارخانہ کتب لال کنواں، رودگراں، دہلی ○ قیمت: ۱۵/۰۰

اس اہم کتاب میں موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر اسلام کا تعارف کرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام نوعِ انسانی کے لئے پوری زندگی کا بہترین رہنما ہے۔ اسلام خدا کی رحمت و محبت کا پیغام ہے، انسانی عظمت اور سربلندی کا پیغام ہے۔ اس کتاب میں اسلامی تعلیمات، تقریبات اور ربانی پیغامات کو قرآن و حدیث اور سیرت پاک کی روشنی میں نہایت آسان زبان اور عقلی انداز بیان میں

کیا گیا ہے۔ اسلام کے داعی برحق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت، سابق رسولوں کی زندگی کے اہم واقعات سے نہایت محتاط موازنہ۔ داعی اوّل کے جانشین صحابہ کرام اور اہل بیت عظام کی اسوۂ حسنہ اور اولیا و صلحاء امت کے حالات زندگی، سیاسی و اجتماعی معاملات میں غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کا عدل و انصاف۔ اسلام کے پرسنل اور شخصی و سماجی احکامات کی افادیت اور اسلام میں ردوبدل کی تحریک چلانے والوں کے مطالبہ کی نامعقولیت، دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے موازنہ۔ غرضیکہ یہ کتاب اسلام کا بہترین تعارف ہے۔ ہر طبقہ، اہل علم اور عوام عورتوں اور مردوں اور علما و جدید تعلیم یافتہ حضرات سب کے لئے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی ملک کے مقبول عام خطیب اور صاحب قلم ہیں۔ موصوف نے سالہا سال کے تجربات کی روشنی میں اس کتاب کے مضامین کو مرتب کیا ہے۔

نئی نسلیں ○ مدیر: انجم نعیم ○ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ ○ ۱۵/۰۰

گزشتہ چند برسوں میں ہندوستان میں اردو کے ادبی رسائل کو خوبصورت کتابت، طباعت اور تخلیقات کے ساتھ نہایت سلیقے سے پیش کرنے کی طرف کافی توجہ دی گئی ہے اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ "نئی نسلیں" (جو ایک قدیم رسالہ ہے) نے بھی کچھ دن پہلے اپنا لباس تبدیل کیا ہے تازہ شمارہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔

رسالہ کا پہلا حصہ گوشۂ سلیم احمد ہے جس میں ظفر اقبال، شہریار، ابن فرید اور سراج منیر نے سلیم احمد کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ آصف فرخی کا انٹرویو جو سلیم احمد کی حیات میں شائع نہیں ہوا تھا اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ صاحب گوشہ کے مضامین سے اہم اقتباسات اور ان کی شعری تخلیقات کا ایک مختصر انتخاب شامل ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ گوشہ ایک بھرپور اور جامع خراج تحسین ہے جو ہندوستان کے کسی رسالے نے سلیم احمد کو پیش کیا ہے۔

مضامین کے حصہ میں سراج منیر، سدی نوح اور ح عامر کے مضامین ہیں۔ جملہ حضرات نے اپنے اپنے موضوعات کا بہت خوبی سے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانوی حصہ میں ابن فرید کے تین افسانے خاصے کی چیز ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے ابن فرید کا ایک نیا اور مسرت افزا امیج ابھرتا ہے۔ اب تک عام طور پر ادبی حلقہ انھیں تنقید کے حوالے سے ہی جانتا تھا۔ دوسرے دو افسانے آصف فرخی اور علی امام نقوی کے ہیں۔ دونوں نئے افسانے کے جدید ترین اور قابل توجہ نام ہیں۔ اسی سے ان افسانوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ثوبان فاروقی کا ریڈیو ڈراما رنگوں کے گھیرے بھی دلچسپی کا حامل ہے۔

شعری حصہ میں محمد علوی، عرفان صدیقی، راشد [illegible]، حفیظ میرٹھی، [illegible] تبسم، مہتاب حیدر نقوی اور [illegible] کی تخلیقات متنوع اسالیب کی حامل ہیں۔

"تکلف برطرف" اس شمارے کی سب سے جاندار اور جرأت مندانہ چیز ہے۔ اس میں اردو کے معروف ادیبوں کی روزمرہ کی زندگی اور ادبی ہنگامہ بازیوں کی رپورٹنگ نہایت سلیقے سے کی گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس سے آزردہ بھی ہیں۔

بحیثیت مجموعی "نئی نسلیں" کا نیا انداز پرکشش بھی ہے اور قابل مطالعہ بھی۔

—— اسعد بدایونی

قاضی عبدالودود کی وفات پر تعزیتی جلسہ

۲۷ر جنوری کی شام نئی دہلی میں "ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو کے عظیم محقق قاضی عبدالودود کی وفات پر ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے قاضی صاحب کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ قاضی عبدالودود نے محققین کی تین نسلوں کی تربیت کی ہے۔ انھوں نے تحقیق کرنے کے آداب سے ہمیں آشنا کیا ہے۔ اگر آج اردو تحقیق بین الاقوامی تحقیق کا مقابلہ کرسکتی ہے تو صرف قاضی صاحب کی وجہ سے۔

ایم۔ حبیب خاں صاحب نے قاضی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب نے پہلی بار اردو تحقیق کو سائنٹفک انداز میں پیش کیا۔ ان کی وفات سے اردو تحقیق میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی طرح پر نہیں ہوسکتا۔

ضامن علی خاں ضامن مرادآبادی نے کہا کہ قاضی صاحب اگرچہ انتہا پسند تھے لیکن اردو تحقیق کو انھوں نے سائنٹفک بنایا ہے۔ ان کی پوری زندگی علمی اور ادبی کاموں میں گزری اور ان کا شمار اردو کے عظیم ترین محققوں میں ہوتا ہے۔

جلسے کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ قاضی صاحب کا اردو تحقیق کی دین یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں مبالغہ آرائی سے بچنے کا راستہ بتایا ہے۔ تحقیق میں حقائق کی تلاش، ان کی اہمیت اور تعبیر پر زور دیا ہے۔ قاضی صاحب نے ہمیں سکھایا کہ بغیر مکمل دلائل کے ہم کسی روایت یا حقیقت کو نہ مانیں۔ تمام ممکن مواد کا مطالعہ کرکے قلم اٹھائیں۔ استدلال کی بنیاد جذباتیت پر نہیں منطقیت اور حقیقت پر رکھیں۔ قاضی صاحب کی وفات اردو تحقیق کا وہ نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

(نمائندہ)